اِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَأْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ

بے شک یہ علم دین ہے، پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

جلد پنجم

اِنَّ ھٰذَا الْعِلْمَ دِیْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِیْنَکُمْ (صحیح مسلم)

بیشک یہ علم دین ہے پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل

جلد پنجم

پروفیسر مفتی مُنیبُ الرحمٰن

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور - کراچی
پاکستان

نام کتاب	تفہیم المسائل (جلد پنجم)
مصنف	پروفیسر مفتی منیب الرحمن
تصحیح	مولانا فیصل ندیم احمد قادری (ایم اے، ایل ایل بی، بی ایڈ)
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
سال اشاعت	اگست 2012ء
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	FQ8
قیمت	-/450 روپے

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔فون:37221953 فیکس:۔042-37238010

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔فون:37247350 فیکس:37225085

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:021-32212011-32630411۔ فیکس:۔021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Visit our website:- www.zia-ul-quran.com

صفحہ نمبر **مضمون**

انتساب

میں اپنی اس ناچیز کاوش کو علم دوست اور دین دار قارئینِ کرام کے نام منسوب کرتا ہوں۔ الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا کی یلغار اور فحاشی وعریانی کے اس دور میں یہی وہ لوگ ہیں جن کی علم دوستی اور دین سے محبت کی بنا پر اسلامی لٹریچر طبع ہو رہا ہے اور دین کا پیغام دنیا تک پہنچ رہا ہے۔ ابلاغِ دین کا فریضہ جوامت پر فرض کفایہ ہے، اس سے عہدہ برا ہونے کا ایک مؤثر سبب ہمارے معاشرے کا یہی طبقہ ہے۔ میری دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کے ذوقِ آگہی کو سلامت رکھے اور اس کی مہک کو اور وسعت عطا فرمائے، یہ اسی کی توفیق سے ممکن ہے۔

العبد الضعیف

منیب الرحمٰن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العٰلمین، والصلوٰۃ والسلام علیٰ رحمۃ للعٰلمین، سیدنا ومولانا محمدٍ وعلیٰ الہ الطیبین الطاھرین وعلیٰ صحابتہ الصدیقین الکاملین، وعلیٰ اولیاءِ امتہ وعلماءِ ملتہ من الفقہاء المجتہدین والمحدثین والمفسرین اجمعین

تاخیر ہوئی تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا

تفہیم المسائل جلد پنجم بہت پہلے مرتب ہو چکی تھی، لیکن ہمارے کسی کارکن کی غلطی سے یہ کمپیوٹر سے اڑ گئی یعنی Wash Out ہوگئی۔ اپنی ناتجربہ کاری کے باعث ہم نے اس کی Hard Copy محفوظ نہیں رکھی تھی، کمپیوٹر ہی پر اکتفا کیا اور ایک نئے تجربے سے دوچار ہونا پڑا۔ ہمارے اس شعبے کے کچھ ماہر دوستوں نے پیشکش کی کہ وہ جدید تکنیک کے ذریعے اسے کمپیوٹر کے بطن سے دوبارہ برآمد کرلیں گے، لیکن سعیِ بسیار کے باوجود ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ ناچار ہمیں اسے دوبارہ مرتب کرنا پڑا اور اسی میں کافی وقت صرف ہوا۔

ہم نے اس جلد کی تصحیح اور اسے حوالوں سے مُدلّل کرنے کی اپنی بشری استطاعت کے مطابق سعی کی ہے، لیکن اس کے باوجود انسان کی کوئی کوشش امکانِ خطا سے مبرّا نہیں ہے۔ ہمارے علم دوست قارئین اور تنقیدی نظر رکھنے والے اہلِ علم مطالعہ کے دوران اس میں کوئی لفظی یا معنوی غلطی پائیں تو ازراہِ کرم ضرور مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں ان کی رائے سے اس کو مزید بہتر بنایا جا سکے۔ ہم اپنی اصلاح کرنے والوں کی کسی بات کا برا نہیں مناتے بلکہ انہیں اپنا محسن سمجھتے ہیں۔ ہم ان کے شکرگزار ہوں گے اور ان کے لئے دعاگو رہیں گے۔

اس جلد کی ترتیب میں میرے نائب مفتی عبدالرزاق صاحب کا بہت بڑا حصہ (Contribution) ہے، میں ان کا شکر گزار ہوں اور ان کے علم میں اضافے کے لئے دعاگو ہوں۔ اس کتاب کو معنوی اغلاط سے امکانی حد تک پاک کرنے کے لئے میں نے دارالعلوم نعیمیہ کے صدر مدرس واستاذِ حدیث علامہ احمد علی سعیدی زید مجدہم اور

درجۂ تخصص فی الفقہ والافتاء کے استاذ گرامی مفتی محمد وسیم اختر ضیائی صاحب زید مجدہم کو اس جلد کے پروف کی خواندگی کی زحمت دی، انہوں نے کرم فرمایا اور اصلاح کے لئے مخلصانہ رہنمائی کی۔ میں ان دونوں اہلِ علم کا شکر گزار ہوں۔ یاسر رحمان صاحب نے بار بار اس کی کمپوزنگ کی اور ترتیب کو بہتر بنانے میں کاوش کی، میں ان کے لئے بھی دعا گو ہوں۔

عصرِ حاضر کے مایہ ناز مفسر، محدّث اور فقیہ شیخ الحدیث دار العلوم نعیمیہ علامہ غلام رسول سعیدی مُدظلہم کی ذات گرامی اہلسنت و جماعت کے لئے سرمایۂ افتخار ہے، اہلسنت کی علمی شان ان کے دم سے قائم ہے، ان کی ذات اہلسنت کے لئے علمی اعتبار سے ایک ظلِّ عاطفت ہے اور ڈھال بھی ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل یقین ہے کہ ان کی مایۂ ناز تصانیف تفسیر تبیان القرآن، شرح صحیح مسلم اور نعمۃ الباری صدیوں تک مطلع علم پر ضوفشاں رہیں گی اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ان کی علمی جلالت و وقعت میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ یہ تصانیف علمی انسائیکلو پیڈیا ہیں، ہم ان سے استفادہ کرتے رہتے ہیں اور اس جلد میں بھی ان کا فیضان اور حوالہ جات شامل ہیں۔ میری دعا ہے اللہ جلّ شانہٗ انہیں مختلف امراض و عوارض سے صحت کاملہ عطا فرمائے اور اپنی تمام تر علمی، فکری اور جسمانی قویٰ کی سلامتی کے ساتھ انہیں نعمۃ الباری کی تکمیل کی سعادت و توفیق عطا فرمائے۔ یہ ہر علم دوست شخص کے دل کی آواز ہے۔

تفہیم المسائل جلد ششم کا مسودہ بھی الحمدللہ تیار ہے، اس کی تمبیض، تصحیح اور حتمی ترتیب کے مراحل باقی ہیں۔ جیسے ہی مجھے فرصت ملے گی ان شاء اللہ العزیز اس کی تکمیل کر کے اشاعت کا اہتمام کروں گا۔

آخر میں اللہ جل شانہٗ عزّ وجلّ کی بارگاہ میں بصد عجز و نیاز دست بدعا ہوں کہ وہ اپنے حبیب مکرم ﷺ کے طفیل اس سعی کو اپنی بارگاہ میں مقبول فرمائے اور اسے قبولِ عام عطا فرمائے۔ آمین بجاہِ سید المرسلین علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ افضل الصلوات والتسلیمات

طلبگارِ دعا

مفتی منیب الرحمٰن

عقائد کے مسائل

گفتگو کے دوران لفظ ''خدانخواستہ'' استعمال کرنے کا حکم

سوال: 1

آپ کی توجہ لفظ ''خدانخواستہ'' یا ''اللہ نہ کرے'' کی جانب دلوانا چاہتا ہوں، آپ نے کبھی بھی اس کا استعمال اپنے کالم میں کیا ہے۔ یہ عموماً کسی ناخوشگوار یا ناپسندیدہ واقعہ یا حادثہ سے حفاظت کے لئے مستعمل ہے۔ گویا ایسا واقعہ یا حادثہ کا ہونا یا ہوجانا خداخواستہ ہے یعنی اس کی مرضی، رضا یا پسندیدگی سے ہوا ہے؟، یا اس کے ہونے کا محرک وفاعل اللہ تعالیٰ ہے؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں۔ ایسے ناپسندیدہ واقعات وحادثات کے محرک وفاعل، انفرادی اور اجتماعی طور پر ہم انسان ہیں نہ کہ ذاتِ الٰہی۔ ''خدانخواستہ'' کے الفاظ میں بیشک کم مگر یہ معنی پنہاں ہے کہ اگر ناپسندیدہ حادثہ یا واقعہ ہوا ہے تو (خداخواستہ) یعنی اللہ کے چاہنے سے ہوا ہے اور اس کا فاعل ومحرک اُس کی ذاتِ کریمی ہے۔ اس طرح انسان کو جو انفرادی واجتماعی طور پر ایسے ناگوار وناپسندیدہ واقعات وحادثات کا سبب ہیں، بری الذمہ ٹھہرادیا جاتا ہے اور وجہ اللہ تعالیٰ بن جاتے ہیں۔ ''خدانخواستہ یا اللہ نہ کرے'' کی جگہ دوسرے دعائیہ الفاظ استعمال کئے جاسکتے ہیں، جیسے معاذاللہ! خاکم بدہن، اللہ ہمیں یا ہمارے ملک کو اپنی حفظ وامان اور نگاہِ لطف وکرم میں رکھے۔ اللہ نہ صرف رحمٰن ورحیم اور کریم ہے، بلکہ وہ تو اپنے جمالیاتی اور تخلیقی شاہکار انسان سے شدید محبت کرتا ہے، اس کی صفت ''اَلْوَدُوْد'' ہے۔ انسان اُس کی نگاہِ لطف وکرم کا مرکز ہے اور تمام کائنات وقرآن کریم کا محور بھی انسان ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ صرف حسین صفات کا مالک ہے (لَهُ الْأَسْمَآءُ الْحُسْنٰى) بلکہ سبحان بھی ہے یعنی وہ ہر طرح کے عیب ونقص، ضرورت وحاجت اور ناپسندیدہ وناگوار صفات وغیرہ سے پاک ومنزّہ ہے۔ اُس نے خود ہی اپنے کو حسین صفات تک محدود کردیا ہے۔ اُس کی کوئی ایک صفت بھی دکھ، رنج، غم اور تکلیف دینے والی نہیں، اُس کی رحمت ومحبت اور شفقت واحسان کا موازنہ، ماں کی شفقت ورحمت سے کرنا اُس کے شایانِ شان نہیں، لہٰذا محتاط رہنا ہی بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں کج روی اور کج اندیشی سے

سخت ممانعت اور سزا کی وعید ہے،(الاعراف:7/180)

اسی طرح مسلمانوں کے معاشرے میں قسمت، مُقدّر اور تقدیر کے الفاظ کا استعمال بھی نامناسب ہے، میرا برا مقدر یا میری بری تقدیر وغیرہ کے الفاظ کہہ کر ذمے داری اپنے بجائے ربّ ورحمٰن پر ڈال دی جاتی ہے اور ابلیس کی طرح کا شِعار اختیار کرلیا جاتا ہے، حالانکہ ہمارے لئے نمونہ ہمارے آباء حضرت آدم وحوا علیہما السلام ہیں، جنہوں نے اپنی خطا کے جرم کا ارتکاب اپنے اوپر لیا۔ قسمت یا نصیب تو قانونِ مکافاتِ عمل کا نتیجہ اور بدلہ ہے، انسان کے اپنے حسین یا بداعمال کا قصور اپنا ہو اور ذمے داری دوسرے پر ڈالنا، کیا یہ ابلیسی روش نہیں ہے؟۔ اُس نے بھی تو یہی کیا اور کہا تھا۔ بہت اشد ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے بداعمال کے نتائج وعواقب اور خود اُن کے محرک وفاعل ہونے کا احساس کریں، نہ کہ اس کا محرک وفاعل اللہ تعالیٰ یا قسمت وتقدیر کو ٹھہرائیں، (لیفٹیننٹ کرنل عابد حسین عابد)۔

جواب:

آپ اپنے سوال کا براہِ راست جواب سمجھنے سے قبل اپنے سوال میں درج چند باتوں کی اصلاح فرمالیجئے:

(۱) آپ نے لکھا ہے: ''اللہ نہ صرف رحمٰن، رحیم اور کریم ہے، بلکہ وہ تو اپنے جمالیاتی اور تخلیقی شاہکار انسان سے شدید محبت کرتا ہے اس کی صفت ''اَلْوَدُوْد'' ہے۔ انسان اُس کی نگاہِ لطف وکرم کا مرکز ہے اور تمام کائنات وقرآن کریم کا محور بھی انسان ہے۔''

اللہ تعالیٰ صرف اپنے اطاعت گزار بندوں سے بلاشبہ شدید محبت فرماتا ہے اور یقیناً وہ ''اَلْوَدُوْد (نہایت محبت فرمانے والا)'' ہے، لیکن وہ اپنے نافرمان بندوں پر شدید غضب بھی فرماتا ہے، ملاحظہ فرمایئے: سورۂ بقرہ: 174، سورۂ آل عمران: 87 اور سورۃ النساء: 93 اور دیگر آیاتِ مبارکہ۔

(۲) آپ نے لکھا ہے: ''اُس نے خود ہی اپنے کو حسین صفات تک محدود کردیا ہے''۔ ہمارے عقائد میں یہ بات مسلّم ہے کہ صفاتِ باری تعالیٰ اس کی قدرت واختیار میں نہیں

ہیں، جبکہ آپ کی تحریر سے صفات باری تعالیٰ کا مقدور ہونا لازم آتا ہے۔ یہ اگرچہ باریک ولطیف علمی مسئلہ ہے اور عام آدمیوں کے لئے اس کا سمجھنا دشوار ہے اور نہ ہی یہ عام آدمیوں کا موضوعِ بحث ہونا چاہئے، صرف اصلاح کی غرض سے یہ وضاحت کی گئی ہے

(۳) آپ نے لکھا ہے کہ: "حالانکہ ہمارے لئے نمونہ ہمارے آباء حضرت آدم وحوا علیہما السلام ہیں، جنہوں نے اپنی خطا کے جرم کا ارتکاب اپنے اوپر لیا"۔ یہاں پر بھی اپنی اصلاح فرمالیجئے اور توبہ کیجئے، اللہ تعالیٰ کے کسی بھی نبی کی طرف "جرم" کی نسبت درست نہیں ہے۔ ہم محض سمجھنے اور سمجھانے کے لئے اسے "خطاءِ اجتہادی" سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایک معروف اور کثیر الاستعمال اردو محاورہ ہے کہ اگر ہمیں مستقبل کے بارے میں کسی ناخوشگوار بات کے وقوع کا اندیشہ ہو تو ہم کہتے ہیں "خدانخواستہ اگر یوں ہوگیا تو"۔ خواستن مشیت کے معنی میں ہے، ہمیں غیب کا علم تو نہیں ہے، نہ ہی ہمیں یہ معلوم ہے کہ اس مسئلے میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کیا ہے؟۔ یہ ایک دعائیہ کلمہ ہے کہ جس امر کے وقوع یا عدمِ وقوع کا ہمیں اندیشہ ہے اور ہمارے ناقص علم کے مطابق وہ صورت ہمارے حق میں خیر نہیں ہے، تو ہم دعا کے طور پر "خدانخواستہ" کا کلمہ اس کلام کے سابقے کے طور پر استعمال کرتے ہیں کہ اللہ کی مشیت اس طرح نہ ہو تو اچھا ہے، کیونکہ اس کی مشیت کا یہ تقاضا ہوا تو اس نے ہوکر ہی رہنا ہے کیونکہ: "جو اللہ چاہتا ہے وہ لازماً ہو جاتا ہے اور جو وہ نہ چاہے تو اس کا وقوع ناممکن ہے"۔ اس کیلئے عربی میں کہتے ہیں: "مَاشَاءَ اللہُ کَانَ وَمَالَم یَشَأ لَم یَکُن"۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱)۔ وَلَا تَقُولَنَّ لِشَایۡءٍ اِنِّیۡ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾

ترجمہ: "کسی چیز کے بارے میں ہرگز (مطلق طور پر) یہ نہ کہو کہ: میں کل یہ کام کروں گا، بلکہ (یوں کہو کہ) اگر اللہ چاہے گا (تو میں کل یہ کام کردوں گا)، (الکھف:23)

(۲) وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۹﴾

ترجمہ: "اور تمہارا چاہنا (کیا حیثیت رکھتا ہے) مگر یہ کہ جہانوں کا پروردگار اللہ چاہے (تو

ویسا ہی ہوجائے گا)،(التکویر:29)''۔

(۳)وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ (سورۃ الدہر:30)

ترجمہ:''اور تمہارا چاہنا کچھ نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے(وہی ہوگا)''۔

''خدانخواستہ'' کی طرح ''اللہ نہ کرے'' بھی دعائیہ کلمہ ہی ہے،حدیث پاک میں ہے:

مَنْ سَمِعَ رَجُلًا یَنْشُدُ ضَآلَّةً فِی الْمَسْجِدِ فَلْیَقُلْ لَا رَدَّهَا اللّٰهُ عَلَیْكَ فَاِنَّ الْمَسَاجِدَ لَمْ تُبْنَ لِهٰذَا،

ترجمہ:''جو کوئی مسجد میں کسی گمشدہ چیز کا اعلان کرے اسے سن کر کہو:''لَا رَدَّهَا اللّٰهُ عَلَیْكَ''یعنی''اللہ تعالیٰ تمہیں یہ چیز واپس نہ لوٹائے''،کیونکہ مسجدیں اس کام کے لئے تعمیر نہیں کی گئیں،(صحیح مسلم،رقم الحدیث:1162)''۔

اِس حدیثِ پاک میں''لَا رَدَّهَا اللّٰهُ عَلَیْكَ،یعنی اللہ اس گم شدہ چیز کو تمہیں واپس نہ لوٹائے''،کا کلمہ بددُعا کے طور پر نہیں ہے بلکہ تنبیہ اور تہدید یعنی ڈراوے کے طور پر ہے کہ وہ شخص اس کام سے باز آجائے،مسجد کو اعلان اور تشہیر کے لئے استعمال نہ کرے،مسجد کا اصل مقصد تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور ذکروفکر ہے۔

واضح رہے کہ''مشیت الٰہی''اور''رضائے الٰہی''میں فرق ہے،مثلاً سرکش اور اللہ تعالیٰ کے احکام سے بغاوت کرنے والی بعض امتوں پر عذابِ استیصال(یعنی ایسا عذاب جس میں جڑ سے اکھیڑ دیا جائے،نام ونشان مٹ جائے)اس طرح آیا کہ ان کا نام ونشان مٹ گیا،بستیاں تہ وبالا کردی گئیں،سنگ باری ہوئی،طوفان آئے،ایک چنگھاڑ(صَیْحَہ)سے صفحۂ ہستی سے مٹ گئے،یہ مشیت الٰہی تھی،رضائے الٰہی نہیں۔رضائے الٰہی تو یہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار بندے بن کر دنیا وآخرت میں اس کی رحمت کے حق دار بنتے۔مشرکین،کفار،اللہ تعالیٰ کے احکام کے باغیوں،سرکشوں اور گنہگاروں کو سزا دینا مشیت الٰہی ہے،رضاءِ الٰہی نہیں ہے۔یہ عقیدہ نہیں رکھنا چاہیے کہ تمام باطل،ناحق اور برے کام(معاذ اللہ!)اللہ تعالیٰ کی مشیت کے علی الرّغم(برخلاف)ہورہے ہیں۔

ایمان مفصّل کے ان کلمات: "وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی" کا مطلب بھی یہی ہے، یعنی تقدیر اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی مقدر ہوتی ہے، خواہ وہ (بظاہر) خیر کی صورت میں ہو یا شر کی صورت میں۔ ظاہر میں جو صورتِ خیر ہے، وہ اس کی رضا ہے اور جو صورت شر ہے وہ اس کی مشیئت ہے۔ صورت شر کے ساتھ ظاہری طور پر کی قید اس لئے لگائی ہے کہ حقیقت میں باغی اور مجرم کو سزا دینا، شر نہیں ہے۔ اور اس پر انسانیت کی عقل عام (Common Sense) اور اجتماعی دانش (Collective Wisdom) کا اِجماع (Consensus) ہے، اسی لئے تو جرائم کے لئے سزاؤں کے قوانین بنائے جاتے ہیں، عدالتیں قائم ہیں، مجرموں پر تعزیرات نافذ ہوتی ہیں۔

آپ کا یہ کہنا درست ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سارے نام ہی حسین ہیں، لیکن آپ کا مطلقاً یہ کہنا کہ "اُس کی کوئی ایک صفت بھی دکھ، رنج، غم اور تکلیف دینے والی نہیں"، درست نہیں ہے۔ اُن اسماءِ حُسنٰی میں یہ اسماءِ مبارکہ بھی ہیں: اَلْمُتَکَبِّرُ، اَلْجَبَّارُ، اَلْقَھَّار، اَلْمُمِیْتُ، اَلْمُنْتَقِمُ، اَلضَّارُ، یہ سب اسماءِ مبارکہ اُس کے شایانِ شان ہیں، "متکبر" ہونا بندے کے لئے عیب ہے، نقص ہے، اللہ تعالیٰ کی شان ہے، اسے سزاوار ہے، زیبا ہے۔ اللہ تعالیٰ "جَبَّارُ" ہے، وہ سرکشوں اور باغیوں پر جبر فرماتا ہے، وہ "قَھَّار" ہے، اُس نے باغی اُمتوں پر اپنا قہر وغضب نازل فرمایا، اسی طرح وہ "مُنْتَقِم" بھی ہے۔ تو ظاہری صورت میں جن پر عذاب آیا، جن کی اللہ تعالیٰ نے گرفت فرمائی، جن کو اللہ تعالیٰ آخرت میں عذابِ جہنم میں مبتلا فرمائے گا، وہ اُن سب کو ظاہری صورت میں تکلیف، غم واندوہ اور رنج والم میں مبتلا کرنے والا ہے۔ اس لئے آپ کا یہ کہنا کہ: "اُس کی کوئی ایک صفت بھی دکھ، رنج، غم اور تکلیف دینے والی نہیں"، درست نہیں ہے۔ اس کی صحیح تاویل یہ ہے کہ اپنے خالق ومالک کے باغیوں کو سزا دینا اور فرماں برداروں کو جزا دینا ایک اچھی قدر ہے۔ ورنہ اگر نیک وبد کو ایک لاٹھی سے ہانکا جائے تو اچھی قدریں کیسے پروان چڑھیں گی؟

قسمت، نصیب، مقدر اور تقدیر کے کلمات کے استعمال میں شرعاً کوئی خرابی نہیں ہے۔

''میری تقدیر بری ہے'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ ! اللہ تعالیٰ نے ظلم کیا ہے، سبب (Cause) بندے کا اپنا عمل ہے اور مُسَبَّب (Effect) یعنی عمل کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کا قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ اہلسنت و جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے افعال کا کاسب ہے اور بندے اور اس کے افعال کا خالقِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے، فعل کا صدور اس کی قدرت سے ہوتا ہے، اور انسان کو جزا وسزا اس کے اپنے اختیاری کسب (فعل) پر ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ، ترجمہ: ''اور اللہ نے تمہیں اور تمہارے اعمال کو پیدا کیا، (الصافات: 96)۔

قرآن نے یہی ادب بتایا ہے کہ بندہ نقص وعیب کو اپنی طرف منسوب کرے اور کمال کو اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف: مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ، ترجمہ: ''(اے مخاطب!) تم کو جو اچھائی پہنچتی ہے، سو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور تم کو جو برائی پہنچتی ہے، وہ تمہاری اپنی ذات کی وجہ سے ہے، (النساء: 79)''۔ نیکی اور بدی بندے کا فعل ہے، لیکن ادباً نیکی کو اللہ کی طرف منسوب کیا اور بدی کی نسبت بندے کی طرف کی، کیونکہ نیکی اور بدی کا فاعل اور کاسب بندہ ہے اور انسان اور اُس کے اعمال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام کے دعائیہ کلمات قرآن مجید میں مذکور ہیں:

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ، ترجمہ: تیرے سوا کوئی معبودِ (برحق) نہیں ہے، تو (ہر عیب سے) پاک ہے، بے شک میں ہی زیادتی کرنے والوں میں سے تھا، (الانبیاء: 87)''۔ اس مقام پر حضرت یونس علیہ السلام نے سبحان (بے عیب ہونے) کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف فرمائی اور زیادتی کی نسبت اپنی طرف کی۔

آپ کی تحریر میں بیان کردہ عقائد قرآن وسنت اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں، اس لئے آپ پر اس عقیدہ سے رجوع کرنا لازم ہے۔ آپ کا یہ جملہ کہ: ''یا اس کے ہونے کا مُحرِّک و فاعل اللہ تعالیٰ ہے؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں''۔

بظاہر یہ جملہ گمراہی پر مبنی ہے اور شاید یہ ارادتاً نہیں بلکہ اسلامی عقائد سے ناواقف

ہونے کی وجہ سے ہے۔ دراصل انسانی افعال (خواہ وہ اچھے ہوں یا برے) کا مُحرِّک انسان خود ہے، اس کا ''نَفْسِ لَوَّامَہ (Consience)'' اور ''نفس مُطْمَئِنَّہ'' خیر کے محرک ہیں اور ''نفس اَمّارہ'' شر کا محرک ہے، اس لئے اس پر جزا وسزا کا مدار ہے۔
باقی انسان اور اس کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:
وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ
''اللہ (ہی) ہے جو تمہارا اور تمہارے اعمال کا خالق ہے، (الصافات:96)''۔
تو انسان کے ہر فعل کا خالق تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی ہے، البتہ کاسب (یعنی کام کرنے والا) بندہ ہے اور ''کسب'' پر ہی ثواب وعقاب کا مدار ہے۔

نعت کے شعر میں بھول کر ایک مصرعے کی جگہ دوسرا مصرعہ پڑھنے کا حکم

سوال:2
ایک شخص نے کسی محفل میں اعلیٰ حضرت کی مناجات بھول کر اِس طرح پڑھی:
؎ یاالٰہی! نامۂ اعمال جب کھلنے لگیں — دولتِ بیدارِ عشقِ مصطفیٰ کا ساتھ ہو
حالانکہ شعر کا دوسرا مصرعہ اس طرح تھا کہ: ع عیب پوشِ خَلق ستارِ خطا کا ساتھ ہو
آیا اس میں کوئی گناہ کا ارتکاب تو نہیں ہوا جبکہ یہ شعر بھول کر پڑھا گیا تھا۔
(محمد عقیل عطاری، ایف۔بی ایریا، کراچی)

جواب:
اس میں کسی گناہ کا ارتکاب نہیں ہوا اور نہ ہی معنی میں کوئی ایسی تبدیلی واقع ہوئی ہے، جس سے شانِ رسالت مآب ﷺ یا شانِ الوہیت جل وعلا میں اہانت کا دور کا بھی کوئی شائبہ پیدا ہوتا ہو۔ جو مصرعہ سہواً نعت خواں سے رہ گیا اور اس کی جگہ جو دوسرا مصرعہ پڑھا گیا ہے، دونوں سے مراد ذاتِ رسالت مآب ﷺ ہی ہے، لہٰذا کوئی بنیادی معنوی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، کیونکہ اس ساری مناجات کے ہر شعر کے مصرعۂ ثانیہ سے رسول اللہ ﷺ ہی کی

ذات بابرکات مراد ہے۔

غیر نبی پر مستقلاً درود و سلام بھیجنا

سوال:3

ایک مسجد میں رسول اللہ ﷺ پر سلام بھیجا جارہا تھا اور سلام کے اختتام پر یہ شعر پڑھا گیا: ؎ میں مُقلّد ہوں احمد رضا کا ریاض

اُس امام اہلسنت پہ لاکھوں سلام

محفل کے اختتام پر ایک نمازی نے اعتراض کیا کہ ایک محفل میں جب حضور ﷺ پر سلام بھیجا جارہا ہو تو اسی محفل میں کسی اور اللہ کے ولی پر ویسا ہی سلام نہیں بھیجا جاسکتا۔ اُس پر امام صاحب نے کہا کہ التحیات میں بھی حضور ﷺ پر سلام بھیجنے کے بعد اللہ کے نیک اور صالحین بندوں پر سلام بھیجتے ہیں، یعنی ''اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ'' پڑھتے ہیں، تو جب نماز میں حضور ﷺ پر سلام بھیجنے کے بعد اللہ کے نیک بندوں پر سلام بھیج سکتے ہیں، تو اسی طرح دوسری محافل میں بھی سلام بھیج سکتے ہیں۔ کیا اُس نمازی کا اعتراض کرنا صحیح ہے؟

(محمد صادق، کراچی)

جواب:

ایک سلام وہ ہے جو اہلِ اسلام کا شعار ہے اور اس میں مسلمانوں کی ایک دوسرے سے ملاقات کے موقع پر مسرت کا اظہار ہے اور یہ ایک دوسرے کے لئے کلمۂ دعا بھی ہے اور خیر خواہی بھی۔ اِس سلام کا جواب دینا شریعت کی رُو سے واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ تَحِیَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَیِّبَةً ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۱﴾

''پھر جب (ان میں سے) کسی گھر میں تم داخل ہو تو اپنوں پر سلام کرو (ملاقات کے وقت) اچھی دعا، اللہ کی طرف سے برکت والی پاکیزہ چیز ہے، اِسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے

آیتیں بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھو، (سورۃ النور: 61)''۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَاؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۝۲۷

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا اور گھروں میں داخل نہ ہو جب تک اجازت نہ لے لو اور ان کے رہنے والوں پر سلام نہ کرلو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو، (سورۃ النور: 27)''۔

وَ اِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَاؕ

ترجمہ: ''اور جب تمہیں کوئی سلام پیش کیا جائے تو تم اُن سے بہتر کلمات کے ساتھ سلام کرو یا (کم از کم) اُنہی الفاظ میں جواب دے دو، (سورۃ النساء: 86)''۔

اسی طرح قرآن مجید نے اہلِ جنت کے بارے میں فرمایا:

اُولٰٓىِٕكَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَ یُلَقَّوْنَ فِیْهَا تَحِیَّةً وَّ سَلٰمًا۝۷۵

ترجمہ: ''وہی لوگ ہیں جنہیں اُن کے صبر کے صلہ میں جنت کا بالا خانہ دیا جائے گا اور وہاں دعا اور سلام کے ساتھ اُن کا استقبال کیا جائے گا، (سورۃ الفرقان: 75)''۔

دَعْوٰىهُمْ فِیْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝۱۰ (یونس: 10)

ترجمہ: ''جنت میں اُن کی دعا یہ ہے: ''اے اللہ! تیرے لئے پاکی ہے''، اور وہاں ان کی باہمی دعائے خیر سلام ہے اور ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' پر اُن کی دعا ختم ہوگی''۔

وَ اُدْخِلَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْؕ تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ۝۲۳ (سورۂ ابراہیم: 23)

ترجمہ: ''اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اُنہوں نے نیک عمل کئے، وہ (جنت کے) باغات میں داخل کئے جائیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں اپنے رب کے حکم سے ہمیشہ رہیں گے وہاں (ملاقات کے وقت) ان کا دعائیہ کلمہ سلام ہوگا''۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث میں مسلمانوں کے ایک دوسرے پر چھ عام حقوق بیان فرماتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِذَا لَقِیْتَہٗ فَسَلِّمْ عَلَیْہِ، ترجمہ: ''جب تم اپنے (مسلمان بھائی) سے ملو تو اُسے سلام کرو''۔ (صحیح مسلم، کتاب السلام، رقم الحدیث: 5616)

سوال میں جو مسئلہ زیر بحث ہے، یہ اُس اصطلاح سے متعلق ہے جو غائبانہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کہا جاتا ہے، یعنی جو تعظیم و تکریم کے طور پر اللہ تعالیٰ کے رسولوں، ملائک اور اُن کی متابعت میں اُس کے محبوب بندوں پر بھیجا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک مختار یہ ہے کہ اصالتاً اور بالذات صلوٰۃ و سلام اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام علیہم السلام اور ملائکہ کے ساتھ خاص ہے، البتہ اُن کی متابعت میں اہلِ بیتِ اطہار، صحابۂ کرام، تابعینِ عظام، آئمۂ کرام اور دیگر مُقربینِ بارگاہِ الٰہی رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر بھی بھیجا جا سکتا ہے۔

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

وَلَا یُصَلّٰی عَلٰی غَیْرِ الْاَنْبِیَاءِ وَلَا غَیْرِ الْمَلَائِکَۃِ اِلَّا بِطَرِیْقِ التَّبَعِ،

ترجمہ: ''غیر انبیاء اور غیر ملائکہ پر درود نہ بھیجا جائے مگر اُن کی متابعت میں''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

لِاَنَّ فِی الصَّلَاۃِ مِنَ التَّعْظِیْمِ مَا لَیْسَ فِیْ غَیْرِھَا مِنَ الدَّعْوَاتِ، وَھِیَ زِیَادَۃُ الرَّحْمَۃِ وَالْقُرْبِ مِنَ اللہِ تَعَالٰی، وَلَا یَلِیْقُ ذٰلِکَ بِمَنْ یُتَصَوَّرُ مِنْہُ الْخَطَایَا وَالذُّنُوْبُ اِلَّا تَبَعًا بِاَنْ یَّقُوْلَ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَسَلِّمْ۔ لِاَنَّ فِیْہِ تَعْظِیْمَ النَّبِیِّ ﷺ۔ زیلعی۔ وَاخْتُلِفَ ھَلْ تَحْرِیْمًا اَوْ تَنْزِیْھًا اَوْ خِلَافَ الْاَوْلٰی وَصَحَّحَ النَّوَوِیُّ فِی الْاَذْکَارِ الثَّانِیْ، لٰکِنْ فِیْ خُطْبَۃِ شَرْحِ الاشباہِ لِلْبِیْرِیْ مَنْ صَلّٰی عَلٰی غَیْرِھِمْ اَثِمَ وَکُرِہَ، وَھُوَ الصَّحِیْحُ، وَفِی الْمُسْتَصْفٰی وَحَدِیْثُ صَلَّی اللہُ عَلٰی آلِ اَبِیْ اَوْفٰی۔ اَلصَّلَاۃُ حَقُّہٗ فَلَہٗ اَنْ یُّصَلِّیَ عَلٰی غَیْرِہٖ ابْتِدَاءً، اَمَّا لِغَیْرِہٖ فَلَا، وَاَمَّا السَّلَامُ فَنَقَلَ اللَّقَانِیُّ فِیْ شَرْحِ جَوْھَرَۃِ التَّوْحِیْدِ عَنِ الْاِمَامِ الْجُوَیْنِیِّ اَنَّہٗ فِیْ مَعْنَی الصَّلَاۃِ، فَلَا یُسْتَعْمَلُ فِی الْغَائِبِ وَلَا یُفْرَدُ

بِهٖ غَيْرُ الْاَنْبِيَاءِ، فَلَا يُقَالُ عَلِيٌّ عليه السلام، وَسَوَاءٌ فِيْ هٰذَا الْاَحْيَاءُ وَالْاَمْوَاتُ، اِلَّا فِي الْحَاضِرِ فَيُقَالُ اَلسَّلَامُ اَوْ سَلَامٌ عَلَيْكَ اَوْ عَلَيْكُمْ، وَهٰذَا مُجْمَعٌ عَلَيْهِ،

ترجمہ: ''اس کا سبب یہ ہے کہ دُرود میں (اِس درجے کی) تعظیم ہے جو دیگر دعاؤں میں نہیں ہے اور اِس میں رحمتِ باری تعالیٰ کی فراوانی ہے اور اللہ تعالیٰ کے زیادہ قُرب کا اظہار ہے، لہٰذا جن افراد سے خطا اور گناہ کا صدور مُتصور ہو اُن پر مستقلاً درود نہ بھیجا جائے، البتہ تبعاً بھیجا جاسکتا ہے کہ اِس طرح کہے: ''اللّٰھم صلّ علیٰ محمد وّاٰلہٖ وصحبہٖ وسلّم''، (ترجمہ: اے اللہ! محمد ﷺ اور اُن کی آل اور اصحاب پر درود وسلام نازل فرما) کیونکہ بِالتبع دوسروں کو شامل کرنے میں بھی نبی کریم ﷺ ہی کی تعظیم ہے، (بحوالہ زیلعی)۔ اِس امر میں اختلاف ہے کہ آیا غیر نبی پر مستقلاً درود بھیجنا مکروہِ تحریمی ہے یا مکروہِ تنزیہی یا خلافِ اولیٰ؟ امام نووی نے ''الاذکار'' میں مکروہِ تنزیہی کے قول کو صحیح قرار دیا ہے۔ لیکن ''علامہ بیری'' کی ''شرحِ الاشباہ'' میں لکھا ہے: جس نے (غیرِ نبی پر اصالتاً) درود بھیجا، وہ گناہ گار ہوا اور فعلِ مکروہ کا ارتکاب کیا اور یہی قول صحیح ہے۔ (امام ابنِ عابدین شامی اِس اعتراض کا، کہ غیرِ نبی پر اصالتاً درود بھیجنے کا ثبوت موجود ہے، جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:) ''المستصفیٰ'' میں اس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے اللہ! (تو آلِ ابی اوفیٰ پر اپنی خصوصی رحمت نازل فرما'') یعنی یہاں غیرِ نبی پر مستقلاً درود بھیجا گیا ہے، اِس کا جواب یہ ہے: کہ درود حقِ رسول ﷺ ہے، انہیں تو اختیار ہے کہ (کسی) غیر نبی (پر خصوصی کرم فرماتے ہوئے) مستقلاً درود بھیجیں، لیکن غیرِ نبی کو یہ اختیار نہیں ہے۔ لیکن جہاں تک غیرِ نبی پر مستقلاً سلام بھیجنے کا تعلق ہے تو ''جوہرۃ التوحید'' میں ''علامہ لقانی'' نے ''امام جوینی'' کے حوالے سے لکھا: مستقلاً کسی پر سلام بھیجنا صلوٰۃ ہی کے معنی میں ہے، لہٰذا کسی بھی غائب پر مستقلاً سلام نہ بھیجا جائے اور نبی کے علاوہ کسی اور پر بالذات سلام نہ بھیجا جائے، پس ''علی علیہ السلام'' نہ کہا جائے، اِس حکم میں زندہ اور وفات پانے والے سب شامل ہیں، مگر کسی موجود شخص کو کہہ سکتے ہیں کہ ''السلام علیک'' یا ''سلام علیکم'' یا ''السلام علیکم''، یہ مسئلہ مُتفقہ ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

میں (ابنِ عابدین شامی) کہتا ہوں کہ: (خلاصۂ کلام) سلف صالحین کی زبان سے ''صلوٰۃ وسلام'' کا استعمال انبیاء کرام کے ساتھ خاص ہے، جیسے ''عزّوجلّ'' کا استعمال اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ عزیز بھی ہیں اور جلیل بھی، ''لقانی'' نے کہا: قاضی عیاض کہتے ہیں کہ محققین کی یہی رائے ہے، مالک، سفیان اور کئی محققین اور متکلمین کا یہی مختار ہے کہ بالذات اور مستقلاً ''صلوٰۃ وسلام'' نبی کریم ﷺ اور انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے مخصوص کرنا ضروری ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر مبارک ہوتو کلماتِ تسبیح وتقدیس وتکبیر بولے جاتے ہیں اور باقی صلحاء امت کے لئے ''رضی اللہ عنہ''، ''رحمہ اللہ تعالیٰ'' اور ''غفرہ اللہ تعالیٰ'' کے کلمات بولے جاتے ہیں، جیسے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ'' اللہ اُن سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے، المائدہ: 9 اور الحشر: 10 میں ہے: رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ، (ترجمہ: ''(بعد میں آنے والے) اہلِ ایمان اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں: اے پروردگار! ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ چلے گئے)''، نماز میں جو ''اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ'' منقول ہے، اس طرح کے امور اپنے مورد (یعنی جس مقام کے لئے مشروع ہوئے ہیں) میں بند ہوتے ہیں اور یہ سلام مستقلاً نہیں بلکہ بالتبع ہے، کیونکہ اس میں رسول اللہ ﷺ نے شبِ معراج اپنے اوپر سلام بھیجا اور صالحین امت کا ذکر تبعاً ہے مستقلاً نہیں ہے (نوٹ: یہ علامہ شامی کی طویل بحث کا خلاصہ ہے)''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 10، ص: 400، 401، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ یحیٰ بن شرف النووی متوفی 676ھ لکھتے ہیں: قَالَ الشَّیْخُ اَبُوْ مُحَمَّدِ الْجُوَیْنِیُّ مِنْ اَئِمَّۃِ اَصْحَابِنَا اَلسَّلَامُ فِیْ مَعْنَی الصَّلَاۃِ وَلَا یُفْرَدُ بِہٖ غَیْرَ الْاَنْبِیَاءِ لِاَنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی قَرَنَ بَیْنَھُمَا وَلَا یُفْرَدُ بِہٖ غَائِبٌ وَلَا یُقَالُ قَالَ فُلَانٌ عَلَیْہِ السَّلَامُ وَاَمَّا الْمُخَاطَبَۃُ بِہٖ لِحَیٍّ اَوْ مَیِّتٍ فَسُنَّۃٌ فَیُقَالُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَوْ عَلَیْکَ اَوْ سَلَامٌ عَلَیْکَ اَوْ عَلَیْکُمْ،

ترجمہ: ''اصحابِ شافعیہ کے ایک امام شیخ محمد الجوینی نے کہا کہ: لفظ سلام بھی صلوٰۃ کے حکم میں ہے، اور غیرِ نبی پر تنہا سلام نہیں بھیجنا چاہئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (صلاۃ وسلام) دونوں کو یکجا کر کے ذکر فرمایا ہے، اور غیر موجود شخص پر بھی سلام نہیں بھیجنا چاہئے اور اس طرح نہ کہا جائے کہ ''فلاں علیہ السلام نے یہ بات کہی ہے''، البتہ زندہ اور فوت شدہ کو سلام کے ساتھ مخاطب کرنا سنت ہے، مثلاً: ''السلام علیکم'' کہنا یا ''علیک السلام'' یا ''سلام علیک'' اور ''سلام علیکم'' کہنا''۔ (شرح مسلم للنووی، جلد ثالث، جز سابع، ص: 185، مکتبۂ غزالی، دمشق)

علامہ غلام رسول سعیدی غیر نبی پر سلام بھیجنے کے مسئلے پر تفصیلی کلام کرتے ہوئے اختتام پر لکھتے ہیں: ''علامہ شہاب الدین خفاجی متوفی 1069ھ نسیم الریاض میں لکھتے ہیں: ''صحیح یہ ہے کہ غیر انبیاء پر صلوٰۃ بھیجنا مکروہ تنزیہی ہے، مکروہ تحریمی نہیں ہے، کیونکہ نبی ﷺ کے ساتھ صلوٰۃ اس طرح خاص ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ عز وجل خاص ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ صلوٰۃ کی طرح آپ کے ساتھ سلام بھی خاص ہے، اس لئے آپ کے علاوہ کسی کو ''علیہ السلام'' بھی نہ کہا جائے، جیسا کہ فقہاء نے تصریح کی ہے، اس لئے یہ بھی مکروہ تنزیہی ہے''۔

علامہ غلام رسول سعیدی صاحب علامہ محمود آلوسی حنفی بغدادی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں: ''درمنضود میں ہے کہ سلام، صلوٰۃ کی طرح ہے سوائے اس صورت کے جب حاضر یا غائب کی تحیت اور تعظیم مقصود ہو اور بعض علماء نے یہ فرق کیا ہے کہ سلام ہر مومن کے حق میں مشروع ہے، بخلاف صلوٰۃ کے۔ لیکن یہ بات مدعا کے خلاف ہے، اس لئے مقبول نہیں ہے۔ اور ''اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِيْنَ'' سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ اوّل تو وہ خاص مَورَد ہے، ثانیاً: وہ سلام بالتَّبع ہے اور ہماری گفتگو سلام بالاستقلال میں ہے۔ اور بعض علماء نے یہ تحقیق کی ہے کہ جو سلام زندہ اور مردہ کو شامل ہے، یہ وہ سلام ہے جس سے تحیت اور تعظیم کا قصد کیا جاتا ہے، جیسے ملاقات یا زیارتِ قبر کے وقت سلام کیا جاتا ہے، جو وجوباً جواب کا مستحق ہوتا ہے، خواہ وجوب فرضی ہو

یا وجوب کفائی۔ اور جس سلام کے ساتھ دعا مقصود ہوتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے سلامتی کا قصد ہو، یہ وہ ہے جو امت کی طرف سے حضور ﷺ کے لئے خاص ہے۔ لہٰذا آپ کے غیر پر یہ سلام صرف تبعاً کیا جاسکتا ہے۔ علامہ تقی الدین سبکی نے "شفاء الغرام" میں اسی طرف اشارہ کیا ہے اور اب علیہ السلام، علیہ الصلوٰۃ کے حکم میں ہوگا یعنی "علیہ السلام من اللہ تعالیٰ"۔ اور سلام میں وہی تعظیم ملحوظ ہوگی جو صلوٰۃ میں ہوتی ہے"۔

حرفِ مُدَّعا: "غیر نبی پر صلوٰۃ اور سلام کی بحث میں ہم نے جو دلائل ذکر کئے ہیں اور جو عبارات نقل کی ہیں، ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غیر نبی پر صلوٰۃ بھیجنا مکروہ تنزیہی ہے اور غیر نبی پر سلام بھیجنے کی ممانعت اس سے کم درجہ کی ہے اور اس کو زیادہ سے زیادہ خلافِ اولیٰ کہا جاسکتا ہے، (شرح صحیح مسلم، جلد 2، ص: 1024)"۔

علامہ امجد علی اعظمی سے سوال کیا گیا کہ: "اگر کوئی شخص واعظ یا کسے باشد مگر سنی صحیح العقیدہ حنفی ہو، ایام محرم میں شہداء کربلا رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مجالس میں، حالتِ قیام میں اختتامِ وعظ کے بعد اشعار وصلوٰۃ وسلام مضمونِ شہادت کے ساتھ اگر ایسا پڑھے کہ "یا نبی سلام علیك"، "یا حَسَن سلام علیك"، "یا حسین سلام علیك"، "صلوات اللہ علیکم"، "پڑھے اور لوگوں سے پڑھائے تو حرام ہے یا مکروہ ہے یا جائز ہے؟"۔

آپ نے جواب میں لکھا: "یہ طریقہ زمانہ سابق میں نہیں تھا کہ کتابوں میں اس کے جواز یا عدمِ جواز کا ذکر ہوتا اور سَلف صالحین کے قول یا فعل سے اس کی تائید ہوتی۔ عامۂ مسلمین اور تمام بلاد اسلامیہ میں یہ رواج ہے کہ محفلِ میلاد اقدس میں بوقت ذکر ولادت قیام کیا جاتا ہے اور اس موقع پر صلوٰۃ وسلام پڑھتے ہیں اور یہ محفل شریف کی خصوصیت اور امتیازی چیز سمجھی جاتی ہے، اگر دوسرے مواقع پر بھی یہ طریقہ برتا جائے، کبھی ذکرِ شہادت میں، کبھی گیارہویں کی مجلس میں اور اسی طرح بزرگانِ دین کے عرس وفاتحہ میں، تو مجلس میلاد شریف کی امتیازی کیفیت باقی نہ رہے گی۔ لہٰذا اس اختراع سے گریز کرنا چاہئے، ھذا ماعندی والعلم بالحق عند ربی"۔

اُن سے ایک اور سوال کیا گیا کہ: ''یا حسین علیہ السلام'' کہنا جائز ہے یا نہیں، اور ایسا لکھنا بھی کیسا ہے اور پکارنا کیسا ہے؟''۔

آپ نے جواب دیا: ''یہ سلام جو نام کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، یہ سلام تحیت نہیں جو باہم ملاقات کے وقت کہا جاتا ہے یا کسی ذریعہ سے کہلایا جاتا ہے، بلکہ اس سے مقصود صاحب اسم کی تعظیم ہے۔ عرف اہل اسلام نے اس سلام کو انبیاء وملائکہ کے ساتھ خاص کردیا ہے، مثلاً: حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت جبرئیل علیہ السلام، حضرت میکائیل علیہ السلام۔ لہٰذا غیر نبی ومَلَک (فرشتے) کے نام کے ساتھ علیہ السلام نہیں کہنا چاہیے، (فتاویٰ امجدیہ، جلد چہارم، ص: 243،244)''۔

یہ اہلسنت وجماعت کا مختار مذہب ہے، فقہ جعفریہ اثناعشری وغیرہ اس کے برعکس عقیدہ رکھتے ہیں اور اہلِ بیتِ اَطہار رضی اللہ عنہم کے اسماء مبارکہ کے ساتھ مستقلاً سلام کا استعمال کرتے ہیں، مثلاً: ''حضرت علی علیہ السلام، امام حسن علیہ السلام، امام حسین علیہ السلام، سیدہ فاطمۃ الزّہرا سلام اللہ علیہا'' وغیرہ۔

یہاں تک تو دینی ذوق رکھنے والوں کے لئے نفسِ مسئلہ کی تشریح کی گئی ہے کہ غیر نبی کے لئے اصالتاً صلاۃ یا سلام بھیجنے کا حکم کیا ہے؟ بالتّبع غیرِ نبی پر صلوٰۃ یا سلام بھیجنے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، جیسے ''اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ''۔

آپ نے سوال میں امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز پر جس سلام کا ذکر کیا ہے، وہ خود آپ کے بیان کے مطابق رسول اللہ ﷺ پر صلاۃ وسلام پڑھنے کے بعد اس کی متابعت میں پڑھا گیا، لہٰذا یہ جائز ہے۔ البتہ اگر صرف منقبت پڑھی جارہی ہو اور بالذات یعنی اصالتاً سلام بھیجا جائے، تو اس سے احتراز اولیٰ ہے، جیسے بعض حضرات شہداءِ کربلا رضی اللہ عنہم کی منقبت پڑھتے ہوئے یہ انداز اپناتے ہیں، ان کو چاہیے کہ ابتدا میں چند اشعار نبی کریم ﷺ پر سلام پڑھنے کے بعد شہداء کربلا رضی اللہ عنہم کی منقبت وسلام پڑھیں۔

انگریزی میں رسول اللہ ﷺ کے نام کے ساتھ SAW لکھنا حرام ہے

سوال:4

دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ عموماً انگلش لکھتے ہوئے نبی کریم ﷺ کے نام کے ساتھ مکمل "صلّی اللہ علیہ وسلم" لکھنے کے بجائے مختصراً SAW لکھتے ہیں، مجموعی طور پر اِس لفظ کو پڑھا جائے تو اِس کا معنیٰ ہے: آری ہے۔ کیا اِس طرح لکھنا درست ہے؟

(منور احمد صدیقی، ملیر کراچی)

جواب:4

فقہائے کرام کا فتویٰ یہی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کا نامِ مبارک لیا جائے یا لکھا جائے تو ساتھ ہی درود شریف یا کم از کم صلّی اللہ علیہ وسلم ضرور لکھا یا پڑھا جائے، بلکہ بعض علماء کے نزدیک تو واجب ہے، علامہ ابن عابدین شامی ان مواقع کا بیان کرتے ہوئے جن میں درود شریف کا پڑھنا مستحب ہے، لکھتے ہیں:

قَوْلُه (وَمُستحبة فِي كلّ أوقَاتِ الإمكان) أي حَيثُ لَا مَانِعَ ـ وَنَصَّ الْعُلَمَاءُ عَلٰى اِستحبَابِهَا فِي مَواضِع يومِ الْجُمُعَةِ، وَلَيْلَتِهَا، وَزِيدَ يَومُ السَّبتِ وَالأحدِ وَالخَميس، لما وَرَدَ فِي كلّ مِن الثَّلَاثَةِ، وَعِندَ الصَّبَاحِ وَالْمَسَاءِ، وَعِندَ دخُولِ المسجدِ وَالخُرُوجِ منهُ، وَعِندَ زِيَارَةِ قبرِهِ الشَّرِيفِ ﷺ، وَعِندَ الصَّفَا وَالْمَروَةِ، وَفِي خُطبَةِ الجُمُعَةِ وَغَيرِهَا، عقِبَ اجابَةِ المُؤذِنِ، وَعِندَ الإقَامَةِ، وَأوّلِ الدُّعاءِ وَأوسطِهِ وَآخِرِهِ، وَعقِبَ دُعاءِ القُنُوتِ، وَعِندَ الفَرَاغِ مِنَ التَّلبِيَةِ، وعِندَ الاجتمَاعِ وَالافتراقِ، وَعِندَ الوُضُوءِ، وَعِندَ طَنِينِ الأذُنِ، وَعِندَ نسيانِ الشَّيءِ، وَعِندَ الوَعظِ وَ نَشرِ العُلُومِ، وَعِندَ قِرَاءَةِ الحَدِيثِ ابتداءً وَانتهاءً، وَعِندَ كتابَةِ السؤال وَالفُتيا، وَلِكلِّ مُصَنِّف وَدَارِسٍ وَمُدَرِّسٍ وَخَطِيبٍ وَخَاطِبٍ وَمُتَزَوِّجٍ وَمُزَوِّجٍ، وَفِي الرَّسَائِلِ وَبَينَ يَدَي السَّائِرِ الأمُورِ المُهِمَّةِ، وَعِندَ ذِكرِ أو سماعِ اِسمِهِ ﷺ أو كتابتِهِ عندَ مَن لايقولُ بِوجُوبِهَا،

ترجمہ: "مصنف کا قول (ان مواقع پر جہاں تک ممکن ہو درود شریف پڑھنا مستحب ہے)

یعنی جہاں کوئی مانع نہ ہو، علماء نے کئی مواقع پر درود شریف پڑھنے کو مستحب قرار دیا ہے، جن میں سے بعض یہ ہیں: جمعہ کے دن اور رات کے وقت، اور (بعض علماء نے) ہفتہ، اتوار اور جمعرات کے دن کا اضافہ کیا ہے، جیسا کہ ان میں سے ہر ایک دن کے بارے میں وارِد ہوا، اور صبح وشام کے وقت، اور مسجد میں داخل ہوتے اور مسجد سے باہر نکلتے وقت، اور قبرِ انور ﷺ کی زیارت کے وقت، اور صفا ومروہ کی سعی کرتے وقت، اور نمازِ جمعہ کے خطبہ اور دیگر خطبات میں، اور مؤذن کے کلماتِ اذان کا جواب دینے کے بعد، اور اقامت کے وقت اور دعا کے اول، درمیان اور آخر میں، اور دعاءِ قنوت کے بعد، اور تلبیہ (یعنی تلبیہ حج کے کلمات لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ) سے فراغت کے بعد، اور کسی جگہ جمع ہونے اور منتشر ہوتے وقت، اور وضو کے وقت، اور کان میں بھنبھناہٹ محسوس ہوتے وقت، اور جب کوئی شے کہیں رکھ کر بھول جائے، اور وعظ کہنے اور علوم کی اشاعت کرتے وقت، اور حدیث شریف پڑھتے وقت اول وآخر میں درود شریف کا پڑھنا، اور سوال وفتویٰ لکھتے وقت اور تصنیف اور تعلیم وتعلّم کے موقع پر، منگنی اور نکاح کا پیغام دیتے وقت، نکاح کرتے وقت یا کسی کا نکاح پڑھاتے وقت، اور خطوط کے شروع میں اور تمام اہم کاموں کے موقع پر اور رسول اللہ ﷺ کا اسمِ مبارک لینے یا اُس کے سننے یا اُس کے لکھنے کے وقت (بعض علماء ان تین مواقع پر درود شریف کے وجوب کے قائل ہیں) ان تمام مواقع پر درود شریف پڑھنا مستحب ہے۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، ص: 204)

لیکن "صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" کو مختصر کر کے صرف "ص" یا "صلعم" لکھنا حرام ہے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا:

کلمۂ طیبہ شریف جب ورد کر کے پڑھا جائے تو اس میں ہر کلمہ پر جب نامِ نامی حضور اقدس صلعم کا آوے، درود پڑھنا چاہئے یا ایک مرتبہ جبکہ وہ جلسہ ختم کرے؟۔ آپ نے جواب میں لکھا: "جوابِ مسئلہ سے پہلے ایک بہت ضروری مسئلہ معلوم کیجئے، سوال میں نام پاک حضور اقدس ﷺ کے ساتھ بجائے "صلی اللہ علیہ وسلم"، کے "صلعم" لکھا ہے۔

یہ جہالت آج کل بہت جلد بازوں میں رائج ہے، کوئی ''صلعم'' لکھتا ہے، کوئی ''عم'' کوئی ، ''ﷺ'' اور یہ سب بیہودہ و مکروہ وسخت ناپسند و موجب محرومی شدید ہے، اس سے بہت سخت احتراز چاہیے اگر تحریر میں ہزار جگہ نامِ پاک حضور اقدس ﷺ آئے ، ہر جگہ پورا ''صلی اللہ علیہ وسلم '' لکھا جائے ، ہرگز ہرگز کہیں ''صلعم'' وغیرہ نہ ہو، علماء نے اس سے سخت ممانعت فرمائی ہے یہاں تک کہ بعض کتابوں میں تو بہت اشد حکم لکھ دیا ہے، علامہ طحطاوی حاشیۂ درمختار میں فرماتے ہیں:

وَيُكْرَهُ الرَّمْزُ بِالصَّلٰوةِ وَالتَّرَضِّيْ بِالْكِتَابَةِ بَلْ يُكْتَبُ ذٰلِكَ كُلُّهٗ بِكَمَالِهٖ وَفِيْ بَعْضِ الْمَوَاضِعِ مِنَ التَّتَارْخَانِيَةِ مَنْ كَتَبَ عليه السلام بِالْهَمْزَةِ وَالْمِيْمِ يُكَفَّرُ لِاَنَّهٗ تَخْفِيْفٌ وَتَخْفِيْفُ الْاَنْبِيَاءِ كُفْرٌ بِلَا شَكٍّ وَلَعَلَّهٗ اِنْ صَحَّ النَّقْلُ فَهُوَ مُقَيَّدٌ بِقَصْدٍ وَالَّا فَالظَّاهِرُ اَنَّهٗ لَيْسَ بِكُفْرٍ وَكَوْنُ لَازِمِ الْكُفْرِ كُفْرًا بَعْدَ تَسْلِيْمِ كَوْنِهٖ مَذْهَبًا مُخْتَارًا مَحَلُّهٗ اِذَا كَانَ اللُّزُوْمُ بَيِّنًا نَعَمِ الْاِحْتِيَاطُ فِي الْاِحْتِرَازِ عَنِ الْاِيْهَامِ وَالشُّبْهَةِ،

ترجمہ: ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کی جگہ اشارتاً ''ص'' یا ''رضی اللہ تعالیٰ عنہ'' کی جگہ ''رض'' لکھنا مکروہ ہے، بلکہ اسے کامل طور پر لکھا پڑھا جائے ، تاتارخانیہ میں بعض جگہ پر ہے جس نے درود و سلام ہمزہ (ء) اور میم (عم) کے ساتھ لکھا، اُس نے کفر کیا کیونکہ یہ عمل تخفیف ہے اور انبیاء علیہم السلام کی بارگاہ میں یہ عمل بلاشبہ کفر ہے، اگر یہ قول صحت کے ساتھ منقول ہو تو یہ مقید ہوگا اس بات کے ساتھ کہ ایسا کرنے والا قصداً ایسا کرے ، ورنہ ظاہر یہ ہے کہ وہ کافر نہیں ، باقی لزومِ کفر سے کفر اس وقت ثابت ہوگا جب اسے مذہب مختار تسلیم کیا جائے اور اس کا محل وہ ہوتا ہے جہاں لزوم ظاہر ہو۔ البتہ احتیاط اس میں ہے کہ ایہام اور شبہ سے احتراز کیا جائے ۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 6،ص: 222،221، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

امام احمد رضا قادری ایک اور جگہ لکھتے ہیں: حضور پُرنور سیّد عالم ﷺ کے ذکرِ کریم کے ساتھ جس طرح زبان سے درود شریف پڑھنے کا حکم ہے:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَبَدًا (اے اللہ ! آپ ﷺ پر اور

آپ کی آل پر اور آپ ﷺ کے صحابہ پر ہمیشہ ہمیشہ درود وسلام اور برکت نازل فرما)،
درود شریف کی جگہ فقط ''ص'' یا ''عم'' یا ''صلعم'' یا ''صللم'' کہنا ہرگز کافی نہیں بلکہ وہ الفاظ بے معنی ہیں اور فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيْلَ لَهُمْ میں داخل، کہ ظالموں نے وہ بات جس کا انہیں حکم تھا ایک اور بات سے بدل ڈالی۔ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ، تو ہم نے آسمان سے اُن پر عذاب اتارا بدلہ اُن کی بے حکمی کا، (البقرہ:59)۔ یونہی تحریر میں 'اَلْقَلَمُ اَحَدُ اللِّسَانَيْنِ (قلم دو زبانوں میں سے ایک ہے)''۔ بلکہ فتاویٰ تاتارخانیہ سے منقول ہے کہ اس میں اِس پر نہایت سخت حکم فرمایا اور اسے معاذ اللہ تخفیفِ شانِ نبوت بتایا، طحطاوی علی الدر المختار میں ہے: يُحَافَظُ عَلٰى كِتَابَةِ الصَّلٰوةِ وَالسَّلَامِ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يُسْأَمُ مِنْ تَكْرَارِهٖ وَاِنْ لَّمْ يَكُنْ فِي الْاَصْلِ وَيُصَلِّيْ بِلِسَانِهٖ اَيْضًا وَيُكْرَهُ الرَّمْزُ بِالصَّلٰوةِ وَالتَّرَضِّيْ بِالْكِتَابَةِ بَلْ يُكْتَبُ ذٰلِكَ كُلُّهٗ بِكَمَالِهٖ وَفِيْ بَعْضِ الْمَوَاضِعِ مِنَ التَّتَارْخَانِيَةِ مَنْ كَتَبَ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِالْهَمْزَةِ وَالْمِيْمِ يُكَفَّرُ لِاَنَّهٗ تَخْفِيْفٌ وَتَخْفِيْفُ الْاَنْبِيَاءِ كُفْرٌ بِلَا شَكٍّ وَلَعَلَّهٗ اِنْ صَحَّ النَّقْلُ فَهُوَ مُقَيَّدٌ بِقَصْدٍ وَاِلَّا فَالظَّاهِرُ اَنَّهٗ لَيْسَ بِكُفْرٍ وَكَوْنُ لَازِمِ الْكُفْرِ كُفْرًا بَعْدَ تَسْلِيْمِ كَوْنِهٖ مَذْهَبًا مُخْتَارًا مَحَلُّهٗ اِذَا كَانَ اللُّزُوْمُ بَيِّنًا نَعَمْ الْاِحْتِيَاطُ فِي الْاِحْتِرَازِ عَنِ الْاِيْهَامِ وَالشُّبْهَةِ،

ترجمہ: ''حضور ﷺ پر درود وسلام لکھنے کی محافظت کی جائے اور اس کی تکرار سے تنگ دل نہ ہو، اگرچہ اصل میں نہ ہو اور اپنی زبان سے بھی درود پڑھے، درود یا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اشارتاً لکھنا مکروہ ہے، بلکہ پورا لکھنا چاہئے۔ تاتارخانیہ میں بعض مقامات پر ہے: جس نے علیہ السلام ہمزہ (ء) اور میم (عم) سے لکھا، کافر ہو گیا، کیونکہ یہ تخفیف ہے اور انبیاء علیہم السلام کی تخفیف بغیر کسی شک کے کفر ہے، اور یہ نقل اگر صحیح ہے تو شاید اس میں قصد کی قید ضرور ہوگی ورنہ بظاہر یہ کفر نہیں ہے، ہاں احتیاط ایہام اور شبہ سے بچنے میں ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 30، ص:664،663، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

مزید لکھتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کے نامِ پاک کے ساتھ صلعم یا ص یا، ہمزہ (ء) میم (م) یا

صللم وغیرہ رموز لکھنا ممنوع اور سخت بے دولتی ہے۔ امام جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں: پہلا شخص جس نے ایسا اختصار کیا اس کا ہاتھ کاٹا گیا، درود پورا لکھنا لازم ہے، صلی اللہ علیہ وسلم۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 22، ص:692، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

جس طرح عربی یا اردو میں اختصار کی نیت سے "ص" یا "صلعم" لکھنا حرام ہے، اِسی طرح انگلش میں اختصار کے ساتھ صرف SAW لکھنا بھی حرام ہے، بلکہ "صلی اللہ علیہ وسلم" پورا لکھا جائے۔

"صلوٰۃ" عربی زبان کا کلمہ ہے اور قرآن وحدیث کی اصطلاح ہے، کسی دوسری زبان میں ایسا متبادل کلمہ (Word) ملنا مشکل ہے جو اس کے مکمل معنی کا احاطہ کرسکے۔ تاہم رسول اللہ ﷺ کے اسم مبارک کے ساتھ درود شریف کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے انگریزی میں Peace Be Upon Him لکھنے اور پڑھنے کا عرف رائج ہے اور اس پر کسی اہل علم نے تحفظ کا اظہار نہیں کیا، لہٰذا یہ جائز ہے۔ افضل تو یہی ہے کہ انگریزی گفتگو اور تحریر کے درمیان رسول اکرم ﷺ کا اسمِ گرامی آنے پر ﷺ ہی پڑھا اور لکھا جائے، لیکن انگریزی میں ہی لکھنا ہو تو چونکہ یہ عرف میں درود پاک کے متبادل یا ہم معنی ہی سمجھا جاتا ہے تو پورے کلمات ہی لکھے جائیں، PBUH مُخفّف کرکے نہ لکھا جائے۔ آپ نے لکھا ہے کہ SAW کے معنی "آرا" کے ہیں، لیکن ﷺ کی جگہ جو S.A.W لکھا جاتا ہے، یہ ایک لفظ نہیں ہے بلکہ ان میں سے ہر حرف تہجی (Alphabetic) الگ الگ لفظ کا مُخَفّف (Abroviation) ہے، لہٰذا آپ کا قیاس درست نہیں ہے۔

انبیاءِ کرام وعبادِ صالحین کے وسیلے سے دعا

سوال:5

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس بارے میں کہ انبیاءِ کرام اور اولیاء کے وسیلے سے دعا کرنے، مدد طلب کرنے کا شرعی حکم کیا ہے، فرض، واجب، سنت مؤکدہ، سنت مستحبہ یا فقط

جائز ہے؟۔ اگر کوئی اللہ کی عطا سے، انبیاء کرام اور اولیاء کرام سے مدد طلب کرنے کو جائز سمجھتا ہے، مگر مدد اللہ تعالیٰ کی ذات ہی سے طلب کرتا ہے، تو کیا ایسے شخص کو لعن طعن کرنا جائز ہے اور لعن طعن والوں کے لئے کیا حکم ہے؟۔

(سید سلیم شاہ عطاری، نارتھ ناظم آباد، بلاک B، کراچی)

استمدادِ غیر اللہ کی تکرار کرنا جائز ہے، جیسے ''یا غوث المدد''100 بار، ''یا عطار المدد'' روزانہ 10 بار نیز قصیدۂ غوثیہ ثواب کی نیت کے ساتھ پڑھنا جائز ہے؟۔ کیا سنتِ نبوی ﷺ کے بیان کردہ طریقے (صلوٰۃ الحاجت وغیرہ) سے ہٹ کر محض رات دن ''یا غوث المدد'' یا ''قصیدۂ غوثیہ'' کی تکرار درست ہے؟، (محمد اسلم موتن، کراچی)۔

جواب:

علامہ علی قاری علیہ رحمۃ الباری نے بحوالہ محمد بن جزری انبیاء و اولیاء سے استعانت اور وسیلے کو امورِ مستحبہ میں شمار کیا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور بزرگانِ دین کے وسیلہ سے دعا کرنے کی اصل ابنِ ماجہ کی یہ حدیث ہے:

عَنْ عُثْمَانَ بْنِ حُنَيْفٍ اَنَّ رَجُلاً ضَرِيْرَ الْبَصَرِ اَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ اُدْعُ اللّٰهَ لِيْ اَنْ يُعَافِيَنِيْ، فَقَالَ: اِنْ شِئْتَ اَخَّرْتُ لَكَ وَهُوَ خَيْرٌ، وَاِنْ شِئْتَ دَعَوْتُ، فَقَالَ: اُدْعُهُ، فَاَمَرَهُ اَنْ يَّتَوَضَّاَ فَيُحْسِنَ وُضُوْءَهُ وَيُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ وَيَدْعُوْ بِهٰذَا الدُّعَاءِ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَيْكَ بِمُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ يَا مُحَمَّدُ اِنِّيْ قَدْ تَوَجَّهْتُ بِكَ اِلٰى رَبِّيْ فِيْ حَاجَتِيْ هٰذِهٖ لِتُقْضٰى، اَللّٰهُمَّ فَشَفِّعْهُ فِيَّ۔

ترجمہ: ''حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک نابینا شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے عرض کیا: آپ اللہ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ میری آنکھیں ٹھیک کردے، آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو میں اس کام کو مؤخر کردوں اور یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا اور اگر تم چاہو تو (ابھی) دعا کردوں، اُس نے کہا: آپ دعا کردیجئے،

آپ ﷺ نے فرمایا: تم اچھی طرح وضو کرو، دو رکعت نماز پڑھو، اس کے بعد یہ دعا کرو:
''اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور محمد نبیِ رحمت ﷺ کے وسیلہ سے تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں، اے محمد ﷺ! میں آپ ﷺ کے وسیلہ سے اس حاجت میں اپنے رب کی طرف متوجہ ہوا ہوں تاکہ میری یہ حاجت پوری ہو، اے اللہ! نبی ﷺ کو میرے لئے شفاعت کرنے والا بنادے''۔

(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 1385، سنن ترمذی، رقم الحدیث: 3578)

امام بیہقی نے اس روایت میں یہ اضافہ کیا ہے: قَالَ عُثْمَانُ فَوَاللّٰهِ مَاتَفَرَّقْنَا وَلَا طَالَ الْحَدِيْثُ حَتّٰى دَخَلَ الرَّجُلُ وَكَاَنَّهٗ لَمْ يَكُنْ بِهٖ ضُرٌّ قَطُّ،

ترجمہ: ''حضرت عثمان بن حنیف نے کہا: بخدا ابھی ہم اس مجلس سے اٹھے بھی نہیں تھے اور نہ ابھی سلسلۂ گفتگو دراز ہوا تھا کہ وہ (نابینا) شخص اس حال میں داخل ہوا کہ اس کی آنکھ میں کوئی تکلیف نہیں تھی''۔ (دلائل النبوۃ، جلد 6، ص: 167، مطبوعہ: دار الکتب العلمیہ، بیروت)

انبیاء علیہم السلام واولیاءِ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ سے استمداد کے متعلق بے شمار احادیث اور کتب میں آئمۂ کرام کے دلائل کثرت سے موجود ہیں، جنہیں علامہ غلام رسول سعیدی مُدَّظِلُّہم نے اپنی تصانیف (تبیان القرآن، شرح صحیح مسلم، توضیح البیان) میں انتہائی تفصیل سے لکھا ہے، علامہ صاحب شرح صحیح مسلم میں اس بحث کو سمیٹتے ہوئے اپنا موقف لکھتے ہیں:
''انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام سے استمداد کے متعلق جو ہم نے احادیث اور فقہاء اسلام کی عبارات نقل کی ہیں، اس سے ہمارا صرف منشاء یہ ہے کہ عام مسلمان جو شدائد اور ابتلاء میں ''یارسول اللہ'' اور ''یاغوث'' کہہ کر پکارتے ہیں، ان کا یہ پکارنا شرک نہیں ہے۔ اس ندا کو شرک کہنا شدید ظلم اور زیادتی ہے، کیونکہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ اور حضرت غوث اعظم قدس سرہ کو بہرحال اللہ کی مخلوق اور اس کا مقرب بندہ گردانتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حقیقی کارساز صرف اللہ تعالیٰ ہے اور انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کا ہر فعل اور ہر تصرُّف اللہ تعالیٰ کے اذن، اُس کی مشیت اور اس کی دی ہوئی قدرت کے تابع ہے۔ انبیاء علیہم السلام

اور اولیاء کرام ہوں یا عام انسان، اس کائنات میں جس سے جو بھی فعل صادر ہوتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت سے صادر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی انسان کو کسی شے پر ذرہ برابر قدرت نہیں ہے۔ اس اعتقاد کے ساتھ انبیاء علیہم السلام اور اولیاءِ کرام سے استمداد اور استغاثہ کرنا ہر چند کہ جائز ہے، لیکن افضل، احسن اور اولیٰ یہی ہے کہ ہر حال میں اور ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جائے اور اسی سے استمداد اور استعانت کی جائے۔

امام ترمذی اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كُنْتُ خَلْفَ النَّبِيِّ ﷺ يَوْمًا فَقَالَ يَا غُلَامُ اِنِّي اُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ اِحْفَظِ اللهَ يَحْفَظْكَ اِحْفَظِ اللهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ اِذَا سَأَلْتَ فَاسْئَلِ اللهَ اِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللهِ وَاعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰى اَنْ يَّنْفَعُوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللهُ لَكَ وَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰى اَنْ يَّضُرُّوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللهُ عَلَيْكَ، رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دن ایک سواری پر نبی ﷺ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: اے بیٹے! میں تم کو چند باتوں کی تعلیم دیتا ہوں، تم اللہ کو یاد رکھو اللہ تمہاری حفاظت کرے گا، تم اللہ کو یاد رکھو، تم اُسے (مصیبت کے وقت اپنی مدد کے لئے) موجود پاؤ گے، جب تم سوال کرو تو اللہ تعالیٰ سے سوال کرو اور جب تم مدد طلب کرو تو اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرو اور جان لو کہ اگر تمام امت تم کو نفع پہنچانے کے لئے جمع ہو جائے تو وہ تم کو صرف اسی چیز کا نفع پہنچا سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلے تمہارے لئے لکھ دی ہے۔ اور اگر تمام لوگ تم کو نقصان پہنچانے کے لئے جمع ہو جائیں، تو تمہیں صرف وہی نقصان پہنچا سکتے ہیں، جسے اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے، قلم اٹھا لئے گئے ہیں اور صحیفے (یعنی وہ غیبی دستاویز جن میں بندے کی تقدیر کے معاملات لکھتے ہوتے ہیں) خشک ہو چکے ہیں، (جامع الترمذی، رقم الحدیث: 2516)''۔ یہ حدیث متعدد کتب حدیث میں موجود ہے، جن میں سے چند کے حوالہ جات درج ذیل ہیں:

☆ امام ابویعلیٰ، ''مسند ابویعلیٰ'' (جلد 3، ص: 85,84، مطبوعہ بیروت)۔
☆ امام ابن سنی، ''عمل الیوم واللیلۃ'' (ص: 136، مجلس الدائرۃ المعارف دکن، بھارت)
☆ امام ابن عبدالبر ''تمہید'' (جلد 4، ص: 111، مکتبۂ قدوسیہ، لاہور)۔

رسول اللہ ﷺ کی اس تعلیم اور تلقین کے پیشِ نظر مسلمانوں کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے سوال کریں اور اسی سے مدد چاہیں اور دعا میں مستحسن طریقہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے وسیلہ سے دعا مانگیں۔ زیادہ محفوظ اور زیادہ سلامتی اس میں ہے کہ وہ دعائیں مانگی جائیں جو قرآن اور احادیث میں مذکور ہیں تاکہ اِن دعاؤں میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سایہ فگن رہے، اگر کسی خاص حاجت میں دعا مانگنی ہو تو رسول اللہ ﷺ کے وسیلہ سے مانگنی چاہئے۔

ہمارے فاضل معاصر علامہ محمد عبدالحکیم شرف رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''البتہ یہ ظاہر ہے کہ جب حقیقی حاجت روا، مشکل کشا اور کارساز اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو احسن اور اولیٰ یہی ہے کہ اسی سے مانگا جائے اور اسی سے درخواست کی جائے اور انبیاء واولیاء کا وسیلہ اس کی بارگاہ میں پیش کیا جائے، کیونکہ حقیقت، حقیقت ہے اور مجاز، مجاز ہے یا بارگاہِ انبیاء واولیاء سے درخواست کی جائے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کریں وہ ہماری مشکل آسان فرمادے اور حاجتیں بَرلائے، اس طرح کسی کو غلط فہمی بھی پیدا نہیں ہوگی اور اختلافات کی خلیج بھی زیادہ وسیع نہیں ہوگی، (ندائے یارسول اللہ، ص: 12، مطبوعہ: مرکزی مجلس رضا، لاہور)''۔

خلاصہ یہ ہے کہ نداء غیر اللہ اعتقاد مذکور کے ساتھ ہر چند کہ جائز ہے، لیکن افضل، اولیٰ اور احسن یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جائے اور اسی سے استمداد اور استعانت کی جائے، جیسا کہ حدیثِ مذکور کا تقاضا ہے''۔ (شرح صحیح مسلم، جلد 7، ص: 90,89، مطبوعہ: فرید بک اسٹال، لاہور)

الغرض ہمارے بعض دینی معمولات ومعاملات ایسے ہیں جو مستحب یا مباح کے درجے میں ہیں، مخالفین کے ساتھ ان کے جواز یا عدمِ جواز پر بحث ہوتی ہے، لیکن اپنے دائرے میں ہم اعتقاداً تو نہیں کم از کم عملاً واجب کا درجہ دے دیتے ہیں، اگر کوئی اَحیاناً (یعنی کبھی

کبھی) چھوڑ بھی دے تو اسے ہدفِ طعن بناتے ہیں یا اس کے مسلک پر شبہ کرنے لگتے ہیں ، یہ طرزِ عمل ہمارے نزدیک درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے براہِ راست استمداد کرنے پر طعن کرنا، جبکہ خود رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جب تم نے مدد مانگنی ہو تو اللہ سے مانگو ''، ایک شرعی طور پر جائز امر کو ''مکروہ تحریمی'' قرار دینا ہے، کیونکہ کم از کم مکروہ تحریمی یا ترکِ واجب پر ہی ملامت کیا جاسکتا ہے یا طعن و تشنیع کا ہدف بنایا جاسکتا ہے۔ اور کسی چیز کو واجب یا مکروہ تحریمی قرار دینا شارع علیہ السلام کا منصب ہے نہ کہ کسی اور کا۔ لہٰذا ایسے لوگوں کو اپنے رویے پر نادم اور تائب ہونا چاہیے اور اپنے آپ کو ملامت کرنا چاہیے۔ پھر جاہل عوام تو ظاہری معمولات پر تعامل کو دیکھ کر انہیں واجب سمجھنے لگتے ہیں، کیونکہ ہمارے ہاں صحیح دینی و تعلیمی تربیت کا انتظام نہیں ہے۔ اب بات ''یا رسول اللہ ﷺ''، ''یا علی'' اور ''یا غوث'' سے آگے بڑھ کر ''یا عطار المدد'' تک جا پہنچی ہے، اگر یہ تسلسل جاری رہا تو علم اور تقوے کے تمام معیارات سے قطع نظر کرکے ہر ایک اپنے پیر کو روزانہ المدد پکارنے کا عمل بطور وظیفہ شروع کردے گا، جو امور (جیسے صلوٰۃ الحاجت) رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں، دوسرے وظائف جائز ہونے کے باوجود افضلیت میں، اُن کے برابر نہیں ہوسکتے۔ ہماری رائے میں دینی حکمت، شرعی احتیاط اور مسلک کا مفاد اِس میں ہے کہ یہ سلسلہ موقوف کردینا چاہیے۔ اگر کسی کے نزدیک جائز بھی ہو تو ہر جائز کام کا کرنا ضروری نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے بنائے ابراہیم علیہ السلام پر تعمیرِ کعبہ کی خواہش کو اس کے مستحسن ہونے کے باوجود دینی حکمت کے تحت ترک فرما دیا تھا۔

موئے مبارک کے آداب

سوال:6

رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک کو ایسے گھر میں رکھنا جہاں علانیہ طور پر غیر شرعی کام کیے جاتے ہوں، مثلاً کیبل پر فلمیں، موسیقی بلند آواز سے چلتی ہوں نیز موئے مبارک کے آداب کیا ہیں؟ ایک شخص لوگوں میں بکثرت موئے مبارک تقسیم کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ

موئے مبارک کو جن خوشبویات میں بساتے ہیں وہ آپ نہیں لگا سکتے میں خود ہی لگاؤں گا۔ اور خوشبو لگانے کے عوض وہ تین یا چار ہزار روپے طلب کرتا ہے، اِس سے دل میں شک پیدا ہوتا ہے کہ کہیں اُس نے یہ کاروبار تو نہیں بنایا ہوا، اُس کا یہ عمل کیسا ہے؟ کیا موئے مبارک کی رسول اللہ ﷺ کی طرف محض نسبت کے دعوے کو قبول کرلیا جائے یا حضور اکرم ﷺ کے موئے مبارک کی کوئی پہچان ہے؟، اگر کوئی مالی منفعت یا شہرت کے لئے غلط بیانی کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟، (محمد تاشفین خان، گلشنِ معمار، کراچی)۔

جواب:

احکامِ شرع کی پابندی و پاسداری ہر مسلمان پر فرض ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں عموماً غفلت وکوتاہی برتتے ہوئے احکامِ شرع کو نظر انداز کردیا جاتا ہے، جن لوگوں کے گھروں کے سامنے مسجد ہوتی ہے، وہ مسجد کا تقدس جانتے ہیں لیکن اکثر اوقات اپنی خواہشات کی تسکین کی خاطر نظر انداز کردیتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نیکی کی کوشش کرنا ہی چھوڑ دی جائے۔ ہر مسلمان کے گھر میں مصحفِ مُقدّس یعنی قرآن مجید کے نسخے موجود ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی وہاں بہت سے خلافِ شرع کام ہورہے ہوتے ہیں، تو اسے وجہ بنا کر ایسا تو نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن مجید کے نسخے ہی گھروں میں رکھنا چھوڑ دیئے جائیں۔ ہاں! ممکنہ حد تک تعظیم وتوقیر کا اہتمام لازم ہے اور ایسے لوگوں کے لئے ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ کے تبرُّکات سے سچی عقیدت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ لوگ احکام شرع اور سنّتِ مصطفیٰ ﷺ کی زیادہ پاس داری کریں۔

موئے مبارک کی تعظیم لازم ہے اور بے ادبی حرام، لہٰذا اگر گھر میں موئے مبارک موجود ہے تو اس کی تعظیم کا خاطر خواہ اہتمام کیا جائے۔ درحقیقت عشقِ مصطفیٰ ﷺ کا تقاضا یہی ہے کہ تمام کائنات کی دولت بھی جمع ہوجائے تو رسول اکرم ﷺ کے موئے مبارک کا بدل قطعاً نہیں ہوسکتی۔

عَنِ ابْنِ سِيْرِيْنَ قَالَ: قُلْتُ لِعَبِيْدَةَ عِنْدَنَا مِنْ شَعَرِ النَّبِيِّ ﷺ أَصَبْنَاهُ مِنْ قِبَلِ أَنَسٍ أَوْ مِنْ قِبَلِ أَهْلِ أَنَسٍ۔ فَقَالَ لِأَنْ تَكُوْنَ عِنْدِي شَعْرَةٌ مِنْهُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا۔

ترجمہ: ''حضرت ابن سیرین (تابعی) نے حضرت عبیدہ سے کہا: ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کے کچھ موئے مبارک ہیں، جو ہمیں حضرت انس یا حضرت انس رضی اللہ عنہ کے خاندان سے ملے ہیں، یہ سن کر عبیدہ نے کہا کہ میرے پاس ان بالوں میں سے ایک بال کا ہونا میرے نزدیک دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب تر ہے'' (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 170)

اگر مذکورہ شخص غلط بیانی سے کام لیتا ہے تو یہ جھوٹ اُس کی اُخروی بربادی کا سبب بنے گا کہ حدیث مبارک میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ

ترجمہ: ''جس شخص نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم کو بنا لے''۔
(صحیح بخاری، کتاب العلم، رقم الحدیث: 110، 6197)

کتبِ احادیث و سیرت میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے جسمِ مبارک کا سایہ نہیں تھا، ابن مبارک اور ابنِ جوزی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا سایہ نہیں تھا۔ اس نشانی کو اہل عشق و محبت بیان کرتے ہیں کہ موئے مبارک کی شناخت بھی یہی ہے کہ اس کا بھی سایہ نہیں ہوتا۔ آج کل دنیا میں متعدد مقامات پر اس دعوے کے ساتھ کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا موئے مبارک ہے، زیارات کا سلسلہ جاری ہے۔
شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے والد شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ تعالیٰ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک رات نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شاہ عبدالرحیم صاحب کو ملاقات سے مشرف فرمایا اور ازراہِ عنایت انہیں اپنے دو موئے مبارک بھی عنایت فرمائے، ایک مرتبہ شاہ صاحب نے وہ بال دکھائے، تین شخصوں نے اس بات کا انکار کیا کہ وہ حضور کے موئے

مبارک ہیں اور بحث چل پڑی، جب مناظرہ طوالت کو پہنچا تو وہ لوگ ہر دو موئے مبارک کو دھوپ میں لے گئے، اسی وقت ابر کا ایک ٹکڑا ظاہر ہوا، حالانکہ اس وقت سورج خوب گرم تھا اور موسم ابر کا نہ تھا، تین میں سے ایک نے توبہ کرلی اور باقی دو کہنے لگے کہ اتفاقاً بادل آ گیا تھا، دوسری مرتبہ لے گئے اور دوسری بار بادل آ گیا دوسرا بھی تائب ہو گیا لیکن تیسرے نے کہا ممکن ہے یہ بھی اتفاق ہو، تیسری بار لے گئے تیسری بار ابر پھر ظاہر ہوا اور تیسرا منکر بھی تائب ہوا'' (انفاس العارفین، ص:40)

شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی فرماتے ہیں:

''وا ہمیشہ ابر در وقت تمازت گرما برایشاں سایہ مے داشت۔ ترجمہ: ''اور ابر ہمیشہ گرمی کے وقت آپ کے اوپر سایہ کرتا تھا'' (تفسیر عزیزی، پارہ:30، ص:219)

تعظیم وتکریم موئے مبارک وتبرکات رسول اللہ ﷺ پر ہمارا ایمان ہے، جو لوگ نسبتِ ذاتِ رسالت کی تقدیس پر ایمان رکھتے ہوئے عقیدت ومحبت سے زیارت کرتے ہیں، وہ یقیناً ماجور ہوں گے۔ کوئی فریب دیتا ہے تو وہ اپنے عمل کا انجام دیکھ لے گا۔ خوشبو لگانے کے حوالے سے جو آپ نے لکھا ہے، لگتا یہی ہے کہ یہ ایک مُقدّس نسبت کو مالی منفعت کا ذریعہ بنانے کا حربہ ہے، ورنہ باوضو ہو کر کوئی مومن بھی خوشبو لگا سکتا ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرّہ العزیز نے تبرکات کی زیارت اور اس کی اسناد سے متعلق ایک استفتاء کا طویل جواب تحریر فرمایا، جس کا خلاصہ یہ ہے:

''نبی ﷺ کے آثار وتبرکاتِ شریفہ کی تعظیم مسلمانوں کا فرضِ عظیم ہے، تابوتِ سکینہ جس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے، جس کی برکت سے بنی اسرائیل کافروں پر فتح پاتے تو اس تابوت میں انبیاء کے تبرکات موجود تھے، جس کی تصدیق قرآن مجید نے فرمائی۔ صحابۂ کرام وتابعین کرام اور آئمہ دین رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہمیشہ تبرکاتِ شریفہ کی تعظیم اور ان سے برکت طلب کرتے آئے ہیں اور اس کے لئے کسی سند کی حاجت نہیں۔ شفاء شریف، مواہب لدنیہ اور مدارج شریف میں ہے:

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ کی تعظیم میں اُن تمام اشیاء کی تعظیم شامل ہے، جن کو نبی ﷺ سے کچھ تعلق ہے یا جسے نبی ﷺ نے چھوا ہو یا جو حضور ﷺ کے نامِ پاک سے مشہور ہو''۔

تعظیم کے لئے نہ یقین درکار ہے اور نہ کوئی خاص سند بلکہ صرف نام پاک سے اس شے کا مشہور ہونا کافی ہے اور اگر کوئی کذب بیانی سے کام لیتا ہے تو اللہ عزوجل کا فرمان:

وَ اِنْ یَّكُ كَاذِبًا فَعَلَیْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَ اِنْ یَّكُ صَادِقًا یُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُكُمْ (المومن:28)

ترجمہ: ''اور اگر بالفرض وہ غلط کہتے ہیں تو اُن کی غلط گوئی کا وبال اُن پر (ہی ہے) اور اگر وہ سچے ہیں تو تمہیں پہنچ جائے گا کچھ وہ جس کا تمہیں وعدہ دیتے ہیں''۔ (کنزالایمان)

یہ کہنا کہ اکثر لوگ مصنوعی تبرکات لئے پھرتے ہیں، اگر یہ بلاتعیین شخصی ہو اور کسی پر الزام یا بدگمانی مقصود نہ ہو تو اس میں کوئی گناہ نہیں، لیکن اگر بلاثبوتِ شرعی کسی خاص کی طرف منسوب کرتے ہوئے یہ حکم لگائے کہ یہ مصنوعی تبرُّکات لئے پھرتا ہے، ناجائز، گناہ اور حرام ہے۔

تبرُّکاتِ شریفہ جس شخص کے پاس ہوں، اس شخص کا ان تبرُّکات کی زیارت کے عوض لوگوں سے کچھ طلب کرنا سخت معیوب ہے، جس کی احادیث مبارکہ میں وعید آئی ہے۔

دوسرا اس طرح رقوم بٹورنے سے دنیا کمانا ظاہر ہے اور وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (میری آیات (میں لفظی ومعنوی تحریف کرکے اِن) کے بدلے میں کم قیمت نہ لو) کی قبیل میں داخل ہے۔ بغیر اس کے مانگے، زائرین کچھ دے دیں تو شریعتِ مطہرہ میں قاعدہ کلیہ یہ ہے: اَلْمَعْهُوْدُ عُرْفًا كَالْمَشْرُوْطِ لَفْظًا (عرفاً مقررہ چیز لفظاً مشروط کی طرح ہے)۔ اس کی صورت یہ بیان کی کہ اگر لوگ کچھ نہ دیں تب بھی، کم دیں یا زیادہ دیں ہر صورت میں زیارت کرانے والا خوشی وشادمانی کے ساتھ مسلمانوں کو زیارت کرائے، تنگ دلی اور تنگ نظری کا اظہار نہ کرے، کسی معاوضے اور نذرانے کی تمنا دل میں نہ رکھے، تو ایسی صورت میں زائرین ومُزَوِّر (یعنی زیارت کرنے والے اور زیارت کرانے والا) دونوں ثواب پائیں گے''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد:21، ص:414 تا 419، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

کپڑے کے ڈیزائن میں اسمِ ''محمد'' ظاہر ہوتو اُس کا شرعی حکم

سوال:8

کمال سپننگ ملز میں کپڑا پرنٹ ہوا، جس پر اسمِ ''محمد'' ظاہر ہے، پرنٹ کا یہ ڈیزائن غیر ملکی کلائنٹ نے ہمیں فراہم کیا تھا، ہمارا تیار کردہ نہیں ہے، ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہم سے کوتاہی ہوئی، ہم عہد کرتے ہیں کہ آئندہ کوئی بھی ملکی یا غیر ملکی ڈیزائن ہو، ہم اس کا عمیق اور جامع جائزہ لئے بغیر پرنٹ نہیں کریں گے اور اگر کہیں کوئی اشتباہ ہوا تو کسی مستند مفتی و عالم سے مشاورت کریں گے اور ان کی ہدایت پر بلاچوں وچرا عمل کریں گے۔ ہم سے یہ کام نادانی اور تساہل وتغافل سے سرزد ہوگیا، جس کی یقین دہانی کے لئے ہم حلف نامہ اور کپڑا بھی ساتھ بھیج رہے ہیں، برائے کرم یہ تحریر فرمائیں کہ شرعاً اس کا کیا حل ہے؟

(احمد کمال، چیف ایگزیکٹو کمال سپننگ ملز، فیصل آباد)

حلف نامہ

ہم اللہ وحدہٗ لاشریک اور اس کی ذات وصفات کی قسم کھا کر اقرار کرتے ہیں کہ اس کپڑے میں جو لفظ ''محمد'' پرنٹ ہوا ہے، اس کا پہلے سے ہمیں کوئی علم نہیں تھا، اگر اس معاملے میں ہم نے کذب بیانی سے کام لیا ہو تو بروزِ قیامت اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہوں گے۔ ہم اعتراف کرتے ہیں کہ یہ کام ہمارے ارادے سے تو نہیں، لیکن ہماری بشری کمزوری سے وقوع پذیر ہوا۔ ہم اس پر اللہ تعالیٰ کے حضور نادم ہیں اور صدقِ دل سے توبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے طفیل ہمیں معاف فرمائے اور اللہ جلّ شانہٗ کے رسول مکرم ﷺ سے بھی معافی کے خواستگار ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ آئندہ کوئی بھی ملکی یا غیر ملکی آرڈر ہو، ہم تینوں پر مشتمل کمیٹی اسے پاس کرے گی اور اگر ڈیزائن میں ہمیں اشتباہ ہوا تو ہم کسی مستند مفتیٔ اہلسنت سے مشورہ لیں گے اور ان کے مشورے اور ہدایت پر عمل کریں گے۔

مُقِرِّین وحالفین

احمد کمال　　بلال رمضان　　رفاقت علی

چیف ایگزیکٹو　　جنرل منیجر ملز　　جنرل منیجر مارکیٹنگ

مورخہ:20 اگست 2008ء　　کمال سپننگ ملز فیصل آباد

جواب:

کمال سپننگ ملز، کھڑیاں والا، فیصل آباد کے پرنٹڈ کپڑے کا ایک نمونہ ہمیں دکھایا گیا، یہ کپڑا برآمد (Export) کے لئے آرڈر پر تیار کیا گیا ہے اور اس کا پرنٹ ڈیزائن ایکسپورٹ آرڈر کے لئے انہیں بیرونِ ملک کے کلائنٹ نے مہیا کیا تھا۔ اس ڈیزائن پر ختم المرسلین رحمۃ للعالمین سیدنا ومولانا محمد رسول اللہ ﷺ کا اسمِ مبارک واضح طور پر پڑھا جاسکتا ہے۔ یہ اس ادارے کے مالکان اور متعلقہ شعبہ جات کے ذمہ داران کی انتہائی غیر ذمہ داری اور نااہلی کا ثبوت ہے۔ تاہم ادارے کے چیف ایگزیکٹو احمد کمال صاحب، جنرل منیجر ملز بلال رمضان صاحب اور جنرل منیجر مارکیٹنگ رفاقت علی صاحب نے ایک مشترکہ تحریری حلف نامہ ہمارے پاس جمع کرایا ہے کہ ان سے یہ کوتاہی نادانستہ طور پر ہوئی ہے اور وہ اسے بروقت سمجھ نہیں پائے، وہ اس پر اللہ تعالیٰ سے صدقِ دل سے توبہ کرتے ہیں، اس کے رسول مکرم ﷺ سے معافی کی التجا کرتے ہیں اور ان کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے توبہ کی قبولیت کی التجا کرتے ہیں اور عامۃ المسلمین سے بھی معافی کے خواستگار ہیں، کیونکہ یہ حساس دینی مسئلہ ہے اور کوئی بھی مسلمان عمداً، اشارۃً اور کنایۃً ایسی کسی بھی حرکت یا فعل کا تصور بھی نہیں کرسکتا کہ جس سے اشارۃً، کنایۃً یا تعریض، توریہ اور ایہام کے طور پر رسول اللہ ﷺ کی اہانت کا کوئی امکانِ بعید ہو۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ ایسا کرنے والے کا ایمان سلامت نہیں رہتا۔ ہم انہیں ہدایت کرتے ہیں کہ جتنا کپڑا اس ڈیزائن پر پرنٹ ہوچکا ہے، اس سے کیمیکل کے ذریعے یہ سارا ڈیزائن زائل (Wash out) کردیں اور اس کیمیائی محلول (Liquid) کو کسی پاک جگہ پر زمین میں گڑھا بنا کر دفن کردیں۔ اس کے

بعد یہ لوگ اس کپڑے کو کسی بھی مقصد کے لئے استعمال کر سکتے ہیں، خواہ یہ تمام پرنٹ کیمیکل کے ذریعے مٹا کر بالکل سفید کر دیا جائے یا کوئی اور کلر کر دیا جائے، اس کے بعد وہ اِس پر کوئی اور ڈیزائن بھی پرنٹ کر سکتے ہیں، اسے اپنے ذاتی استعمال میں بھی لا سکتے ہیں اور برآمد بھی کر سکتے ہیں۔ علامہ علاؤالدین حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:

اَلْکُتُبُ الَّتِیْ لَایُنْتَفَعُ بِھَا یُمْحٰی عَنْھَا اِسْمُ اللهِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَرُسُلُہٗ وَیُحْرَقُ الْبَاقِیْ

ترجمہ: ''ایسی (دینی) کتابیں جو قابلِ انتفاع نہ رہی ہوں، ان سے اسماءِ الٰہیہ، اسماءِ ملائکہ اور اسماءِ رُسُل علیہم السلام مٹا دیئے جائیں اور بقیہ اوراق جلا دیئے جائیں، (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 9، ص: 518)''۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاِنْ شَآءَ غَسَلَہٗ بِالْمَآءِ، ترجمہ: ''اور اگر چاہے تو اوراقِ مصحف کو پانی سے دھوڈالے (تاکہ تحریر مٹ جائے)، (ردالمحتار، جلد 9، ص: 519، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں: ''حاصل البتہ قواعد بغدادی وابجد اور سب کتب غیر منتفع بہا (یعنی جو نفع اُٹھانے کے قابل نہ رہیں) ماورائے مصحف کریم کو جلا دینا بعد اسماءِ باری تعالیٰ اور اسمائے رُسُل وملائکہ علیہم السلام اجمعین کے جائز ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 23، ص: 339 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

ہمارے نزدیک قرآن مجید کی طرح صاحبِ قرآن سید المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ اقدس بھی مقدس ہے، مُعظّم ہے، مُکرّم اور محترم ہے، تو جس طرح بوسیدہ اوراق پر قرآن مجید کی تحریر کسی بھی کیمیائی عمل سے مٹا کر بچے ہوئے گودے (Pulp) کو کاغذ کی صورت میں ڈھال کر دوبارہ طباعت کے مقصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے، اسی طرح اس کپڑے کے مذکورہ بالا پرنٹ کو کیمیائی طریقے سے مٹانے کے بعد اس کا استعمال جائز ہے۔ شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ اور علامہ مفتی محمد رفیق حسنی صاحب نے بھی اس فتویٰ پر اپنے تائیدی وتوثیقی دستخط ثبت فرمائے۔

طہارت کے مسائل

کنویں میں جانور کا گرنا

سوال: 9

اگر کنویں میں مرغی یا کبوتر یا چھپکلی گر جائے تو اس کے زندہ یا مردہ نکلنے یا پھول کر پھٹ جانے کی صورت میں کنویں کے پانی کے لیے کیا حکم ہوگا؟ نیز اگر وہ نجاست سے آلودہ ہے، تب کیا حکم ہے اور نہیں تو اس صورت میں کیا حکم ہے؟

(مولانا زاہد اللہ عادل، اوگی، بلند کوٹ، مانسہرہ)

جواب:

مرغ، مرغی، بلی، چوہا، چھپکلی یا اور کوئی دَمَوی (بہتے ہوئے خون والا) جانور کنویں میں گر جائے، مر کر پھول یا پھٹ جائے تو کنویں سے تمام پانی نکالا جائے گا اور اگر یہ جانور مرنے کے بعد کنویں میں گرا، تب بھی یہی حکم ہے۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

حَیَوَانٌ دَمَوِیٌّ وَانْتَفَخَ أَوْ تَمَعَّطَ أَوْ تَفَسَّخَ وَلَوْ تَفَسُّخُهُ خَارِجَهَا ثُمَّ وَقَعَ فِیهَا یُنْزَحُ کُلُّ مَائِهَا الَّذِی کَانَ فِیهَا وَقْتَ الْوُقُوعِ،

ترجمہ: "ایسا جانور (کنویں میں گرا) جس میں بہتا ہوا خون ہو، پھول گیا یا اس کے بال جدا ہو گئے یا پھٹ گیا، خواہ کنویں سے باہر پھٹا اور پھر کنویں میں گرا ہو، (ان تمام صورتوں میں) کنویں کا وہ سارا پانی نکالا جائے گا، جتنا پانی اس میں (جانور کے) گرنے کے وقت موجود تھا، (ردالمختار علی الدرالمختار، جلد 1، ص: 327، داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

کبوتر، مرغی، بلی کو کنویں میں گر کر مرنے اور پھولنے پھٹنے سے پہلے نکال لیا تو چالیس سے ساٹھ ڈول پانی نکالا جائے گا۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

إِنْ مَاتَ فِیهَا الدَّجَاجَةُ وَالسِّنَّوْرُ وَالْحَمَامَةُ وَنَحْوُهَا وَلَمْ یَکُنْ مُنْتَفِخًا وَلَا مُتَفَسِّخًا یُنْزَحُ أَرْبَعُونَ أَوْ خَمْسُونَ دَلْوًا هٰکَذَا فِی مُحِیطِ السَّرَخْسِیِّ وَهُوَ الْأَظْهَرُ کَذَا فِی الْهِدَایَةِ،

ترجمہ: "اگر مرغی، بلی اور کبوتر یا اس کے مثل کوئی جانور کنویں میں گر کر مر جائے اور پھولا

یا پھٹا نہ ہو تو چالیس سے پچاس ڈول پانی نکالا جائے گا۔ محیط السرخسی میں بھی اسی طرح ہے اور یہی زیادہ واضح ہے، ہدایہ میں بھی اسی طرح ہے"۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص 19، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: "اگر چھپکلی کنویں میں گر کر مر جائے اور پھول جائے یا پھٹ جائے تو کس قدر پانی کنویں سے نکالا جائے گا"؟

آپ نے جواب میں لکھا:

"سب (یعنی تمام پانی نکالا جائے گا)، کہ اس میں دَمِ سائل (بہنے والا خون) ہوتا ہے۔

فتاویٰ امام اجل قاضی خان "فَصْلُ النَّجَاسَةِ الَّتِیْ تُصِیْبُ الثَّوْبَ" (کپڑے کو لگنے والی نجاست کی فصل) میں ہے: دَمُ الْحَلَمَةِ وَالْوَزَغَةِ یُفْسِدُ الثَّوْبَ وَالْمَاءَ،

ترجمہ: "حلمہ (ایک قسم کا کیڑا جو چمڑے کو لگ جاتا ہے اور اسے خراب کر دیتا ہے) کا خون اور چھپکلی کا خون کپڑے اور پانی کو فاسد کر دیتا ہے"۔

فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:

دَمُ الْحَلَمَةِ وَالْوَزَغَةِ اِذَا کَانَ سَائِلًا کَذَا فِی الظَّهِیْرِیَّةِ فَاِذَا اَصَابَ الثَّوْبَ اَکْثَرَ مِنْ قَدَرِ الدِّرْهَمِ یَمْنَعُ جَوَازَ الصَّلَاةِ کَذَا فِی الْمُحِیْطِ،

ترجمہ: "حلمہ کا خون اور چھپکلی کا خون نجس ہے، جب کہ وہ بہنے والا ہو، "ظہیریہ" میں اسی طرح ہے، پس جب (اس کا خون) کپڑے کو ایک درہم کی مقدار سے زیادہ لگ جائے تو نماز کے جواز سے مانع ہوگا، "محیط" میں بھی اسی طرح ہے"۔

اَقُوْلُ وَالتَّقْیِیْدُ بِالسَّیَلَانِ عَلَی الْمَعْهُوْدِ مِنْ اَصْلِنَا اِنَّ دَمَ کُلِّ دَمَوِیٍّ لَا یَنْجُسُ مِنْهُ اِلَّا سَائِلُهٗ وَلِذَا لَا یَنْقُضُ دَمُ الْاِنْسَانِ وُضُوْءَهٗ اِلَّا اِذَا کَانَ سَائِلًا۔

ترجمہ: "میں کہتا ہوں کہ خون کے ساتھ بہنے کی قید ہمارے مقررہ قاعدہ پر مبنی ہے کہ ہر خون والے (جانور) کا صرف بہنے والا خون نجس ہوتا ہے،، اسی لیے انسان کا خون (جب تک وہ اپنی جگہ پر ہے) وضو نہیں توڑتا مگر اس وقت (توڑتا ہے) جب اپنی جگہ سے بہہ کر تجاوز کر

جائے۔ فتح القدیر میں ہے:

دَمُ الْحَلَمَةِ وَالْاَوْزَاغِ نَجِسٌ۔

ترجمہ: "حلمہ (ایک قسم کا کیڑا) اور چھپکلی کا خون ناپاک ہے"۔

اَقُوْلُ فَقَدْ اَطْلَقُوْا، وَالْمُرَادُ دَمَوِیٌّ وَلَوْشَكٌّ فِیْ دَمَوِیَّتِهَا لَمَا سَاغَ لَهُمُ الْاِطْلَاقُ كَالْاِمَامِ فَقِیْهِ النَّفْسِ۔

ترجمہ: "میں کہتا ہوں: ان فقہاء نے مطلق چھپکلی کا ذکر کیا ہے، حالانکہ مراد خاص خون والی ہے۔ اگر اس کے خون والی ہونے کے بارے میں شک ہوتا تو پھر ان کے لیے مطلق ذکر کرنے کی گنجائش نہ ہوتی، جیسا کہ امام فقیہ النفس نے فرمایا"۔ فتاویٰ صاحب البحر الرائق میں ہے: سُئِلَ عَنْ دَمِ الْوَزْغِ هَلْ هُوَ طَاهِرٌ اَمْ نَجِسٌ اَجَابَ هُوَ نَجِسٌ

ترجمہ: "ان سے چھپکلی کے خون کے بارے میں پوچھا گیا کہ آیا وہ پاک ہے یا نجس؟ تو انہوں نے جواب دیا: وہ نجس ہے"۔

مراقی الفلاح میں ہے: سُؤْرُ سَوَاكِنِ الْبُیُوْتِ مِمَّا لَهٗ دَمٌ سَائِلٌ كَالْحَیَّةِ وَالْوَزَغَةِ مَكْرُوْهٌ لِلُزُوْمِ طَوَافِهَا وَحرمة لحمها النجس۔

ترجمہ: "بہنے والے خون کے حامل، گھروں میں رہنے والے جانور، جیسے سانپ اور چھپکلی کا جوٹھا مکروہ ہے، اُن کے لازمی طور پر گھروں میں چلنے پھرنے اور ان کے ناپاک گوشت کی حرمت کی وجہ سے اِن کے جوٹھے کا یہ حکم ہے" (یعنی اگر چہ اِن کا گوشت ناپاک ہونے کی بناء پر حرام ہے، مگر چونکہ ان کے بکثرت گھروں میں چلنے پھرنے کی وجہ سے ان سے بچنا دشوار ہے اس لئے یُسر کی خاطر کراہت کا حکم لگایا گیا ہے)۔

درمختار میں ہے: سُؤْرُ الْوَزَغَةِ مَكْرُوْهٌ لِاَنَّ حُرْمَةَ لَحْمِهَا اَوْجَبَتْ نَجَاسَةَ سُؤْرِهَا لٰكِنَّهَا سَقَطَتْ لِعِلَّةِ الطَّوَافِ فَبَقِیَتِ الْكَرَاهَةُ

ترجمہ: "چھپکلی کا جوٹھا مکروہ ہے، کیونکہ اس کے گوشت کی حرمت کا تقاضا یہ تھا کہ اس کا جوٹھا نجس قرار دیا جائے، لیکن نجاست کے حکم کو طواف کی علت کے سبب ساقط کر دیا گیا، پس

کراہت کا حکم باقی ہے"۔

غنیۃ ذوی الاحکام میں ہے: وَلِھٰذَا اِذَا مَاتَتْ فِی الْمَاءِ نَجَسَتْهُ

ترجمہ: "اس لیے جب وہ پانی میں مرجائے تو پانی کو ناپاک کردے گی"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 3 ص:277,276,275، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

آج کل کنوؤں سے پانی مشین کے ذریعے نکالا جاتا ہے، لہٰذا اگر تمام پانی نکالنا ہو تو کسی رسی یا بانس کے ذریعے پانی کی گہرائی ناپ لی جائے اور پھر نجاست نکالنے کے بعد اتنا ہی پانی نکال لیا جائے۔ ایسے کنویں جن کا پانی ٹوٹتا نہیں، تو نجاست گرنے کے وقت جتنا پانی تھا اتنا نکال دینے سے کنواں پاک ہو جائے گا۔ اگر پانی کی ایک مقررہ مقدار مثلاً بیس یا چالیس ڈول نکالنا ہو تو بذریعہ مشین ہی مطلوبہ مقدار میں ڈول بھر کر نکالے جائیں۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: "کنویں میں جب کوئی چیز گر جائے اور شرعِ مُطَہَّر کچھ ڈول نکالنے کا حکم دے جہاں متون متاخرین میں لفظ "دلوِ وسط" (درمیانہ ڈول) واقع ہوا، یعنی مثلاً چوہا گر کر مر جائے تو بیس ڈول متوسط نکالے جائیں، اس ڈول کے تعین میں بھی اقوال مختلف ہیں کہ سات تک پہنچے ہیں، مگر ظاہر الروایۃ، امام قاضی خان و صاحب محیط و مصنف اختیار و مؤلِّفِ ہدایہ وغیرہم اکابر علماء کا مختار یہی ہے کہ ہر کنویں کے لیے اسی کا ڈول معتبر ہوگا، جس سے اس کا پانی بھرا جاتا ہے۔ ہاں، اگر اس کنویں کا کوئی ڈول معین نہ ہو تو اس ڈول کا اعتبار کریں گے جس میں ایک صاع عدس یا ماش آجائیں۔ غنیۃ میں ہے: اَلدَّلْوُ الْوَسَطُ مَا یَسَعُ صَاعًا مِنَ الْحَبِّ المعتدل

ترجمہ: "درمیانہ ڈول وہ ہے جس میں صاع برابر (دال وغیرہ کے) دانے آجائیں"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 3 ص:261,262، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

پانی کے کنویں میں گٹر کا پانی رِس کر آنا اور اس سے پیدا شدہ مسائل

سوال:10

مسئلہ کراچی کے عوام کا ہے کہ کراچی میں کنوؤں کے پانی (Well Water)

استعمال عام ہے، اور اسی کراچی میں جگہ جگہ گٹر اُبل رہے ہیں یا ان کا پانی رس رہا ہے جو بالآخر کنوؤں تک پہنچ رہا ہے، اور کنوؤں کے پانی کو ناپاک کررہا ہے۔ میں بذاتِ خود ایک مقامی لیبارٹری میں کام کرتا ہوں جس کی رپورٹ اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ پانی میں گندہ پانی شامل ہوگیا ہے۔ انہی معلومات کو سامنے رکھتے ہوئے آپ سے سوال عرض کرتا ہوں کہ کراچی کے کنوؤں کا پانی شرعی اعتبار سے پینے، غسل اور وضو کے قابل ہے یا نہیں؟

(زاہد شاہ تیموری، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب:

پانی کا رنگ، ذائقہ اور بُو نجاست گرنے کی وجہ سے تبدیل ہوجائے یا وہ ماءِ مستعمل (یعنی ایسا پانی جسے طہارت کے لئے استعمال کیا گیا ہے) ہو تو قابلِ استعمال (یعنی وضو اور غسل کے قابل) نہیں رہتا، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

بِئْرُ الْمَاءِ اِذَا كَانَتْ بِقُرْبِ الْبِئْرِ النَّجِسَةِ فَهِيَ طَاهِرَةٌ مَالَمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ أَوْ لَوْنُهُ أَوْ رِيْحُهُ كَذَا فِي الظَّهِيْرِيَّةِ۔ وَلَا يُقَدَّرُ هٰذَا بِالذُّرْعَانِ حَتّٰى اِذَا كَانَ بَيْنَهُمَا عَشَرَةُ أَذْرُعٍ وَكَانَ يُوْجَدُ فِي الْبِئْرِ أَثَرُ الْبَالُوْعَةِ فَمَاءُ الْبِئْرِ نَجِسٌ وَاِنْ كَانَ بَيْنَهُمَا ذِرَاعٌ وَلَا يُوْجَدُ أَثَرُ الْبَالُوْعَةِ فَمَاءُ الْبِئْرِ طَاهِرٌ كَذَا فِي الْمحيط وهو الصحيح هكذا في محيط السرخسي۔

ترجمہ: ''(پینے کے) پانی کا کنواں اگر نجاست کے گڑھے کے قریب ہے تو جب تک اس کے ذائقے، رنگ اور بُو میں تغیر نہ آجائے، وہ پاک ہے، ''ظہیریہ'' میں اسی طرح ہے، اور ان دونوں کے درمیان فاصلے کی حد دو ہاتھ سے مقرر نہیں کی جائے گی یہاں تک کہ یہ حد دس ہاتھ تک ہو اور اگر کنویں میں (اتنے فاصلے کے باوجود) نجاست کا اثر پایا جاتا ہے تو اس کنویں کا پانی نجس ہے اور اگر ایک ہاتھ کے فاصلے پر بھی اس کنویں میں نجاست کا اثر نہیں پایا جاتا تو وہ پانی پاک ہے، ''محیط'' میں اسی طرح ہے اور یہی صحیح ہے، ''محیط السرخسی'' میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:20، مطبوعہ: مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

کسی پاک چیز کے گرنے یا کافی عرصے تک محض پانی کے ٹھہرے رہنے کی وجہ سے اس کے

اَوصاف تبدیل ہو جائیں تو وہ پانی ناپاک یا ناقابلِ استعمال نہیں ہوتا، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

''رنگ یا بُو یا مزہ اگر کسی پاک چیز کے گرنے یا زیادہ دیر ٹھہرنے سے بدلے تو پانی خراب نہیں ہوتا ہاں نجاست کی وجہ سے تغیر آجائے تو نجس ہوگا اگرچہ کتنا ہی کثیر کیوں نہ ہو''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 3 ص:250، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''کنویں کے قریب نجس چہ بچہ (گندی نالی یا گٹر) کا ہونا اُسے نجس کر دیتا ہے بعض نے کہا پانچ ہاتھ سے کم تک بعض نے سات ہاتھ سے کم تک، اور صحیح یہ ہے کہ جتنی دور سے نجاست کا اثر ظاہر ہو، نجس کر دے گا، اگرچہ تیس ہاتھ کے فاصلے سے، درمختار میں ہے:

اَلْبُعْدُ بَیْنَ الْبِئْرِ وَالْبَالُوْعَةِ بِقَدْرِ مَالَا یَظْهَر للنجس اَثَرٌ

ترجمہ: ''کنویں اور نجس چہ بچہ کے درمیان اتنا فاصلہ ہو کہ نجاست کا اثر کنویں میں ظاہر نہ ہو''۔ ردالمحتار میں ہے: فی الخلاصة والخانیة: والتعویل علیه وصححه فی المحیط

ترجمہ: ''خلاصہ اور خانیہ کے حوالے سے ہے: اسی پر اعتماد ہے اور محیط میں اسی کو صحیح قرار دیا گیا ہے''۔ (بحر الرائق)

اُسی میں ہے: روایة خمسة اذرع وفی روایة سبعة والحاصل انه یختلف برخاوة الارض وصلابتها ومن قدرہ اعتبر حال ارضه۔

ترجمہ: ''اس میں پانچ ہاتھ اور سات ہاتھ کی روایتیں بھی ہیں، الحاصل یہ فاصلہ زمین کی نرمی اور سختی کے اعتبار سے مختلف ہوگا اور جس نے اس کی مقدار (ہاتھ کے ساتھ) بیان کی تو اس نے اپنی زمین کے حال کا اعتبار کیا ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 3، ص:287، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اگر گٹر یا سیوریج لائن درست حالت میں ہے اور اس سے پانی رس (Leak) نہیں رہا، یا وہ اُبل (Over Flow) نہیں رہا تو کنویں کے اس کے قریب واقع ہونے میں

کوئی حرج نہیں ہے۔لیکن اگر گٹر لائن لیک ہے اور رِس رہی ہے یا گٹر بند (Choke) ہونے کی وجہ سے اُبل رہا ہے اور زمین کچی ہے اور کنواں اتنے فاصلے پر ہے کہ سیوریج لائن یا گٹر کا پانی رِس کر اس تک پہنچ جاتا ہے تو وہ ناپاک ہوجائے گا اور پھر وضو اور غسل کے قابل نہیں رہے گا۔امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کے فتوے کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کے لئے کنویں اور گٹر لائن کے درمیان مستقل طور پر کسی فاصلے کا تعین نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ یہ ہر جگہ کی مٹی اور زمین کی ساخت پر منحصر ہے۔اور اگر لیبارٹری ٹیسٹ اور کیمیائی تجزیئے سے معلوم ہوجائے کہ گٹر کا ناپاک پانی کنویں میں آرہا ہے تو شرعاً اس کا اعتبار بھی کیا جاسکتا ہے۔لیکن اس بات کا بھی خیال رہے کہ بسا اوقات کنویں میں پانی کم ہونے کی وجہ سے بھی اس میں گادیا بُو آجاتی ہے، لہٰذا جب تک اس بات کا یقین یا ظن غالب نہ ہو کہ اس میں نجاست ملی ہے، اس کنویں کو پاک مانا جائے گا۔ویسے یہ سٹی گورنمنٹ یا واٹر اینڈ سیوریج بورڈ یعنی مقامی حکومت (Local Govt) کی ذمہ داری ہے کہ سیوریج لائن سے پانی کے رساؤ (Leakage) کی مرمت کرے اور جہاں جہاں سیوریج لائن کے مین ہول (Main hole) اُبل رہے ہیں، ان کی بہاؤ کی درستگی کا فوری انتظام کرے۔اور اس مقصد کے لئے اس محکمے کے پاس تعمیر و مرمت (Repair and maintenance) کا خصوصی بجٹ ہونا چاہئے، کیونکہ اس سے امراض پھیلتے ہیں اور ان کے علاج کے مقابلے میں یہ احتیاطی اقدامات بہت سستے ہیں۔آئے دن ہم دیکھتے ہیں کہ لاکھوں کروڑوں کے بجٹ سے سڑکیں بنتی ہیں اور وہ واٹر لائن یا سیوریج لائن کے اُبل جانے سے تباہ و برباد ہوجاتی ہیں، اور پھر ان پر پہلے سے زیادہ رقم قومی خزانے سے خرچ ہوتی ہے۔شریعت کے مقاصد میں ایک ''سدِّ ذرائع'' بھی ہے، یعنی مَفاسِد اور خرابیوں کا راستہ روکنا۔موجودہ سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ نے یہ بہتر اقدام کیا ہے کہ بعض اہم سڑکوں کی ازسرِ نو تعمیر سے پہلے واٹر لائن اور سیوریج لائن اور ٹیلیفون لائن ازسرِ نو ڈالی جارہی ہیں، اس سلسلے کو شہر کی تمام سڑکوں اور گلی کوچوں تک پھیلانے کی ضرورت ہے۔بعض مقامات پر دیکھنے میں آتا ہے کہ جھگیوں یا کچی

آبادیوں والے پانی کی لائن کو دانستہ لیک کر دیتے ہیں، اس مقام سے پانی لائن سے نکلتا رہتا ہے اور ایک گڑھے میں جمع ہوتا رہتا ہے، اس سے وہ لوگ پانی بھرتے بھی ہیں، ناپاک کپڑے بھی وہیں دھوتے ہیں اور غسلِ طہارت یا غسلِ جنابت بھی وہیں کرتے ہیں اور پانی کا یہ ضیاع 24 گھنٹے جاری رہتا ہے اور جب لائن میں پانی نہیں ہوتا تو یہ ناپاک پانی واپس لائن میں جاتا ہے۔ اگرچہ شرعاً بہنے والا پانی پاک ہے، لیکن جو لوگ اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے ہوتے ہیں، ان کی طبیعت میں حکمِ رو انقباض اور کراہت و ناگواری پیدا ہوتی ہے اور امراض بھی پھیلتے ہیں۔ لہٰذا سٹی گورنمنٹ اور واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کے ذمہ داران کو چاہئے کہ اس سلسلے کو روکنے کے لئے مستقل نگرانی کا انتظام کریں اور اسے تعزیری جرم قرار دیں، لیکن اس سے پہلے ان مقامات پر ایسے لوگوں کے لئے پانی کی ایک ٹونٹی کا انتظام کریں اور اس بات کا بھی انتظام ہو کہ استعمال شدہ پانی سیوریج لائن میں جائے، نگرانی اور مرمت کے لئے سریع الحرکت فوج (Rapid Deployment Force) کے طرز پر ہمہ وقت متحرک عملہ ہو جس کے پاس فوری مرمت کے بھی وسائل وآلات ہوں تاکہ معلوم ہو کہ عوام کی بنیادی ضروریات کی فراہمی اور صحت کا تحفظ حکومت کی ترجیح اول ہے۔

فٹ پاتھ پر وضو خانہ

سوال: 11

مسجدِ غوثیہ لیاقت آباد کراچی کے بالکل سامنے ہسپتال کی عقبی دیوار سے ملحق تقریباً چار فٹ جگہ خالی پڑی ہے۔ یہ جگہ سرکاری ملکیت ہے۔ ہسپتال کے علاوہ اسی قطار کے دیگر مکانات کے مکینوں نے اپنے اپنے گھر کے سامنے کی جگہ کو گیلری بنا کر اپنے مصرف میں لے لیا ہے۔ لوگ اس خالی قطعہ اراضی کو فالتو اور بے کار جان کر کوڑا کرکٹ ڈال دیتے ہیں، کچھ مویشی بھی باندھے جانے لگے ہیں، جس کی وجہ سے مسجد کے سامنے گندگی اور غلاظت جمع ہو جاتی ہے۔ خدشہ ہے کہ اس طرح یہ جگہ مستقل کوڑا گھر بن جائے گی اور مستقل طور پر مسجد کے سامنے گندگی و غلاظت کا ڈھیر لگا رہے گا۔ اس مسئلے پر ہم نے اہلِ محلہ اور یو۔سی ناظم

وغیرہ سے بھی بات کی ہے اور سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کے ذمہ داران کا کہنا ہے کہ ہمیں اس جگہ پر مسجد کے لئے وضو خانہ بنانے میں کوئی اعتراض نہیں، اب ہم معلوم یہ کرنا چاہتے ہیں کہ کیا اِس جگہ پر مسجد کے لئے اضافی وضو خانہ بنایا جا سکتا ہے؟

مکانات	مکانات	مکانات	مسجد

سڑک سڑک

سڑک

گیلری	گیلری	گیلری	خالی جگہ
مکانات	مکانات	مکانات	ہسپتال

(سعید احمد قادری، مینجنگ ٹرسٹی غوثیہ مسجد، لیاقت آباد، کراچی)

جواب:

اگر آپ کا بیان درست ہے اور سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کے ذمہ داران آپ کو اجازت دے رہے ہیں تو آپ اس جگہ پر وضو خانہ بنا سکتے ہیں یا کسی اور مصرف میں بھی لا سکتے ہیں۔ لیکن بظاہر قانونی پوزیشن یہ معلوم ہوتی ہے کہ فٹ پاتھ کی جگہ وہ کسی کو قانونی طور پر الاٹ نہیں کر سکتے، لوگوں نے بھی گیلریاں بنا کر غیر قانونی تجاوز (Enchroachment) کیا ہے اور یہ بھی ایسا ہی تجاوز ہوگا، جس سے متعلقہ محکمے کے ذمہ دار لوگ صرفِ نظر کر لیتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر وضو خانہ بنانے سے بھی بظاہر آلودگی بڑھے گی، اس کے بجائے اگر ممکن ہو تو دارالمطالعہ بنا لیا جائے یا کسی اور بہتر مصرف میں لایا جائے۔

عذر کے سبب وضو قائم نہ رہنے کی صورت میں عبادات کی ادائیگی کا حکم

سوال:12

ایسا شخص جس کا وضو کسی سبب قائم نہیں رہتا، طواف کرتے ہوئے اگر اُس کا وضو ٹوٹ جائے تو کیا وہ طواف اور سعی مکمل کر سکتا ہے؟۔ اسی طرح حرم شریف میں نمازِ جمعہ میں کافی دیر بیٹھنا پڑتا ہے، اس قدر ہجوم میں وہاں سے اٹھ کر وضو خانہ تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا، اگر نماز

شروع ہونے سے پہلے وضوٹوٹ جائے تو کیا اسی طرح نماز ادا کرلی جائے؟ دوبارہ وضو کرنے کی صورت میں بھی بیت اللہ یا مقامِ سعی تک پہنچنے کے دوران پھر وضوٹوٹنے کا امکان ہے۔
(محمد عبدالسمیع، گلشن اقبال، کراچی)

جواب:

ایسا شخص جس کو کوئی ایسی بیماری ہے جس سے وضو قائم نہ رہ سکے، مثلاً پیشاب کے قطرے آنے کا مرض، ریح (ہوا) خارج ہونا، دکھتی آنکھ سے پانی بہنا، پھوڑے یا ناسور سے رطوبت یا پیپ بہنا، کان، ناف، پستان سے بیماری کی وجہ سے پانی بہنا وغیرہ۔ فقہی اصطلاح میں ایسے شخص کو "شرعی معذور" کہا جاتا ہے، بشرطیکہ اس کا یہ عذر نماز کے پورے وقت کو اس طرح گھیر لے کہ اس عذر کے بغیر وہ فرض نماز بھی ادا نہ کرسکے۔ اتنی دیر تک اپنا وضو قائم رکھنے پر قادر نہ ہو کہ ایک وقت کی پوری نماز پڑھ لے، تو بار بار عذر لاحق ہونے کی وجہ سے اُسے شرعاً یہ رخصت دی گئی ہے کہ وہ ایک وقت کی نماز کے لئے تازہ وضو کرے اور اس میں اس عذر کی وجہ سے وضوٹوٹنے کے باوجود اُس وقت کے فرض، واجب، سنّت کے علاوہ قضا نماز، نوافل اور تلاوت، الغرض جو عبادات ادا کرنا چاہے، کرلے اور جب دوسری نماز کا وقت آئے تو پھر تازہ وضو کر کے اسی طرح پڑھے، البتہ ایسا شخص امامت نہیں کرسکتا۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

اَلْمُسْتَحَاضَةُ وَمَنْ بِهٖ سَلَسُ الْبَوْلِ اَوْ اِسْتِطْلَاقُ الْبَطْنِ اَوْ اِنْفِلَاتُ الرِّيْحِ اَوْ رُعَافٌ دائِمٌ أَوْ جُرْحٌ لَايَرْقَأُ يَتَوَضَّؤُنَ لِوَقْتِ كُلِّ صَلَاةٍ وَيُصَلُّوْنَ بِذٰلِكَ الْوُضُوْءِ فِي الْوَقْتِ مَاشَاۗءُوْا مِنَ الْفَرَائِضِ وَالنَّوَافِلِ هٰكَذَا فِي الْبَحْرِ الرَّائِقِ۔

ترجمہ: "مستحاضہ (یعنی وہ خاتون جسے سیلان الرحم کی بیماری لاحق ہے) اور جسے پیشاب کے قطرے آتے ہوں یا مسلسل دست کی بیماری (DIARRHOEA) ہو یا ریح (یعنی ہوا) خارج ہوتی ہو یا دائمی نکسیر جاری ہو یا زخم جو مسلسل رستا رہتا ہو، تو ایسے معذور ہر نماز کے وقت کے لئے تازہ وضو کریں اور اُس وقت کے اندر فرائض و نوافل جس قدر چاہیں اُسی

وضو سے ادا کریں، جیسا کہ "البحر الرائق" میں ہے۔۔۔۔۔مزید لکھتے ہیں:

وَيَبْطُلُ الْوُضُوْءُ عِنْدَ خُرُوْجِ وَقْتِ الْمَفْرُوْضَةِ بِالْحَدَثِ السَّابِقِ هٰكَذَا فِي الْهِدَايَةِ۔

ترجمہ: "دائمی معذور کا وضو سابقہ حدث کی وجہ سے فرض نماز کا وقت نکل جانے سے ٹوٹ جاتا ہے، جیسا کہ "ھدایہ" میں ہے"۔ یعنی اگلے وقت کی نماز کے لئے تازہ وضو کرنا ہوگا۔

لہٰذا اگر آپ معذورِ شرعی ہیں تو نماز کے وقت کے اندر اندر طواف وسعی مکمل کر سکتے ہیں اگرچہ دورانِ طواف وسعی وہ عذر پایا جائے۔ اگر دورانِ طواف ایک نماز کا وقت ختم ہوکر دوسری نماز کا وقت شروع ہوجائے تو اس کے بارے میں علامہ امجد علی اعظمی "منسک" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"معذور طواف کر رہا ہے، چار پھیروں کے بعد وقتِ نماز جاتا رہا تو اب اسے حکم ہے کہ وضو کر کے طواف کرے کیونکہ وقت نماز خارج ہونے سے معذور کا وضو جاتا رہتا ہے اور بغیر وضو طواف حرام، اب وضو کرنے کے بعد جو باقی ہے، پورا کرے اور چار پھیروں سے پہلے وقت ختم ہوگیا، تب بھی وضو کر کے باقی کو پورا کرے اور افضل یہ ہے کہ نئے سرے سے کرے"۔ (بہارِ شریعت، جلد اول، ص:469، مکتبہ رضویہ، کراچی)

مندرجہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ معذور شخص کے طواف کے دوران اُس نماز کا وقت نکل گیا تو وہ دوبارہ وضو کر کے طواف کے بقیہ پھیرے مکمل کرے گا، علامہ شیخ احمد طحطاوی متوفی 1231ھ معذور کے شرعی احکام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(وَمَنْ بِهٖ عُذْرٌ كَسَلَسِ بَوْلٍ أَوِ اسْتِطْلَاقِ بطنٍ) وانفلاتِ ريح و رُعَافٍ دَائِمٍ وَجُرْحٍ لايرقأ ولا يمكن حبسه بحشو من غير مشقة ولا بجلوس فبهذا يتوضؤون (لوقت كل فرض) لا لكل فرض ولا نفل، لقوله ﷺ المستحاضة تتوضأ لوقت صلاة رواه سبط ابن الجوزي عن ابي حنيفة رحمه الله تعالى، فسائر ذوي الاعذار في حكم المستحاضة، فالدليل يشملهم (ويصلون به) أي بوضوئهم في الوقت، (ماشاؤوا من الفرائض) أداء للوقتية وقضاء لغيرها ولو لزم الذمة زمان الصحة (و) ماشاؤوا

من (النوافل) والواجبات کالوتر والعید وصلاۃ جنازۃ وطواف ومس مصحف۔
ترجمہ: ”جسے پیشاب کے قطرے آتے ہوں یا دست کی بیماری ہو یا ریح خارج ہوتی ہو یا نکسیر جاری ہو یا زخم مسلسل رِستا رہتا ہو اور بغیر مشقت اسے روکنا ممکن نہ ہو اور نہ بیٹھ کر روک سکتا ہو تو ایسے عذر والے ہر نماز کے وقت میں ایک بار تازہ وضو کریں اور جب تک اس نماز کا وقت باقی ہے، فرائض ونوافل جس قدر چاہیں اُسی وضو سے ادا کریں۔
رسول اللہ ﷺ کا فرمان مبارک ہے: ”مستحاضہ ہر نماز کے وقت میں تازہ وضو کرے“۔ اس حدیث کو سبط ابن جوزی نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے روایت کیا، پس تمام عذر والے مستحاضہ کے حکم میں ہیں، اور یہ دلیل سب کو شامل ہے اور وہ اُس وضو سے جس قدر چاہیں (فرض) نماز پڑھیں، وقت کی ادا یا قضا نماز اور اگر زمانۂ صحت کی کوئی نماز اُس کی قضا ہوگئی تھی تو وہ بھی ادا کر سکتا ہے، اس کے علاوہ جس قدر چاہے نوافل اور واجبات اسی وضو سے ادا کر سکتے ہیں، مثلاً وتر، عید کی نماز، نمازِ جنازہ اور طواف اور مُصحف (قرآن مجید) کو چھونا۔ (حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح، جلد اوّل، ص: 212، 213)
سعی کیلئے طہارت لازمی نہیں بلکہ مستحب ہے، علامہ مفتی امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ تحریر فرماتے ہیں: ”مستحب یہ ہے کہ باوضو سعی کرے“۔ (بہارِ شریعت، حصہ ششم، جلد 1، ص: 435)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ معذور کے حج وعمرہ کی سعی کے بارے میں لکھتے ہیں:
وَاِنْ سَعٰی جُنُبًا اَوْ حائضًا اَوْ نَفَسًا فَسَعْیُہٗ صَحِیْحٌ، ترجمہ: ”اور اگر حیض ونفاس والی عورت اور جنبی شخص (یعنی جس پر غسل واجب ہو) سعی کریں تو (ان کا سعی کرنا) صحیح ہے (یعنی سعی کے لئے طہارت شرط نہیں)، (فتاویٰ عالمگیری، جلد اول، ص: 41، ص: 247)“۔
باقی رہا یہ سوال کہ جمعہ میں رَش کی وجہ سے وضو خانہ تک جانا ممکن نہیں اور اس دوران وضو ٹوٹ گیا تو کیا بغیر وضو نماز پڑھ سکتے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ: اگر یہ معذورِ شرعی نہیں ہے تو اس پر وضو کے لئے جانا لازم ہے اور پلٹ کر وہیں واپس آنا ضروری نہیں بلکہ

جہاں جگہ ملے، نماز پڑھ لے اور اگر وضو کے دوران نمازِ جمعہ ختم ہوگئی تو اگر قریب کوئی اور مسجد ہے تو وہاں چلا جائے ورنہ ظہر کی نماز ادا کرے، بے وضو نماز ادا کرنا سخت حرام ہے اور اگر نماز کو حقیر جان کر ایسا کرے تو کفر ہے۔

بالغ کے ختنہ اور فالج زدہ شخص کے زیرِ ناف بال زائل کرنے کا حکم

سوال:13

چند سوالات پیشِ خدمت ہیں:

(1) سترِ عورت (شرمگاہ) کیا کسی حدیث یا کسی اور حکم سے اس کی صفائی کی حد مقرر ہے اور کیا دنوں کا بھی تعین ہے کہ کتنے دن بعد کی جاسکتی ہے اور کس حد تک کی جاسکتی ہے؟

(2) عورتوں کے لئے کیا حکم ہے کہ وہ کس چیز کے ذریعے صفائی کرسکتی ہیں بعض عورتیں اپنے سارے جسم کو بلیڈ یا کسی اور کریم سے صاف کرتی ہیں کیا سارے جسم کو بلیڈ یا کریم سے صاف کرنا جائز ہے؟

(3) اگر کوئی شخص فالج زدہ ہوجائے اور اپنے زیرِ ناف بالوں کی صفائی نہ کرسکتا ہو تو اب ان بالوں کو اپنے حال پر رہنے دے یا دوسرے شخص سے صفائی کراسکتا ہے؟

(قاری مظہر محمود، ڈھوک فرمان، راولپنڈی)

جواب:

زیرِ ناف بالوں کو صاف کرنا سنت ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(۱) اَلْفِطْرَةُ خَمْسٌ اَلْخِتَانُ، وَالِاسْتِحْدَادُ، وَقَصُّ الشَّارِبِ، وَتَقْلِيمُ الْاَظْفَارِ، وَنَتْفُ الْآبَاطِ۔

ترجمہ: ''پانچ چیزیں فطرت سے ہیں (یعنی انبیائے سابقین علیہم السلام اور ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت ہیں): ختنہ کرنا، موئے زیرِ ناف مونڈنا، مونچھیں کم کرنا، ناخن ترشوانا اور بغل کے بال اکھیڑنا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:5889، 5891)''۔

(۲) عَن انسِ بنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ انسٌ وُقِتَ لَنَا فِي قَصِّ الشَّارِبِ وَتَقْلِيمِ الاَظْفَارِ وَنَتْفِ الاِبِطِ وَحَلْقِ الْعَانَةِ اَنْ لَّا نَتْرُكَ اَكْثَرَ مِن اَربَعِينَ لَيلَةً ۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مونچھیں اور بغل کے بال اکھاڑنے، ناخن کاٹنے اور موئے زیرِ ناف مونڈنے میں ہمارے لئے جو مدت مقرر کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ چالیس راتوں سے زیادہ نہ چھوڑیں یعنی چالیس دن کے اندر ان کاموں کو ضرور کر لیں''۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 598)

شاہ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں: ''باید از چہل روز نہ گزرد و اگر کمتر از اں کنند افضل ست، و گفتہ اند کہ آنحضرت قص شارب و تقلیم اظفار در جمعہ می کرد، حلق عانہ در بست روز و نتف الابط در چہل روز''۔

ترجمہ: ''(ان کاموں کے لئے) چالیس دن سے زیادہ نہیں گزرنا چاہئے اور اگر اس سے کم میں کرے تو افضل ہے اور کہا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ مونچھ اور ناخن ہر جمعہ کو کاٹتے تھے اور ہر بیس دن پر موئے زیرِ ناف مونڈتے تھے اور ہر چالیس روز پر بغل کے بال اکھیڑتے تھے''۔ (اَشِعَّۃُ اللّمعات، جلد 3، ص: 569)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

ویستحب حلق عانته وتنظيف بدنه بالاغتسال فی کل اُسبوع مرة والافضل يوم الجمعة، وجاز فی کل خمسة عشرة، وکره ترکه وراء الاربعين

ترجمہ: ''موئے زیرِ ناف دور کرنا، ہفتہ میں ایک مرتبہ غسل کر کے بدن کو صاف ستھرا رکھنا مستحب ہے اور افضل جمعہ کا دن ہے اور ہر پندرہ دن کے بعد کرنا بھی جائز ہے، چالیس دن سے زائد گزار دینا مکروہ ہے''۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

ویستحب حلق عانته قال فی الهندية ويبتدئ من تحت السرة، ولو عالج بالنورة يجوز ۔ کذا فی الغرائب ۔ وفی الاشباه والسنة فی عانة المرأة نتف ۔

ترجمہ: ''اور زیرِ ناف بالوں کا دور کرنا مستحب ہے، فتاویٰ ''ہندیہ'' میں کہا کہ ناف کے نیچے سے ابتدا کرے، اگرچہ نورہ (چونا یا بال دور کرنے کا پاؤڈر) استعمال کرے، جائز ہے۔ ''غرائب'' میں اسی طرح ہے، ''الاشباہ'' میں ہے: عورت کے لئے ان بالوں کو (مونڈنے کے بجائے) اکھیڑنا سنت ہے''۔۔۔آگے چل کے (وکرہ ترکہ) کی تشریح میں لکھتے ہیں:

أی تحریمًا لقول المجتبیٰ ولاعذر فیما وراء الاربعین ویستحق الوعید

ترجمہ: ''(چالیس دن سے زائد گزرنا مکروہ ہے) یعنی مکروہِ تحریمی ہے، ''المجتبیٰ'' کے قول کے مطابق چالیس دن سے زائد ان بالوں (کو چھوڑنے میں) کوئی عذر (مقبول) نہیں ہے (بلکہ اس پر وہ حدیث میں بیان کی گئی) وعید کا مستحق ہے''۔ (درمختار، جلد 9، ص: 497)

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ویحلق عانته وینظف بدنه بالاغتسال فی کل اسبوع مرة فان لم یفعل ففی کل خمسة عشر یوما ولا یعذر فی ترکه وراء الاربعین فالاسبوع هوالافضل والخمسة عشر الاوسط والاربعون الابعد ولاعذر فیما وراء الاربعین ویستحق الوعید کذا فی القنیة۔

ترجمہ: ''اور ہر ہفتے میں ایک بار اپنے زیرِ ناف بالوں کو مونڈے اور اپنے بدن کو غسل کر کے صاف کرے، اگر (ہفتے میں) ایسا نہ کر سکے تو ہر پندرہ دن میں (ضرور) کرے، اور چالیس دن سے زیادہ چھوڑنے پر کوئی عذر (مقبول) نہیں ہوگا، پس ایک ہفتے میں کرنا افضل ہے، پندرہ دن میں کرنا درمیانی مدت ہے اور چالیس دن زیادہ سے زیادہ مدت ہے، اور چالیس دن سے زیادہ ترک کرنے پر کوئی عذر مقبول نہیں ہوگا اور (اس پر) وہ وعید کا مستحق ہوگا، ''قنیہ'' میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص: 357، 358)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: حلق وقصر و نتف و تنور یعنی مونڈنا، کترنا، اکھیڑنا، نورہ لگانا سب صورتیں جائز ہیں کہ مقصود اس موضع کا پاک کرنا ہے اور وہ سب طریقوں میں حاصل ہے۔

فِیْ صَحِیْحِ مُسْلِمِ ابْنِ الْحَجَّاجِ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: قَالَ: اَلْفِطْرَۃُ خَمْسٌ اَوْخَمْسٌ مِنَ الْفِطْرَۃِ اَلْخِتَانُ وَالْاِسْتِحْدَادُ وَتَقْلِیْمُ الْاَظْفَارُ وَنَتْفُ الْاِبِطِ وَقَصُّ الشَّارِبِ، قَالَ الشارح النووی واما الاستحداد فھو حلق العانۃ وھو سنۃ والمراد بہ نظافۃ ذلك الموضع۔ وبمثلہ قال الغزالی فی احیائہ وغیرہ فی غیرہ۔

ترجمہ: ''صحیح مسلم ابن حجاج میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے حضور ﷺ سے روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا امورِ فطرت پانچ ہیں، یا یوں فرمایا: پانچ کام فطرت سے ہیں: (1) ختنہ کرنا، (2) زیرِ ناف بال مونڈنا، (3) ناخن کاٹنا، (4) بغلوں کے بال اکھیڑنا، (5) مونچھیں کترنا۔ شارح صحیح مسلم امام نووی نے فرمایا: رہا ''استحداد''، تو وہ مقامِ ستر کے بال مونڈنے ہیں اور یہ عمل سنّت ہے اور اس عمل سے اُس جگہ کی طہارت مقصود ہے، امام غزالی رحمہ اللہ نے ''اِحیاء علوم الدین'' میں اور دوسرے علماء نے دیگر کتابوں میں اس طرح صراحت فرمائی ہے''۔

مگر مرد کے لئے کاٹنے، اکھیڑنے اور پاوڈر لگانے کی بہ نسبت ان بالوں کا مونڈنا افضل ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ سے متعلق احادیث اور عام کتبِ فقہ میں اس خصلت کا ذکر بلفظ ''حلق'' و ''استحداد'' وغیرہ آیا ہے۔

قال النووی: والافضل فیہ الحلق ویجوز بالقص والنتف والنورۃ وفی الفتاویٰ الھندیۃ: الافضل ان یقلم اظفارہ ویحلق عانتہ

ترجمہ: ''امام نووی نے فرمایا کہ زیرِ ناف بالوں کو مونڈنا افضل ہے اور تراشنا، اکھیڑنا اور چونا وغیرہ لگانا بھی جائز ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ بہتر یہ ہے کہ ناخن کاٹے جائیں اور زیرِ ناف بال مونڈے جائیں۔

امام احمد رضا قادری قدس سرّہ العزیز نے اس کے بعد مختلف فقہی حوالوں سے عورت کے لئے مونڈنے کے بجائے دیگر طریقوں سے بال صاف کرنے کو افضل قرار دیا

ہے"۔(فتاویٰ رضویہ، جلد 22، ص:601،600، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ:

(1) غیر ضروری بالوں کے صاف کرنے کی افضل مدت ایک ہفتہ، اوسط پندرہ دن اور چالیس دن سے زائد گزر جائیں تو مکروہ (تحریمی) ہے۔

(2) عورتیں غیر ضروری بالوں کی صفائی نورہ (یعنی بال صاف کرنے کے پاؤڈر یا کریم) کے ساتھ کرسکتی ہیں، بلیڈ استعمال کرنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں، لیکن صنفِ نازک کے لئے ضرر کا اندیشہ ہے۔ آج کل خواتین کے لئے بالوں کو صاف کرنے کی جو مختلف کریمیں دستیاب ہیں، ان کا استعمال جائز ہے۔

(3) عورتوں کے لئے سر کے بالوں اور ابرو کے علاوہ بدن کے دیگر بالوں کو صاف کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، چہرے کے بال بھی صاف کرسکتی ہیں۔

(4) مرد بھی چاہیں تو بدن کے دیگر غیر ضروری بالوں کو صاف کرسکتے ہیں، اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے، بشرطیکہ طبی لحاظ سے ان کے لئے مضر نہ ہو۔ علامہ ابن عابدین شامی نے ابرو کے حدِ اعتدال سے زائد بال تراشنے کو مباح قرار دیا ہے، لمبی پلکوں کو بھی حسبِ خواہش تراشنے کی اجازت دی ہے، سینے اور پیٹھ کے بالوں کو بھی مونڈ سکتے ہیں، علامہ شامی نے اسے زیادہ سے زیادہ خلافِ ادب قرار دیا ہے، مرد کے لئے چہرے کے زائد بال صاف کرنا مباح ہے۔ اسی طرح مرد وعورت دونوں ہاتھ، پاؤں اور پیٹ وغیرہ کے معیوب نظر آنے والے بال دور کرسکتے ہیں۔

(5) مرد کے لئے افضل مونڈنا ہے، پاؤڈر یا کریم بھی استعمال کرسکتا ہے یہ صرف خلافِ اولیٰ ہوگا۔

(6) مرد یا عورت فالج زدہ ہوں تو اگر ان کا ہاتھ حرکت کرسکتا ہے تو پاؤڈر یا کریم استعمال کر کے خود اپنے زیرِ ناف بالوں کی صفائی کرسکتے ہیں اور اگر زوجین میں سے ایک (شوہر یا بیوی) بالکل معذور ہے تو جو صحت مند ہے وہ دوسرے کے زیرِ ناف بال صاف کرسکتا ہے۔

اور یہ عمل کرتے وقت شرمگاہ پر نظر ڈالنے سے بچا جاسکتا ہے اور ہاتھ پر پلاسٹک وغیرہ چڑھا کر براہِ راست بدن کو چھونے سے بھی اجتناب کیا جاسکتا ہے، کیونکہ شرمگاہ پر پردہ ڈال کر نظر ڈالے بغیر یہ کام کیا جاسکتا ہے۔ اگر فالج زدہ مرد یا عورت کے اپنے ہاتھ کو حرکت دی جاسکتی ہو تو اس مقصد کے لئے اُس کا اپنا ہاتھ استعمال کیا جائے۔ زوجین میں سے کوئی ایک دوسرے کی مدد کے لئے موجود نہ ہو، مثلاً عورت بیوہ ہوگئی ہو یا بیوی کا انتقال ہوگیا ہو یا کسی کی شادی ہی نہ ہوئی ہو اور فالج کا شکار ہوگیا ہو تو اجنبی شخص سے بھی یہ خدمت لی جاسکتی ہے، تاہم اگر بالغہ غیر شادی شدہ لڑکی فالج کا شکار ہوگئی ہو تو دوسری عورت سے یہ کام لیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح علاج کی غرض سے ڈاکٹر کے سامنے مجبوری کے تحت اپنی شرمگاہ سے بقدرِ ضرورت پردہ ہٹاسکتے ہیں۔

اسی اصول کے تحت اگر کوئی بالغ شخص اسلام قبول کرے اور خود اپنا ختنہ نہ کرسکتا ہو تو ڈاکٹر سے ختنہ کرانے کے لئے اپنی شرمگاہ سے پردہ ہٹاسکتا ہے۔ علاج کے لئے کشفِ عورت شرعی اور طبعی ضرورت ہے اور ختنہ کے لئے ایسا کرنا شرعی ضرورت ہے۔

امام فخر الدین حسن بن منصور اوزجندی فرغانی حنفی المعروف امام قاضی خان متوفی 295ھ لکھتے ہیں: امرأة اصابت قرحة فی موضع العورة لایحل للرجل أن ینظر الیها، ولکن یعلّم أمراة لتداویها، فان لم یجد أمرأةً تتعلّم ذلك اذا علمت اخیف علیها البلاء والوجع والهلاك فانه یستر منها کل شئی الّا موضع تلك القرحه ثم یداویها الرجل ویغض بصرہٗ الّا ان ذلك الموضع ☆ ولافرق فی هذا بین ذوات المحارم وغیرهنّ لان النظر الی العورة لایحل بسبب المحرمیة ☆ وللقابلة ان تنظر الی فرج المرأة عند اخذ الولد لمکان الضرورة ☆ وکذالحجام ان ینظر الی فرج البالغ عند الختان

ترجمہ: ''ایک عورت کی شرمگاہ پر زخم لگ گیا تو مرد کو اُس کی طرف دیکھنا جائز نہیں ہے، بلکہ وہ کسی عورت کو اس کا علاج کرنا سکھائے، پس اگر وہ علاج سیکھنے کے لئے کوئی عورت نہ

پائیں اور اُس زخمی عورت کے مصیبت میں مبتلا ہونے یا (شدید) درد یا ہلاک ہونے کا خدشہ ہو تو مرد معالج اس زخمی جگہ کے علاوہ عورت کے باقی بدن پر پردہ ڈال دے اور پھر اُس کا علاج کرے اور اِس خاص جگہ کے علاوہ باقی جگہوں پر نظر ڈالنے سے نگاہیں پست رکھے☆اور اس مسئلے میں مرد مُعالج کے محرم یا غیر محرم ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ شرمگاہ پر نظر ڈالنے کی رخصت علاج کی ضرورت کے تحت ہے نہ کہ محرم ہونے کی بنا پر☆ اور دائی (مڈوائف/گائنا کالوجسٹ) کو ضرورت کی بنا پر بچہ پکڑنے کے لئے زچہ (یعنی وہ عورت جس کا بچہ پیدا ہو رہا ہو) کی شرمگاہ کی طرف دیکھنے کی رخصت ہے☆اور اسی طرح ختنہ کرنے والے کے لئے ختنہ کرتے وقت بالغ کی شرمگاہ کی طرف دیکھنا جائز ہے"۔

(فتاویٰ قاضی خان علی ہامش الہندیہ، جلد 3 ص:409، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

نوٹ: اس سے پہلے اگر میں نے کہیں اس کے برعکس لکھا ہے تو اس تحریر کو اُس سے رجوع سمجھا جائے۔

نماز کے مسائل

اذان کے بعد ”تثویب“ (اعلانِ ثانی) کا جواز

سوال:14

بعض مساجد میں اذانِ فجر کے بعد اور نماز سے دس منٹ پہلے ”الصلوٰۃ، الصلوٰۃ“ کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ ایک عالم کا کہنا ہے کہ ایسا کرنا اذان کی توہین ہے، کیا اذان کافی نہیں ہے؟، ایسا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوا تو انہوں نے اس سے منع فرمایا۔ اس عمل کی شرعی حیثیت بیان فرمایئے۔ (محمد نثار اعوان عطاری، اسلام آباد)

جواب:

اذان کے بعد اور جماعت سے قبل وقفے وقفے سے جماعت کی اطلاع دینے کے لئے جو اعلان کیا جاتا ہے، اُسے فقہی اصطلاح میں ”تثویب“ کہا جاتا ہے۔ متاخرین فقہاء نے اسے مستحسن قرار دیا ہے، اس کے لئے کوئی خاص الفاظ متعین نہیں ہیں، بلکہ وہاں کے لوگوں نے جو الفاظ مقرر کر لئے ہوں، وہی جائز ہیں۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

والتثویب حسن عند المتأخرین فی کل صلاۃ الا فی المغرب ھکذا فی شرح النقایۃ للشیخ أبی المکارم۔ وھو رجوع المؤذن الی الاعلام بالصلاۃ بین الاذان والاقامۃ وتثویب کل بلدۃ علی ما تعارفوہ اما بالتنحنح أو بالصلاۃ الصلاۃ أو قامت قامت لانہ للمبالغۃ فی الاعلام وانما یحصل ذلک بما تعارفوہ کذا فی الکافی۔

ترجمہ: ”متاخرین فقہاء کے نزدیک سوائے نمازِ مغرب کے ہر اذان کے بعد (جماعت سے قبل) تثویب مستحسن ہے۔ ”شرح نقایہ“ میں شیخ ابوالمکارم سے منقول ہے کہ یہ مؤذن کی جانب سے نماز کے لئے اذان اور اقامت کے درمیان ایک بار پھر یاددہانی ہے۔ ہر علاقے کی تثویب اسی طریقے پر ہوگی، جو وہاں متعارف ہے۔ پس یہ عمل کھانسنے کے ساتھ یا ”الصلوٰۃ، الصلوٰۃ“ (نماز، نماز) پکار کر یا قامت قامت (یعنی تکرار کے ساتھ کہنا کہ جماعت کھڑی ہونے والی ہے) کہہ کر کیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ یہ اعلان میں مبالغہ کے

لئے ہے اور یہ اُسی طریقے پر حاصل ہوگا جو وہاں متعارف ہے، جیسا کہ ''کافی'' میں بھی ہے''۔(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص:56، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: اذان کے بعد صلوٰۃ کہنا، جس طرح یہاں رمضان المبارک میں معمول ہے جائز ہے، یا نہیں؟ آپ جواب میں لکھتے ہیں:

اسے فقہ میں ''تثویب'' کہتے ہیں، یعنی مسلمانوں کو نماز کی اطلاع اذان سے دے کر پھر دوبارہ اطلاع دینا اور وہ شہروں کے عرف پر ہے جہاں جس طرح اطلاع مکرر رائج ہو، وہی تثویب ہے، خواہ عام طور پر ہو، جیسے ''صلاۃ'' کہی جاتی ہے یا خاص طریقہ پر مثلاً کسی سے کہنا کہ اذان ہوگئی یا جماعت کھڑی ہوتی ہے یا امام آگئے یا کوئی قول یا فعل ایسا جس میں دوبارہ اطلاع دینا ہو، وہ سب تثویب ہے اور اس کا اور صلاۃ کا ایک حکم ہے، یعنی جائز، جس کی اجازت عامۂ کتب مذہب متون: مثل تنویر الابصار ووقایہ، نقایہ، غُرر الاحکام، کنز الدقائق، غُرر الاذکار، وافی، ملتقی، اصلاح، نور الایضاح۔

شروح: در مختار، ردالمحتار، طحطاوی، عنایہ، نہایہ، غُنیہ، شرح مُنیہ، صغیری، البحرالرائق، نہر الفائق، تبیین الحقائق، برجندی، قہستانی، دُرر، ابن ملک، کافی، مجتبیٰ، ایضاح، امداد الفتاویٰ، مراقی الفلاح، حاشیۂ مراقی للعلامۃ الطحطاوی۔

فتاویٰ: ظہیریہ، خانیہ، خلاصہ، خزانۃ المفتیین، جواہر اخلاطی، عالمگیری وغیرہا۔

مختصر الوقایہ میں ہے: التثویب حسن فی کل صلاۃ (تثویب ہر نماز کے لئے بہتر ہے)۔

متن علامہ غزنی تمرتاشی میں ہے: یُثَوّبُ اِلّا فی المغرب (مغرب کے علاوہ ہر نماز کے لئے تثویب کہی جائے)۔ شرح محقق علائی میں ہے: یثوب بین الاذان والاقامۃ فی الکل للکل بما تعارفوہ (اذان اور اقامت کے درمیان متعارف ومروجہ طریقہ پر تمام نمازوں میں ہر ایک کے لئے تثویب کہی جائے)۔ حاشیۂ آفندی محمد بن عابدین میں ہے:

قولہ یثوب، التثویب العود الی الاعلام بعد الاعلام، دُرَر، قولہ فی الکل ای کل الصلوات لظہور التوانی فی الامور الدینیۃ، قولہ بما تعارفوہ کتنحنح اوقامر قامر

او الصلاۃ الصلاۃ ولو احدث تو اعلاما مخالفا لذلک جاز، نہر عن المجتبیٰ

ترجمہ: ''ان کا قول: ''یُثوِّب'': تثویب اطلاع کے بعد اطلاع کو کہا جاتا ہے، دُرر۔ قولہ فی الکل: یعنی تمام نمازوں میں کہنی چاہئے کیونکہ امور دینیہ کے بجالانے میں بہت سستی دکاہلی آچکی ہے۔ ان کا قول: ''بما تعارفوہ'': مثلاً کھانسنا یا نماز کھڑی ہوگئی نماز کھڑی ہوگئی یا نماز نماز، اگر کوئی اور طریقہ اس کے علاوہ اپنالیں، تب بھی جائز ہے، ''نہر'' نے مجتبیٰ سے نقل کیا ہے''۔

شرح الوافی للامام المصنف العلام حافظ الدین ابی البرکات النسفی میں ہے:

تثویب کل بلدۃ علی ما تعارفوہ لانہ للمبالغۃ فی الاعلام وانما یحصل ذلک بما تعارفوہ۔

ترجمہ: ''ہر شہر کی تثویب اسی طریقہ پر ہوگی جو وہاں متعارف ہے، کیونکہ یہ اعلان میں مبالغہ کے لئے ہے اور وہ متعارف ومشہور طریقہ سے حاصل ہوگا''۔ اور ماہِ رمضان المبارک سے اس کی تخصیص بے جا نہیں کہ لوگ افطار کے بعد کھانے پینے میں مشغول اور نفس آرام کی جانب مائل ہوتے ہیں، لہٰذا تنبیہ بعد تنبیہ مناسب ہوئی، جس طرح نبی کریم ﷺ نے اذانِ فجر میں ''الصلاۃ خیر من النوم'' مقرر کرنے کی اجازت عطا فرمائی، اخرجہ الطبرانی فی المعجم الکبیر عن سیدنا بلال رضی اللہ عنہ (طبرانی نے معجم کبیر میں سیدنا بلال رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے)۔ ہدایہ میں ہے: خص الفجر بہ لانہ وقت نوم وغفلۃ (وقت فجر کو مخصوص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ وقت نیند اور غفلت کا وقت ہوتا ہے)۔ بالجملہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس پر مسلمانوں میں نزاع ڈالی جائے اور فتنہ انگیزی کرکے تفریق جماعت کی راہ نکالی جائے، جو ایسا کرتا ہے سخت جاہل اور مقاصدِ شرع سے بالکل غافل ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 5، ص: 361 تا 363، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

ان حوالوں سے معلوم ہوا کہ ہمارے متاخرین فقہائے کرام نے لوگوں میں نمازِ باجماعت کے لئے سستی اور دنیاوی امور میں انہماک دیکھتے ہوئے ''تثویب'' یعنی اذان

کے بعد ایک اور اعلان کو مستحسن قرار دیا ہے، جیسے سعودی عرب میں "مُطوِّع" مقرر ہیں جو اذان کے بعد کاروبار بند کراتے ہیں اور لوگوں کو نماز باجماعت کے لئے شدت سے سعی کی تلقین کرتے ہیں، یہ بھی "تثویب" ہی کا ایک طریقہ ہے۔ کسی نے اسے سنّتِ ثابتہ یا مستحب قرار نہیں دیا اور نہ ہی یہ حدیث سے ثابت ہے، جیسے نماز کی لفظی نیت حدیث سے ثابت نہیں ہے، اسی بنا پر بعض فقہائے کرام نے اسے بدعت قرار دیا ہے، لیکن متاخرین فقہاء نے توجہ کے اِرتکاز اور نیت کی حضوری کے لئے اسے مستحب و مستحسن قرار دیا ہے، لہٰذا اِسے نزاع کا سبب بنانا صحیح نہیں ہے، ویسے بھی مستحبات پر اتنی تاکید کرنا کہ لوگ اسے عملاً واجب سمجھنے لگیں، درست نہیں ہے۔ ایسے امور کے تعامل کو کبھی کبھی ترک بھی کردینا چاہئے، تاکہ یہ الزام باطل ثابت ہوجائے کہ یہ لوگ مستحب و مستحسن امور کو واجب کا درجہ دیتے ہیں۔ شریعت کے مقاصد میں ایک "سدِّ ذرائع" بھی ہے، یعنی مُفاسِد اور خرابیوں کا راستہ روکنا۔

رسول پاک ﷺ نے بھی حکمتِ شرعی کے تحت اپنے بعض پسندیدہ امور کو ترک فرمایا ہے، مثال کے طور پر آپ ﷺ کی خواہش تھی کہ بنائے قریش پر بنی ہوئی "کعبۃ اللہ" کی عمارت کو شہید کردیں اور پھر اس میں "حطیم" کو شامل کرکے بنائے ابراہیم پر تعمیر کریں، لیکن آپ ﷺ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

لَوْلَا حَدَاثَةُ عَهْدِ قَوْمِكِ بِالْكُفْرِ لَنَقَضْتُ الْبَيْتَ وَلَجَعَلْتُهَا عَلٰى أَسَاسِ إِبْرَاهِيمَ فَإِنَّ قُرَيْشًا حِيْنَ بَنَتِ الْبَيْتَ اِسْتَقْصَرَتْ وَلَجَعَلْتُ لَهَا خَلْفًا۔

ترجمہ: "اگر تمہاری قوم نے نیا نیا کفر نہ چھوڑا ہوتا تو میں بیت اللہ کی عمارت کو منہدم کرکے اُسے ابراہیم علیہ السلام کی قائم کی ہوئی بنیادوں پر تعمیر کرتا، کیونکہ قریش نے جب اس کو بنایا تو اس کو چھوٹا کردیا اور میں اس کی پچھلی جانب بھی ایک دروازہ بناتا"۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3227)

اسی طرح بعض اوقات آپ ﷺ نے دینی مصلحت کی خاطر (بظاہر) "خلافِ اولیٰ" کام کیا، مثلاً قرآن میں اللہ تعالیٰ نے حالتِ سفر میں رمضان المبارک کا روزہ نہ رکھنے کی

رخصت عطا فرمائی، لیکن ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا: وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ
ترجمہ: ''اگر تم (سفر کی حالت میں) روزہ رکھلو تو یہ تمہارے لئے (اجر کے اعتبار سے) بہتر ہے، (البقرہ:184)''۔

فتح مکہ کا سفر چونکہ جہاد کے لئے تھا اور نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام روزے سے تھے، مگر یہ دینی ضرورت ہے کہ مجاہد کو تازہ دم اور توانا حالت میں ہونا چاہئے، چنانچہ جب آپ ﷺ نے مجاہدین میں کمزوری کے آثار دیکھے تو آپ ﷺ نے انہیں روزہ توڑنے کا حکم فرمایا، مگر انہیں روزہ توڑنے میں تردّد اس لئے ہوا کہ آپ ﷺ خود تو روزے سے ہیں۔ لہٰذا آپ نے خود برسرِ عام پانی پی کر روزہ افطار کیا، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:1948)۔ ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (جہاد کے دوران) سفر میں روزہ رکھنا کوئی اعلیٰ درجے کی نیکی نہیں ہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:1946)۔ ہمارے نزدیک یہ عمل مومنوں کے لئے ''خلافِ اولیٰ'' ہے۔ لیکن رسول کریم ﷺ کے لئے کسی امر کی مشروعیت اور جواز کو اپنے عمل مبارک سے ثابت کرنے کے لئے واجب کے درجے میں تھا اور اس پر بھی آپ ﷺ ماجور ہوئے۔ میرے نزدیک موجودہ دور میں جب کہ ہر مسجد میں نمازِ باجماعت کے اوقات متعین ہیں، تقریباً ہر شخص کے پاس گھڑی موجود ہے تو ''تثویب'' کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی، لہٰذا کوئی حصول ثواب کے لئے کرنا چاہتا ہے تو اسے ٹوکا نہ جائے اور کوئی نہیں کرتا تو اسے ملامت نہ کیا

دفتر میں اذان دیئے بغیر باجماعت نماز پڑھنے کا حکم

سوال:15

ہمارے دفتر میں ایک کمرہ نماز کے لئے مخصوص ہے، جہاں باجماعت نماز پڑھی جاتی ہے۔ قرب وجوار میں مساجد ہیں، جہاں سے اذان کی آواز آجاتی ہے۔ کیا ہمارے دفتر میں جماعت کے لئے اذان دینا ضروری ہے یا صرف اقامت کافی ہے؟

(سید ناصر علی قادری، گلشن اقبال، کراچی)

جواب:

ایسی صورت میں اذان کہنا ضروری نہیں ہے، البتہ جماعت کے لئے اقامت کہی جائے گی، لیکن اگر اذان بھی کہہ لی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولایکرہ ترکھما لمن یصلی فی المصر اذا وجد فی المحلة ولا فرق بین الواحد والجماعة ھکذا فی التبیین والافضل أن یصلی بالاذان والاقامة کذا فی التمرتاشی واذالم یؤذن فی تلک المحلة یکرہ لہ ترکھما ولو ترک الاذان وحدہ لایکرہ کذا فی المحیط۔

ترجمہ: "اُس شخص کے لئے اذان واقامت کا ترک کرنا مکروہ نہیں ہے جو شہر میں نماز پڑھتا ہے اور محلے کی مسجد میں اذان واقامت ہوتی ہے۔ اس مسئلے میں منفرد (تنہا نماز پڑھنے والا) اور جماعت میں کوئی فرق نہیں، "تبیین" میں بھی اسی طرح ہے اور افضل یہ ہے کہ اذان واقامت کے ساتھ نماز پڑھے جیسا کہ "فتاویٰ تمرتاشی" میں ہے اور اگر محلے (کی مسجد) میں اذان واقامت نہیں کہی جاتی تو اذان واقامت دونوں کا ترک کرنا مکروہ ہے اور اگر صرف اذان ترک کی تو مکروہ نہیں، جیسا کہ "محیط" میں ہے"۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 54)

نائب امام کی موجودگی میں امامت کا استحقاق

سوال: 16

مسجد میں انتظامیہ کی جانب سے مقررہ امام موجود ہیں، اُن کی عدم موجودگی میں اُن کے نائب بھی موجود ہیں، جو مؤذن کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ ایک روز امام صاحب کسی کام سے گئے تو اپنی جگہ اپنے بیٹے کو مقرر کر گئے۔ کیا یہ درست ہے؟، کیا انتظامیہ ان کے بیٹے کو نماز پڑھانے سے روکنے کا اختیار رکھتی ہے؟، (محمد سلیم شاہ، کراچی)۔

جواب:

امام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنا نائب کسی کو بھی مقرر کرے، لیکن اس شخص میں امامت کی تمام شرائط پائی جاتی ہوں اور کراہت کی کوئی وجہ نہ ہو، صرفِ امام کا بیٹا ہونا امامت کے لئے کافی نہیں۔ جب مقرر کردہ نائب موجود ہے تو امام صاحب کا اپنے بیٹے کو اپنی جگہ امام

مقرر کرنا درست نہیں، اگر مقررہ امام موجود نہ ہو یا آنے میں تاخیر ہو جائے تو اس کی جگہ مؤذن نماز پڑھانے کا زیادہ اہل ہے، یہ اس کے فرائض میں شامل ہے۔ ہاں! اگر کسی مسجد میں مقررہ امام کے ساتھ نائب امام بھی علیحدہ سے مقرر ہو تو نماز پڑھانے کا اختیار اسے حاصل ہوگا، لیکن اگر مؤذن ہی نائب امام ہے اور اس میں امامت کی تمام شرائط پائی جاتی ہیں تو پھر نماز وہی پڑھائے۔

امام کا ترکِ نماز

سوال: 17

ہماری مسجد کے امام فجر کی نماز کے علاوہ باقی چاروں وقت کی نماز پڑھاتے ہیں۔ پہلے وہ کہتے تھے کہ میں فجر میں اُٹھ نہیں پاتا، اس لئے فجر کی نماز نہیں پڑھا سکتا۔ اب مسجد کی انتظامیہ تبدیل ہوگئی ہے، تو وہ کہتے ہیں کہ میں السر کا مریض ہوں، اس لئے فجر کی نماز نہیں پڑھا سکتا۔ ہماری مسجد کے ایک معزز نمازی کا کہنا ہے کہ جو پانچوں وقت کی نماز نہیں پڑھا سکتا، وہ پیش امام نہیں ہو سکتا اور ہماری نماز بھی نہیں ہوتی، کیونکہ امام کا صاحبِ ترتیب ہونا ضروری ہے، رہنمائی فرمائیے، (محمد جمال خان، میر پور خاص)۔

جواب:

صورتِ مذکورہ میں امام صاحب کے دونوں عذر (نمازِ فجر کے لئے نہیں اٹھ سکتا اور میں السر کا مریض ہوں، اس لئے فجر نہیں پڑھا سکتا) قابلِ قبول نہیں ہیں۔ مرض کی بنا پر صرف نمازِ فجر ہی نہیں پڑھا سکتے یا دیگر نمازوں میں بھی یہ عذر قائم ہے؟، اگر محض غفلت اور سستی کے سبب نماز قضا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ (الماعون)

ترجمہ: ”سو ان نمازیوں کے لئے ہلاکت ہے جو اپنی نمازوں سے غفلت کرتے ہیں“۔

جو شخص سستی اور کاہلی کی بنا پر نماز ترک کرے، وہ فاسق اور گنہگار ہے، لہٰذا مذکورہ امام صاحب اگر پنج وقتہ نماز کی پابندی کریں یا وہ نمازِ فجر باجماعت ادا کریں، خواہ کسی کی اقتدا

میں پڑھیں تو انہیں منصب امامت پر قائم رکھا جائے ورنہ معزول کر دیا جائے۔

مذکورہ نمازی کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ امام کا نماز باجماعت کی امامت کے لئے صاحبِ ترتیب ہونا شرط ہے۔ امام احمد رضا قادری سے سوال کیا گیا: ''جس شخص کی نمازِ فجر قضا ہو، وہ نمازِ ظہر یا دیگر اوقات کی نمازوں میں امام ہو سکتا ہے؟، آپ نے جواب میں لکھا: اگر امام صاحبِ ترتیب ہے تو جب تک قضائے فجر ادا نہ کر لے، ظہر کی امامت نہیں کر سکتا ورنہ کر سکتا ہے۔

جماعت کے لئے اقامت کے موقع پر امام تکبیر تحریمہ کب کہے؟

سوال:18

کتبِ فتاویٰ میں ایک مسئلہ درج ہے کہ ''جب مؤذن اقامت کہے، امام قد قامت الصلوٰۃ سے ذرا پہلے تکبیرِ تحریمہ کہہ لے اور مقتدی بھی نیت کر کے ہاتھ باندھ لیں، (فتاویٰ عالمگیری، جلد اوّل، ص: 57)''۔ وضاحت فرمائیں کہ کیا یہ مسئلہ صحیح ہے؟، کیا مؤذن تکبیر پڑھتا رہے اور امام و مقتدی ثناء پڑھیں؟

(مولانا قاری رب نواز فیضی، جامع مسجد فاروقیہ، نیو کراچی)

جواب:

مذکورہ مسئلے کی روشنی میں یہاں چند باتیں قابلِ غور ہیں:

ایک تو یہ کہ اِس مسئلہ پر عمل کے لئے تمام مقتدیوں کو ''حی علی الصلوٰۃ'' سے پہلے کھڑا ہونا پڑے گا، جبکہ ہمارے فقہاءِ احناف نے لکھا ہے کہ مسجد میں پہلے سے موجود مقتدیوں کو کھڑے ہو کر ''اقامت'' کا انتظار کرنا مکروہ ہے، وہ اقامت کے وقت بیٹھے رہیں اور ''حی علی الصلوٰۃ'' پر کھڑے ہوں۔

دوسرا یہ کہ امام تکبیر اولیٰ اقامت ختم ہونے کے بعد فوراً یا وقفے سے کہے اور ایسا کرنا بغیر کسی کراہت کے بالاتفاق جائز ہے۔ اقامت ختم ہونے کے بعد امام کے ''تکبیرِ اولیٰ'' کہنے میں تین فائدے ہیں:

اوّل: امام ومقتدی دونوں مؤذن کے کلماتِ اقامت (تکبیر) کا جواب دے سکیں گے، جو مستحب ہے۔

دوم: مؤذن اقامت سے فارغ ہوکر تکبیرِ اولیٰ پا سکے گا اور یوں وہ مستحب کے اجر کا حق دار بنے گا۔

سوم: مقتدی کراہت سے بچ کر صفیں سیدھی کرلیں گے۔

مؤذن کے "قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ" کہنے پر امام کا "تکبیرِ تحریمہ" کہہ کر نماز شروع کردینا، طرفین (امام ابوحنیفہ اور امام محمد) کے نزدیک مستحب ہے، امام کے ایک مستحب پر عمل کرنے (یعنی قد قامت الصلوٰۃ سے پہلے تکبیرِ اولیٰ کہنے) سے خود امام اور تمام مقتدیوں کا دوسرے مستحبات کو ترک کرنا لازم آتا ہے کہ کوئی بھی اقامت کا جواب نہیں دے سکے گا اور نہ ہی مؤذن تکبیرِ اولیٰ پاسکے گا اور صفیں درست کرنے کے لئے "حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ" سے پہلے کھڑے ہونا کراہت کا سبب بنے گا، تو مستحب پر عمل کے لئے کراہت کا حکم نہیں دیا جائے گا بلکہ اس صورت میں مستحب کو چھوڑ دیا جائے گا۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

وشروعُ الامام فی الصلاۃِ مُذ قیلَ قَد قَامتِ الصلاۃُ وَلَو أَخَّرَ حتّٰی أتمّھا لَابأسَ بہٖ إجماعًا۔ ترجمہ: "(اقامت کے وقت) جب "قَدْ قَامَتِ الصلوٰۃ" کہا جائے تو امام نماز شروع کردے اور (تکبیرِ تحریمہ) مؤخر کرے یہاں تک کہ مؤذن اقامت سے فارغ ہوجائے تو اِس میں بالاتفاق کوئی حرج نہیں ہے"۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، ص: 156، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ زین الدین بن ابراہیم المعروف ابن نجیم حنفی لکھتے ہیں:

وشروعُ الامام مُذ قیلَ قَد قامتِ الصَّلاۃُ عندَ ابی حنیفۃ ومحمدٍ وقالَ ابویوسف یشرعُ اِذا فرغَ مِنَ الاقامۃِ مُحَافَظَۃً علٰی فضیلۃِ مُتابعۃِ المُؤذِّنِ واِعانۃً لِلمُؤذِّنِ عَلَی الشُّروعِ معہٗ،۔۔۔۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: وفی الظھیریۃ وَلو أَخَّرَ حتّٰی یَفرغَ المؤذنُ مِنَ الْاقامۃِ لَابأسَ بِہٖ فی قولھم جمیعًا واللہ اعلم۔

ترجمہ:"(اقامت کے وقت) جب "قد قامتِ الصلوٰۃ" کہا جائے، تو امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہا اللہ تعالیٰ کے نزدیک امام کو نماز شروع کردینا چاہیے اور امام ابویوسف رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جب مُؤَذِّن اقامت سے فارغ ہوجائے تو امام نماز شروع کرے، اس طرح (امامت کے کلمات دُہرانے میں) مُؤَذِّن کی پیروی بھی ہوگی اور تکبیرِ اولیٰ میں امام کے ساتھ شامل ہونے پر اس کی مدد بھی ہوگی۔۔۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں: "ظہیریہ" میں ہے: اگر (امام تکبیرِ تحریمہ) موخر کرے یہاں تک کہ مُؤَذِّن اقامت سے فارغ ہوجائے تو اِس میں بالاتفاق کوئی حرج نہیں ہے"۔

(البحر الرائق، جلد 1، ص: 531، مطبوعہ: مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ علاؤالدین حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ "آدابِ نماز بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اُن میں سے ایک یہ ہے:

(شروعُ الامام) فی الصلاۃِ (مُذ قیلِ قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ) ولو أخّر حتّٰی أتمّھا لا بأسَ بِہٖ إجماعًا

ترجمہ:"جب اقامت کے وقت "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ" (بے شک نماز کھڑی ہوگئی) کہا جائے تو امام کا نماز شروع کرنا (آدابِ نماز میں سے) ہے اور اگر وہ نماز کو موخر کردے (یعنی فوراً تکبیرِ تحریمہ کہہ کر نماز شروع نہ کرے) تو اِس پر آئمہ کا اجماع ہے کہ اِس میں کوئی حرج نہیں ہے"۔ اِس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

لِاَنَّ فیہ محافظۃً علٰی فضیلۃِ المؤذِّنِ واعانۃً لہٗ علَی الشروعِ معَ الامامِ لأنّ الخلافَ فی الافضلیۃ فنفی البأس، أی الشدۃ۔

ترجمہ:"کیونکہ اس میں مُؤَذِّن کی فضیلت کی حفاظت ہوگی اور امام کے ساتھ نماز شروع کرنے میں اس کی مدد بھی ہوگی، کیونکہ (جماعت کب شروع ہو؟، اس کے بارے میں) اختلاف صرف اس میں ہے کہ افضل کیا ہے، اس لئے شارح نے شدت کی نفی کی ہے تو پھر مُؤَذِّن کے "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ" کہنے پر یا اقامت کے اختتام پر کسی بھی موقف میں

شدت نہیں ہونی چاہیے۔

آپ نے سوال میں فتاویٰ عالمگیری کا جو حوالہ دیا ہے، وہ درست ہے۔ دراصل یہاں اختلاف جواز یا عدمِ جواز کا نہیں ہے، اختلاف صرف اس میں ہے کہ افضل کیا ہے؟ آیا امام کا مُؤَذِّن کے "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃ" کہنے پر نماز شروع کر دینا یا اقامت (تکبیر) کے اختتام کے بعد فوراً یا قدرِ توقف کے بعد "تکبیرِ اولیٰ" کہنا افضل ہے، تو ہمارے نزدیک دوسری صورت پر عمل کرنا افضل ہے، کیونکہ اس میں امام اور مقتدی دونوں کلماتِ اقامت دُہرانے کا اجر بھی پالیں گے، جو مستحب ہے اور مُؤَذِّن بھی "تکبیرِ اولیٰ" کے وقت ہی امام کے ساتھ شامل ہونے کا اجر پاسکے گا۔ آج کل عرف بھی اسی کا ہے اور عرف سے ہٹ کر کام کرنے سے لوگوں میں فتنہ وفساد و بے چینی پھیلے گی۔

امام کا دو رکعت یا چار رکعت والی نماز میں قعدۂ اخیرہ بھول کر کھڑا ہو جانا

سوال:19

اگر امام دو رکعت والی نماز (نمازِ فجر یا تراویح) میں تیسری رکعت یا چار رکعت والی نماز میں پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو جائے، مقتدی لقمہ دیں تو کیا اُسے بیٹھنا چاہیے یا نہیں؟، ہر دو صورت میں اُس کے لئے کیا حکم ہے؟۔ (صفی اللہ، بنگرام، مانسہرہ)

جواب:

دو رکعت والی نماز میں اگر تیسری رکعت کے لئے یا چار رکعت والی نماز میں پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا، تو جب تک اُس زائد رکعت کا سجدہ نہ کیا ہو، واپس قعدے کی طرف لوٹ آئے اور سجدۂ سہو کر کے نماز مکمل کرے، لیکن نمازِ تراویح میں اگر امام دوسری رکعت میں بیٹھنا بھول گیا اور تیسری رکعت کا سجدہ بھی کر لیا تو اب چار رکعت پوری کرے، لیکن تراویح دو رکعتیں ہی شمار کی جائیں گی۔ اگر دو رکعت میں بیٹھ کر تیسری کے لئے اٹھا تھا تو تراویح چار شمار کی جائیں گی۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وَعَنْ اَبِی بَکْرٍ الاسکاف انه سُئِلَ عَنْ رجلٍ قَامَ اِلَی الثَّالِثَةِ

فِی التَّرَاوِیحِ وَلَمْ یَقْعُدْ فِی الثَّانِیَةِ قَالَ اِن تذکّر فِی الْقِیَامِ یَنۡبَغِی اَنۡ یَّعُودَ وَیقعدَ وَیُسَلِّمَ وَاِن تَذَکَّرَ بَعدَ مَاسجدَ لِلثَّالِثَةِ فان اضافَ اِلیھا رکعةً اُخریٰ کانت ھذہ الاربع عن تسلیمة واحدة وان قعدَ فی الثانیةِ قدرَ التشھّدِ اِختلفوا فیہِ فَعَلیٰ قولِ العَامّةِ یجوزُ عَن تسلیمتینِ وَھُوَ الصَّحِیۡحُ ھٰکذا فِی فَتاویٰ قاضی خان۔

ترجمہ: ''ابو بکر اسکاف سے سوال کیا گیا کہ تراویح کی دو رکعت نماز میں ایک شخص دوسری رکعت کے بعد قعدے میں بیٹھے بغیر تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا (تو اس کی نماز کا کیا حکم ہے؟)، آپ نے فرمایا: اگر اسے قیام میں یاد آ گیا تو لوٹ آئے اور قعدہ مکمل کرے اور سلام پھیر دے۔ اور اگر تیسری رکعت کا سجدہ کرنے کے بعد یاد آیا تو اگر ایک اور رکعت کا اضافہ کر لیا تو اب یہ ایک سلام کے ساتھ چار رکعت ہو جائیں گی۔ اگر دوسری رکعت میں تشہد کی مقدار بیٹھ چکا تھا تو اس صورت میں اختلاف ہے، عام فقہاء کرام کے قول کے مطابق یہ دو سلاموں سے شمار ہوں گی (یعنی چار رکعت ادا ہو جائیں گی) اور یہی صحیح ہے، فتاویٰ قاضی خان میں اسی طرح ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 118، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

امام احمد رضا قادری قدس سرہٗ العزیز سے سوال ہوا کہ ''قعدہ اخیرہ کے بعد گمان ہوا کہ یہ قعدۂ اولیٰ تھا، کھڑا ہو گیا اور (اگلی رکعت کے) سجدہ سے قبل یاد آ گیا تو اب سجدے سے لوٹ کر دوبارہ التحیات پڑھ کر سجدۂ سہو میں جائے یا ویسے ہی سجدہ کو چلا جائے''؟

آپ جواب میں لکھتے ہیں: ''عود کر کے بیٹھنا چاہیے اور معاً سجدۂ سہو میں چلا جائے، دوبارہ التحیات نہ پڑھے: فی الدر المختار وَاِنۡ قَعَدَ فِی الرابعةِ مثلاً قدرَ التشھُّدِ ثم قامَ عادَ وَسلَّمَ وَلو سَلَّم قائماً صَحَّ۔

ترجمہ: ''درمختار میں ہے کہ اگر چوتھی رکعت میں مثلاً تشہد کی مقدار بیٹھ گیا پھر (بھول کر) کھڑا ہوا تو لوٹ آئے اور سلام پھیر دے اگر کھڑے کھڑے سلام پھیر دے، تب بھی صحیح ہے۔

ردالمحتار میں ہے: قولہ ثم قام ای ولم یسجد قولہ عاد وسلم ای عاد للجلوس، وفیہ اشارةٌ اِلیٰ اَنَّہٗ لَایُعِیۡدُ التَّشَھُّدَ، وبہ صرّح فی البحر، قال فی الامداد والعودُ للتسلیم

جالسا سُنَّۃٌ لان السُّنَّۃَ التَّسلِیمُ جالساً۔

ترجمہ: ''ماتن کا قول: پھر کھڑا ہوا لیکن (ابھی پانچویں رکعت کا) سجدہ نہیں کیا، ماتن کا قول: ''لوٹے اور سلام کہے'' یعنی بیٹھنے کے لیے لوٹے (اور بیٹھ کر سلام پھیرے)، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تشہد نہ لوٹائے اور ''بحر'' میں اسی کی تصریح کی ہے۔

''امداد الفتاویٰ'' میں کہا: بیٹھ کر سلام پھیرنے کے لیے لوٹنا سنّت ہے کیونکہ بیٹھ کر سلام پھیرنا سنت ہے''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص: 183، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

علامہ امجد علی اعظمی ''غنیۃ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''چار رکعت والے فرض میں چوتھی رکعت کے بعد قعدہ نہ کیا تو جب تک پانچویں کا سجدہ نہ کیا ہو، بیٹھ جائے اور پانچویں کا سجدہ کرلیا یا فجر میں دوسری رکعت پر نہیں بیٹھا اور تیسری کا سجدہ کرلیا یا مغرب میں تیسری پر نہ بیٹھا اور چوتھی کا سجدہ کرلیا تو ان سب صورتوں میں فرض باطل ہوگئے، مغرب کے سوا اور نمازوں میں ایک رکعت اور ملالے''۔

(بہارِ شریعت، جلد اول، ص: 192)

پس ایسی صورت میں امام کو چاہئے کہ دو رکعت والی نماز میں تیسری رکعت اور چار رکعت والی نماز میں پانچویں کا سجدہ کرنے سے پیشتر لوٹ آئے اور اگر نہ لوٹا اور اُس رکعت کا سجدہ بھی کرلیا تو ایک رکعت اور زائد پڑھے، اگر ایک رکعت اور نہ ملائی تو وہ نماز فاسد ہوجائے گی۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز ردالمحتار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

لَو تطوّعَ بِثَلَاثٍ بِقعدۃٍ وَاحدَۃٍ کان ینبغی الجوازُ اعتبارا بِصلوٰۃِ الْمغربِ لکن الاصِحُّ عَدَمُہٗ لانہٗ قد فسد ما اتصلتْ بہ القعدۃُ وھو الرکعۃ الاخیرۃ، لان التنفل بالرکعۃ الواحدۃ غیر مشروع فیفسد ما قبلھا۔

ترجمہ: ''اگر کسی نے ایک قعدہ کے ساتھ تین نفل پڑھے تو (اصولاً) مغرب کی نماز پر قیاس کرتے ہوئے اسے جائز قرار دینا چاہئے، لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ نفل جائز نہیں ہیں کیونکہ اس کی آخری رکعت جس کے بعد قعدہ کیا ہے وہ فاسد ہوگئی کیونکہ وہ دو پر زائد ایک نفل رہ گئی جبکہ

ایک رکعت نفل جائز نہیں ،لہٰذا اس آخری رکعت کے فساد سے پہلی دو رکعت بھی فاسد ہو جائیں گی۔اور چار پڑھ لیں اور قعدۂ اولیٰ نہ کیا تو مُفتیٰ بہ مذہب پر یہ چاروں دو ہی رکعت کے قائم مقام گنی جائیں گی،باقی اور پڑھ لے"۔

(فتاویٰ رضویہ،جلد 7،ص:567،رضا فاؤنڈیشن،لاہور)

رہا مقتدی کے لقمہ دینے یا نہ دینے کا سوال،تو فقہاء لکھتے ہیں: چار چیزیں وہ ہیں کہ اگر امام کرے تو مقتدی اس کا ساتھ نہ دیں،علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

واربعةُ اشیاءَ إِذَا تَعَمّدَ الامامُ لَایُتابِعُهُ المقتدی۔۔۔۔۔او قام الی الخامسة ساهیا کذا فی الوجیز الکردری۔ فان لم یقید الخامسة بالسجدة دعاد وسلم، سلم المقتدی معه، وان قَیّدَ الخامسةِ بالسجدة سَلّمَ المقتدی۔ وَلَوْلَم یَقْعُدِ الامامُ عَلَی الرابعةِ وقامَ إِلی الخامسة ساهِیًا وَتَشَهّدَ المقتدی وسَلّم ثم قَیّدَ الامامُ الخامسةَ بِالسجدةِ فَسَدَتْ صَلَاتُهم کذا فی الخلاصة۔

ترجمہ:"چار چیزیں وہ ہیں کہ مقتدی اُن میں امام کی متابعت نہ کرے۔۔۔۔(اُن میں سے ایک)امام بھول کر پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو جائے(تو مقتدی کھڑا نہ ہو)جیسا کہ "وجیز کردری" میں ہے۔(مقتدی اُس کے لوٹنے کا انتظار کریں)پس اگر اُس نے پانچویں رکعت کا سجدہ نہیں کیا اور لوٹ آیا اور سلام پھیر دیا تو مقتدی بھی اُس کے ساتھ سلام پھیر دیں اور اگر امام نے پانچویں رکعت کا سجدہ کر لیا تو مقتدی تنہا سلام پھیر دیں۔اور اگر امام نے چوتھی رکعت پر قعدہ نہیں کیا تھا اور بھول کر پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا اور پانچویں رکعت کا سجدہ بھی کر لیا تو اب سب کی نماز فاسد ہو گئی،اگرچہ مقتدیوں نے تشہد پڑھ کر سلام پھیرا ہو،"خلاصۃ الفتاویٰ" میں اسی طرح ہے"۔

(فتاویٰ عالمگیری،جلد 1،ص:90،مکتبہ رشیدیہ،کوئٹہ)

عبارت کا مفہوم:(چار رکعت والے فرض میں)امام بھول کر پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا،پھر اگر اس صورت میں قعدہ اخیرہ کر چکا ہے تو مقتدی اس کے لوٹنے کا انتظار

کرے، اگر امام پانچویں رکعت کے سجدہ سے پہلے لوٹ آیا تو مقتدی اُس کا ساتھ دیں اُس کے ساتھ سجدۂ سہو کریں اور سلام پھیریں۔ اور اگر امام پانچویں رکعت کا سجدہ کر لے تو مقتدی تنہا سلام پھیر دیں۔ اگر چوتھی رکعت پر امام نے قعدۂ اخیرہ نہیں کیا تھا اور پانچویں رکعت کا سجدہ کر لیا تو امام اور مقتدی سب کی نماز فاسد ہو جائے گی، اگرچہ مقتدی نے تشہد پڑھ کر سلام پھیر لیا ہو۔

جب فسادِ نماز کا خدشہ ہو تو امام احمد رضا قادری قدس سرہٗ العزیز لکھتے ہیں:

''امام کو لقمہ دینا ہر نماز میں جائز ہے، جمعہ ہو یا کوئی نماز، بلکہ اگر اس نے ایسی غلطی کی جس سے نماز فاسد ہوگی تو لقمہ دینا فرض ہے، نہ دے گا اور اس کی تصحیح نہ ہوگی تو سب کی نماز جاتی رہے گی اور لقمہ دینے سے سجدۂ سہو نہیں آتا''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 7، ص:289، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

نمازِ مغرب کی دونوں رکعتوں میں ایک ہی سورت کی تکرار

سوال:20

ایک امام صاحب نے مغرب کی نماز میں الحمد شریف پڑھنے کے بعد ''سورۃ الفلق'' پوری پڑھی، دوسری رکعت میں الحمد شریف پڑھنے کے بعد ''سورۃ الناس'' شروع کی، مگر درمیان میں بھول گئے اور پھر ''سورۃ الفلق'' پڑھ کر حسبِ معمول دوسری رکعت مکمل کی۔ کیا اس صورت میں نماز صحیح ادا ہوگئی؟ جب امام صاحب سے مقتدی صاحبان نے پوچھا تو انہوں نے عشاء کی نماز میں یہ وضاحت کی کہ دوسری رکعت میں چار آیتیں پڑھ لی تھیں، اس لئے ہماری نماز ہوگئی۔ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں کہ آیا ہماری نماز ہوئی یا نہیں؟۔ (محمد کلیم خان، اورنگی، کراچی)۔

جواب:

سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد سورت کا ملانا واجب ہے جس کی کم از کم مقدار قرآن مجید کی سب سے چھوٹی سورت (یعنی سورۃ الکوثر) یا سب سے چھوٹی تین آیات جو کسی ایک

مقام پر متصل ہوں، یا کسی ایک طویل آیت کا ایک حصہ جو اس مقدار کے مساوی ہو، اس کی مقدار تعدادِ حروف کے اعتبار سے علامہ ابن عابدین شامی نے 30 حروف بتائی ہے اور امام احمد رضا قادری نے لکھے ہوئے حروف کی تعداد کے اعتبار سے 28 حروف اور تلفظ کئے جانے والے حروف کی تعداد کے اعتبار سے 25 حروف بتائی ہے۔ نماز میں قرآن مجید ترتیب سے پڑھنا واجب ہے اور یہ واجباتِ قراءت میں سے ہے، واجبات نماز سے نہیں ہے۔ اگر قصداً خلافِ ترتیب پڑھا تو یہ مکروہِ تحریمی ہے، لیکن نماز واجب الاعادہ نہیں ہوگی اور اگر بھولے سے پڑھا تو مکروہ بھی نہیں ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ''اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کو اُلٹا پڑھنا اور درمیان سے ایک چھوٹی سورت چھوڑ کر پڑھنا ، یہ تب مکروہ ہے جب قصداً ایسا کرے، لیکن اگر بھول کر ایسا ہو گیا تو کراہت نہیں ہے جیسا کہ ''شرح منیہ'' میں ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار جلد 2، ص:239، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

صورتِ مسؤلہ میں نماز ادا ہوگئی سجدہ سہو بھی واجب نہیں ہے چوں کہ سہواً (بھولے سے) خلاف ترتیب پڑھا گیا ہے، اس لئے کراہت بھی نہیں ہے۔ ویسے ہر نماز کے بعد یہ دُعا کر لینی چاہیے:

''یا اللہ! ہماری نماز میں دانستہ یا نادانستہ کوئی تقصیر ہوگئی ہو تو اسے معاف فرما اور ہماری نماز کو شرفِ قبول عطا کر کے اجر کامل عطا فرما، آمین''۔

نماز میں خلاف ترتیب قراءت کا حکم

سوال:21

امام صاحب نے عشاء کی نماز کی پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد ''سورۃ الاعلیٰ'' کی آخری چار آیات کی تلاوت کی اور دوسری رکعت میں ''سورۃ الاعلیٰ'' کی شروع کی تین آیات کی تلاوت کی۔ نماز کے بعد چند لوگوں نے امام صاحب کو بتایا کہ آپ نے اس طرح نماز پڑھائی ہے، اس لئے دوبارہ نماز پڑھائیں مگر امام صاحب اور چند اور افراد نے نماز کو جائز

قرار دیا اور دوبارہ نماز نہیں پڑھائی۔ آپ سے التجا ہے کہ برائے کرم مجھے صحیح راہ دکھائیں، عین نوازش ہوگی، (محمد علی، فیز 1 اسٹریٹ نمبر 6، ڈیفنس آفیسر ہاؤسنگ اسکیم، کراچی)

جواب:

نماز میں قرآن ترتیب سے پڑھنا یعنی سورتوں میں ترتیب رکھنا واجب ہے اور یہ احکامِ قراءت میں سے ہے، احکامِ نماز سے نہیں۔ اگر قصداً خلافِ ترتیب پڑھا تو یہ مکروہِ تحریمی ہے، لیکن نماز کا دُہرانا لازم نہیں ہوگا۔ اگر بھولے سے خلافِ ترتیب پڑھا تو مکروہ بھی نہیں ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر غلطی سے ایک لفظ بھی خلافِ ترتیب زبان سے نکل گیا تو اسی کو پڑھے، اس کو چھوڑنا مکروہ ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

لا باس أَنْ يَقْرَأَ سُوْرَةً وَيُعِيدُهافی الثانيةِ، وَأَنْ يَقْرَأَ فِي الْأُوْلٰى مِنْ مَّحَلٍّ وَفِي الثَّانِيَةِ مِنْ آخَرَ وَلَوْ مِنْ سُوْرَةٍ ان كان بينهما آيتان فاكثر، ويكره الفصل بسورة قصيرة وَأَنْ يَقْرَأَ مَنْكُوسًا اِلَّا اِذَا خَتَمَ فَيَقْرَأُ مِنَ الْبَقَرَةِ وَفِي الْقُنْيَةِ قَرَأَ فِي الْأُوْلٰى الْكَافِرُوْنَ وفی الثانية أَلَمْ تَرَ أَوْ تَبَّتْ۔ ثُمَّ ذَكَرَ يَتِمُّ وَقِيلَ يَقْطَعُ وَيَبْدَأُ،

ترجمہ: ''ایک رکعت میں کوئی سورت پڑھی اور پھر دوسری رکعت میں بھی اُسی کو پڑھا، یا پہلی رکعت میں کوئی سورت ایک مقام سے تلاوت کی اور دوسری رکعت میں وہی سورت دوسرے مقام سے تلاوت کی، بشرطیکہ اِن دونوں مقامات کے درمیان دو آیات یا زیادہ کا فاصلہ ہو تو اِن دونوں صورتوں میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (نماز کی ایک رکعت میں ایک سورت پڑھی اور دوسری میں دوسری سورت پڑھی تو اُن دونوں کے) درمیان ایک چھوٹی سورت کا چھوڑنا مکروہ ہے۔ قرآن کو خلافِ ترتیب پڑھنا (یعنی دوسری رکعت میں ایسی سورت کا پڑھنا جو ترتیب کے اعتبار سے پہلی رکعت میں پڑھی گئی سورت سے پہلے ہو) مکروہ ہے، مگر یہ کہ ختمِ قرآن کے موقع پر پہلی رکعت میں ''سورۃ الناس'' کے بعد دوسری رکعت میں ''سورۂ بقرہ'' پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور ''قنیہ'' میں ہے: پہلی رکعت میں ''سورۃ الکافرون'' پڑھی اور دوسری رکعت میں ''سورۃ الفیل'' یا ''سورۃ اللھب'' پڑھی، پھر (دورانِ تلاوت) یاد آیا تو اسی

سورت کو مکمل کرے، اور ایک ضعیف قول یہ بھی ہے کہ اُسے چھوڑ دے اور پھر (ترتیب کے مطابق دوسری سورت) پڑھے"۔

علامہ ابن عابدین شامی (وَأَنْ یَّقْرَأَ مَنکوسًا) کی تشریح میں لکھتے ہیں:

بِأَنْ یَّقْرَأَ فِی الثَّانِیَةِ سورۃً اعلٰی مِمَّا قرأ فی الاولی، لِأَنَّ تَرْتِیبَ السُّوَرِ فِی القراءۃ من واجبات التلاوۃ،

ترجمہ: "یعنی دوسری رکعت کے اندر پہلی رکعت میں پڑھی جانے والی سورت کے مقابلے میں ایسی سورت پڑھی جو ترتیب میں اُس سے مقدم ہے"، (اگرچہ اس طرح خلافِ ترتیب پڑھنا مکروہ ہے، لیکن نماز دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے)، کیونکہ قرآن کو ترتیب سے پڑھنا تلاوت کے واجبات میں سے ہے (نماز کے واجبات میں سے نہیں ہے)"۔

علامہ ابن عابدین شامی مزید لکھتے ہیں:

أَفَادَ أَنَّ التَّنکیسَ أَوِ الْفَصْلَ بِالقصیرۃِ إِنَّما یکرہ اذا کان عن قصدٍ، فلو سہوًا فلا کما فی شرح المنیۃ۔ وَإِذَا انتفتِ الکراھۃُ فاعراضُہٗ عَنِ الَّتِی شَرَعَ فِیہا لَا یَنْبَغِی۔ وفی الخُلَاصۃِ إِفْتَتَحَ سورۃً أُخْرٰی فلما قرأ آیۃ أو آیتین أراد أَن یَّتْرُکَ تلکَ السورۃَ ویفتتح التی أرادھا یکرہ۔ وفی الفتح ولوکان أی المقروء حرفا واحداً۔

ترجمہ: "اس عبارت سے معلوم ہوا ہے کہ قرآن کو الٹا پڑھنا یا درمیان سے ایک چھوٹی سورت چھوڑ کر پڑھنا صرف اس صورت میں مکروہ ہے، جب جان بوجھ کر ایسا کرے، لیکن اگر بھول کر اس طرح پڑھ لیا تو مکروہ نہیں ہے، جیسا کہ "شرح منیہ" میں ہے: جب (بھول کر) خلافِ ترتیب پڑھنا مکروہ نہیں ہے تو جس سورت کو (خلافِ ترتیب) پڑھنا شروع کر دیا ہے اُسے چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔ اور "خلاصۃ الفتاویٰ" میں ہے: ایک شخص نے ایک سورت پڑھنی شروع کی اور اُس کا ارادہ دوسری سورت پڑھنے کا تھا، پھر جب اُس نے ایک یا دو آیات پڑھ لیں تو اُس نے چاہا کہ اسے چھوڑ کر وہی سورت پڑھے، جس کا اُس نے ارادہ کیا ہوا تھا، تو یہ مکروہ ہے اور "فتح القدیر" میں ہے: اگرچہ ایک ہی حرف پڑھا

ہو، (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 2، ص: 239، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''امام نے پہلی رکعت میں ''قل اعوذ برب الناس'' پڑھی اور دوسری میں ''قل اعوذ برب الفلق'' پڑھی اور آخر میں سجدۂ سہو کیا، اس مسئلہ کا حکم بیان فرمائیے''۔ آپ نے جواب میں لکھا:

''اگر بھول کر ایسا کیا نماز میں حرج نہیں اور سجدہ سہو نہ چاہئے تھا اور قصداً ایسا کیا تو گنہگار ہوگا، نماز ہوگئی، سجدۂ سہو اب بھی نہ چاہیے تھا، توبہ کرے، پہلی میں اگر ''سورۂ الناس'' پڑھی تھی تو اُسے لازم تھا کہ دوسری میں بھی ''سورۂ الناس'' ہی پڑھتا کہ فرض کی دونوں رکعتوں میں ایک ہی سورت پڑھنا صرف خلافِ اولیٰ ہے اور ترتیب اُلٹا کر پڑھنا حرام، (فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص: 346، 347، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

صورتِ مسئولہ میں چونکہ امام نے نماز میں ایک ہی سورت ''الاعلیٰ'' کی آیات بھول کر خلافِ ترتیب پڑھی ہیں، لہٰذا نماز بلاکراہت جائز ہے اور جماعت کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

قراءت میں متشابہ لگنا اور یاد آنے پر پھر اسی جگہ سے پڑھنا

سوال: 22

ایک آدمی نے نماز شروع کی، اس نے سورۂ فاتحہ کے بعد قراءت شروع کی، ایک سورت پڑھی درمیان میں بھول گیا اور اس سورت کو چھوڑ کر اس کی جگہ دوسری سورت پڑھنا شروع کردی، کیا اس صورت میں اس پر سجدہ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟۔ (بخت ولی، راولپنڈی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں نماز درست ہوگئی اور سجدہ سہو کی ضرورت نہیں تھی، لیکن اگر دونوں سورتوں کے درمیان ایک رکن ادا کرنے (یعنی تین مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم کہنے) کی مقدار تاخیر ہوئی تو سجدۂ سہو لازم ہوگا۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''امام مغرب میں رکوع ''لقد

صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهٗ'' پڑھ رہا تھا جب ''فِی الانجیل'' تک پڑھ لیا، آیت پارہ 22 کا متشابہ لگا اُس کے بعد ''اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ'' تک پڑھی، پھر جب یاد آیا اُسے چھوڑ کر مقامِ اصل سے شروع کیا اور نماز ختم کی اور سجدہ سہو نہ کیا اس صورت میں نماز ہوئی یا نہیں؟، آپ نے جواب میں لکھا: نماز ہوگئی اور سجدۂ سہو کی بھی حاجت نہ تھی اگر بقدر ادائے رکن سوچتا نہ رہا ہو، ہاں اگر بھولا اور سوچنے میں اتنی دیر خاموش رہا، جس میں کوئی رکن نماز کا ادا ہو سکتا ہے تو سجدۂ سہو لازم آیا'' کما فی الدر المختار'' وغیرہ۔ اگر نہ کیا تو نماز جب بھی ہوگئی مگر ناقص ہوئی پھیرنا واجب ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص: 274، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

امام کے بارے میں مقتدیوں کی ناپسندیدگی کا شرعی حکم

سوال: 23

ایک شخص جو ایک مسجد کا امام بھی ہے اور اُس کے بارے میں مشہور ہے کہ لوگوں سے روپیہ لے کر جادو ٹونہ کرتا ہے۔ ایک دن دورانِ تقریر اُس نے رسولِ اکرم ﷺ کے والدین کی شان میں گستاخی کی اور یہ بھی کہا کہ حضور ﷺ کے دادا عبدالمطلب جہنمی ہیں بلکہ جہنم کا ایندھن ہیں اور کفر پر مرے۔ اِس امام مسجد سے لوگ بیزار اور مُتنفر ہیں اور اِس کی وجہ سے انتشار پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اِن حالات میں اِس شخص کا امامت کروانا کیسا ہے؟۔ کیا اُس کی تنخواہ حلال ہے؟، (محمد فرید قادری، قائد آباد، کراچی)۔

جواب:

اگر سائل کا بیان درست ہے تو جادو ٹونے کا شرعی حکم یہ ہے کہ (1) اگر وہ کلمات کفر پر مشتمل ہے، تو کفر ہے، اگر کلماتِ فسق و فجور اور ضلالت پر مشتمل ہے، تو فسق ہے، اگر کوئی ان چیزوں کی تاثیرِ ذاتی پر یقین رکھتا ہے، تو یہ الحاد ہے۔ چونکہ عام طور پر جادو ٹونہ سے باطل مقاصد حاصل کئے جاتے ہیں، مثلاً کسی کو روحانی یا جسمانی اذیت پہنچانا، میاں بیوی، باپ بیٹا، بھائی بہن یا دوستوں میں تفریق پیدا کرنا یا کسی کو مالی نقصان پہنچانا یا کسی اجنبی عورت کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسانا مقصود ہوتا ہے۔ یہ تمام امور شرعاً ممنوع اور حرام ہیں اور جو شخص

اِس طرح کے جادوٹونے کرتا ہے،تو وہ امام بننے کا اہل نہیں ہے،البتہ اگر کلماتِ خیراور ایسے اَورَاد و وظائف جو آیاتِ قرآنی ، اسمائے الٰہی یا درود پر مشتمل ہوں اور اُن سے کوئی ایسا مقصد حاصل کرنا مطلوب ہو جو شرعاً پسندیدہ ہے، جیسے:

(الف) میاں بیوی میں محبت پیدا کرنا (ب) باپ بیٹے ، بھائی بہن یا دوستوں میں محبت پیدا کرنا،تو ایسے روحانی عملیات میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اجداد کریمین کے بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہ موَحد تھے ،دینِ فطرت پر تھے اور شرک سے بری تھے،اُن کو مشرک قرار دینے والا شخص امامت کا اہل نہیں ہے۔

جادو کا اثر ختم کرنے کے لئے جادو سیکھنا فرض ہے (بشرطیکہ وہ کفریہ کلمات اور گمراہی کے کلمات پر مشتمل نہ ہو) اور میاں بیوی کے درمیان محبت پیدا کرنے کے لئے جادو سیکھنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ کفریہ کلمات یا گمراہی کے کلمات پر مشتمل نہ ہو اور نہ ہی اس میں ایسا طریقہ اختیار کیا جائے ،جس میں کلماتِ مقدسہ کی بے حرمتی ہو،تاہم اس فرض سے مرادفرضِ قطعی نہیں لینا چاہئے بلکہ فرضِ ظنّی لینا چاہئے ،جو واجب عملی کے درجے میں ہے،یہ بھی تب ہے کہ ان کے رَد کے لئے کوئی اور سبیل نہ ہو،ایک اسلامی ملک میں حکومت کو چاہئے کہ ایسے لوگوں کو کنٹرول کرنے کے لئے باقاعدہ قانون سازی کرے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وفی الذخیرۃ الناظر تعلُّمُہٗ فرضٌ لردّ ساحِراھلِ الحرب، وحرامٌ لِیُفَرِّقَ بہٖ بینَ المرأۃِ وزوجِھا،وجائزٌلِیُوَفِّقَ بینھما۔

ترجمہ:’’اور’’الذخیرۃ‘‘ میں ہے: کفار کے مقابلے پر جادو کا اثر ختم کرنے کے لئے کسی روحانی عمل یا علم کا سیکھنا فرض ہے،اور میاں بیوی کے درمیان جدائی پیدا کرنے کے لئے جادو سیکھنا حرام ہے اور اُن کے درمیان اُلفت ومحبت پیدا کرنے کے لئے سیکھنا جائز ہے،(ردالمحتار علی الدر المختار،جلد 1،ص:124،داراحیاالتراث العربی،بیروت)‘‘۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہٗ العزیز سے سوال کیا گیا: جس امام سے جماعت کے بعض آدمی ناراض ہوں اور بعض اس کی خوشامد کرتے ہوں تو ایسے کی اقتداء کرنا جائز ہے یا نہیں؟ آپ نے جواب میں لکھا: ''(مقتدیوں کی) رنجیدگی (کی وجہ) دیکھی جائے گی، اگر اُس میں کسی قصورِ شرعی کی وجہ سے ہے، تو اُسے امام بنانا گناہ ہے اور بحکمِ حدیث اُس کی نماز مقبول نہ ہوگی: ثَلٰثَۃٌ لَا تُرْفَعُ صَلَاتُھم فَوقَ آذانھم شبرًا الیٰ ان قال ﷺ وَمَن اَمَّ قومًا وَھُم لہٗ کارھون۔ ترجمہ: ''تین اشخاص کی نماز ان کے کانوں سے ایک بالشت برابر بھی بلند نہیں ہوتی، آپ ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ (ان میں سے) ایک وہ شخص ہے، جو کسی قوم کی امامت کرے، حالانکہ وہ لوگ اُسے ناپسند کرتے ہوں''۔

(سنن ابن ماجہ، باب من ام قوماً وھم لہ کارھون، رقم الحدیث: 971)

اور اگر اُس میں کوئی قصورِ شرعی نہیں تو اُس کی امامت میں کوئی حرج نہیں اور اُن رنج رکھنے والوں پر وبال ہے، کمانصّ علیہ فی الدُّرِّ الْمُختار''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص: 575، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

یعنی اگر امام سے مقتدیوں کی ناراضگی کا سبب اس میں کوئی شرعی عیب ہے، تو وہ امامت کا اہل نہیں ہے۔ اگر مقتدیوں کی ناراضگی کا سبب اُن کا ذاتی عناد اور بغض وعداوت ہے یا امام کے کلمۂ حق کہنے کے سبب اُس سے ناراض ہیں تو اِس سے امام کی شرعی اہلیت بالکل متاثر نہیں ہوتی بلکہ اس کا وبال مقتدیوں پر ہوگا۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ولو اُمّ قوماً وھم لہٗ کارھون، ان) الکراھۃ (لفساد فیہ أو لأنّھم أحق بالامامۃ منہ کرہ) لہ ذلک تحریماً لحدیثِ أبی داؤد لایقبَلُ اللّٰہُ صَلاۃ من تَقَدَّم قوماً وھُم لہٗ کارھون (وإن ھو أحَقُّ، لا) والکراھۃُ علیھم۔

ترجمہ: ''اگر کسی شخص نے کسی ایسی قوم کی امامت کی جو اُسے ناپسند کرتے ہیں، تو اگر لوگوں کی ناپسندیدگی کا سبب امام میں کوئی شرعی یا اخلاقی خرابی ہے یا اُس کی وجہ یہ ہے کہ اُن میں کوئی

شخص امام کے مقابلے میں امامت کا زیادہ اہل ہے تو سنن ابوداؤد کی حدیث کی رُو سے اُس کی امامت مکروہِ تحریمی ہے، وہ حدیث یہ ہے: ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ اُس شخص کی نماز قبول نہیں فرماتا، جو لوگوں کی ناپسندیدگی کے باوجود امامت کر رہا ہو''۔ اور اگر وہ امام ان لوگوں کے مقابلے میں (شرعی معیار کے مطابق) امامت کا زیادہ حق دار ہے تو اس کے امام بننے میں کوئی کراہت نہیں ہے، البتہ امام سے کسی شرعی جواز کے بغیر نفرت کرنا مقتدیوں کے لئے کراہت کا سبب ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2، ص:254، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

عورت کا مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے باپردہ آنا

سوال:24

مسجد کی انتظامیہ کی طرف سے مسجد میں نمازِ جمعہ اور دیگر مذہبی اجتماعات میں خواتین کی شرکت کے لئے مسجد کے اوپر گیلری (دوسری منزل) میں باپردہ انتظام موجود ہو اور اُن کا راستہ بھی مردوں کے راستے سے جدا ہو تو خواتین مسجد میں نمازِ جمعہ اور دیگر اجتماعات میں شرکت کرسکتی ہیں اور یہ بھی فرمائیں کہ نمازِ جمعہ بھی امام کے پیچھے ادا کرسکتی ہیں؟

(شیخ غلام احمد امتیاز، شاہ فیصل کالونی، کراچی)

جواب:

ابتدائی دور میں عورتوں کو مسجد میں آنے، نمازِ باجماعت ادا کرنے کی اجازت تھی، اسی لئے حدیثِ پاک میں جماعت کی صفوں میں مرد اور عورت کی صف کے درمیان افضلیت اس طرح بیان فرمائی گئی ہے: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ خَیْرُ صُفُوْفِ الرِّجَالِ اَوَّلُهَا، وَشَرُّهَا آخِرُهَا، وَخَیْرُ صُفُوْفِ النِّسَاءِ آخِرُهَا وَشَرُّهَا اَوَّلُهَا
ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (نمازِ باجماعت میں اجر کے اعتبار سے) مردوں کی بہترین صف پہلی صف ہے اور بری صف آخری صف ہے (یعنی پہلی صف کی بہ نسبت اس کا اجر اور فضیلت کم ہے)۔ عورتوں کی

بہترین صف آخری صف ہے اور بری صف پہلی صف ہے (یعنی وہ صف جو مردوں کی صف کے متصل ہے، کیونکہ اس میں نفس کے بہکاوے یا توجہ بٹنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے)''۔ (سُنن ترمذی، رقم الحدیث:224)

علامہ علاؤالدین حصکفی صفوں کی ترتیب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الرجالُ ثُمَّ الصِّبیانُ، ثم الخناثیٰ، ثم النساء ترجمہ:'' (جماعت میں ترتیب کے اعتبار سے) پہلے مردوں کی صف، پھر بچوں کی پھر خنثیٰ اور پھر عورتوں کی صفیں بنائی جائیں، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2، ص:270، دار احیاء التراث العربی، بیروت)''۔ لیکن

عہدِ فاروقی میں خلیفہ دوم حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فسادِ زمانہ کے سبب عورتوں کے مسجد آنے پر پابندی لگادی تھی۔

عَنْ عَمْرَۃَ، عَنْ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللہ عَنْھَا قَالَتْ لَوْ اَدْرَکَ رَسُوْلُ اللہ ﷺ مَا اَحْدَثَ النِّسَاءُ، لَمَنَعَھُنَّ کَمَا مُنِعَتْ نِسَاءُ بَنِی اسْرَائِیلَ۔ قُلْتُ لِعُمْرَۃَ اَوَمُنِعْنَ؟ قَالَتْ نَعَمْ۔

ترجمہ:''عمرہ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اگر رسول اللہ ﷺ عورتوں کے اس بناؤ سنگھار کو دیکھ لیتے جو انہوں نے اب ایجاد کیا تو اُن کو (مسجد میں آنے سے) منع فرمادیتے، جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کیا گیا تھا۔ میں نے عمرہ سے پوچھا: کیا اُن کو منع کر دیا گیا تھا؟، انہوں نے فرمایا: ہاں''۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث:869)

علامہ غلام رسول سعیدی (علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی 855ھ کے حوالے سے) لکھتے ہیں:''اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عورتوں کے اس بناؤ سنگھار کو دیکھ لیتیں جو انہوں نے ہمارے زمانے میں ایجاد کر لیا ہے اور اپنی زیبائش اور نمائش میں غیر شرعی طریقے اور مذموم بدعات نکال لی ہیں، تو یقیناً اپنے موقف میں اور شدت اختیار فرماتیں''۔ (عمدۃ القاری، جلد 6، ص:227)

میں (علامہ غلام رسول سعیدی) کہتا ہوں: اگر علامہ عینی ہمارے زمانے کی فیشن زدہ

عورتوں کو دیکھ لیتے تو حیران رہ جاتے، اب اکثر عورتوں نے برقع لینا چھوڑ دیا ہے، سر کو دوپٹہ سے نہیں ڈھانپتیں، تنگ اور چست لباس پہنتی ہیں، بیوٹی پارلر میں جاکر جدید طریقوں سے میک اپ کراتی ہیں، مردوں کے ساتھ مخلوط اجتماعات میں شرکت کرتی ہیں، میراتھن دوڑ میں حصہ لیتی ہیں، بسنت میں پتنگ اڑاتی ہیں، ویلنٹائن ڈے مناتی ہیں، اس قسم کی آزاد منش عورتوں کے مسجد میں جانے کا تو خیر کوئی امکان ہی نہیں ہے، البتہ چند اللہ سے ڈرنے والی خواتین ضرور مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے یا رمضان کے مہینے میں تراویح کی نماز پڑھنے جاتی ہیں، جہاں اُن کی نماز کے لئے باپردہ جگہ بنائی جاتی ہے، سو جو خواتین پردہ کی حدود و قیود سے مسجدوں میں جائیں تاکہ وہ درسِ قرآن و حدیث، وعظ اور نصیحت سن سکیں تو میری رائے ہے کہ ان کو منع نہیں کرنا چاہئے، جبکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ایک قول میں اس کی گنجائش بھی ہے، (نعمۃ الباری، جلد 2، ص:798)"۔

علامہ زین الدین بن شہاب الدین ابن رجب حنبلی متوفیٰ 795ھ لکھتے ہیں:

مردوں کے ساتھ جماعت میں خواتین کے مسجد میں نماز پڑھنے کے مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف رہا ہے، بعض فقہاء نے اس کو ہر حال میں مکروہ کہا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بھی یہی موقف ہے۔ امام احمد بن حنبل نے کہا: میں اس زمانہ میں عورتوں کے نکلنے کو مکروہ کہتا ہوں کیونکہ وہ فتنہ اور آزمائش ہیں۔ امام ابوحنیفہ سے ایک روایت یہ ہے کہ وہ عیدین کے سوا گھروں سے نہ نکلیں۔ بعض فقہاء نے بوڑھی عورتوں کو نکلنے کی اجازت دی ہے اور جوان عورتوں کو منع کیا ہے، یہ امام مالک کا قول ہے اور ایک روایت کے مطابق امام شافعی، امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول ہے اور ہمارے اصحابِ حنبلیہ کا بھی یہی قول ہے"۔

(فتح الباری لابن رجب، جلد 5، ص:309، دار ابن الجوزیہ، ریاض)

مفتی احمد یار خاں نعیمی رحمہ اللہ غسلِ جمعہ سے متعلق ایک حدیث کی شرح میں مرقاۃ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

وَعَنْ ابنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ اِذَا اسْتَاذَنَتْ اِمْرَاَۃُ اَحَدِکُمْ اِلَی الْمَسْجِدِ فَلَا

یَمْنَعْهَا۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کی بیوی مسجد میں آنے کی اجازت مانگے تو اسے منع نہ کرو، (بخاری و مسلم)۔

اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: ''ظاہر ہے کہ یہ حکم اس وقت کے لئے تھا جب عورتوں کو مسجد میں حاضری کی اجازت تھی، عہدِ فاروقی سے اس کی ممانعت کردی گئی کیونکہ عورتوں میں فساد بہت آگیا، اب فی زمانہ عورتوں کو باپردہ مسجدوں میں آنے اور علیحدہ بیٹھنے سے نہ روکا جائے، کیونکہ اب عورتیں سینماؤں، بازاروں میں جانے سے تو رکتی نہیں، مسجدوں میں آکر کچھ دین کے احکام سن لیں گی، عہدِ فاروقی میں عورتوں کو مطلقاً گھر سے نکلنے کی ممانعت تھی''۔

ایک دوسری حدیث کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

''یہاں صرف مرد کا ذکر ہوا ہے، کیونکہ نمازِ جمعہ صرف مردوں پر فرض ہے عورتوں پر نہیں۔ اور بعض احادیث میں عورتوں کا ذکر ہے، وہاں عبارت یہ ہے: مَنْ اَتَی الْجُمُعَةَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ اس لئے جمعہ میں عورتوں کا آنا بھی مستحب ہے مگر اب زمانہ خراب ہے عورتیں مسجدوں میں نہ آئیں'' (مرقاۃ)۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورتیں سینماؤں، بازاروں، کھیل تماشوں، اسکولوں، کالجوں میں جائیں، صرف مسجد میں نہ جائیں، گھروں میں رہیں، بلاضرورتِ شرعیہ گھر سے باہر نہ نکلیں اسی لئے فقیر کا یہ فتویٰ ہے کہ اب عورتوں کو باپردہ مسجدوں میں آنے سے نہ روکو۔ اگر ہم انہیں روکیں گے تو یہ وہابیوں، مرزائیوں، دیوبندیوں کی مساجد میں پہنچتی ہیں جیسا کہ تجربہ ہوا، ان لوگوں نے عورتوں کے لئے بڑے بڑے انتظامات اپنی اپنی مسجدوں میں کئے ہوئے ہیں، عورتوں کو گمراہ کرکے ان کے خاوندوں اور بچوں کو بہکاتے ہیں، (مرآت شرح مشکوٰۃ، جلد دوم، ص:170، 333)''۔

مزید لکھتے ہیں: ''اب فی زمانہ عورتوں کو باپردہ مسجدوں میں آنے اور علیحدہ بیٹھنے سے نہ روکا جائے، کیونکہ اب عورتیں سینماؤں، بازاروں میں جانے سے تو رُکتی نہیں، مسجدوں

میں آکر کچھ دین کے احکام سُن لیں گی''۔ (مرآت شرح مشکوٰۃ، جلد 2، ص: 158)

ہمارے فقہاءِ کرام کا عمومی موقف تو یہی ہے کہ اخلاقی تنزّل کی وجہ سے عورتوں کو مسجد میں آنے کی اجازت نہ دی جائے، لیکن اس کا مقصد تو یہ ہے کہ جب مسجد میں نماز کے لئے آنے سے اِن خواتین کا روکنا شریعت کا منشا ہے، تو پھر یہ پابندی انہیں زندگی کے عام معمولات میں بھی اختیار کرنی چاہیے۔ لیکن اب چند دین دار خواتین کے علاوہ عام عورتیں تعلیم، روزگار، بازاروں، سماجی تقریبات اور روزمرہ معاملات میں بلا روک ٹوک شرعی حجاب کے بغیر گھومتی پھرتی رہتی ہیں، تو صرف مسجد یا بالخصوص دینی مجالس سے کیوں روکا جائے، جب کہ مسجد میں نماز کے لئے یا عورتوں کے لئے مخصوص تبلیغی اجتماعات میں آنے والی خواتین شرعی حجاب کے ساتھ آتی ہیں اور انہیں دینی مسائل سننے کا موقع بھی ملتا ہے۔

حضرت علامہ مفتی احمد یار خان نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس کی رخصت دی ہے، لیکن یہ رخصت اس امر کے ساتھ مشروط ہے کہ خواتین کی نماز کی جگہ مکمل باپردہ ہو اور آمد و رفت کا راستہ مردوں سے علیحدہ ہو، ان پر یہ پابندی عائد ہو کہ بالکل ایسے چھوٹے بچوں کو لے کر نہ آئیں جنہیں مسجد، نماز اور دینی شعائر کے ادب واحترام کا شعور نہ ہو۔ آج کل مختلف مسالک کے لوگ عورتوں کے لئے خصوصی اجتماعات کا اہتمام کر رہے ہیں، ملک کے اندر اور باہر مخصوص ریڈیو چینلز اس مقصد کے لئے استعمال ہو رہے ہیں، مساجد میں بھی باجماعت نمازوں اور جمعہ اور دُروسِ قرآن وحدیث کے اجتماعات میں اُن کی باپردہ شرکت کا اہتمام ہوتا ہے، جس کی وجہ سے دینی ذوق رکھنے والی اہلسنت کی خواتین کیلئے جب اپنے مسلک کے مطابق اس طرح کے انتظامات نہیں ہوتے تو وہ اُن مجالس میں جاتی ہیں اور علم کی کمی کی وجہ سے اُن کے عقائد ونظریات تبدیل ہو جاتے ہیں، اس لئے میرے نزدیک موجودہ دور میں مساجد میں نمازِ جمعہ وتراویح اور دُروس کی مجلسوں میں شرعی حدود کی مکمل پاسداری کے ساتھ خواتین کی شرکت کا اہتمام اباحت وجواز کی حدود سے نکل کر ضرورت کے درجے میں داخل ہو گیا ہے۔ اس لئے میں اس کی تائید کرتا

ہوں اور علماء، فقہاء اور مفتیانِ عہد کو اس ضرورت کا احساس دلاتا رہتا ہوں، اَللّٰھُمَّ اَرِنِی الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنِی اِتِّبَاعَہٗ، اَللّٰھُمَّ اَرِنِی الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنِیْ اِجْتِنَابَہٗ۔

نماز میں عورت کے سجدہ کا طریقہ

سوال: 25

نماز یا غیر نماز میں مردوں اور عورتوں کے سجدہ کرنے کا طریقہ جدا ہوتا ہے، جبکہ میری بیگم کہتی ہیں کہ ہمیں صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ ہمارے سرکار ﷺ نے کس طرح سجدہ کیا تھا، ہمیں اُسی طرح سجدہ کرنا چاہئے، یعنی وہ مردوں کی طرح سجدہ کرتی ہیں۔ مہربانی فرما کر عورتوں کے لئے نماز میں سجدے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟، بیان فرمائیے، نیز ایک ٹی وی چینل پر ایک عالم اکثر کہتے رہتے ہیں کہ عورت کی نماز کا طریقہ مرد ہی کی طرح ہے اور حدیث میں عورت کی نماز کی ہیئت الگ سے ذکر نہیں ہے، (محمود زبیری، کراچی)۔

جواب:

نماز میں عورتوں کے سجدہ کرنے اور بیٹھنے کا طریقہ وہیئت مردوں سے جدا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کی نماز کی ادائیگی کا جو طریقہ ارشاد فرمایا، اُس میں سجدہ کرنے کا طریقہ اور صورت مرد کے سجدہ کرنے کی ہیئت سے جدا ہے، جیسا کہ ذیل کی حدیثِ مبارک میں ارشاد فرمایا:

عَنْ یَزِیْدَ بْنِ اَبِیْ حَبِیْبٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللہِ ﷺ مَرَّ عَلٰی اِمْرَاَتَیْنِ تُصَلِّیَانِ فَقَالَ اِذَا سَجَدْتُّمَا فَضُمَّا بَعْضَ اللَّحْمِ اِلَی الْاَرْضِ فَاِنَّ الْمَرْاَۃَ لَیْسَ فِیْ ذٰلِکَ کَالرَّجُلِ۔

ترجمہ: ''یزید بن ابی حبیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دو عورتوں کے پاس سے گزرے جو نماز پڑھ رہی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم سجدہ کرو تو اپنے جسم کے بعض حصے کو زمین سے لگایا کرو کیونکہ اس میں عورت مرد کی طرح نہیں ہے''۔

(مراسیل ابوداؤد، ص:8)

علامہ علی متقی بن حسام الدین برہان پوری متوفّٰی 975ھ روایت فرماتے ہیں:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ اِذَا جَلَسَتِ الْمَرْأَةُ فِي الصَّلٰوةِ وَضَعَتْ فَخِذَهَا عَلٰى فَخِذِهَا الْأُخْرٰى فَاِذَا سَجَدَتْ اَلْصَقَتْ بَطْنَهَا فِي فَخِذَيْهَا كَاَنَ اَسْتَرَ مَا يَكُوْنُ لَهَا۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب عورت نماز میں بیٹھے تو اپنی ایک ران دوسری ران پر رکھ لے اور جب سجدہ کرے تو اپنے پیٹ کو رانوں کے ساتھ چمٹائے، اِس میں اُس کے ستر کی زیادہ رعایت ہے، (کنز العمال، جلد 7، ص: 549)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی عورتوں کی نماز میں سجدہ کی بابت لکھتے ہیں:

عورتوں کی نماز کے طریقہ کے متعلق احادیث اور آثار:

علقمہ، حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ انہوں نے کہا: ''رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے وائل بن حجر! جب تم نماز پڑھو تو اپنے دونوں ہاتھ اپنے کانوں کے مقابل اٹھاؤ اور عورت اپنے ہاتھ اپنے سینہ کے مقابل اٹھائے''۔

(معجم کبیر، جلد 22، ص: 20، مجمع الزوائد، جلد 1، ص: 103)

خالد بن الحجاج بیان کرتے ہیں کہ عورتوں کو یہ حکم دیا جاتا تھا کہ وہ نماز میں چارزانو (آلتی پالتی مارکر) بیٹھیں اور مردوں کی طرح سرین پر نہ بیٹھیں، (مصنف ابن ابی شیبہ: 2799)

نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نماز میں چارزانو بیٹھتی تھیں، (مصنف ابن ابی شیبہ: 2800)۔ اس حدیث میں جس صفیہ کا ذکر ہے، یہ ابو عبید کی بیٹی اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی زوجہ ہیں۔

قتادہ نے کہا: عورت کو جس طرح آسانی ہو، اس طرح بیٹھے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: 2803)

نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ازواج نماز میں چارزانو بیٹھتی تھیں، (مصنف ابن ابی شیبہ: 2805)۔

ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ میں نے عطا سے پوچھا: کیا عورت دو رکعت کے بعد اپنے بائیں کولہے پر بیٹھے؟ انہوں نے کہا: ہاں! وہ میرے نزدیک دائیں کولہے پر بیٹھنے کی بہ نسبت مستحسن ہے، (مصنف ابن ابی شیبہ: 2791،2807، دارالکتب علمیہ، بیروت)۔

نماز میں عورت کے سجدہ کرنے کا طریقہ

حارث بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب عورت سجدہ کرے تو اپنے جسم کو سمیٹے اور اپنی رانوں کو (اپنے پیٹ کے ساتھ) ملائے۔
(مصنف ابن ابی شیبہ: 2793، مجلس علمی، بیروت)
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے عورت کی نماز کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: وہ اپنے اعضاء کو جمع کرے اور سمیٹے، (مصنف ابن ابی شیبہ: 2794 مجلس علمی، بیروت)۔ ابراہیم نخعی نے کہا: جب عورت سجدہ کرے تو اپنی رانوں کو ملائے اور اپنا پیٹ ان پر رکھے، (مصنف ابن ابی شیبہ: 2795، مجلس علمی، بیروت)۔ ابراہیم نے کہا: جب عورت سجدہ کرے تو اپنے پیٹ کو اپنی رانوں کے ساتھ ملائے اور اپنے کولہوں کو اوپر نہ اٹھائے اور اپنے پیٹ کو اپنی رانوں سے دور نہ رکھے، جس طرح مرد دور رکھتا ہے۔
(مصنف ابن ابی شیبہ: 2798، مجلس علمی، بیروت)
علامہ ابوالحسن بن علی بن ابی بکر مرغینانی حنفی متوفی 593ھ لکھتے ہیں: عورت اپنے بائیں کولہے پر بیٹھے اور اپنے دونوں پیروں کو دائیں جانب نکالے، اس میں اس کے لئے زیادہ ستر ہے، (ہدایہ مع فتح القدیر جلد 1 ص: 319 دارلکتب علمیہ، بیروت)۔
علامہ بدرالدین عینی حنفی اس عبارت کی شرح میں لکھتے ہیں: کیونکہ ستر کے فرض کی رعایت کرنا (مردوں کی طرح) قعدے کے مسنون طریقے کی رعایت سے زیادہ بہتر ہے۔
(البنایہ فی شرح الہدایہ، جلد 2، ص: 305)
علامہ ابوبکر محمد بن احمد السرخسی متوفی 483ھ لکھتے ہیں: ''عورت سجدہ میں اپنے جسم کو سمیٹے اور اپنے پیٹ کو رانوں سے ملائے اور بازؤوں کو پہلوؤں سے ملائے، اسی طرح حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے عورتوں کے سجدہ کے طریقے میں مروی ہے اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ عورت میں اصل ستر ہے، سو جو طریقہ عورت کے ستر کے زیادہ موافق ہو، وہ اولیٰ ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورت مستورہ ہے یعنی چھپائی جانے والی ہے''۔
(المبسوط، جلد 1، ص: 110، دارالکتب العلمیہ، بیروت)

علامہ محمود بن صدر الشریعہ متوفی 616ھ لکھتے ہیں: ''عورت قعدہ میں اس طرح بیٹھے، جس میں اس کیلئے زیادہ ستر ہو، (المحیط البرہانی، جلد 2 ص:84، ادارۃ القرآن، کراچی)

علامہ عثمان بن علی زیلعی حنفی متوفی 743ھ لکھتے ہیں: عورت جھکے اور سجدہ میں اپنا پیٹ اپنی رانوں سے ملائے کیونکہ یزید بن ابی حبیب بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دو عورتوں کے پاس سے گزرے جو نماز پڑھ رہی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم سجدہ کرو تو اپنے گوشت کو ایک دوسرے سے ملاؤ کیونکہ عورت اس میں مرد کی طرح نہیں ہے۔
(تلخیص الحبیر، جلد 1 ص:394، مراسیل ابوداؤد:87، سنن بیہقی، جلد 2، ص:223)

(مزید لکھتے ہیں:) عورت نماز کی دس چیزوں میں مرد کے خلاف ہے، عورت اپنے کندھوں تک ہاتھ اٹھائے گی اور اپنے سینہ کے نیچے اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر رکھے گی اور اپنے ہاتھ اپنی رانوں پر گھٹنوں تک رکھے گی، سجدہ میں اپنی بغلوں کو ظاہر نہیں کرے گی، تشہد میں اپنے کولہے کے اوپر بیٹھے گی، رکوع میں اپنی انگلیوں کو متفرق نہیں رکھے گی، مردوں کی امامت نہیں کرے گی، ان کی جماعت مکروہ ہے اور ان کی امام ان کے وسط میں کھڑی ہوگی، (تبیین الحقائق، جلد 1، ص:307)۔

نیز علامہ زیلعی حنفی متوفی 743ھ نے لکھا ہے: عورت تشہد میں اپنے کولہے پر بیٹھے کیونکہ اس کا زیادہ ستر اسی میں ہے، (تبیین الحقائق، جلد 1، ص:313)۔

علامہ سید ابن عابدین شامی متوفی 1252ھ نے الخزائن کے حوالہ سے چند مزید چیزوں کا اضافہ کیا ہے، جن میں عورت کی نماز کے احکام مردوں کے خلاف ہیں، انہوں نے کہا ہے: ''عورت کا مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز کے لئے جانا مکروہ ہے اور وہ جماعت میں مردوں کے پیچھے کھڑی ہوگی، عورت پر جمعہ فرض نہیں ہے، لیکن پڑھے گی تو جمعہ ادا ہوجائے گا، نہ عورت پر عید اور تکبیرات تشریق ہیں اور نہ اس پر صبح کی نماز سفیدی میں مستحب ہے، نہ وہ جہری نمازوں میں بلند آواز سے قرآن پڑھے کیونکہ عورت کی آواز بھی عورت ہے''۔ خلاصہ یہ ہے کہ نماز کے احکام میں عورت چھبیس (۲۶) چیزوں میں مرد کے احکام

کے خلاف ہے، البحر الرائق اور غنیۃ المستملی میں بھی اسی طرح مذکور ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، ص: 186، 187، داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

(نعمۃ الباری شرح صحیح البخاری، جلد 2، ص: 754، 755)

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

أما المرأة فتضم بطنها الی فخذیها وفی جمیع احوالها، لأنه أستر لها۔

ترجمہ: "پس رہا عورت کا سجدہ تو وہ اپنے پیٹ کو رانوں سے ملائے اور بازوؤں کو پہلوؤں سے، اس میں اُس کے لئے زیادہ ستر ہے"۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہٗ، جلد 1، ص: 707، دارالفکر، بیروت)

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وَالْمَرْأَةُ لاتَجافِی فِی رکوعِهَا وسجودِها وتَقْعُدُ علیٰ رِجْلَیها وفی السَّجْدَةِ تَفْتَرِشُ بَطنَهَا عَلیٰ فَخِذَیْهَا کذا فِی الخلاصة۔۔۔۔۔ وَاِن کَانَتْ اِمْرَأَةً جلست علیٰ اِلْیتها الیُسْریٰ وَأَخْرَجَتْ رِجْلَیها مِنَ الْجَانِبِ الاَیْمنِ کَذافِی الهدایة۔

ترجمہ: "عورت رکوع اور سجود میں اعضا جدا نہیں رکھے گی (رکوع میں اتنا جھکے کہ ہاتھ گھٹنوں تک پہنچ جائیں) اور اپنے دونوں پاؤں پر بیٹھے اور سجدے میں اپنا پیٹ رانوں سے ملائے "خلاصۃ الفتاویٰ" میں اسی طرح ہے،۔۔۔۔ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: (سجدے میں) عورت دونوں پاؤں داہنی جانب نکال دے اور بائیں سرین پر بیٹھے، "ہدایہ" میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد اول، ص: 75، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

مذکورہ اسکالر کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے، باطل ہے کہ حدیث میں عورت کی نماز کی الگ ہیئت کا ذکر نہیں ہے، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی روایات صحاحِ ستہ یا صحیح بخاری میں نہیں ہیں۔ اور یہ کوئی اصولِ شرعی نہیں ہے کہ احادیث صرف صحیح بخاری یا صحاحِ ستہ تک محدود ہیں۔ اور بھی کتب احادیث ہیں جن سے علماء امت استفادہ کرتے ہیں، چنانچہ آپ نے مراسیل ابی داؤد، سنن بیہقی، مصنفِ ابن ابی شیبہ اور کنز العمال کے حوالہ جات پڑھے جو کتب

احادیث ہیں اور آئمہ ومجتہدین سبھی کے اجتہادات کا مدار بھی کتاب وسنت پر ہوتا ہے۔

عورت کی نماز کن امور میں مرد کی نماز سے جدا ہے

سوال:26

عورتوں کی نماز مردوں کی نماز سے کن کن امور میں مختلف ہے؟ وضاحت فرمائیں

(معاذ احمد، ملیر کراچی)

جواب:

عورتوں کی نماز بعض امور میں مرد کی نماز سے مختلف ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وحررنا فی الخزائن انّھا تخالف الرّجل فی خمسة وعشرین۔

ترجمہ: ''الخزائن'' میں ہم نے لکھا کہ (نماز کے احکام میں) عورت پچیس (۲۵) چیزوں میں مرد کے احکام کے خلاف ہے۔

اس کی شرح میں علامہ سید ابن عابدین شامی متوفی 1252ھ لکھتے ہیں:

وذالك حيث قال تنبيه ذكر الزيلعى انها تخلف الرجل فى عشر، وقد زدت أكثر من ضعفها ترفع يديها حذاء منكبيها، وَلَا تَخْرُجُ يَدَيْهَا مِنْ كُمَّيْهَا، وَتَضَعُ الْكَفَّ عَلَى الْكَفِّ تَحْتَ ثَدْيِهَا، وتنحنى فى الركوع قليلاً ولا تعتمد، ولا تفرج فيه أصابعها بل تضمها، وتضع يديها على ركبتيها، ولاتحنى ركبتيها، وتنضم فى ركوعها وسجودها، وتفترش ذراعيها، وتتورك فى التشهد وتضع فيه يديها تبلغ رؤوس أصابعها ركبتيها، وتضم فيه أصابعها، واذا نابها شىء فى صلاتها تصفق ولا تسبح، ولا تؤم الرجل، وتكره جماعتهن، ويقف الامام وسطهن، ويكره حضورها الجماعة، وتؤخر مع الرجال، ولا جمعة عليها، لكن تنعقد بها ولاعيد ولا تكبير تشريق، ولا يستحب ان تسفر بالفجر، ولا تجهر فى الجهرية، بل لو قيل بالفساد بجهرها لأمكن بناءً على ان صوتها عورة۔

ترجمہ: ''وہ امور جن میں عورتوں کی نماز کا طریقہ مردوں سے مختلف ہے،'' علامہ زیلعی'' نے

دس چیزوں کا ذکر کیا ہے اور (علامہ شامی بیان کرتے ہیں کہ) میں نے اضافہ کر کے ان مواقع کی تعداد دگنے سے بھی زیادہ کردی ہے اور وہ یہ ہیں:

عورت اپنے ہاتھ اپنے کندھوں تک ہاتھ اٹھائے گی، اور اپنے ہاتھوں کو چادر سے نہ نکالے، اپنے سینہ کے نیچے اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھے، رکوع میں کم جھکے زیادہ نہ جھکے، گھٹنوں پر زور نہیں ڈالے گی۔ رکوع میں اپنی انگلیوں کو گھٹنے پر کشادہ نہ رکھے بلکہ ملا کر رکھے، رکوع میں اپنے ہاتھ اپنی رانوں پر گھٹنوں تک رکھے، گھٹنوں کو خم (ٹیڑھا) نہ کرے، رکوع اور سجود میں گھٹنوں کو ملا کر رکھے، کلائیوں کو زمین پر بچھادے، تشہد میں اپنے کولہے کے اوپر بیٹھے گی، تشہد میں اپنے ہاتھ اس طرح رکھے گی کہ اس کی انگلیوں کے سرے گھٹنوں تک پہنچ جائیں اور اس میں اپنی انگلیوں کو ملا کر رکھے گی، اور (عورت کو باجماعت نماز میں امام کو اصلاح نماز کے لئے متوجہ کرنا ہو یا کوئی ضرورت لاحق ہو، مثلاً کوئی آدمی سامنے سے گزر رہا ہے تو اسے متوجہ کرنے کے لئے) وہ تصفیق کرے (یعنی داہنے ہاتھ کی انگلیاں بائیں ہاتھ کی پشت پر مارے) اور (بلند آواز سے) تسبیح یعنی سبحان اللہ نہ کہے، (عورت) مردوں کی امامت نہیں کرے گی، عورتوں کی جماعت مکروہ ہے اور (اگر عورتیں کہیں اپنی جماعت قائم کریں تو) اُن کی امام اُن کے وسط میں کھڑی ہوگی، عورت کا مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز کے لئے جانا مکروہ ہے اور وہ (اگر جماعت میں شامل ہو تو) مردوں کے پیچھے کھڑی ہوں گی، عورت پر جمعہ فرض نہیں ہے، لیکن (مرد کی امامت میں) عورتوں کی جماعت قائم ہو تو جمعہ ادا ہو جائے گا، عورت پر عید اور تکبیرات تشریق نہیں ہیں اور نہ اس پر صبح کی نماز سفیدی میں پڑھنا مستحب ہے، نہ وہ جہری نمازوں میں بلند آواز سے قرآن پڑھے بلکہ اگر عورت کے جہر کے ساتھ پڑھنے پر نماز کے فاسد ہونے کا قول کیا جائے، تو یہ اس بنا پر درست ہوگا کہ عورت کی آواز بھی عورت ہے۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، ص: 186، 187)

جاندار کی تصویر والا کپڑا پہن کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال: 27

کسی شخص نے ایسی شرٹ یا قمیص پہنی ہوئی ہو، جس پر جاندار کی تصویر بنی ہوئی ہے، تو کیا اُس شخص کی اپنی نماز ہو جائے گی؟ نیز اُس کے پیچھے کھڑے ہوئے لوگوں کی نماز کا کیا حکم ہے؟، (سید وسیم حسن، گودھرا، نیو کراچی)۔

جواب:

جس کپڑے پر کسی جاندار کی تصویر ہو اسے پہن کر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (ولبس ثوب فیه تماثیل) ذی رُوح، وان یکون فوقَ رَأْسِهٖ او بینَ یدیه او بحذائه یُمنۃ او یُسرۃ او محل سجودہٖ (تمثال) ولوفی وسادۃ منصوبۃ لامفروشۃ۔

ترجمہ: ''اور نمازی کو ایسے کپڑے پہننا مکروہ ہے، جس پر جاندار کی تصویر بنی ہو، اور اگر تصویر نمازی کے سر پر یعنی چھت پر ہو، یا سامنے ہو یا برابر دائیں یا بائیں یا سجدے کی جگہ پر ہو، سب کا حکم یہی ہے، خواہ کسی ایسے گاؤ تکیے پر ہو جو کھڑا کیا ہوا ہے، بچھا ہوا نہیں ہے،
(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 2، ص: 359، 360)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ اگر کسی کپڑے پر تصویریں چھپی ہوئی ہوں، اُس میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟، آپ جواب میں لکھتے ہیں: ''کسی جاندار کی تصویر جس میں اُس کا چہرہ موجود ہو اور اتنی بڑی ہو کہ زمین پر رکھ کر کھڑے ہو کر دیکھیں تو اعضاء کی تفصیل ظاہر ہو، اس طرح کی تصویر جس کپڑے پر ہو اس کا پہننا، پہنانا یا بیچنا، خیرات کرنا سب ناجائز ہے اور اسے پہن کر نماز مکروہِ تحریمی ہے، جس کا دوبارہ پڑھنا واجب ہے۔ ایسے کپڑے پر سے تصویر مٹادی جائے یا اُس کا سر یا چہرہ بالکل محو کر دیا جائے۔ اُس کے بعد اس کا پہننا، پہنانا، بیچنا، خیرات کرنا، اُس میں نماز، سب جائز ہو جائے گا۔ اگر وہ ایسے پکے رنگ کی ہو کہ مٹ نہ سکے دُھل نہ سکے تو ایسے ہی پکے رنگ کی سیاہی اُس

کے سر یا چہرے پر اس طرح لگادی جائے کہ تصویر کا اُتنا عضو محو ہوجائے، صرف یہ نہ ہو کہ اُتنے عضو کا رنگ سیاہ معلوم ہو کہ یہ محو منافیِ صورت نہ ہوگا''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 24، ص: 567، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

تصویر خواہ قمیص یا شرٹ کے اگلے حصے پر بنی ہوئی ہو یا پشت پر بنی ہوئی ہو، مکروہ ہے۔ جو لوگ اُس کے پیچھے کھڑے ہیں اُن کی نماز بھی مکروہ تحریمی ہوگی۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ویکرہ أن یصلی وبین یدیہ أوفوق رَأسہ أو علی یمینہٖ أوعلیٰ یسارہ أو فی ثوبہٖ تصاویر وفی البساط روایتان والصحیح أنہ لایکرہ علی البساط اذالم یسجد علی التصاویر۔۔۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: وأشدھا کراھۃ أن تکون أمامَ الْمُصَلّی ثُمَّ فَوْقَ رَأسِہٖ ثُمَّ یمینہٖ ثم یسارہٖ ثم خلفہٗ ھکذافی الکافی

ترجمہ: ''جہاں نمازی کے آگے یا چھت پر یا برابر دائیں یا بائیں (جاندار کی تصویر بنی) ہو، یا نمازی کے کپڑے پر تصویریں ہوں تو نماز مکروہِ تحریمی ہے۔ (ایسا کپڑا جس پر تصویریں بنی ہوں تو) اُسے بچھا کر اُس پر نماز پڑھنے (کی کراہت کے بارے) میں دو روایتیں ہیں اور صحیح یہی ہے کہ اُس پر نماز مکروہ نہیں ہے بشرطیکہ سجدہ تصویروں پر نہ کرے۔۔۔۔۔

آگے چل کر لکھتے ہیں: تصویر کے حوالے سے نماز کی شدید ترین کراہت کی ترتیب اس طرح ہے، سب سے زیادہ کراہت اس میں ہے کہ تصویر نمازی کے آگے ہو، پھر اس کے سر کے اوپر ہو، پھر اس کے دائیں جانب ہو، پھر اس کے بائیں جانب ہو، پھر اس کے پیچھے ہو، ''کافی'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 107، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

سجدۂ شکر کا شرعی جواز

سوال: 28

ایک معروف اخبار میں ایک مفتی صاحب سے سوال کیا گیا: ''سجدۂ شکر کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یہ کس طرح ادا کیا جاسکتا ہے؟'' تو مفتی صاحب نے جواب میں لکھا کہ ''سجدۂ شکر اکیلا نہیں ہوتا، کیوں کہ اکیلا سجدہ کوئی عبادت نہیں ہے۔ ہاں شکرانہ کے نوافل کے سجدوں کو

سجدۂ شکر کہا جاتا ہے''، آیا یہ درست ہے یا نہیں؟۔

(قاری محمد زمان چشتی، خطیب المصطفیٰ جامع مسجد، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی)

جواب:

مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ اکیلا سجدہ کوئی عبادت نہیں ہے، درست نہیں ہے۔ سجدۂ تلاوت بھی اکیلا سجدہ ہے، واجب ہے اور عبادت کی نیت سے ادا کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے چند احادیث مبارکہ ملاحظہ ہوں:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بُشِّرَ بِحَاجَةٍ فَخَرَّ سَاجِداً۔

(۱) انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو کسی حاجت کے پورا ہونے کی بشارت دی گئی تو (سنتے ہی) آپ (رب تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لئے) سجدے میں چلے گئے، (ابن ماجہ، رقم الحدیث: 1392)۔

عَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ أَبِيهِ قَالَ لَمَّا تَابَ اللهُ عَلَيهِ خَرَّ سَاجِداً۔

(۲) کعب بن مالک اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اُن (حضرت کعب رضی اللہ عنہ) کی توبہ قبول فرمائی تو وہ (رب تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لئے بے اختیار) سجدے میں چلے گئے، (ابن ماجہ، رقم الحدیث: 1393)۔

عَنْ أَبِي بَكْرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ اِذَا اَتَاهُ اَمْرٌ يَسُرُّهُ اَوْ يُسَرُّ بِهٖ خَرَّ سَاجِداً شُكْراً لِلّٰهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى۔

(۳) ابوبکرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی خوش خبری ملتی تو آپ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ ریز ہو جاتے، (ابن ماجہ، رقم الحدیث: 1394)۔

''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب یمامہ فتح کر لیا تو آپ بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہو گئے''۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، جلد: 2، ص 482-3)

''ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ''مُخدَج الید'' (ناقص ہاتھ والا شخص) لایا گیا تو آپ نے سجدۂ شکر ادا کیا''۔ (المصنف، جلد: 2، ص 482-3)

(یہ امت میں فتنہ برپا کرنے والا شخص تھا، جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے خبر دی تھی)
امام احمد بن حنبل اور امام محمد بن ادریس الشافعی کے نزدیک سجدۂ شکر مستحب ہے۔
علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وقال ابویوسف ومحمد رحمهما الله تعالیٰ هی قربة یثاب علیها وصورتها عندهما أن من تجددت عنده نعمة ظاهرة أو رزقه الله تعالیٰ ولداأو مالا أووجد ضالة أو اندفعت عنه نقمة أو شفی مریض له أوقدم له غائب یستحب له أن یسجد شکراً لِلّٰه تعالیٰ مستقبل القبلة یحمدالله فیها ویسبحه ثم یکبرأخریٰ فیرفع رأسه کما فی سجدة التلاوة کذافی السراج الوهاج۔ قال فی الحجة ولایمنع العباد من سجدة الشکر لمافیها من الخضوع والتعبد وعلیه الفتویٰ کذافی التتارخانیة۔

ترجمہ: ''امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک سجدۂ شکر اللہ تعالیٰ کی قربت کا ذریعہ ہے اور ان کے نزدیک اس پر اسے ثواب ملے گا اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ جسے کوئی ظاہری نعمت عطا ہو یا اللہ تعالیٰ اسے نعمتِ اولاد یا نعمتِ مال دے یا اسے کوئی گمشدہ چیز مل جائے یا اس سے کوئی تکلیف دور ہو جائے یا اس کے کسی مریض کو شفا مل گئی یا اس کا کوئی گم شدہ بندہ سلامتی کے ساتھ واپس آ گیا، تو اُس کے لئے مستحب ہے کہ قبلے کی طرف رُخ کر کے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ کرے، اُس (سجدے) میں اللہ تعالیٰ کی حمد اور تسبیح کے کلمات پڑھے، پھر اللہ اکبر کہہ کر سجدے سے سر اٹھائے، جیسا کہ سجدۂ تلاوت میں ہوتا ہے، ''سراج الوہاج'' میں اسی طرح ہے۔ ''الحُجّہ'' میں فرمایا: بندوں کو سجدۂ شکر سے منع نہ کیا جائے کیونکہ اس میں انتہائی درجے کی عاجزی ہے اور یہ بندگی کا قرینہ ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ ''فتاویٰ تتارخانیہ'' میں اسی طرح ہے''۔ (عالمگیری، جلد: 1، ص: 135-6)
علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

وسجدةُ الشکرِ مستحبةٌ، بهٖ یُفتی، لکنها تکره بعدالصلاة، لِأَنَّ الْجَهَلَةَ یعتقدونها سنة أوواجبة وکل مباح یؤدی الیه فمکروه۔

ترجمہ: ''سجدۂ شکر مستحب ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، لیکن نماز کے بعد (متصلاً) مکروہ ہے، کیونکہ جاہل لوگ اس کے سنت یا واجب ہونے کا اعتقاد کرنے لگیں گے اور ہر مباح امر جسے لوگ سنت یا واجب سمجھنے لگیں، مکروہ ہے''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی نے تفصیلی بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے: اس مقام پر انہوں نے ''سراج الوہاج'' کی وہ عبارت (جس کے بارے میں عالمگیری کا حوالہ گزر چکا ہے) لکھ کر اسے ''مُفتیٰ بہٖ'' قرار دیا ہے اور یہ صاحبین کا قول ہے۔۔۔ آگے چل کر علامہ شامی ''حلیہ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں: متعدد احادیثِ مبارکہ اور خلفائے راشدین سے سجدۂ شکر ثابت ہے اور فعلِ رسول ﷺ کو منسوخ قرار دینے کی بات بھی صحیح نہیں ہے، ''فروق الاشباہ'' میں ہے: سجدۂ شکر جائز ہے، واجب نہیں ہے، امام اعظم سے جو اس کا مشروع نہ ہونا روایت کیا گیا ہے، اس کی توجیہہ یہ ہے کہ یہ واجب یا سنت نہیں ہے بلکہ مستحب ہے، البتہ نماز کے فوراً بعد مکروہ ہے تاکہ جاہل لوگ اسے واجب یا سنت نہ سمجھنے لگیں۔ علامہ ابن عابدین شامی مزید فرماتے ہیں:

وحاصلہ أن مالیس لھا سبب لاتکرہ مالم یؤد فعلھا الی اعتقاد الجھلۃ سنیتھا کالتی یفعلھا بعض الناس بعد الصلاۃ،

ترجمہ: ''اس تفصیلی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں کوئی سببِ کراہت نہ ہو، اُس فعل کو مکروہ قرار دینا درست نہیں ہے تاوقتیکہ جاہل لوگ اسے سنت سمجھنے لگیں، جیسے بعض لوگ نماز کے بعد کرتے ہیں، (ردالمحتار، جلد: 2، ص: 522,521)''۔

اگر کسی ایسے امر کے بارے میں جو حدیث سے ثابت ہے، امام اعظم کا قول عدمِ جواز یا کراہت کا ہو تو اس کی تاویل کی جائے گی یا یہ سمجھا جائے گا کہ امام اعظم تک وہ حدیث نہیں پہنچی، کیونکہ آپ کا ارشاد ہے: ''جب کسی مسئلے کے بارے میں ثابت ہو جائے کہ اس کی بابت حدیثِ صحیح موجود ہے تو سمجھو کہ یہی میرا مذہب ہے''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے پوچھا گیا: ''بندوں کو قرب الی اللہ کا مرتبہ

علاوہ نماز بھی ہوتا ہے؟۔آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا:''ہاں!ہر سجدے میں رب کے قریب ہوتا ہے اور سجدے چار قسم کے ہیں:(۱)سجدۂ نماز(۲)سجدۂ تلاوت(۳)سجدۂ سہو،(۴)سجدۂ شکر''

اُن سے پھر دریافت کیا گیا:سجدۂ شکر مسنون ہے یا مستحب؟،آپ نے ارشاد فرمایا: سنّت مستحبہ ہے،جس وقت ابوجہل لعین کا سر کٹ کر سرکار میں آیا،سجدۂ شکر فرمایا۔

(الملفوظ مع وصایا شریف،ص:78،مطبوعہ:قادری کتاب گھر اسلامی مارکیٹ،بریلی)

علامہ غلام رسول سعیدی نے اس مسئلے پر تفصیلی بحث کی ہے،شرح صحیح مسلم،جلد:خامس، صفحات:570تا581ملاحظہ ہو۔

بعد نمازِ عشاء با آوازِ بلند تلاوتِ قرآن مجید کرنا جبکہ لوگ نماز میں مشغول ہوں

سوال:29

بعض مساجد میں معمول ہے کہ روزانہ بعد نمازِ عشاء سورۂ ملک تلاوت کی جاتی ہے۔ ایک شخص تلاوت کرتا ہے اور کچھ نمازی جو اپنی نماز پڑھ چکے ہوتے ہیں،سنتے ہیں۔لیکن بعض نمازی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو اپنی بقیہ نماز یا نوافل یا اگر دیر سے آئے ہوں تو اپنی فرض نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں،وہ تلاوتِ قرآن سن نہیں پاتے اور اُن کی نماز میں خلل بھی واقع ہوتا ہے۔اب اس صورت میں کیا طریقہ اختیار کیا جائے،سورۂ ملک کی تلاوت جو بلند آواز سے کی جارہی ہے،وہ بند کرائی جائے یا دیگر نمازی اپنی نماز اور نوافل چھوڑ دیں اور تلاوتِ قرآن مجید سنیں؟،(محمد افتخار اللہ قادری،مانسہرہ)۔

جواب:

جب قرآن مجید پڑھا جائے تو خاموش رہنا اور غور سے سننا فرض ہے،اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ O

ترجمہ:''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے،(الاعراف:204)''۔

لیکن اگر کسی ایسی جگہ کہ جہاں لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہیں، وہاں کوئی شخص بلند آواز سے تلاوت کرتا ہے تو وہ تلاوت کرنے والا خود ہی گناہ گار ہوگا۔

علامہ ابن عابدین شامی "یجب الاستماع للقرأة مطلقًا" کی شرح میں لکھتے ہیں:

(یجب الاستماع للقرأة مطلقاً) ای فی الصلاة وخارجها، لأن الآیة وان کانت واردة فی الصلاة علی ما مرفالعبرة لعموم اللفظ لالخصوص السبب، ثم هذا حیث لاعذر ولذا فی القنیة صبیٌ یقرأ فی البیت واهله مشغولون بالعمل یعذرون فی ترک الاستماع ان افتتحوا العمل قبل القراءة والّا فلا، وکذا قرأة الفقه عند قرأة القرآن۔ وفی الفتح عن الخلاصة رجل یکتب الفقه وبجنبه رجل یقرأ القرآن فلا یمکنه استماع القرآن فالاثم علی القاری، وعلی هذا لوقرأ علی السطح والناس نیام یأثم أی لأنه سبباً لاعراضهم عن استماعه، أو لأنه یؤذیهم بایقاظهم۔ تأمل۔

ترجمہ: "(قرآن مجید کا سننا مطلقاً واجب ہے) یعنی نماز اور خارجِ نماز دونوں حالت میں (قرآن سننا واجب ہے)، یہ آیت اگرچہ نماز کے متعلق وارد ہوئی ہے، جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا ہے، لیکن اعتبار خصوصیت سبب کا نہیں، عمومِ الفاظ کا ہوتا ہے اور یہ حکم اُس وقت ہے جب کوئی عذر نہ ہو جیسا کہ "قنیہ" میں مذکور ہے: گھر میں بچہ قرآن مجید پڑھ رہا ہو اور گھر والے کام کاج میں مصروف ہوں تو وہ نہ سننے میں معذور ہیں، بشرطیکہ انہوں نے اُس کے پڑھنے سے پہلے کام شروع کیا ہو، ورنہ وہ معذور نہیں ہوں گے۔ اور اسی طرح فقہ (کی کتاب) پڑھنے والے کے پاس قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے کا حکم ہے اور "فتح القدیر" میں "خلاصۃ الفتاویٰ" کے حوالے سے منقول ہے: ایک شخص فقہی مسائل لکھ رہا ہے اور اس کے پاس کوئی شخص (بلند آواز سے) قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے اور اس کے لئے (اپنی علمی مصروفیت کی وجہ سے) توجہ کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کا سننا عملاً دشوار ہے، تو اس کا گناہ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے پر ہوگا، اسی طرح لوگ سوئے ہوئے ہیں اور ایک شخص چھت پر بیٹھ کر (بلند آواز سے) تلاوت کرتا ہے، تو (لوگوں کے نہ

سننے کا) گناہ تلاوت کرنے والے پر ہوگا، کیونکہ لوگوں کے تلاوت قرآن کی طرف توجہ نہ کرنے کا سبب وہی شخص بن رہا ہے یا اس لئے کہ وہ انہیں جگا کر اذیت دے رہا ہے، اس مسئلے میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔۔۔۔ پھر آگے چل کر ''غنیۃ المستملی'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

إنه يجب عَلى القَارِی احترامه بِأن لايقرأه فی الاسواق ومواضعَ الاشتغال، فَإذَا قرأهُ فِيها كَان هو المُضيعُ لحرمته، فَيَكُون الاثم عليه دون أهل الاشتغال دفعاً لِلحرج

ترجمہ: ''قرآن کریم پڑھنے والے پر اس کا احترام واجب ہے اس طور پر کہ وہ بازاروں میں (بلند آواز سے) قرآن مجید نہ پڑھے اور ان مقامات پر بھی قرآن کریم نہ پڑھے جہاں لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہوں، کیونکہ جب کوئی شخص ان مقامات پر قرآن کی (بلند آواز سے) تلاوت کرے گا تو قرآن مجید کے احترام کو ضائع کرنے والا وہی بنے گا اور گناہ اسی پر ہوگا نہ کہ اپنے کام کاج میں مصروف لوگوں پر، (عام لوگوں) سے حرج کو دور کرنے کے لئے (یہی مسئلے کی بہتر توجیہ ہے)''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2،ص: 237،238، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''جمعہ کی اذان کے بعد بہت سے آدمی مسجد میں جمع ہوکر ''سورۂ کہف'' پڑھتے ہیں بلند آواز سے، اور بغیر پڑھے جو لوگ ہیں یعنی اَن پڑھ نمازی بھی ہوتے ہیں، وہ شوق سے سورۂ کہف سنتے ہیں اور بعض نمازی جو دیر سے آتے ہیں وہ نفل پڑھ کر سنتے ہیں، نفل پڑھنے والے کہتے ہیں کہ سورۂ کہف بلند آواز سے مت پڑھو، ہمارے نفل میں خرابی آتی ہے، نفل کا ثواب زیادہ ہے یا سورۂ کہف پڑھنے کا؟ آیا سورۂ کہف کو بلند آواز سے پڑھیں یا نہیں یا نفل نماز کو چھوڑ دیں''؟۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز جواب میں لکھتے ہیں: حدیث صحیح میں قرآن مجید با آواز ایسی جگہ پڑھنے سے جہاں لوگ نماز پڑھ رہے ہوں، ممانعت فرمائی ہے اور قرآن عظیم نے حکم فرمایا ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے، کان لگا کر سنو اور چپ رہو،

(سورۂ اعراف: 204)، تو ایسی جگہ جہر سے پڑھنا ممنوع اور دو یا زیادہ آدمیوں کا باآواز پڑھنا اور شدید ممنوع کہ مخالف حکمِ قرآن اور قرآن عظیم کی بے حرمتی ہے۔ ان لوگوں کو چاہئے کہ آہستہ پڑھیں اور نفل پڑھنے والے نفل سے نہیں روکے جاسکتے، نفل نماز مستحب، تلاوت سے افضل ہے کہ اُس میں تلاوت بھی ہے، رکوع وسجود بھی''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 6،ص: 338، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

جو صورتِ مسئلہ آپ نے بیان کی ہے، مذکورہ بالا تفصیلی بحث ودلائل کی روشنی میں یہ طریقہ کار درست نہیں ہے۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ ''سورۃ الملک'' کی تلاوت کرنے والا اور اس کے سامعین مسجد میں الگ کسی کونے میں بیٹھیں اور صرف اتنی بلند آواز سے پڑھیں جو اُن کے سننے والوں تک پہنچ جائے اور نوافل پڑھنے والوں کا ذہن منتشر نہ ہو۔ اور اگر مسجد بڑی ہے تو نوافل پڑھنے والے بھی ذرا فاصلے پر کھڑے ہوکر نوافل پڑھیں اور اس سے بھی زیادہ بہتر صورت یہ ہے کہ آج کل متفرق سورتیں چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں مطبوعہ ملتی ہیں، وہ تمام لوگ جو تلاوت کرسکتے ہیں، ایک طرف بیٹھ کر اپنی اپنی تلاوت کریں اور پھر اجتماعی دعا کرنی ہو تو کرلیں۔

نماز میں امام کی اتباع کب نہیں کی جائے گی

سوال:30

اگر امام دورکعت والی نماز (نمازِ فجر یا تراویح) میں تیسری رکعت یا چار رکعت والی نماز میں پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہوجائے، کیا امام کی اتباع مقتدی کو کرنا چاہئے؟، یا مقتدی لقمہ دیں؟، اس مسئلے میں مقتدی کیلئے کیا حکم ہے؟، (محمد اعیان احمد، سیکٹر D-11، نارتھ کراچی)

جواب:

فقہاء لکھتے ہیں کہ چار چیزیں وہ ہیں کہ اگر امام کرے تو مقتدی اس کا ساتھ نہ دیں، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَاَرْبعۃُ اَشیاءَ اذا تعمد الامام لایتابعہ المقتدی۔۔۔۔او قام الی الخامسۃ

ساهیا کذا فی الوجیز الکردری۔ فان لم یقید الخامسة بالسجدة وعاد وسلم سلم المقتدی معه وان قید الخامسة بالسجدة سلم المقتدی۔ ولو لم یقعد الامام علی الرابعة وقام الی الخامسة ساهیا وتشهد المقتدی وسلم ثم قید الامام الخامسة بالسجدة فسدت صلاتهم کذا فی الخلاصة

ترجمہ: ''چار چیزیں وہ ہیں کہ مقتدی اس میں امام کی متابعت نہ کرے۔۔۔۔۔۔اُن میں سے ایک یہ کہ امام قعدۂ اخیرہ کرنے کے بعد بھول کر پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہوجائے (تو مقتدی کھڑا نہ ہو) جیسا کہ ''الوجیز الکردری'' میں ہے۔ (مقتدی اُس کے لوٹنے کا انتظار کریں)، پس اگر اُس نے پانچویں رکعت کا سجدہ نہیں کیا اور لوٹ آیا اور سلام پھیر دیا تو مقتدی بھی اُس کے ساتھ سلام پھیر دیں۔ اور اگر اُس نے پانچویں رکعت کا سجدہ کرلیا تو مقتدی تنہا سلام پھیر دیں (اس طرح مقتدی کی نماز صحیح طور پر ادا ہوجائے گی) اور اگر امام نے چوتھی رکعت پر قعدہ نہیں کیا تھا اور بھول کر پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا اور پانچویں رکعت کا سجدہ بھی کرلیا تو اب سب کی نماز فاسد ہوگئی، اگرچہ مقتدیوں نے تشہد پڑھ کر سلام پھیرا ہو، کیونکہ مقتدی کی نماز کے صحیح ہونے کا مَدار امام کی نماز کے صحیح ہونے پر ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:90، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

جب فسادِ نماز کا خدشہ ہو تو امام احمد رضا قادری قدس سرہُ العزیز لکھتے ہیں: ''امام کو لقمہ دینا ہر نماز میں جائز ہے، جمعہ ہو یا کوئی نماز، بلکہ اگر اس نے ایسی غلطی کی جس سے نماز فاسد ہوگی تو لقمہ دینا فرض ہے، نہ دے گا اور اس کی تصحیح نہ ہوگی تو سب کی نماز جاتی رہے گی اور لقمہ دینے سے سجدۂ سہو نہیں آتا''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 7، ص:289، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

گاؤں میں جمعہ کا قیام

سوال:31

ایک گاؤں میں پچاس گھر ہیں، یہاں نمازِ جمعہ کا کیا حکم ہے؟، (حافظ سمیع اللہ، راولپنڈی)

جواب:

نمازِ جمعہ کی ادائیگی کیلئے احناف کے نزدیک چھ شرائط ہیں، جن میں سے ایک ''شہر'' ہونا ضروری ہے۔

عَنْ اَبِیْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ قَالَ قَالَ عَلِیٌّ لَا جُمُعَۃَ وَلَا تَشْرِیْقَ وَلَا صَلٰوۃَ فِطْرٍ وَلَا اَضْحٰی اِلَّا فِیْ مِصْرٍ جَامِعٍ اَوْ مَدِیْنَۃٍ عَظِیْمَۃٍ

ترجمہ: ''ابوعبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی نے فرمایا: ''شہر اور بڑے قصبہ کے سوا جمعہ ہے نہ تشریق نہ عیدالفطر نہ عیدالاضحیٰ، (المصنف ابن ابی شیبہ، جلد 2، ص: 101)''۔

عَنْ حُذَیْفَۃَ قَالَ لَیْسَ عَلٰی اَھْلِ الْقُرٰی جُمُعَۃٌ اِنَّمَا الْجُمُعُ عَلٰی اَھْلِ الْاَمْصَارِ

ترجمہ: ''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''دیہات والوں پر جمعہ نہیں، جمعہ صرف شہر والوں پر ہے، (المصنف ابن ابی شیبہ، جلد 2، ص: 168)''۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

فی التحفة عن ابی حنیفة أنه بلدة کبیرة فیها سکك وأسواق ولها رساتیق وفیها وال یقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه أو علم غیره یرجع الناس الیه فیما یقع من الحوادث، وهذا هو الاصح

ترجمہ: '''' تحفہ'' میں امام ابوحنیفہ سے یہ روایت منقول ہے کہ شہر اس بڑی جگہ کو کہتے ہیں جہاں گلیاں اور بازار ہوں، مضافاتی علاقہ ہو اور اس میں ایک ایسا حاکم ہو جو اپنے اقتدار کے دبدبے (اور طاقت سے) اور اپنے (ذاتی) علم یا دوسرے کے علم سے (یعنی قاضی کے ذریعے) مظلوم کو ظالم سے انصاف دلا سکے، لوگ اپنے پیش آمدہ معاملات میں اس کی طرف رجوع کریں، یہی صحیح تعریف ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص: 7، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

اس تعریف کے لحاظ سے شہر کے ثبوت کے لئے مندرجہ ذیل امور ضروری ہیں:

(1) اشیائے ضرورت کے لئے بازار اور دکانیں (2) قوتِ حاکمہ اور عالمِ دین۔

مذکورہ دلائل کی روشنی میں دیہات میں جمعہ قائم نہیں کیا جائے گا اور اگر پہلے سے ہو رہا ہو تو اسے بند بھی نہیں کیا جائے گا، بلکہ جمعہ پڑھنے کے بعد چار رکعت ظہر احتیاطی ادا کی جائیں۔

جماعت میں چھوٹی سورتوں کی تلاوت

سوال: 32

اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہمارے امام حضرات نماز میں چھوٹی سورتوں کی آخری تین آیات کی قراءت کرتے ہیں، مثلاً سورۃ الضحیٰ اور سورۃ التین کی آخری تین آیات اور ایک امام صاحب نے سورۃ الحشر کی آخری ایک ہی آیت کی قرأت کی۔ کیا اس سے نماز ہو جاتی ہے؟، تفصیل سے آگاہ فرمائیں کہ کون سی سورتیں مکمل پڑھنی چاہئیں اور کون سی سورتوں کی کوئی بھی کم از کم تین آیات پڑھی جا سکتی ہیں؟، (امجد حسین، سرائے عالمگیر)۔

جواب:

نماز میں ''قرأتِ قرآن'' مطلقاً فرض ہے اور یہ سورۂ مزمل کی آیت نمبر: 4 اور آخری آیت سے مستفاد ہے، جو قیام اللیل (یعنی نوافلِ شب) کے سیاق وسباق میں ارشاد ہوا:

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ اور فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ

ترجمہ: ''جتنی مقدارِ تلاوت تمہارے لئے آسان ہو پڑھ لیا کرو، (المزمل: 20)''۔

تعیین کے ساتھ سورۂ فاتحہ کی قرأت واجب ہے، اسی طرح سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد ''ضمِ سورت'' یعنی سورت کے ملانے کو آئمۂ کرام نے واجب قرار دیا ہے، جس کی کم از کم مقدار قرآن مجید کی سب سے چھوٹی سورت (یعنی سورۃ الکوثر) یا سب سے چھوٹی تین آیات جو کسی ایک مقام پر متصل آئی ہوں، جیسے: ثُمَّ نَظَرَ ﴿٢١﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَ بَسَرَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿٢٣﴾ (المدثر: 21 تا 23) کے مساوی ہو یا کسی طویل آیت کا اتنا حصہ جو اس مقدار کے مساوی ہو، اس کی مقدار تعدادِ حروف کے اعتبار سے علامہ ابن عابدین شامی نے 30 حروف بتائی ہے اور امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے مکتوب الفاظ (Written Alphabets) کے اعتبار سے 28 حروف اور ملفوظ کلمات (Spoken

(Alphabets) کے اعتبار سے 25 حروف بتائی ہے۔

اس مسئلے کی مکمل تفصیل ہم تفہیم المسائل کی پہلی جلد میں بیان کر چکے ہیں، لہٰذا امام صاحب کی قرأت درست ہے، لیکن واضح رہے کہ امام کا کسی ایک نماز یا ہر نماز کے لئے کسی ایک سورت کا متعین کر لینا کہ ہر نماز میں اسی سورت کی تلاوت کرتا رہے، درست نہیں ہے اور امام کو چاہئے کہ کم از کم مقدارِ فرض وواجب پر انحصار نہ کرے بلکہ نماز با جماعت میں سنت رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرے، تاہم اتنی طویل تلاوت نہ کرے کہ جماعت میں شامل مقتدیوں پر گراں گزرے اور اس سے ان کے خشوع وخضوع اور حضوریٔ قلب میں فرق واقع ہو، حدیثِ پاک میں ہے:

(1) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ لِلنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ، فَاِنَّ مِنْهُمُ الضَّعِيْفَ وَالسَّقِيْمَ وَالْكَبِيْرَ، وَاِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ لِنَفْسِهٖ فَلْيُطَوِّلْ مَا شَآءَ۔

ترجمہ: ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص لوگوں کو نماز پڑھائے (یعنی امامت کرے) تو اسے چاہئے کہ (مقدارِ قراءت میں) تخفیف کرے، کیونکہ اُن میں (جماعت میں شامل لوگوں میں) بعض لوگ کمزور ہوتے ہیں اور بعض بیمار یا بوڑھے ہوتے ہیں (یعنی زیادہ دیر تک نماز میں قیام اُن کے لئے دشوار ہوتا ہے) اور جب تم میں سے کوئی شخص تنہا نماز پڑھے تو وہ (اپنی استطاعت اور ذوق کے مطابق) جتنی چاہے، لمبی نماز پڑھے“۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث:703)

اَخْبَرَنِیْ اَبُوْمَسْعُوْدٍ اَنَّ رَجُلًا قَالَ وَاللهِ يَا رَسُوْلَ اللهِ، اِنِّیْ لَاَتَاَخَّرُ عَنْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ مِنْ اَجْلِ فُلَانٍ، مِمَّا يُطِيْلُ بِنَا، فَمَا رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ فِیْ مَوْعِظَةٍ اَشَدَّ غَضَبًا مِنْهُ يَوْمَئِذٍ، ثُمَّ قَالَ اِنَّ مِنْكُمْ مُنَفِّرِيْنَ، فَاَيُّكُمْ مَا صَلّٰى بِالنَّاسِ فَلْيَتَجَوَّزْ، فَاِنَّ فِيْهِمُ الضَّعِيْفَ وَالْكَبِيْرَ وَذَا الْحَاجَةِ۔

ترجمہ: ”حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول کریم ﷺ

کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میں فلاں شخص کی وجہ سے نمازِ فجر سے رہ جاتا ہوں کیونکہ وہ ہمیں طویل نماز پڑھاتے ہیں۔ حضرت ابومسعود کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اُس دن کے مقابلے میں کبھی وعظ ونصیحت کے موقع پر اتنا غضبناک نہیں دیکھا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: تم لوگوں کو (دین سے) متنفر کرنے والے ہو، پس تم میں سے جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے (یعنی امامت کرے) تو اسے چاہئے کہ (مقدارِ قراءت میں) تخفیف کرے کیونکہ ان میں (یعنی جماعت میں شامل لوگوں میں سے) بعض لوگ کمزور یا بوڑھے یا کام کاج والے ہوتے ہیں، (یعنی زیادہ دیر تک نماز میں قیام اُن کے لئے دشوار ہوتا ہے)''۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث:702)

مانعِ حمل ذرائع اختیار کرنے کا جواز

سوال:33

ہمارے علاقے کی مسجد کے امام صاحب نے گذشتہ دنوں اپنی بیوی کی نس بندی کروا دی ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا اُن کا یہ عمل درست ہے اوران کے پیچھے نماز درست ہوگی؟ (میاں عبدالرشید، راجوری، مقبوضہ کشمیر)

جواب:

زمانۂ قدیم میں امتناعِ حمل کے لئے ایک طریقہ ''عزل'' رائج تھا، امام غزالی نے اپنے زمانے کے حالات، ضروریات اور وسائل کے اعتبار سے عزل کی پانچ صورتیں بیان کی ہیں: ایک صورت حرام، ایک بدعت اور تین صورتیں جائز قرار دی ہیں۔ موجودہ ترقی یافتہ دور میں منعِ حمل کے مختلف جدید ذرائع موجود ہیں، بہت سے نئے اسباب اور وسائل وجود میں آچکے ہیں، ضروریات اور تقاضے بڑھ گئے ہیں اور مسائل بھی زیادہ ہیں۔ ہمارے نزدیک امتناعِ حمل کے درجِ ذیل طریقے شرعاً جائز ہیں:

(1) کھانے والی گولیاں (Tablets)

(2) انجکشن (3) کیمیاوی اشیاء (Chemical Method) مثلاً فوم جیلی اور کریم

وغیرہ کا بیرونی استعمال

(4) کنڈومز (Condoms) (5) ڈایافرام (6) چھلہ (Loop)

(7) نل بندی (Tubal Ligation)

نل بندی (Tubal Ligation) کے عمل میں عورت کے بیضہ دان کی نالی (Fallopian Tube) کو کاٹ کر باندھ دیا جاتا ہے، یہ عمل صرف اس صورت میں جائز ہے جب کوئی ماہر مسلمان ڈاکٹر یہ کہے کہ بچہ پیدا ہونے یا مزید بچے پیدا ہونے سے عورت کی ہلاکت کا ظنِ غالب ہے یا یہ کہ عورت کے بچے آپریشن کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتے اور مزید آپریشن کرنے سے عورت کی ہلاکت کا اندیشہ ہے، طبی اصطلاح میں ایسی عورت کو Caesarean کہتے ہیں، ان صورتوں میں نل بندی صرف جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے، کسی طبی سبب کے بغیر یہ طریقہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔

ضبطِ تولید کا ایک طریقہ نس بندی (Vasec Tomy) ہے، جس میں مرد کی جن نالیوں سے تولیدی جرثومے (Sperm) گزرتے ہیں، ان نالیوں کو کاٹ کر باندھ دیا جاتا ہے، یہ طریقہ شرعاً ممنوع اور ناجائز ہے، کیونکہ اس سے مرد بانجھ ہو جاتا ہے، اس کے مقابل عورت کی نل بندی کی جاتی ہے، جس کا حکم اوپر بیان کیا جاچکا ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہم نے شرح صحیح مسلم، جلد:3، ص: 887 تا 891 میں اس مسئلے پر مفصل بحث کی ہے، جس میں مندرجہ بالا صورتوں کے علاوہ چند صورتیں اور بیان کی ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ اگر سلسلۂ تولید کو قائم رکھنے سے عورت کے شدید بیمار ہونے کا خدشہ ہو تو ضبطِ تولید جائز ہے۔

۲۔ مسلسل پیدائش سے بچوں کی تربیت اور نگہداشت میں حرج کا خدشہ ہو تو وقفے سے پیدائش کے لئے ضبطِ تولید جائز ہے، کیونکہ جب گھر میں صرف ایک عورت ہو اور نو، دس ماہ بعد دوسرا بچہ آجائے تو اس کے لئے دونوں کو سنبھالنا مشکل ہوتا ہے۔

۳۔ حمل اور وضع حمل کے وقفوں کے دوران بعض صورتوں میں زوجین اپنی جنسی خواہش

پوری نہیں کر سکتے، اس لئے اس مقصد کی خاطر حمل میں وقفہ کرنے کے لئے امتناعِ حمل کے جائز ذرائع استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

۴۔ اگر کوئی شخص عورت سے محبت کی وجہ سے اس کو ایامِ حمل، دردِ زہ اور زچگی کی تکالیف سے بچانا چاہتا ہو تو یہ جائز ہے۔

۵۔ عام طور پر بچوں کی مسلسل پیدائش سے عورت کا حسن و جمال کم یا ختم ہو جاتا ہے، اس لئے عورت کے حسن و جمال کو قائم رکھنے کیلئے امتناعِ حمل کے جائز طریقے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

امام غزالی نے فرمایا ہے:

۶۔ زیادہ بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی خاطر انسان کو آمدنی کے لئے زیادہ محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے، انسان دوہری تہری نوکریاں اور اوور ٹائم کرتا ہے اور بسا اوقات ناجائز وسیلوں کو بھی اختیار کرتا ہے۔ لہٰذا اپنے آپ کو استطاعت سے زیادہ محنت و مشقت سے بچانے اور مالی بوجھ کم کرنے کے لئے یہ عمل جائز ہے، کیونکہ جس قدر آمدنی کے لئے مشقت کم ہوگی وہ اتنا ہی عبادت کے لئے فارغ ہوگا، امام غزالی نے بھی اس سبب کو جائز قرار دیا ہے۔ اس بحث میں انہوں نے لکھا ہے کہ ہم نے اسلامی قانون کی ان حکمتوں کے تحت یہ رائے قائم کی ہے جو عدمِ حرج اور یُسر پر مبنی ہیں۔ اس بحث کو خالص مادہ پرستانہ اور لادینی سوچ سے الگ سمجھا جائے۔

مندرجہ بالا تحقیق کے مطابق اگر آپ کے امام صاحب نے امتناعِ حمل کی کوئی جائز صورت اختیار کی ہے تو اس سے ان کی اہلیتِ امامت پر کوئی زَد نہیں پڑتی۔ تاہم یہ امر ملحوظ رہے کہ ان تمام صورتوں کا تعلق اسبابِ منعِ حمل سے ہے، اسقاطِ حمل (Abortion) سے نہیں ہے۔

خطابت کی اہلیت اور خطیب کے فرائض

سوال: 34

ہماری مسجد کے سابق خطیب صاحب جو مسجد کمیٹی کے صدر بھی تھے، کا انتقال ہو گیا،

اُن کی جگہ کمیٹی نے دوسرے خطیب کو مقرر کیا، جن کا کام صرف اور صرف نمازِ جمعہ سے قبل بیان کرنا ہے۔ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ خطیب صاحب بیان سے فارغ ہونے کے بعد امام مسجد کی اجازت کے بغیر زبردستی خطبہ دے کر نماز پڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔ خطیب صاحب کی اس حرکت سے تمام نمازی حضرات میں بھی ناراضگی پائی جاتی ہے۔ امامِ مسجد کی موجودگی میں امام مسجد سے پوچھے بغیر خطیب ہو یا امام مسجد کا پیر ہو یا کوئی اور بڑا عالم ہو، کیا اپنی مرضی سے نماز یا نمازِ جمعہ پڑھا سکتا ہے یا امام مسجد کی اجازت ضروری ہے؟

(ظہور احمد، لیاقت آباد، کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں مسجد کمیٹی کو چاہیے کہ ایک ہی شخص کو نمازِ جمعہ کے لئے خطیب مقرر کرے، اگر وہ شخص اہل ہے اور اس میں امامت کی تمام شرائط پائی جاتی ہیں اور کراہت کی کوئی شرعی وجہ بھی موجود نہیں ہے تو اسی کو نمازِ جمعہ کی امامت کے لئے مقرر کر دیں۔ اُس خطیب کے نماز پڑھانے پر لوگوں کی ناراضگی اگر کسی شرعی عذر کے سبب نہیں بلکہ محض ذاتی انا کے تحت ہے تو کوئی معنی نہیں رکھتی۔ صورتِ مسئولہ میں مسجد کمیٹی کو یہ طے کرنا ہے کہ انتظامیہ نے اُس شخص کو مکمل خطیب مقرر کیا ہے یا صرف نماز سے قبل بیان کے لئے مقرر کیا ہے۔ اگر خطیبِ جمعہ مقرر کیا تھا تو عرفِ عام میں نمازِ جمعہ پڑھانے کا بھی اُسے حق حاصل ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

اذن الامیر فی الخطبة اذن فی الجمعة واذنه فی الجمعة اذن فی الخطبة ولو قال اخطب لهم ولا تصل أجزأه أن يصلی بهم كذا فی الزاهدی۔

ترجمہ: ''امیر کا کسی شخص کو خطبہ کی اجازت دینا، نمازِ جمعہ (پڑھانے) کی اجازت دینا ہے، اور جمعہ کی اجازت دینا خطبہ کی اجازت دینا ہے۔ اگر اُس نے کہا ہو کہ لوگوں کو خطبہ دیں اور نماز (جمعہ) نہ پڑھائیں، تب بھی خطبے کی اجازت نماز پڑھانے کی اجازت کے لئے کافی ہے، ''زاہدی'' میں بھی اسی طرح ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1 ص: 146، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وفی السراجیۃ لو صلی احدٌ بغیر اذن الخطیب لایجوز، الّا اذا اقتدی بہ من لہ ولایۃ الجمعۃ۔

ترجمہ: ''سراجیہ'' میں ہے: اگر خطیب کی اجازت کے بغیر کسی نے جمعہ پڑھایا تو جائز نہیں، سوائے اس صورت کے کہ جسے نمازِ جمعہ خود پڑھانے یا اُس کا امام مقرر کرنے کی ولایت حاصل ہے، وہ خود بھی اس شخص کی اقتدا میں نماز پڑھ رہا ہو (یعنی اس صورت میں اس کا امام بنا جائز ہوگا)۔ اس کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں کہ جسے امام وخطیب جمعہ مقرر کرنے کا اختیار ہے، اس کا خود کسی امام کی اقتداء میں جمعہ پڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ اُسے اس کی اجازت حاصل ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص: 12، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

البتہ اگر لوگوں کی اکثریت کسی شخص کی امامت پر کسی شرعی سبب کی بنا پر ناراض ہو تو اس کا امام یا خطیب مقرر کیا جانا درست نہیں ہے۔

عَنْ عَبدِ اللهِ بنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ ثَلٰثَةٌ لَا تُقْبَلُ لَهُمْ صَلَاةٌ الرَّجُلُ يَؤُمُّ الْقَوْمَ وَهُمْ لَهٗ كَارِهُوْنَ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین اشخاص کی نماز قبول نہیں کی جاتی، (اُن میں سے) ایک وہ شخص ہے جو کسی قوم کی امامت کرے، حالانکہ وہ لوگ اُسے ناپسند کرتے ہوں، (سنن ابن ماجہ، باب من أم قومًا وھم لہ کارھون، رقم الحدیث: 970)''۔ البتہ اگر کسی شخص یا چند اشخاص کا کسی شخص کی امامت پر اختلاف محض ذاتی عناد اور انانیت کے سبب ہے تو شرعاً اس کا اعتبار نہیں ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا:

''جس امام سے جماعت کے بعض آدمی ناراض ہوں اور بعض اس کی خوشامد کرتے ہوں تو ایسے کی اقتدا کرنا جائز ہے یا نہیں؟''۔ آپ نے جواب میں لکھا:

''(مقتدیوں کی) رنجیدگی (کی وجہ) دیکھی جائے گی، اگر اُس میں کسی قصور شرعی کی وجہ

سے ہے تو اُسے امام بننا گناہ ہے اور بحکمِ حدیث اُس کی نماز مقبول نہ ہوگی: ثَلٰثَۃٌ لَا تُرْفَعُ صَلَاتُھم فَوقَ آذانھم شبراً۔ الیٰ ان قال ﷺ وَمَنْ اَمَّ قومًا وَھُم لہٗ کارھون۔

ترجمہ: ''تین اشخاص کی نماز ان کے کانوں سے ایک بالشت برابر بھی بلند نہیں ہوتی، آپ ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ (ان میں سے) ایک وہ شخص ہے جو کسی قوم کی امامت کرے حالانکہ وہ لوگ اُسے ناپسند کرتے ہوں، (سنن ابن ماجہ، باب من اَمّ قوماً وھم لہ کارھون، رقم الحدیث: 971)۔ اور اگر اُس میں کوئی قصور شرعی نہیں، تو اُس کی امامت میں کوئی حرج نہیں اور اُن رنج رکھنے والوں پر وبال ہے، کما نصّ علیہ فی الدُّرِ المُختار، (فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص: 575، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

صورتِ مسئولہ میں اگر مسجد کے مُتولی یا انتظامیہ اس خطیب کے پیچھے جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں تو یہ بھی اس بات کی دلیل ہوگی کہ وہ اس کی امامت پر راضی ہیں۔

جنازہ گاہ میں نماز باجماعت کی ادائیگی

سوال: 35

ایک مسجد کے ساتھ ہی نمازِ جنازہ کے لئے جگہ مقرر کی گئی ہے، جس میں نمازِ جنازہ ادا کی جاتی ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ کیا اس جنازہ گاہ میں نمازِ پنج گانہ کی جماعت کرا سکتے ہیں یا نہیں؟ نیز اصل مسجد کی تعمیر کا کام بھی جاری ہے، تو کیا صرف عارضی طور پر نمازِ جنازہ والی جگہ پر نمازِ پنجگانہ کی جماعت کرائی جا سکتی ہے؟، (محمد سیف اللہ سعیدی، کورنگی کراچی)۔

جواب:

جو جگہ نمازِ جنازہ کی ادائیگی کے لئے مخصوص کی گئی ہے، اصلاً تو وہاں نمازِ جنازہ کی ادائیگی کی جانی چاہئے، اور وہاں نمازِ جنازہ کی ادائیگی میں شرعاً کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔ باقی رہا پنج وقتہ نمازوں کی جماعت کا معاملہ تو اُس کے لئے مسجد موجود ہے اور جیسا کہ آپ نے اپنے سوال میں لکھا کہ مسجد میں تعمیری کام جاری ہے تو عارضی طور پر جنازہ گاہ میں نماز ادا کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ جگہ پاک ہو۔ لیکن بغیر عذر اصل مسجد کو ویران

کر کے دوسری جگہ جماعت قائم نہ کی جائے۔ مسجد سے باہر خواہ جنازہ گاہ ہو یا کھلا میدان اگر زمین خشک اور پاک ہے تو ضرورت کے وقت نماز فرداً فرداً اور باجماعت ادا کی جاسکتی ہے۔ پس صورت مسئولہ میں اگر تعمیر کی وجہ سے مسجد میں نماز باجماعت کے لئے جگہ نہیں ہے تو مسجد سے متصل جنازہ گاہ میں نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ مگر اس سے نماز تو ادا ہو جائے گی اور جماعت بھی صحیح ہوگی، لیکن مسجد کا ثواب نہیں ملے گا۔

اذانِ مغرب اور جماعت کے درمیان وقفہ

سوال :36

نمازِ مغرب میں اذانِ مغرب اور اقامت کے دوران کتنا وقفہ کیا جاسکتا ہے؟ کیا اذان کے فوراً بعد بغیر کسی تاخیر کے جماعت قائم کرنا لازم ہے اور تاخیر میں کوئی شرعی قباحت ہے؟، (محمد رمیز احمد، سیکٹر D-11، نارتھ کراچی)۔

جواب :

ہر نماز کی اذان واقامت (بشمول نمازِ مغرب) کے درمیان وقفہ کرنا مشروع ہے۔ لیکن آج کل اذانِ مغرب کے بعد وقفہ نہیں کیا جاتا اور فوراً اقامت کہہ دی جاتی ہے۔ ہر چند کہ نمازِ مغرب کا وقت دوسری نمازوں کے مقابلہ میں کم ہے، لیکن اتنا کم بھی نہیں جتنا عام لوگوں نے سمجھ رکھا ہے اور اس قدر حساس ہو گئے ہیں کہ اگر کبھی اتفاقاً کسی مسجد میں کچھ وقفہ (دو تین منٹ) کرلیا جائے تو اسے خلافِ شرع سمجھا جاتا ہے اور بعض نمازی جذباتی انداز اختیار کرتے ہوئے شور مچانے لگتے ہیں اور یہ جاننے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ شریعت میں اس عمل کی گنجائش موجود ہے۔ اگرچہ اذان کے بعد نمازِ مغرب دوسری نمازوں کی بہ نسبت جلدی پڑھنا مستحب ہے، لیکن مغرب کا سارا وقت صحیح ہے، چند منٹ کی تاخیر ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی بنا پر رمضان المبارک میں نمازِ مغرب میں تقریباً دس منٹ یا کم وبیش کا وقفہ کیا جاتا ہے تاکہ لوگ گھر پر یا مساجد میں افطار کر کے جماعت میں شامل ہو سکیں۔ بعض صحابۂ کرام مغرب کی اذان کے بعد اور اقامت سے پہلے دو رکعت نفل پڑھتے

تھے، تاہم قلتِ وقت کو ضرور مدِ نظر رکھتے تھے، حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں:

كَانَ الْمُؤَذِّنُ إِذَا أَذَّنَ، قَامَ نَاسٌ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ يَبْتَدِرُونَ السَّوَارِيَ، حَتَّى يَخْرُجَ النَّبِيُّ ﷺ وَهُمْ كَذٰلِكَ، يُصَلُّونَ الرَّكْعَتَيْنِ قَبْلَ الْمَغْرِبِ، وَلَمْ يَكُنْ بَيْنَ الْأَذَانِ وَالْإِقَامَةِ شَيْءٌ۔

ترجمہ: ''جب مؤذن اذان سے فارغ ہوجاتا تو نبی کریم ﷺ کے صحابۂ کرام میں سے کچھ لوگ کھڑے ہوکر جلدی جلدی ستونوں کے قریب آجاتے، اتنے میں نبی کریم ﷺ تشریف لے آتے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اسی حال میں نمازِ مغرب سے پہلے دو رکعت پڑھتے اور اذان اور اقامت کے درمیان اور کوئی چیز نہ ہوتی''۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث:625)

امام بخاری حضرت عبداللہ مُزنی سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

صَلُّوا قَبْلَ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ، قَالَ فِي الثَّالِثَةِ لِمَنْ شَاءَ كَرَاهِيَةَ أَنْ يَتَّخِذَهَا النَّاسُ سُنَّةً

ترجمہ: ''نمازِ مغرب سے پہلے نماز (نفل) پڑھا کرو، تیسری مرتبہ فرمایا: جس کی مرضی ہو پڑھے، (اسے آپ ﷺ نے اختیاری اس لئے رکھا کہ) آپ نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ لوگ اسے (یعنی مغرب کے فرض سے پہلے نفل پڑھنے کو) سنت نہ قرار دے دیں''۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث:7368)

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كُنَّا بِالْمَدِينَةِ فَإِذَا أَذَّنَ الْمُؤَذِّنُ لِصَلٰوةِ الْمَغْرِبِ ابْتَدَرُوا السَّوَارِيَ فَرَكَعُوا رَكْعَتَيْنِ حَتَّى أَنَّ الرَّجُلَ الْغَرِيبَ لَيَدْخُلُ الْمَسْجِدَ فَيَحْسِبُ أَنَّ الصَّلٰوةَ قَدْ صُلِّيَتْ مِنْ كَثْرَةِ مَنْ يُصَلِّيهِمَا۔

ترجمہ: ''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں جب مؤذن مغرب کی اذان دیتا تو ہم لوگ ستونوں کی آڑ میں ہوکر دو رکعت نماز (نفل) پڑھ لیتے تھے، یہاں تک کہ اگر (اُس وقت) کوئی نیا آدمی مسجد میں آتا تو وہ زیادہ تعداد میں لوگوں کو نماز میں مشغول دیکھ کر یہ سمجھتا کہ شاید جماعت ہوچکی ہے''۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث:1936)

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر مرغینانی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''(مؤذن) اذان اور اقامت کے درمیان کچھ دیر کے لئے بیٹھے، سوائے نمازِ مغرب کے، یہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ہے اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد) نے فرمایا: مغرب میں بھی تھوڑی دیر بیٹھے، اس لئے کہ (اذان واقامت کے درمیان) فصل (جدائی) ضروری ہے اور وصل (دونوں کو ملانا) مکروہ ہے، اور محض معمولی سکتے سے فصل واقع نہیں ہوتا، کیونکہ وہ تو کلماتِ اذان کے درمیان بھی ہوتا ہے۔ پس مؤذن اس طرح بیٹھے جس طرح خطیب دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھتا ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک (زیادہ) تاخیر بھی مکروہ ہے، لہٰذا کراہت سے بچنے کے لئے معمولی سی فصل کافی ہے، (ہدایہ اولین، جلد: 1 ص: 88 مکتبہ رحمانیہ، لاہور)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ویجلس بینھما) بقدر مایحضر الملازمون مراعیاً لوقت الندب (الا فی المغرب) فیسکت قائما قدر ثلاثۃ آیات قصار، ویکرہ الوصل اجماعاً۔

ترجمہ: ''مؤذن اذان واقامت کے درمیان اتنی مقدار بیٹھے کہ لوگ اپنے ضروری کاموں سے فارغ ہوکر مستحب وقت کی رعایت کرتے ہوئے جماعت کے لئے حاضر ہوسکیں سوائے نمازِ مغرب کے، پس اذان مغرب کے بعد مؤذِن تین چھوٹی آیات کی مقدار کھڑے ہوکر خاموش رہے اور اذان واقامت کو ملادینا (یعنی دونوں کے درمیان بالکل وقفہ نہ کرنا) بالاتفاق مکروہ ہے،۔۔۔ علامہ ابنِ عابدین شامی ''فَیَسْکُتُ قَائِماً'' کے تحت لکھتے ہیں:

ھذا عندہٗ، وعندھما یفصل بجلسۃ کجلسۃ الخطیب، والخلاف فی الافضلیۃ، فلو جلس لایکرہ عندہٗ۔

ترجمہ: ''یہ وقفہ (یعنی تین چھوٹی آیات کے برابر کھڑا رہنا) امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ہے اور صاحبین (امام محمد وامام ابو یوسف رحمہما اللہ) کے نزدیک یہ ہے کہ مؤذن اتنی

مقدار بیٹھے، جس طرح خطیب دو خطبوں کے درمیان بیٹھتا ہے۔ اور اختلاف افضلیت میں ہے، پس اگر موذن بیٹھ گیا تو امام اعظم کے نزدیک بھی مکروہ نہیں ہوگا''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 2، ص: 52، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ زین الدین ابن نجیم لکھتے ہیں:

وقال ابوحنیفة ان الفصل بالسکتة اقرب الی التعجیل المستحب والمکان ھنا مختلف، لأن السُّنة أن یکون الاذان فی المنارة والاقامة فی المسجد، وکذا النغمة والھیئة بخلاف خطبتی الجمعة لاتحاد المکان والھیئة فلا یقع الفصل الا بالجلسة، وفی الخلاصة ولوفعل المؤذن کما قالا، لایکرہ عندہ، ولوفعل کما قال، لایکرہ عندھما یعنی أن الاختلاف فی الافضلیة۔

ترجمہ: ''امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (اذان اور اقامت کے درمیان کچھ دیر) سکتہ کرنے سے نمازِ مغرب قائم کرنے میں عُجلت کا مستحب ادا ہو جاتا ہے اور یہاں (اذان واقامت کی) جگہ مختلف ہے، کیونکہ سنت یہ ہے کہ اذان مینار پر ہو اور اقامت مسجد میں ہو۔ اور اسی طرح اذان کی ادائیگی کے طریقے اور ہیئت سے بھی دونوں میں وقفہ ہو جاتا ہے، جمعہ کے دو خطبوں کی صورتِ حال اس سے مختلف ہے، کیونکہ ان دونوں کے پڑھنے کا انداز بھی ایک ہے اور جگہ بھی ایک ہے، اس لئے درمیان میں بیٹھے بغیر ان دونوں کے درمیان فصل واقع نہیں ہو سکتا۔ ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں ہے: اگر موذن صاحبین کے قول پر عمل کر کے اذان ونماز کے درمیان تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جائے تو امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک بھی مکروہ نہیں ہوگا اور اگر وہ امام صاحب کے قول پر عمل کر کے کچھ دیر کے لئے خاموش کھڑا رہے تو صاحبین کے نزدیک بھی اس صورت میں کراہت نہیں ہوگی، یعنی یہ اختلاف افضلیت میں ہے (دونوں صورتیں بلا کراہت جائز ہیں)''۔

(البحرالرائق، جلد 1، ص: 454، مکتبۃ الرشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: ''اذان اور اقامت کے درمیان وقفہ کرنا سنت ہے

،اذان کہتے ہی اقامت کہہ دینا مکروہ ہے، مگر مغرب میں وقفہ تین چھوٹی آیتوں یا ایک بڑی آیت کے برابر ہو، (بہارِ شریعت، جلد اول، حصہ سوم، ص:175)''۔

اگر اذان کے بعد پہلے درود شریف پڑھ کر اذان کی مسنون دعا پڑھ لی جائے تو از خود اتنا وقفہ اور فصل ہوجاتا ہے بلکہ تین چھوٹی آیات سے قدرِ زائد ہی ہوتا ہے اور اس میں اس حدیث کی اِتباع کی سعادت بھی نصیب ہوجائے گی اور کھڑے رہنے کے بجائے اطمینان سے بیٹھ کر بھی دعا کی جاسکتی ہے۔

دعا بعد الصلوٰۃ کی شرعی حیثیت

سوال:36

فرضوں کے بعد دعا مانگنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(محمد احمد ساجد، ریلوے روڈ، بصیر پور اوکاڑہ)

جواب:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اُدْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المومن:60)

ترجمہ:''(اے میرے بندو!) مجھ سے دعائیں مانگتے رہو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا''۔

اس میں کسی وقت کی قید نہیں لگائی، لہٰذا مسلمان ہر وقت دعا کرسکتا ہے، حصن حصین میں دعا کی قبولیت کے اوقات بتائے گئے ہیں، ان میں ایک وقت یہ بیان کیا:

بعد کل عمل صالح　　یعنی ہر نیک کام کے بعد

نماز اعلیٰ درجے کی نیکی ہے، لہٰذا اس کے بعد دعا کرنا مستحسن ہے۔ الشیخ حسن بن علی شرنبلالی ''نور الایضاح'' میں لکھتے ہیں:

ویستحب للامام بعد سلامہٖ ان یتحوّل الی یسارہٖ لتطوع بعد الفرض وان یستقبل بعدہ الناس ویستغفرون اللہ ثلاثا ویقرؤن آیۃَ الکرسی والمُعوِّذات ویسبحون اللہ ثلاثا وثلاثین ویحمِدونہٗ کذلک ویکبّرونہٗ کذلک ثم یقولون لاالٰہ الااللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ لہ الملکُ ولہ الحمدُ وھوعلیٰ کل شیٔ قدیر، ثم یدعون

لانفسهم وللمسلمين رافعي ايديهم ثم يمسحون بها وجوههم في آخره۔

ترجمہ: ''امام کیلئے مستحب ہے کہ فرض سے سلام پھیرنے کے بعد نوافل کیلئے بائیں جانب مڑ جائے، اس کے بعد لوگوں کی طرف منہ کرے، پھر اللہ سے استغفار کرے، آیۃ الکرسی، معوذتین (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) پڑھے اور 33,33 مرتبہ ''سبحان اللہ''، ''الحمد للہ'' اور ''اللہ اکبر'' کا ورد کرے۔ پھر ''لاالہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شئ قدیر'' پڑھ کر اپنے لئے اور دیگر تمام مسلمانوں کیلئے ہاتھ اٹھا کر دعا کریں اور آخر میں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیر لیں''۔

(کتاب الصلوٰۃ، فصل فی الاذکار الواردۃ بعد الفرض، ص:80 قدیمی کتب خانہ، کراچی)

صاحب مراقی الفلاح ''أن یستقبل بعدہ الناس'' کے تحت لکھتے ہیں:

ای بعد التطوع وعقب الفرض ان لم یکن بعدہ نافلۃ

ترجمہ: ''امام کیلئے مستحب ہے کہ نوافل کے بعد اور فرائض کے بعد اگر نوافل نہ ہوں، تو لوگوں کی طرف منہ کرے''۔ آگے چل کر مزید فرماتے ہیں:

ثم یختمون بقولہ تعالیٰ سُبۡحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الۡعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ

ترجمہ: ''پھر اللہ تعالیٰ کے فرمان ''سُبۡحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الۡعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ'' پر دعا کو ختم کریں''۔ (کتاب الصلاۃ، فصل صفۃ الاذکار، ص:171 قدیمی کتب خانہ، کراچی)

دعا عبادت کی روح ہے، عبادت کا مغز اور نچوڑ ہے۔ نماز کے بعد دعائیں، تسبیحات واوراد اور بعض سورتوں کا پڑھنا احادیث سے ثابت ہے۔ اجتماعی دعا کا نہ ثبوت ہے نہ ہی ممانعت۔ تو پھر اپنی اصل کے اعتبار سے دعا انفرادی بھی کی جاسکتی ہے اور اجتماعی بھی، کیونکہ دعا کو اصل عبادت اور جوہر عبادت قرار دیا گیا ہے اور ایک حدیث مبارک میں دعا کو عین عبادت قرار دیا گیا ہے (اَلدُّعَاءُ هُوَ الۡعِبَادَةُ، سنن ترمذی، رقم الحدیث:2969) اور اس کی بہت زیادہ ترغیب دی گئی ہے، پھر نمازِ جمعہ کا خطبہ جو واجب ہے اور عیدین کا خطبہ جو سنت ہے، ان میں بھی اجتماعی دعا ثابت ہے۔ نمازِ تراویح کی جماعت تو عہدِ رسالت مآب ﷺ

اور عہدِ صدیقی کے بعد رائج ہوئی، اس میں حرمین طیبین کے آئمہ ختمِ قرآن کے موقع پر گڑگڑا کر نماز کے اندر دعا کرتے ہیں، یہ بھی تو رسول ﷺ کی ذاتِ اقدس سے ثابت نہیں ہے، لیکن اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ دعا انفرادی طور پر کی جائے یا اجتماعی طور پر بہر صورت مستحسن و مستحب عمل ہے۔

مغفرت وایصالِ ثواب کے لئے اجتماعی دعا

سوال: 37

ہمارے علاقے میں یہ رواج ہے کہ میت کے لئے دعا کے لئے آنے والے حضرات قرآن شریف کی چند آیات یا ایک سورت پڑھ کر میت کی مغفرت کیلئے اجتماعی دعا کرتے ہیں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تعزیت کے لئے گھر میں پہلے سے موجود کوئی قاری یا عالمِ دین یا کوئی بھی مسلمان تلاوت کے بعد اجتماعی دعا کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ جو عرصہ دراز سے جاری ہے، اس کو بعض حضرات منع کرتے ہیں، تو کیا اُن کا اسے منع کرنا درست ہے؟ (عبدالوکیل، چترال)

جواب:

مذکورہ صورت درحقیقت ایصالِ ثواب ہے، جو شرعاً جائز بلکہ مستحسن امر ہے۔ ''ایصالِ ثواب'' کے معنی ہیں: کسی شخص کا اپنے کسی نیک کام کا ثواب دوسرے کو پہنچانا، خواہ وہ زندہ ہو یا وفات پا چکا ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِاَخِیْ وَاَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝

(1) ترجمہ: ''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے التجا کی: اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی ہارون کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے، (الاعراف: 151)''۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝

(2) ترجمہ: ''(حضرت ابراہیم نے دعا کی) اے ہمارے رب! حساب (یعنی قیامت) کے دن میری، میرے والدین اور تمام اہلِ ایمان کی بخشش فرمانا، (ابراہیم: 41)''۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ

(3) ترجمہ: ''اے ہمارے رب: ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی (بھی مغفرت) فرما، جو ہم سے پہلے وفات پا چکے (یا ایمان لانے میں ہم سے سبقت حاصل کر چکے ہیں)، (الحشر: 10)''۔

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ

(4) ترجمہ: ''(حضرت نوح نے دعا کی) اے میرے رب! میری اور میرے والدین اور جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہوا اور (جملہ) مومن مردوں اور عورتوں کی مغفرت فرما، (نوح: 28)''۔

ایصالِ ثواب کا ذریعہ دعائے مغفرت بھی ہے، مالی صدقات بھی ہیں اور دیگر عبادات بھی ہیں، مثلاً حج بدل وعمرہ، تلاوتِ قرآنِ پاک، اذکار، درود پاک وغیرہ۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

الاصل فی ھذا الباب أن الانسان له أن یجعل ثواب عمله لغیرہ صلاۃً کان أو صوماً أو صدقةً أو غیرھا کالحج وقراءۃ القرآن والاذکار وزیارۃ قبور الانبیاء علیھم الصلاۃ والسلام والشھداءِ والاولیاءِ والصالحین وتکفین الموتیٰ وجمیع أنواع البر کذا فی غایة السروجی شرح الهدایة۔

ترجمہ: ''ایصالِ ثواب کے مسئلے میں اصل یہ ہے کہ انسان اپنے ہر نیک عمل کا ثواب دوسرے شخص کو پہنچا سکتا ہے، خواہ وہ نماز ہو یا روزہ ہو یا مالی صدقہ ہو یا کوئی اور نیک عمل، جیسے حج، قرآن مجید کی تلاوت، اَذکار، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام وشہداءِ کرام واولیاءِ کرام اور صالحینِ اُمت رحمہم اللہ تعالیٰ کی قبروں کی زیارت اور مُردوں کو کفن دینا اور دیگر تمام نیکی کے کام، اسی طرح ''غایۃ السروجی شرح ہدایہ'' میں ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 257، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

دعا عبادت کی روح ہے، عبادت کا مغز اور نچوڑ ہے اور ایک حدیث مبارک میں دعا کو

عین عبادت قرار دیا گیا ہے (اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ، سنن ترمذی، رقم الحدیث: 2969)، کیونکہ بندہ اپنے آپ کو عاجز، محتاج اور بے کس و بے بس سمجھ کر اپنے خالق و مالک کو پکارتا ہے، اسی کا نام بندگی ہے۔ دعا انفرادی طور پر کی جائے یا اجتماعی طور پر بہر صورت مستحسن و مستحب عمل ہے، حرمین طیبین میں بھی ختمِ قرآن کے موقع پر نمازِ تراویح میں اور خطبات مبارکہ میں اجتماعی دعا کی جاتی ہے، تو جب یہ اجتماعی دعا نماز کے اندر جائز ہے تو نماز سے باہر اس کی ممانعت کیوں ہوگی۔ جو اجتماعی دعا کی ممانعت کا دعویٰ کرتا ہے، اُس پر لازم ہے کہ دلیل پیش کرے، اب تو تبلیغی اجتماع میں بھی اجتماعی دعا کی جاتی ہے اور لوگ بڑے اہتمام سے اس میں شرکت کے لئے جاتے ہیں، تو ایک خاص موقع اور مقام پر اس کے جواز اور باقی مواقع اور مقامات پر اس کی ممانعت کی کیا دلیل ہے، سوائے اس کے کہ کوئی شخص خود شارع بننے کی کوشش کرے اور ''مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ'' (خیر کے کاموں سے بہت زیادہ روکنے والا) بننا چاہتا ہو۔

☆☆ ☆☆
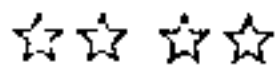
مسجد اور وقف کے مسائل

مسجد میں اسکرین لگا کر ٹیلی ویژن کے دینی پروگرام چلانا

سوال:38

ایک مذہبی تنظیم کے کارکنان رمضان المبارک کی 27ویں شب میں مسجد کے اندر پروجیکٹر لگا کر دینی بیان دکھانا چاہتے ہیں۔کیا مسجد میں پروجیکٹر یا کمپیوٹر یا انٹرنیٹ کے ذریعے دینی بیانات دکھائے جا سکتے ہیں؟۔کچھ مساجد میں نماز سے فراغت کے بعد باقاعدہ اعلان کیا جاتا ہے اور مسجد کے منبر پر کمپیوٹر رکھ کر بیانات کی سی ڈی چلائی جاتی ہے اور لوگ سنتے اور دیکھتے ہیں۔اس طرح کی تبلیغ سے اور منبر رسول ﷺ پر کمپیوٹر رکھ کر یا مسجد کے اندر پروجیکٹر لگا کر مسجد و منبر کی توہین تو نہیں ہو رہی؟

(امیر ممتازی، جامع مسجد رحمانیہ، گوہر آباد، دستگیر، کراچی)

جواب:

مساجد میں انٹرنیٹ یا کیبل سے لنک کر کے ٹیلیویژن اسکرین نہ لگائے جائیں، یہ آدابِ مسجد کے منافی ہے اور اس سے مسجد میں انتشار اور فتنے کا اندیشہ ہے۔مسجد میں سب نمازیوں کو اپنے اپنے انداز سے نوافل، تلاوت، ذکر واذکار اور درود وتسبیحات اور اَوراد پڑھنے کا حق حاصل ہے۔اس سے کل یہ مقابلہ شروع ہو جائے گا کہ کسی اور عالم یا قائد کی تقریر بھی کلوز سرکٹ ٹیلیویژن کے ذریعے مسجد میں سنائی اور دکھائی جائے۔رمضان المبارک میں کثیر تعداد میں معتکفین مساجد میں بیٹھتے ہیں، اعتکاف کی رُوح خلوت ہے، ان لوگوں کو اپنی عبادات یا قضا نمازیں پڑھنے سے محروم نہ کیا جائے۔کسی بزرگ کے جو عقیدت مند ایسا کرنا چاہتے ہیں، وہ اپنے گھروں میں ایسا انتظام کر سکتے ہیں یا اجازت لے کر پارک میں کر سکتے ہیں، جو لوگ شوق اور عقیدت رکھتے ہیں، وہ وہاں جمع ہو جائیں گے۔مذکورہ دینی تنظیم کی قیادت کو چاہیے کہ اپنے پُرجوش کارکنوں کو روکیں، نظم کا پابند کریں اور مساجدِ اہلسنت میں تنازعات پیدا نہ کریں۔دعوتِ دین کو قرآن مجید نے حکمت کے ساتھ مشروط کیا ہے اور مقاصد شریعت میں ''سَدِّ ذرائع'' بھی ہے، یعنی ممکنہ شَر کا سَدِّ باب کرنا،

مُفاسِد اور خرابیوں کا راستہ روکنا۔ رسول پاک ﷺ نے بھی اسی دینی حکمت کے تحت اپنے بعض پسندیدہ امور کو ترک فرمایا ہے۔ مثال کے طور پر آپ ﷺ کی خواہش تھی کہ بنائے قریش پر بنی ہوئی ''کعبۃ اللہ'' کی عمارت کو شہید کر دیں اور پھر اس میں ''حطیم'' کو شامل کر کے بنائے ابراہیم پر تعمیر کریں، اسلام کو حجاز میں غلبہ حاصل ہو چکا تھا اور آپ کے پاس مالی وسائل بھی تھے۔ لیکن آپ ﷺ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: لَوْلَا حَدَاثَةُ عَهْدِ قَوْمِكِ بِالْكُفْرِ لَنَقَضْتُ الْبَيْتَ وَلَجَعَلْتُهَا عَلٰى اَسَاسِ اِبْرَاهِيمَ فَاِنَّ قُرَيْشًا حِيْنَ بَنَتِ الْبَيْتَ اِسْتَقْصَرَتْ وَلَجَعَلْتُ لَهَا خَلْفًا۔

ترجمہ: ''اگر تمہاری قوم نے نیا نیا کفر نہ چھوڑا ہوتا تو میں بیت اللہ کی عمارت کو منہدم کر دیتا اور اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قائم کی ہوئی بنیادوں پر قائم کرتا، کیونکہ جب قریش نے اس کو بنایا تھا تو (وسائل کی کمی کے سبب ایک جانب سے) اس کو چھوٹا کر دیا تھا اور میں اس کی پچھلی جانب بھی ایک دروازہ بناتا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3227)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

''پس ان امور میں ضابطۂ کلیہ واجبۃ الحفظ (یعنی ایسا ضابطہ وقانون شرعی جسے لازماً یاد رکھنا چاہیے) یہ ہے کہ فعل فرائض وترک مُحرّمات (یعنی فرائض کو ادا کرنے اور حرام کاموں کے چھوڑنے) کو اِرضائے خَلق (لوگوں کی خوشنودی) پر مُقدّم رکھے اور ان امور میں کسی کی مطلقاً پروا نہ کرے اور اِتیان مستحب (مستحب کو ادا کرنے) وترک غیر اولیٰ (غیر افضل کاموں کو چھوڑنے) پر مُدارات خَلق ومُراعات قلوب (مخلوق کی دلداری) کو اہم جانے اور فتنہ ونفرت وایذا ووحشت کا باعث ہونے سے بہت بچے۔ اسی طرح جو عادات ورسوم خَلق میں جاری ہوں اور شرع مُطہّر سے اُن کی حرمت وشَناعت ثابت نہ ہو، اُن میں اپنے تَرَفُّع (بڑائی) وتَنَزُّہ (پاکبازی) کے لئے خلاف وجدائی نہ کرے کہ یہ سب امور اِئتلاف وموانست (لوگوں کے دلوں کو جوڑنے اور دین کی طرف مائل کرنے) کے معارض (خلاف) اور مراد ومحبوبِ شارع کے مناقض (خلاف) ہیں، ہاں! وہاں ہوشیار

وگوش دار (کان لگا کرسن) کہ یہ وہ نکتۂ جمیلہ وحکمتِ جلیلہ وکوچۂ سلامت وجادۂ کرامت ہے جس سے بہت زاہدانِ خشک واہلِ تکشف غافل وجاہل ہوتے ہیں، وہ اپنے زُعم میں محتاط ودین پرور بنتے ہیں اور فی الواقع مغز حکمت ومقصود شریعت سے دور پڑتے ہیں، خبر دار و مُحکم گیر یہ چند سطروں میں علمِ غزیر (دافر علم) وباللہ التوفیق والیہ المصیر (یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہے اور اسی کی طرف رجوع کرنا ہے)''۔

(فتاوی رضویہ، جلد 4، ص:528، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

نوٹ: امام اہلسنت کی یہ عبارت نہایت دقیق ہے، عام اردو داں قاری کے لئے اس کا سمجھنا دشوار ہے، الفاظ واصطلاحات کافی مشکل ہیں، اس لئے ہم پہلے مشکل الفاظ کے معانی درج کریں گے اور اس کے بعد آسان عبارت میں اس کا مفہوم بیان کریں گے۔

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
واجبۃُ الحفظ	جسے ضرور یاد رکھنا چاہیے	فِعلِ فرائض	فرائض کا ادا کرنا
ترکِ مُحرّمات	حرام کاموں کو چھوڑنا	اِرضائے خَلق	مخلوق کی خوشنودی حاصل کرنا
اِتیانِ مُستحَب	مستحب کو ادا کرنا	اَولیٰ	افضل، بہترین
ترکِ غیرِ اولیٰ	غیر افضل کام کو چھوڑنا	مُداراتِ خَلق	مخلوق کی دلداری
مراعاتِ قلوب	لوگوں کے جذبات کا خیال رکھنا	ایذا	اذیت دینا، تکلیف پہنچانا
رسومِ خلق	عوام کی رسمیں	شرعِ مُطہّر	پاکیزہ شریعت
شَناعت	عیب، برائی، قباحت	تَرَفُّع	اپنی برتری کا احساس
تنزُّہ	پاک دامنی کا دعویٰ کرنا	اِیتلاف	دلوں کو جوڑنا
مُوانست	باہم محبت کرنا	معارِض	مقابل
مُناقض	ایک دوسرے کی ضد	گوش دار	کان لگا کرسن، توجہ سے سن
نکتہ	لطیف، باریک علمی بات	نکتۂ جمیلہ	خوبصورت نکتہ

حکمتِ جلیلہ	حکمت ودانائی کی بات	کوچۂ سلامت	سلامتی راستہ
جادۂ کرامت	عزت کا راستہ	اہلِ تکشّف	کشف کا دعویٰ کرنے والے، اس بات کا دعویٰ کرنے والے کہ وہ باطن پر نظر رکھتے ہیں
زُعم	غلط خیال	دین پرور	دین دار
محکم گیر	مضبوطی سے پکڑ	علم غزیر	وافر علم

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز کی اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے:

ان امور میں قاعدہ کلیہ جسے ضرور یاد رکھنا چاہئے یہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی اور حرام کاموں سے بچنے کو مخلوق کی خوشنودی پر ترجیح دے اور ان امور میں کسی کی ناراضگی کی پروانہ کرے، دینی حکمت کے تحت مخلوق کی دلداری اور ان کے جذبات کو مستحب کاموں پر ترجیح دے، یعنی لوگوں کی دلداری کی خاطر افضل کاموں کو چھوڑا جا سکتا ہے اور دینی مصلحت کے تحت بعض اوقات خلافِ اَولیٰ کام بھی کیا جا سکتا ہے۔ دین کے مبلغ کو لوگوں کے درمیان نفرت پیدا کرنے سے گریز کرنا چاہئے، وہ لوگوں کے لئے اذیت اور دل آزاری کا سبب نہ بنے۔ اسی طرح لوگوں میں جو رسمیں اور طریقے جاری ہیں، اگر وہ شریعت کے خلاف نہیں ہیں اور نہ ہی ان میں کوئی شرعی عیب ہے تو محض اپنی بڑائی ظاہر کرنے اور اپنی پاکدامنی ثابت کرنے کے لئے عام لوگوں سے ہٹ کر کوئی شعار اختیار نہ کرے، بلکہ لوگوں کے ساتھ ان رسوم میں شامل ہو۔ اگر وہ لوگوں کی عام روش سے ہٹ کر کوئی الگ راستہ اپناتا ہے تو یہ لوگوں کے دلوں کو دین کی طرف مائل کرنے کے مقصد خیر کے بالکل خلاف ہے۔ خبردار رہو، اس بات کو خوب توجہ سے سنو کہ یہ بہت خوبصورت باریک علمی نکتہ اور حکمت کی بات ہے اور دین کے معاملے میں سلامتی اور وقار کا راستہ ہے، جس سے بہت سے خشک مزاج زاہد اور باطنی کشف کا دعویٰ کرنے والے غافل اور جاہل ہوتے ہیں، وہ اپنے فاسد گمان میں بڑے دین دار بنتے ہیں، لیکن درحقیقت وہ دین کی حکمت اور شریعت کے مقاصد سے

بہت دور ہوتے ہیں، اس حکیمانہ بات کو مضبوطی سے پکڑو، یہ چند سطریں ہیں، مگر اس میں علم کا بڑا خزانہ ہے۔

مسجد کے فنڈ سے مسجد کے عملے کو علاج معالجے کی سہولت دینا

سوال:39

مسجد کی رقم سے مسجد کے ملازمین (امام وخطیب، مؤذن، مدرس، خادم وغیرہ) کا علاج کیا جاسکتا ہے، نیز ان کی جائز ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مسجد کے فنڈ سے خرچ کیا جاسکتا ہے؟، (عابد علی دہلوی، صدر، جامع مسجد نورانی، لیاقت آباد، کراچی)

جواب:

مسجد کی جمع شدہ رقم مالِ وقف کہلاتی ہے، جو مصارفِ مسجد کے لئے استعمال کی جاتی ہے، جیسے مسجد کے عملے کا مشاہرہ اور مسجد کی دیگر ضروریات جو مسجد کے مفاد میں ہوں، تو ضرورت اور کفایت کے مطابق ان پر وقف کا مال خرچ کیا جاسکتا ہے۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ثُمَّ اِلیٰ مَاھُوَاقربُ إِلَی الْعِمَارَةِ وَاَعَمُّ لِلْمَصْلَحَةِ کَالامامِ للمسجدِ والْمُدَرِّسِ لِلْمَدْرَسَةِ یُصْرَفُ اِلَیْهِمْ بِقَدْرِ کِفَایَتِهم ثُمَّ السِّرَاجُ وَالْبُسُطُ کَذٰلِکَ اِلیٰ اٰخِرِ الْمَصَالِحِ، ھذا اذا لم یکن مُعَیَّنا، فان کان الوقف مُعَیَّنا علی شئی یصرف الیه بعد عمارة البناء کذا فی الحاوی القدسی

ترجمہ: ”پھر وقف کے مال کو اُن امور پر ضرورت کے مطابق خرچ کیا جائے، جن سے مسجد کی زیادہ آبادکاری ہو اور مسجد کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید ہوں، جیسے مسجد کے لئے امام اور مدرسے کے لئے مُدَرِّس جن پر اس قدر رقم خرچ کی جائے جو ان کی ضروریات کے لئے کفایت کرے، پھر چراغ (یعنی روشنی) اور دریوں وچٹائیوں کا انتظام اور اسی طرح دوسری مفید چیزیں۔ وقف کے مال کو خرچ کرنے میں یہ (وسعت) اس صورت میں ہے کہ اس کا مصرف (واقف کی طرف سے) مُعَیَّن نہ ہو، لیکن اگر وقف کا مَصرف (واقف کی طرف سے) مُعَیَّن ہے تو عمارت کی تعمیر کے بعد اسی مصرف پر صرف کیا جائے گا“ الحاوی القدسی“

میں اسی طرح ہے"،(فتاویٰ عالمگیری، جلد 2،ص:368، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

مسجد کے عطیات صدقاتِ نافلہ ہوتے ہیں، لہٰذا اُن کا مصرف بننے کے لئے امام کا نادار ہونا شرط نہیں ہے۔زکوٰۃ،فطر،فدیہ، کفارات اور صدقاتِ واجبہ کا مصرف بننے کے لئے نادار ہونا شرط ہے۔

آج کل مساجد کے لئے عوام سے جو چندے اور عطیات لئے جاتے ہیں، ان میں یہ امر معروف ہے کہ مسجد کے مصارفِ جاریہ جن میں مساجد کے (بجلی، گیس اور پانی وغیرہ کے) یوٹیلٹی بلز، ضرورت کے وقت رنگ روغن، دریاں، قالین، ٹیوب لائٹس، پنکھے، پانی وسیوریج کا انتظام اور مسجد کے عملے کی تنخواہیں اور مصارف سب شامل ہوتے ہیں۔لہٰذا انتظامیہ مسجد فنڈ سے امام یا دیگر عملے کی علاج کے لئے بھی اعانت کرسکتی ہے۔مساجد کی انتظامیہ کے لئے بہتر صورت یہ ہے کہ وہ امام اور مسجد کے دیگر عملے کے ساتھ اجارہ کرتے وقت ان سہولتوں کو شامل کرلیں۔البتہ جو رقم تعمیر یا کسی خاص مصرف کے لئے دی جائے یا لی جائے، اسے صرف اسی معیّن مصرف پر خرچ کرنا ضروری ہے۔

عام گزرگاہ کو روک کر قرآن کی تعلیم دینا

سوال:40

ہماری پانچ منزلہ بلڈنگ ہے جس میں 102 فلیٹ ہیں اور آنے جانے کے لئے دو سیڑھیاں ہیں، جن کے درمیان آنے جانے کا راستہ ہے۔چند حضرات نے اُس راستے کو بند کرکے قرآن کی تعلیم دینے کا انتظام کیا ہے۔ابتداءً پندرہ بیس منٹ تعلیم دیتے تھے، اب آہستہ آہستہ دو گھنٹے تعلیم دینا شروع کردی ہے اور اِس طرح لوگوں کی آمدورفت کا راستہ بند ہوگیا ہے۔لوگوں کو پریشان کرکے اور راستہ بند کرکے قرآن کی تعلیم دینا درست ہے؟۔

(محمد قاسم سلیمان، لیاقت آباد، کراچی)

جواب:

عام گزرگاہ اور راستے کو بند کرکے قرآن مجید کی تعلیم دینا نامناسب ہے، ایسے لوگوں

کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد مبارک ہے: ''کَلِمَةُ الْحَقِّ اُرِیْدَ بِهَا الْبَاطِلُ''
یعنی یہ بات اپنی جگہ حق ہے لیکن اس سے باطل معنی مراد لیا جارہا ہے''۔ عام گزر گاہ پر سب کا
حق برابر ہوتا ہے، جسے ''حقِ مُرُور'' (Right of Passage) کہتے ہیں۔ کثیر
المنزلہ بلڈنگ کی سیڑھیوں کی حیثیت بھی عام گزر گاہ کی ہوتی ہے اور کسی کو اسے روکے رکھنے
یا وہاں گھنٹوں جم کر بیٹھنے کا حق نہیں ہے۔ حدیث پاک میں شارع عام پر نماز پڑھنے سے
منع فرمایا گیا ہے:

عَنِ ابنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهٰی اَنْ یُصَلّٰی فِی سَبْعَةِ مَوَاطِنَ فِی الْمَزْبَلَةِ، وَالْمَجْزَرَةِ، وَالْمَقْبَرَةِ، وَقَارِعَةِ الطَّرِیْقِ، وَفِی الْحَمَّامِ، وَفِی مَعَاطِنِ الْاِبِلِ، وَفَوْقَ ظَهرِ بَیْتِ اللهِ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سات
مقامات پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا: کوڑے خانہ، ذبح خانہ (Butchery)، قبرستان،
عام گزرگاہ (شارع عام)، حمام، مویشی خانہ اور بیت اللہ کی چھت''۔
(سُنَن ترمذی، رقم الحدیث: 346)

ان میں سے بیت اللہ کی چھت پر نماز پڑھنے سے ممانعت کا سبب بیت اللہ کا ادب
واحترام ہے، شارع عام پر نماز پڑھنے کی ممانعت کا سبب عام لوگوں کے لئے دشواری پیدا
ہونا اور لوگوں کے آنے جانے کے حق (حقِ مُرُور) میں رکاوٹ بننا ہے، قبرستان میں اگر قبر
کی جانب رخ کر کے نماز پڑھی جائے (یعنی مقامِ سجدہ کے آگے قبر ہو) تو بت پرستی سے
مشابہت کی بنا پر حرام ہے اور باقی مقامات پر ناپاکی کا احتمال ہے اور وہاں پر نماز پڑھنا نماز
کی تقدیس کے منافی ہے۔ نمازِ جنازہ کے بارے میں علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

''تکرہ فی الشارع واراضی الناس کذا فی المضمرات''
ترجمہ: ''سڑک پر اور لوگوں کی زمین پر (بلا اجازت ومنظوری) نماز جنازہ پڑھنا مکروہ
ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، ج:1، ص:165، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

لہٰذا قرآن مجید کی تعلیم دینا یا دینی مسائل بتانا یقیناً اجر کی بات ہے، لیکن اس کے لئے عام گزرگاہ کو روک کر بیٹھنا درست نہیں ہے، جبکہ وہاں سے خواتین کو بھی اپنی ضروریات کے لئے گزرنا ہوتا ہے، اس کے لئے الگ باوقار جگہ کا انتظام کیا جائے۔

مسجد کو ہبہ کئے گئے مکان کی فروخت

سوال:42

ہمارے پاس مسجد کے مکانات ہیں، یہ مکان مسجد سے بالکل ہٹ کر ہیں، اُن میں سے ہم ایک مکان بیچنا چاہتے ہیں، کیونکہ ہم مسجد کی ضرورت کے تحت مسجد کے کچھ حصے کی ازسرنو تعمیر کرانا چاہتے ہیں اور ہمارے پاس فنڈ کی کمی ہے اور یہ مکان فروخت کر کے اس کمی کو پورا کر سکتے ہیں، یہ مکان ایک صاحب نے مسجد کے نام پر تحفتاً دیا تھا اور اب ان کا انتقال ہو چکا ہے اور ہم اس مکان کو مسجد کے نام پر لیز کرا چکے ہیں۔ کیا ہم اس مکان کو بیچ کر اس کی رقم مسجد کی تعمیر میں لگا سکتے ہیں؟، (انتظامیہ جامع مسجد محمدی، لیاقت آباد، کراچی)

جواب:

مذکورہ صورت میں یہ تعیّن کرنا ضروری ہے کہ مذکورہ مکانات مسجد کو ہبہ کئے گئے یا وقف، دونوں صورتوں میں احکام جدا ہوں گے، اگر مکانات وقف ہیں تو اُن کی بیع ناجائز ہے علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وفی الفتاویٰ النسفیة سئل عن أهل المحلة باعوا وقف المسجد لاجل عمارة المسجد قال لایجوز بامر القاضی وغیرہ کذا فی الذخیرة

ترجمہ: ''فتاویٰ نسفی میں ہے، آپ سے سوال کیا گیا کہ اہلِ محلہ مسجد کے وقف شدہ مال کو عمارتِ مسجد کے لئے فروخت کر سکتے ہیں، آپ نے فرمایا: قاضی یا کسی اور کے حکم سے (بھی) جائز نہیں ہے، ''ذخیرہ'' میں بھی اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص:464، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

وقف کے متعلق حکم یہ ہے کہ اُسے نہ تو بیچا جا سکتا ہے نہ ھبہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اُس

میں وراثت جاری ہوتی ہے، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

فیلزم ولا یباع ولا یوھب ولا یورث کذا فی الھدایۃ۔

ترجمہ: ''پس (وقف) لازم ہوجاتا ہے، نہ تو اُسے بیچا جاسکتا ہے، نہ ھبہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اُس میں وارثت جاری ہوتی ہے، ہدایہ میں اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 2 ص:350، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ امجد علی اعظمی سے سوال کیا گیا کہ ''کیا وقف شدہ جائیداد جو کہ کسی بھی مسجد میں واسطے ایصالِ ثواب کے واقف نے وقف کی ہو، بِک سکتی ہے یا نہیں اور کسی بھی متولی کو کبھی اس اوقاف کے بیچنے یا بیع کرنے کا حق ہے یا نہیں؟، جبکہ واقف نے اوقاف کو اس طرح وقف کیا ہو کہ اگر متولیٔ مسجد اس بات کی ضرورت محسوس کرے کہ یہ جائیداد بیچ کر اِصراف مسجد میں لائے تو متولی مسجد کو اختیار ہے کہ بیچ دے، اس حالت کا کیا حکم ہے؟''۔

آپ نے جواب میں لکھا: ''جائیداد موقوفہ کی بیع نہیں ہوسکتی البتہ جائیداد موقوفہ کو دوسری جائیداد سے بدل سکتے ہیں جبکہ واقف نے وقف میں استبدال (تبادلے) کی شرط ذکر کردی ہو۔۔۔۔مزید لکھتے ہیں: واقف نے اگر ان لفظوں سے وقف کیا ہے تو اس سے مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود اسی جائیداد کی قیمت مسجد پر صرف کی جائے نہ یہ کہ اس کی آمدنی صرف ہو اور چیز باقی رہے اور یہ مسجد کے نام ہبہ یا تصدُّق ہوگا کہ متولی کے قبضہ کرلینے پر تمام ہوگا، فتاویٰ قاضی خان میں ہے: رجل تَصدَّق بدارہٖ علی المسجدِ اوعلیٰ طریق المسلمینَ تکلّموا فیہ والفتویٰ علیٰ انہ یجوز۔

ترجمہ: ''ایک شخص نے اپنا گھر مسجد پر صدقہ کیا یا مسلمانوں کے راستے کے لئے، علماء نے اس میں کلام کیا ہے (یعنی علماء کی آراء مختلف ہیں) اور فتویٰ اس پر ہے کہ اسے مسجد (کی ضروریات پر صرف کرنا) جائز ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: لوقال وھبتُ داری للمسجدِ اواعطیتُھا لہٗ صَحَّ ویکونُ تملیکاً فیشرط التسلیمُ۔ تو اگر اس صورت میں داخل کرکے اسے بجائے وقف ہبہ تصور

کیا جائے تو اب یہ مسجد کی ایک چیز ہوگی ۔ واہب کی شرط وغیرہ کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ حقیقۃً اگر مسجد کو ضرورت ہے تو متولی دیگر مسلمانوں سے رائے لے کر مسجد پر صرف کر لے اپنے آپ بغیر مشورہ مسجد کی اشیاء کو نہیں بیچنا چاہیے، مسجد کی چیزیں فروخت کرنے کے لئے اذنِ قاضی کی ضرورت ہے مگر چونکہ یہاں قاضی موجود نہیں، اہلُ الرائے اور سمجھدار اور قابل اطمینان مُتَدیّن مسلمانوں سے رائے لے کر ایسا کرنا، امید ہے کہ کافی ہو اور اس کے مواخذہ سے بچ جائے، (فتاویٰ امجدیہ، جلد سوم، ص: 28-30)"۔

اگر مذکورہ مکان واقف (وقف کرنے والوں) نے اس صراحت کے ساتھ مسجد کو تَصَدُّق یا ہبہ کئے ہوں کہ مسجد کے لئے جس طرح چاہیں صرف کریں، ضرورت ہو تو فروخت بھی کر دیں تو ان کو فروخت بھی کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر مطلقاً مسجد کے لئے وقف کئے ہوں تو ان کی بیع نہیں کی جا سکتی ۔ آپ نے سوال میں لکھا ہے کہ جس مکان کو آپ بیچنا چاہتے ہیں وہ مکان دینے والے شخص نے مسجد کو تحفتاً دیا تھا تو مسجد کے ٹرسٹیوں کی منظوری سے یہ مکان مسجد پر تَصَدُّق یا ہبہ کہلائے گا اور اسے فروخت کر کے اِس کی رقم مسجد پر صرف کی جا سکتی ہے۔

وقف کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا

سوال:43

ایک مسلمان نے ایک پلاٹ اس نیت سے خریدا کہ اس پر دینی مدرسہ قائم کرے گا، کچھ دوستوں کو بھی گواہ کیا اور زبانی وقف بھی کیا ۔ مدرسہ قائم ہو گیا، عرصہ 25 سال سے درس و تدریس، طلباء کی رہائش، تعمیری کام مسلمانوں کے عطیات، زکوٰۃ، صدقات اور چرمِ قربانی وغیرہ سے کئے جاتے رہے ۔ اب شخصِ مذکور کے دل میں بے ایمانی پیدا ہوگئی اور مذکورہ مدرسہ کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ اسلامی شرعی نقطۂ نگاہ سے اس کی کیا حیثیت ہے؟۔

(احمد رضا سعیدی، استاذ شعبہ علوم اسلامی کراچی یونیورسٹی)

جواب:

کسی چیز کو ایک مرتبہ وقف کئے جانے کے بعد وقف سے رجوع درست نہیں ۔ وقف

کرتے وقت وہ شے واقف کی مِلک ہے تو وقف صحیح ہو گیا اور وقف مکمل ہونے کے بعد یہ پلاٹ واقف (وقف کرنے والے) کی ملکیت سے خارج ہو گیا اور واقف کو بھی اُس میں تبدیلی کی اجازت نہیں ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ولا یجوز تغییر الوقف عن هیئته، ترجمہ: ''وقف کی ہیئت کو بدلنا جائز نہیں''۔

(فتاویٰ عالمگیری جلد 2 ص:490، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

وقف کے معنی ہیں: ''کسی شے کو اپنی مِلک سے خارج کر کے خالص اللہ تعالیٰ کی مِلک کر دینا'' کہ اُس کا نفع بندگانِ خدا کو ملتا رہے، وقف کو نہ تو باطل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اُسے فروخت کیا جا سکتا ہے، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں: فیلزَم ولایُباعُ ولایُوھبُ ولایُورَثُ کذافی الھدایۃ

ترجمہ: ''پس جب (وقف) لازم ہو جاتا ہے تو اُسے نہ تو بیچا جا سکتا ہے، نہ ھبہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اُس میں وراثت جاری ہوتی ہے، جیسا کہ ہدایہ میں ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 2 ص:350، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: فَاِذَا تَمَّ وَلَزِمَ لَایُمَلَّكُ ولَایُعَارُ وَلَایُرھَنُ

ترجمہ: ''پس جب وقف تام (مکمل) ہو جائے تو نہ تو کسی کو اس کا مالک بنایا جا سکتا ہے، نہ اسے عاریتاً دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے رہن رکھا جا سکتا ہے۔۔۔۔۔اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (لایُمَلَّكُ) أی لایکون مملوکا لصاحبه ولایُمَلَّكُ أی لایقبل التملیك لغیره بالبیع ونحوه لاستحالة تملیك الخارج عن ملکه ولا یعار، ولایرهن لاقتضائهما الملك۔

ترجمہ: ''(وہ کسی کی مِلک نہیں بنے گا) یعنی وقف کرنے والے کی ملکیت میں بھی نہیں رہے گا اور کسی دوسرے کو (بھی) خرید و فروخت وغیرہ سے اِس کا مالک نہیں بنایا جا سکے گا، کیونکہ جو چیز کسی کی اپنی مِلک سے نکل جائے، کسی دوسرے کو اس کا مالک بنانا ناممکن ہے، اسے عاریتاً بھی نہیں دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی رہن رکھا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ دونوں چیزیں مِلک کا تقاضا

کرتی ہیں"، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 6،ص:421، داراحیاء التراث العربی، بیروت)"۔

وقف مکمل ہونے کے بعد اُسے تبدیل کرنا یا ختم کرنا جائز نہیں ہے اور شرعاً وقف میں تبدیلی کرنا حرام ہے اور تبدیلی کرنے والا سخت گناہ گار ہے۔ البتہ وقف کرنے والے کو شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ وہ مصارفِ وقف کا تعین کرے اور اس سلسلے میں اسلامی فقہ کا مسلّمہ اصول ہے: شرط الواقف کنَصِّ الشارع، "یعنی واقف کی مقررہ شرائط قرآن وسنت کی نَص کی طرح شرعاً مؤثر ہوتی ہیں"۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 6،ص:508، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

ایک سے زائد متولیان کی حیثیت

سوال:44

متولی کسے کہتے ہیں اور اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟، ایک ادارہ جس کی بنیاد رکھنے والے دو صاحبان ہوں اور ادارہ چلانے میں دونوں کی حیثیت برابر رہی ہو، ایک بطور مہتمم اور دوسرا بطور ناظمِ اعلیٰ تو متولی کسے مانا جائے گا؟

(احمد رضا سعیدی، استاذ شعبہ علوم اسلامی کراچی یونیورسٹی)

جواب:

واقف (وقف کرنے والے) یا قاضی کی جانب سے اوقاف کی نگرانی پر مامور شخص کو مُتوَلّی کہتے ہیں۔ مُتوَلّی ایسے کو مقرر کرنا چاہئے جو امانت دار ہو اور وقف کے کام کرنے پر قادر ہو، خواہ خود ہی کام کرے یا اپنے نائب سے کرائے، عاقل و بالغ ہونا بھی شرط ہے۔

علامہ امجد علی اعظمی مُتوَلّی کی صفات کے بارے میں لکھتے ہیں: "مُتوَلّی ایسے شخص کو مقرر کیا جائے جو کارِ تولیت کو بخوبی انجام دے سکے۔ دین دار اور متدیّن ہو، خائن نہ ہو، اگر اس کی خیانت ثابت ہو اور تولیت کا کام اچھی طرح انجام نہ دیتا ہو تو اسے معزول کر کے دوسرا شخص متولی کیا جائے، (فتاویٰ امجدیہ، جلد سوم،ص:53)"۔

اگر مذکورہ شرائط واقف میں پائی جاتی ہوں تو واقف خود بھی مُتوَلّی بن سکتا ہے،

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (جعل) الواقف (الولایۃ لنفسہ جاز) بالاجماع وکذا لولم یشترط لاحد فالولایۃ لہ عند الثانی، وھو ظاہر المذہب "نہر"۔

ترجمہ: "واقف نے خود کو متولی مقرر کیا تو یہ بالاجماع جائز ہے اور اسی طرح اگر واقف نے کسی کو وقف کا منتظم (مُتوَلّی) مقرر کرنے کی شرط عائد نہ کی ہو تو امام ابو یوسف کے نزدیک واقف ہی کے لئے ولایت ثابت ہوگی، یہی ظاہر مذہب ہے، بحوالہ النہر الفائق"۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 6، ص: 451-452، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

جب مُتوَلّی دو شخص مقرر کئے گئے ہوں تو ان میں سے تنہا ایک شخص وقف میں کوئی تصرُّف نہیں کرسکتا، جتنے کام ہوں گے، دونوں کی مجموعی رائے سے انجام پائیں گے۔ اور اگر ان میں سے ایک نے کوئی کام کرلیا اور دوسرے نے اسے جائز قرار دیا یا ایک نے دوسرے کو وکیل مقرر کردیا اور اس نے اس کام کو انجام دیا تو جائز ہے کہ دونوں کی شرکت ہوگئی۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:

واذا جعل الواقف الولایۃ الی اثنین أو صارت الولایۃ الی الوصی والمتولی لم یکن لاحدھما بیع غلۃ الوقف وینبغی علی قول أبی حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ أن یکون لہ ذلک فان باع أحدھما وأجاز الآخر أو وکّل أحدھما صاحبہ بہ جاز وکذا فی الحاوی۔

ترجمہ: "جب واقف نے مُتوَلّی دو افراد کو بنایا ہو یا تولیت وصی اور متولی کے سپرد کی گئی ہو تو ان میں کسی کو اکیلے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ وقف کے غلے کو فروخت کردے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول پر مناسب ہے کہ اسے یہ حق حاصل ہو اور اگر ایک نے فروخت کیا اور دوسرے نے اسے درست قرار دیا یا ایک نے دوسرے کو اپنی طرف سے وکیل بنادیا ہو تو جائز ہے، "حاوی" میں اسی طرح ہے"۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص: 410، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ ایک سے زیادہ مُتوَلّی مقرر کرسکتے ہیں یا نہیں؟، آپ نے جواب میں لکھا: متولی متعدد بھی ہوسکتے ہیں، وہ سب مل کر کام کریں گے ہر ایک مستقل نہ ہوگا۔ مزید سوال کیا گیا کہ جب واقفین میں اختلاف ہو،

بعض زید کو مُتولّی کریں بعض عمرو کو تو اکثر کو ترجیح ہے یا اقل کو، اور بر تقدیر مساوات کس کو اختیار نصبِ مُتولّی کا ہے؟۔ آپ نے جواب میں لکھا: ''ظاہر یہ ہے کہ صورتِ مذکورہ میں زید وعمرو دونوں مُتولّی ہوجائیں گے اور مل کر کام کریں گے کہ نصبِ مُتولّی کی ولایت واقف کو ہے۔ تنویر الابصار میں ہے: وِلَایَۃُ نَصبِ القَیِّمِ الی الواقف'' یعنی مُتولّی مقرر کرنے کی ولایت واقف کو ہے۔ اور وہ سب واقف ہیں اور نصبِ مُتولّی مُتجزّی نہیں (یعنی یہ اختیار ایک کل ہے یہ اجزاء میں نہیں ہوتا) تو ہر ایک کو اختیار کامل ہے تو دونوں مُتولّی ہوجائیں گے''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 16، ص: 606، رضا فاؤنڈیشن لاہور)

ادارے کے قواعد وضوابط (By Laws) پہلے سے طے شدہ ہوتے ہیں، آپ نے یہ واضح نہیں کیا کہ آیا یہ ادارہ ٹرسٹ (وقف) ہے یا انجمن (Association)۔ بہرصورت بورڈ آف ٹرسٹیز یا انجمن کے عہدیداران کا دائرۂ کار اور اختیارات رجسٹرڈ ٹرسٹ ڈیڈ یا ایسوسی ایشن کے میمورنڈم میں پہلے سے طے ہوتے ہیں اور اپنے دستوری میثاق کے اعتبار سے وہ سب اس کے پابند ہوتے ہیں۔ اس میں فرائض واختیارات کا پہلے سے تعیّن ہوتا ہے۔ عہدیداران کی اہلیت اوران کے تقرر ومعزولی (Appointment and Dismissal) کا طریقۂ کار بھی طے ہوتا ہے، لہٰذا سب اس کے پابند ہوتے ہیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ ادارے کے بانی دو ہیں، حالانکہ عام طور پر پوری ہیئت انتظامیہ (Establishment) ہوتی ہے، جو عہدیداران اور مجلسِ عاملہ پر مشتمل ہوتی ہے۔

مدرسے کے لئے وقف پلاٹ کی تبدیلی

سوال: 45

عرصہ 25 سال قبل ایک پلاٹ ایک شخص نے ایک دینی مدرسے کے نام بذریعہ سائل وقف کردیا اور اس پر دینی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ پلاٹ کے چاروں اطراف موجود پلاٹ فروخت ہوگئے، جسکی وجہ سے مذکورہ پلاٹ کی گلی کا مسئلہ پیدا ہوگیا۔ پلاٹ بالکل بند ہوکر رہ گیا اور درس وتدریس کا سلسلہ بھی بند ہوگیا۔ سائل چاہتا ہے کہ مذکورہ پلاٹ فروخت کرکے

اس کے عوض کہیں دوسری جگہ پلاٹ خرید کر دینی درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا جائے۔
شرعی نقطۂ نظر سے وضاحت فرمائیں کہ کیا شرعاً یہ درست ہے؟۔
(احمد رضا سعیدی، استاذ شعبہ علوم اسلامی کراچی یونیورسٹی)

جواب:

اگر مذکورہ پلاٹ اُس شخص نے وقف کر دیا تھا تو اُسے فروخت کرنا جائز نہیں، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں: فیلزم ولایباع ولایوھب ولایورث کذا فی الھدایۃ
ترجمہ: ''جب (وقف قائم ہوجائے) تو وہ لازم ہوجاتا ہے اسے نہ تو بیچا جاسکتا ہے، نہ ھبہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس میں وراثت جاری ہوتی ہے،، جیسا کہ ہدایہ میں ہے''۔
(فتاویٰ عالمگیری، جلد 2 ص:350، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

ہاں! جبکہ واقف (وقف کرنے والے) نے وقف میں (کسی دوسری جائیداد کے عوض) تبدیل کرنے کی شرط ذکر کردی ہو تو اُسے دوسری جائیداد سے بدلا جاسکتا ہے، تبادلے کی شرطوں میں ایک شرط یہ ہے کہ جائیداد غیر منقولہ سے تبادلہ ہو، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: جاز شرط الاستبدال بہ أرضا أخریٰ
ترجمہ: ''(وقف میں) دوسری زمین کے ساتھ تبادلے کی شرط لگانا جائز ہے''۔
(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 6، ص:457، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

آباد وقف کو بدلنے کی چار صورتیں فقہاء نے بیان کی ہیں، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: (لایستبدل العامر الا فی أربع) الاولیٰ: لو شرطہ الواقف، الثانیۃ: اذا غصبہ غاصب وأجری علیہ الماء حتی صار بحرا فیضمن القیمۃ، ویشتری المتولی بھا أرضا بدلاً، الثالثۃ: أن یجحدہ الغاصب ولا بینۃ أی وأراد دفع القیمۃ فللمتولی أخذھا لیشتری بھا بدلاً۔ الرابعۃ: أن یرغب انسان فیہ ببدل أکثر غلۃ وأحسن صقعا، فیجوز علی قول أبی یوسف، وعلیہ الفتویٰ کما فی: فتاویٰ قارئ الھدایۃ قال صاحبُ النھر فی کتابہ: ''اجابۃ السائل'' قول قارئ الھدایۃ والعمل علی قول

ابی یوسف معارض مماقالہ صدر الشریعۃ نحن لانفتی بہ

ترجمہ: ''(چار صورتوں کے علاوہ آباد وقف کو تبدیل کرنا جائز نہیں، ان چار صورتوں میں سے) پہلی صورت یہ ہے کہ خود واقف نے تبدیل کرنے کی شرط لگائی ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی غاصب نے اُسے غصب کر کے اس پر پانی جاری کر دیا یہاں تک کہ وہ وقف دریا بن جائے تو اس صورت میں غاصب قیمت کا تاوان دے گا اور متولی اس قیمت کے بدلے دوسری زمین خریدے گا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ غاصب (وقف کا) انکار کرتا ہے اور گواہ نہیں ہیں، یعنی غاصب زمین کی قیمت دینے پر آمادہ ہے تو متولی کو اختیار ہے کہ اس سے قیمت وصول کرلے تاکہ اس کے بدلے دوسری زمین خریدلے۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص وقف زمین کے بدلے میں ایسی زمین میں رغبت رکھتا ہے جو غلہ (یعنی پیداوار) کے اعتبار سے وقف زمین سے زیادہ پیداوار دیتی ہے اور محلِ وقوع کے اعتبار سے زیادہ خوبصورت ہے، تو امام ابو یوسف کے قول پر اسے تبدیل کرنا جائز ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، جیسا کہ فتاویٰ ''قاری الہدایہ'' میں ہے۔ صاحبِ ''نہر'' نے اپنی کتاب ''اجابۃ السائل'' میں فرمایا: ''قاریٔ الہدایہ'' کا کہنا کہ عمل امام ابو یوسف کے قول پر ہے، صدر الشریعہ کے اس قول کے مخالف ہے، ہم اس پر فتویٰ نہیں دیتے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 6، ص: 460، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے وقف کو تبدیل کرنے کی شرائط کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے جواب میں لکھا:

قال العلامۃ البیری بعد نقلہ اقول وفی فتح القدیر الموجب الشرط اوالضرورۃ ولا ضرورۃ فی ھذا اذلا تجب الزیادۃ بل نبقیہ کماکان، اقول ماقالہ ھذا المحقق ھوالحق الصواب، کلام البیری وھذا ماحررہ العلامۃ القنالی مافی ردالمحتار مختصراً، ورأتنی کتبت علی ھامش قولہ واجری علیہ الماء حتی صار بحرا مانصہ، اقول علی ھذا الم یبق عمارا وفیہ کلام، والصورۃ الرابعۃ سیأتی ان الحق

عدم جواز الاستبدال فیھا فلم یبق الاصورتان، بل لك ان تقول الثالثة ایضا خراب معنی وان لم یکن صورة فلك ان تقول ان العامر لایستبدل الابشرط کماھو قضیة ماحقق المحقق فی الفتح حیث حصرہ فی الشرط او ضرورة خروجه من الانتفاع به وان شئت اوضحت فقلت ان الوقف مھما امکن الانتفاع به لم یجز استبداله الا بالشرط۔

ترجمہ: ”علامہ بیری نے اس کو نقل کرنے کے بعد کہا: میں کہتا ہوں اور فتح القدیر میں ہے: استبدال (وقف کو تبدیل کرنے) کا موجب یا تو شرطِ استبدال ہے یا ضرورتِ استبدال، جبکہ یہاں اس کی ضرورت نہیں کیونکہ وقف پر زیادتی واجب نہیں بلکہ ہم اس کو پہلی حالت پر باقی رکھیں گے۔ میں کہتا ہوں جو کچھ اس محقق نے کہا وہی حق اور درست ہے۔ کلام البیری اور یہ وہ ہے جس کو علامہ قنالی نے تحریر کیا ہے، مختصراً ردالمحتار میں ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے شامی کے قول ”غاصب نے زمین وقف پر پانی بہایا یہاں تک کہ وہ دریا بن گئی“ پر یوں حاشیہ لکھا کہ میں کہتا ہوں اس صورت میں وہ آباد نہ رہی حالانکہ کلام تو آباد زمین میں ہو رہا ہے اور عنقریب چوتھی صورت کے بارے میں آرہا ہے کہ اس میں حق استبدال کا عدمِ جواز ہے، تو اب صرف دو ہی صورتیں باقی رہیں بلکہ تو کہہ سکتا ہے کہ تیسری صورت میں اگرچہ زمین میں صورتاً غیر آباد ہونا نہیں ہے لیکن معنیً غیر آباد ہونا ہے، لہٰذا (اے مخاطب!) تو کہہ سکتا ہے کہ آباد زمین کے وقف میں تبدیلی نہیں کی جائے گی، سوائے اس کے کہ واقف نے خود تبدیل کرنے کی شرط لگادی ہو، جیسا کہ فتح القدیر میں مذکور کلامِ محقق کا تقاضا ہے جہاں اس نے تبدیل کرنے کو شرط یا انتفاع سے خارج ہونے کی ضرورت میں منحصر کیا ہے اگر تو وضاحت کا طلبگار ہے تو میں کہتا ہوں کہ جب تک وقف سے انتفاع ممکن ہو بلا شرط اس کو تبدیل کرنا جائز نہیں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 16، ص:269، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)“۔

امام ابویوسف کے نزدیک وقف زمین کے مقابل دوسری زمین محلِ وقوع کے اعتبار سے پہلی زمین سے زیادہ خوبصورت ہو تو وقف کا تبدیل کرنا جائز ہے یا جب اُس زمین سے

انتفاع ممکن نہ رہے تب واقف کی طرف سے تبدیل کرنے کی شرط کے بغیر بھی بدلنا جائز ہے۔
پس صورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے تو چونکہ مذکورہ پلاٹ دینی مدرسے کے قیام کے لئے وقف کیا گیا تھا اور اب اردگرد کی زمین فروخت ہونے کی وجہ سے وہ پلاٹ محصور ہو گیا ہے اور آمدورفت کا راستہ نہ ہونے کی وجہ سے اس سے جو منفعت مطلوب تھی (یعنی مدرسے کا قیام اور اس میں درس وتدریس کا جاری رہنا) وہ عملاً ممکن نہیں رہا، اس لئے اس کا کسی دوسرے ایسے پلاٹ سے تبدیل کرنا جائز ہے، جہاں واقف کا مقصد پورا ہو سکتا ہے اور وہ قابلِ انتفاع ہو۔ امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی بحث کا خلاصہ یہ لکھا ہے:
''ہاں جو وقف ویران اور خراب ہو جائے تو قاضی الشرع حاکم اسلام عالم عادل متدین خدا ترس کو بلا شرطِ واقف بلکہ باوصفِ منعِ واقف بھی اسے بیچ کر دوسری جائیداد اسی غرض کے لئے اس کے قائم مقام کر دینے کی اجازت ہے۔۔۔۔، (فتاویٰ رضویہ، جلد: 16، ص: 271)''۔
لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سائل کے بیان کے مطابق اگر مذکورہ وقف پلاٹ بالکل محصور ہے تو ایسے محصور پلاٹ کو کوئی اور شخص کیوں خریدے گا؟ ہم نے اصولی مسئلہ بیان کر دیا ہے، اس کا صحیح شرعی اطلاق صاحبِ معاملہ کی اپنی دیانت پر موقوف ہے اور ہر شخص اپنے ہر قول وفعل کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہے۔

میت اور جنازہ کے مسائل

کیا غسّال پر غسل یا وضو واجب ہے؟

سوال:46

کیا میت کو غسل دینے والے شخص پر غسل واجب یا فرض ہے؟

(محمد یوسف، گارڈن ٹاؤن، کراچی)

جواب:

سب سے پہلے چند احادیث مبارکہ ملاحظہ فرمائیں:

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ مَنْ غَسَّلَ مَیِّتاً فَلْیَغْتَسِلْ،

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص میت کو غسل دے، اسے چاہئے کہ غسل کرے، (سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 1463)

(۲) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مِنْ غُسْلِهِ الْغُسْلُ، وَمِنْ حَمْلِهِ الْوُضُوْءُ، یَعْنِی الْمَیِّتَ،

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میت کو غسل دینے سے غسل لازم آتا ہے اور میت کو اٹھانے سے وضو لازم آتا ہے، (سنن ترمذی، رقم الحدیث: 995)''۔

اس کے تحت علامہ ترمذی لکھتے ہیں: میت کو غسل دینے والے کے بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے، بعض اصحاب رسول اور دیگر اہلِ علم کا قول ہے کہ جب کوئی کسی میت کو غسل دے تو اس پر غسل لازم ہے، اور امام مالک بن انس نے کہا: میت کو غسل دینے والے کے لئے غسل کرنا مستحب ہے اور میں اسے واجب نہیں سمجھتا، امام شافعی کا بھی یہی قول ہے اور امام احمد کا قول ہے: جس نے میت کو غسل دیا میرا خیال ہے کہ اس پر غسل واجب نہیں ہے، جہاں تک غسّال میت پر وضو واجب ہونے کی بات ہے، تو اس مسئلے میں بہت کم کلام کیا گیا ہے، امام اسحاق کا قول ہے کہ وضو ضروری ہے اور حضرت عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ میت کو غسل دینے والے پر نہ تو غسل ہے نہ ہی وضو ہے، (سنن ترمذی، ص: 304)۔

(۳) عَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا حَدَّثَتْهُ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ یَغْتَسِلُ مِنْ اَرْبَعٍ مِنَ الْجَنَابَةِ،

وَيَوْمِ الْجُمُعَةِ، مِنَ الْحَجَامَةِ وَمِنْ غُسْلِ الْمَيِّتِ۔

ترجمہ: حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ چار چیزوں پر غسل فرمایا کرتے تھے، جنابت کی وجہ سے، جمعہ کے دن، فسد یا پچھنے لگانے سے اور غسلِ میت سے"۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث:3152)

(۴) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ مَنْ غَسَّلَ الْمَيِّتَ فَلْيَغْتَسِلْ، وَمَنْ حَمَلَهُ فَلْيَتَوَضَّاءُ۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو میت کو غسل دے تو اسے چاہئے کہ غسل کرے اور جو میت کو اٹھائے تو اسے چاہئے کہ وضو کرے"۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث:3153)

اس حدیث کی شرح میں شیخ خلیل احمد سہارنپوری لکھتے ہیں:

قال الخطابی: قلتُ لا اعلمُ أحَدًا مِّنَ الْفُقَهَآءِ يُوْجِبُ الْاِغْتِسَالَ مِنْ غُسْلِ الميت ولا الوضوٴ من حمله ویشبه ان یکون الامر فی ذلك علی الاستحباب، وقد یحتمل أن یکون المعنی أن غاسل المیت لایکاد یأمن ان یصیبه نضح من رشاش المغسول، وربما كان علی بدن المیت نجاسة، فاذا اصابه نضحه، وهو لا یعلم مكانه كان علیه غسل جمیع البدن لیكون الماء قد أتی علی الموضع الذی أصابه النجس من بدنه وقد قیل فی معنی قوله فلیتوضأ أی لیكن علی وضوء لیتهیأ له الصلاة علی المیت، والله اعلم

ترجمہ:"خطابی نے کہا: میں کسی ایک فقیہ کو بھی نہیں جانتا، جس نے محض میت کو غسل دینے والے پر غسل کو واجب قرار دیا ہو اور نہ ہی کسی ایسے فقیہ کو جانتا ہوں جس نے میت اٹھانے پر وضو کو واجب قرار دیا ہو، اس لئے ان احادیث میں امر استحباب پر مبنی ہے یا زیادہ سے زیادہ احتیاط پر مبنی ہے کہ غسل دینے والا بعض اوقات میت کو غسل دیتے وقت اس کے غُسالہ (غسل دیتے وقت میت کے بدن سے بہنے والے پانی) کی چھینٹوں سے (بے

احتیاطی کی بنا پر) بچ نہیں پاتا اور بعض اوقات میت کے بدن پر نجاست ہوتی ہے، جب غسل دینے والے پر اس نجاست کی جگہ کے چھینٹے پہنچیں گے اور اسے اپنے جسم کی وہ جگہ بھی معلوم نہیں (کہ محض اسی جگہ کو دھولے)، تو اسے پھر سارے بدن کو دھونا پڑے گا، اور بعض (شارحینِ حدیث) نے حدیث کے ان الفاظ: ''جو میت کو اٹھائے، اسے چاہئے کہ وضو کرے'' کی تشریح یہ کی ہے کہ وہ پہلے سے باوضو رہے تاکہ نمازِ جنازہ پڑھنے کے لئے تیار رہے (اور جنازے کے وقت پھر وضو کے لئے بھاگ دوڑ نہ کرنی پڑے)، واللہ اعلم، اور حدیث کی سند میں بھی کلام کی گنجائش موجود ہے۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:۔۔ابوداؤد نے کہا:

امام احمد بن حنبل سے دریافت کیا گیا کہ غسل میت سے غسل لازم آتا ہے یا نہیں؟ تو میں نے انہیں یہ کہتے ہوئے سنا، اس کے لئے وضو ہی کافی ہے، کیونکہ ان کے نزدیک غسل ثابت نہیں ہے''۔ (بذل المجہود فی حل ابی داؤد جلد 14 ص:128-129، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

اس تمام بحث سے معلوم ہوا کہ محض غسلِ میت سے غسل دینے والے پر غسل واجب نہیں ہوتا اور نہ ہی میت کا جنازہ اٹھانے سے وضو لازم آتا ہے، ہاں اگر کسی نے میت کو غسل دیتے وقت احتیاط سے کام نہیں لیا اور اسے اندیشہ ہو کہ میت کا بدن ناپاک تھا اور اس کے چھینٹے اس کے بدن پر پڑ گئے ہوں گے، اگر ان ناپاک چھینٹوں کی جگہ معلوم ہو تو اس کا دھولینا کافی ہے، ورنہ احتیاطاً سارا بدن دھولے۔ لیکن اگر کسی نے احتیاط سے غسل دیا ہے، اس کے بدن یا لباس پر ناپاک چھینٹے نہیں پڑے تو اسے غسل کی ضرورت نہیں ہے، اسی طرح جنازہ اٹھانے سے وضو لازم نہیں آتا اور اگر پہلے سے باوضو ہے تو اس سے وضو نہیں ٹوٹتا، حدیث کا منشاء یہ ہے کہ جب نمازِ جنازہ کے لئے گھر سے میت کو اٹھا کر لے جانے کا وقت آئے تو پہلے سے وضو کر لے تاکہ بروقت جنازے میں شامل ہو سکے۔

معروف غیر مقلد عالم شیخ عبدالرحمٰن مبارک پوری متوفی 1352ھ ''تحفۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی'' جلد نمبر 2 ص:132 پر لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''امام ترمذی کا قول ہے، اصحابِ نبی ﷺ میں سے بعض اہلِ علم نے کہا: ''اِذَا غَسَّلَ مَيِّتًا فَعَلَيْهِ الْغُسْلُ''۔ یعنی میت کو نہلانے والے پر غسل واجب ہے، اور یہ حضرت علی وابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور انہوں نے اس باب کی حدیث اور اس کے ہم معنی روایات سے استدلال کیا ہے، کیونکہ اس کے ظاہری الفاظ ''غسالِ میت'' غسل کے وجوب پر دلالت کرتے ہیں اور امام مالک بن انس کا قول ہے: میت کو نہلانے والے کے لئے غسل مستحب ہے اور میں اسے واجب نہیں سمجھتا، امام شافعی کا قول بھی اسی طرح ہے، امام احمد کا قول ہے: جو میت کو غسل دے، میرا نظریہ یہ ہے کہ اس پر غسل واجب نہیں ہے، ان سب نے اس باب کی حدیث سے استدلال کیا ہے، لیکن انہوں نے حدیث میں امر کو مستحب پر محمول کیا ہے، کیونکہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ حدیث مروی ہے: ''لَيْسَ عَلَيْكُمْ فِيْ غُسْلِ مَيِّتِكُمْ غُسْلٌ اِذَا غَسَّلْتُمُوْهُ، اِنَّ مَيِّتَكُمْ يَمُوْتُ طَاهِرًا وَلَيْسَ بِنَجِسٍ فَحَسْبُكُمْ اَنْ يَّغْسِلُوْا اَيْدِيَكُمْ'' یعنی تم پر میت کو غسل دینے سے غسل واجب نہیں ہوتا، بے شک تمہاری میت موت کے وقت پاک ہوتی ہے، ناپاک نہیں، تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اپنے ہاتھ دھولو، اس حدیث کو امام بیہقی نے روایت کیا ہے اور حافظ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث اور امر بالغسل کی حدیث میں اس طرح تطبیق کی جائے کہ میت کو نہلانے والے کے لئے غسل کرنا مستحب ہے (اور امر استحباب پر محمول ہے) اور اگر امر کو وجوب ہی پر محمول کرنا ہو تو اس سے غُسلِ معروف نہیں بلکہ ہاتھ دھونا مراد ہے، جیسا کہ اس حدیث میں صراحت ہے، اور یہ موقف حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی اس حدیث کی رو سے بھی درست ہے کہ وہ فرماتے ہیں: ہم میت کو غسل دیتے تھے، ہم میں کوئی غسل کر لیتا تھا اور کوئی نہیں کرتا تھا، حافظ نے تلخیص میں اس حدیث کی سند کو صحیح قرار دیا ہے''۔

اسی لئے فقہاءِ کرام نے احتیاط کی بنا پر لکھا ہے کہ میت کو غسل دینے والا اپنے ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر پہلے اسے استنجا کرالے، اس کے جسم پر اگر ظاہری نجاست ہو تو اسے دھولے،

روئی سے منہ صاف کرلے، اور اس کے بعد میت کو دائیں کروٹ پر لٹا کر کم از کم تین بار پانی بہائے، پھر بائیں کروٹ پر لٹا کر تین بار پانی بہائے، پھر پورے بدن پر پانی بہائے اور اس عمل میں اگر اس نے احتیاط کی ہے، اپنے بدن کو چھینٹوں سے بچایا ہے تو اسے غسل کی ضرورت نہیں ہے، اگر معلوم ہو کہ خدانخواستہ میت پر غسل جنابت واجب تھا تو اس کو غسل دینے میں زیادہ احتیاط کرے۔ فراغت کے بعد احتیاطاً غسل یا وضو کرنا چاہے تو کرلے اور اگر نہ کرے تو کوئی حرج بھی نہیں ہے۔

کفن کا رنگ اور کپڑے کی کوالٹی

سوال:47

دلائل سے وضاحت فرمائیں کہ مرد اور عورت کے کفن کا رنگ کیسا ہو؟۔

(محمد سلطان حنفی، تحصیل وضلع کوٹلی، آزاد کشمیر)

جواب:

مرد ہو یا عورت سب کے لئے سفید کفن بہتر ہے، احادیث مبارکہ میں بھی سفید کفن کی تلقین کی گئی ہے:

عَنْ ابنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ اِلْبِسُوا مِنْ ثِيَابِكُمُ الْبِيَاضَ فَاِنَّهَا مِنْ خَيْرِ ثِيَابِكُمْ وَكَفِّنُوْا فِيْهَا مَوْتَاكُمْ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سفید کپڑے پہنا کرو کیونکہ یہ تمہارے کپڑوں میں سے سب سے بہتر ہیں، اپنے مُردوں کو (سفید کپڑوں کا) کفن پہناؤ، (سُنن ترمذی، رقم الحدیث:996)''۔

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كُفِّنَ فِي ثَلَاثَةِ أَثْوَابٍ يَمَانِيَةٍ، بِيْضٍ سَحُوْلِيَّةٍ مِنْ كُرْسُفٍ، لَيْسَ فِيْهِنَّ قَمِيْصٌ وَلَا عِمَامَةٌ۔

ترجمہ: ''اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو تین سفید یمنی کپڑوں کا کفن دیا گیا، جو سُوت کے بنے ہوئے تھے اور اُن میں قمیص اور عمامہ

نہیں تھا،(صحیح بخاری، رقم الحدیث:1264، سُنن ترمذی، رقم الحدیث:998)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

وَیَحْسُنُ الْکَفَنُ لِحَدِیْثِ:''حَسِّنُوْا اَکْفَانَ الْمَوْتٰی فَاِنَّھُمْ یَتَزَاوَرُوْنَ فِیمَا بَیْنَھُمْ یَتَفَاخَرُوْنَ بِحُسْنِ اَکْفَانِھِمْ''۔

ترجمہ:''اور کفن اچھا ہونا چاہئے، حدیث مبارک میں ہے:''مُردوں کو اچھا کفن دو، کیونکہ وہ آپس میں ملتے ہیں اور اپنے اچھے کفن پر ایک دوسرے سے فخر و مسرت کا اظہار کرتے ہیں''۔

علامہ ابن عابدین شامی ''وَیحسن الکَفن'' کی شرح میں لکھتے ہیں:

بِاَنْ یُّکَفَّنُ مِثْلَہٗ، وھُوَ اَنْ یُّنْظُرَ اِلٰی ثِیَابِہٖ فِی حَیَاتِہٖ لِلْجُمُعَۃِ وَالْعِیْدَیْنِ، وَفِی الْمَرْاَۃِ مَا تَلْبَسُہٗ لِزِیَارَۃِ اَبَوَیْھَا، کذا فی ''المعراج''۔

ترجمہ:''کوئی شخص جس طرح کے کپڑے اپنی زندگی میں جمعہ اور عیدین کے موقع پر پہنتا تھا، اس طرح کے کپڑے کا (بعد از وفات) اُسے کفن پہنایا جائے، اسی طرح عورت جس طرح کے کپڑے پہن کر اپنے ماں باپ کی ملاقات کے لئے جایا کرتی تھی، (بعد از وفات کوالٹی کے اعتبار سے) اُسے اس طرح کے کپڑے کا کفن پہنایا جائے، ''معراج'' میں بھی اِسی طرح ہے''۔(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص:91,90، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

ویجتنب الحریرَ والمزعفرَ کذا فی الجوھرۃِ النَّیِّرۃ ویکفن بکفن مثلہٖ وھو ان ینظر الی مثل ثِیَابِہٖ فی الحَیَاۃِ لِخُروج العیدین وفی المرأۃ ینظر الی ماتلبس اذا خرجت الی زیارۃ ابویھا کذا فی الزاھدی ۔ ولا بَاس بِالبُرُودِ وَالکَتَّانِ وَالقصب وفِی حقّ النساء بالحریر والابریسم والمعصفر والمزعفر ویکرہ للرجال ذالك وَاَحَبُّ الاَکْفَانِ الثِّیَابُ البِیضُ ھکذا فِی النھایۃ ۔ وَالْخَلَقُ وَالْجَدِیْدُ فِی التکفین سواءٌ کذا فی'' جوھرۃ النَّیِّرۃ'' وکلُّ مَا یباحُ لِلرجال لبسہ فِی حَال الحَیَاۃ یُبَاح تکفینہ بعدالوفاۃ ومالا یُبَاحُ لہ لبسُہٗ حالَ الحیاۃِ لَایُباحُ تکفِینُہٗ بعدَ الوفَاۃِ کذا فی شرح الطحاوی۔

ترجمہ: ''زعفران یا پیلے رنگ سے رنگے ہوئے کپڑے سے اجتناب کرے،'' جوھرۃ النیّرۃ'' میں اسی طرح ہے، کوئی شخص جس طرح کے کپڑے اپنی زندگی میں جمعہ اور عیدین کے موقع پر پہنتا تھا، اس طرح کے کپڑے کا (بعد از وفات) اُسے کفن پہنایا جائے، اسی طرح عورت جس طرح کے کپڑے پہن کر اپنے ماں باپ کی ملاقات کے لئے جایا کرتی تھی، (بعد از وفات) اُسے اس طرح کے کپڑوں کا کفن پہنایا جائے، جیسا کہ ''زاہدی'' میں بھی ہے اور میت کو دھاری دار کپڑے کا کفن، یا اُلسی کے پودے سے تیار کئے جانے والے کپڑے کا کفن پہنانے میں حرج نہیں ہے۔ اور عورتوں کو ریشم اور زرد رنگ یا زعفرانی رنگ کے کپڑے کا کفن دینا جائز ہے اور مرد کے لئے مکروہ ہے اور سب سے زیادہ پسندیدہ سفید کپڑے کا کفن ہے، جیسا کہ ''نہایہ'' میں ہے اور کفن پرانے کپڑے کا ہو یا نئے کا، برابر ہے جیسا کہ ''جوھرۃ النیّرۃ'' میں ہے اور ہر وہ کپڑا جو مرد کو زندگی میں پہننا جائز ہے اُس کی وفات کے بعد اُس کپڑے کا کفن بھی اُس کے لئے جائز ہے اور جس کپڑے کا پہننا اُس کے لئے زندگی میں جائز نہیں، اُس کا کفن بھی نہیں دیا جا سکتا، ''شرح الطحاوی'' میں اسی طرح ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 161، مطبوعہ: مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ (۱) میت کو سفید کپڑے کا کفن پہنانا افضل اور پسندیدہ ہے، لیکن اگر کبھی ایسے حالات ہوں کہ سفید کفن دستیاب نہ ہو تو دوسرے رنگوں کے کپڑے کا کفن بھی پہنایا جا سکتا ہے، البتہ مردوں کے لئے جو لباس زندگی میں منع ہے یعنی زرد رنگ، زعفرانی رنگ اور ریشمی کپڑے کا لباس منع ہے لیکن عورتوں کے لئے جائز ہے۔

(2) کپڑا نیا ہو یا استعمال شدہ اور پرانا اس کا کفن بنانا جائز ہے، بس صاف اور پاک ہونا چاہئے۔

میت کا چبوترے پر رکھ کر نمازِ جنازہ پڑھنا

سوال:48

اگر جنازہ دو فٹ اونچے ایک چبوترے پر رکھا ہوا ہو اور امام اور مقتدی نیچے کھڑے

ہوں تو نمازِ جنازہ ہوجائے گی یا نہیں؟، (محمد صابر، 116/3 سیکٹر D-11 نیو کراچی)۔

جواب:

جنازہ زمین پر رکھا ہو، ہاتھ پر اٹھایا ہوا ہو یا اونچے چبوترے پر ہو یا چار پائی یا مسہری پر رکھا ہو، خواہ اس کی بلندی کم ہو یا زیادہ، نمازِ جنازہ ہر صورت میں جائز ہے۔ نمازِ جنازہ کی شرائط میں ہے کہ جنازہ زمین پر رکھا ہو یا ہاتھوں پر ہو مگر قریب ہو۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: وشرطها أيضاً حضورهٗ (وَوَضْعُهٗ)

ترجمہ: ''نمازِ جنازہ کی شرائط میں سے ایک شرط میت کا موجود ہونا (اور زمین پر رکھا ہوا ہونا) ہے۔ اس کی شرح میں علامہ شامی لکھتے ہیں: أَيْ عَلَى الْأَرْضِ أَوعلى الايدی قريبًا منها

ترجمہ: ''یعنی جنازہ زمین پر رکھا ہوا ہو یا (اگر چھوٹے بچے کا جنازہ ہے تو) ہاتھوں پر ہو مگر قریب ہو، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص: 98، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ زید کہتا ہے اگر جنازہ کو ایسی چار پائی پر رکھ کر نماز پڑھی کہ جس کے پائے ایک بالشت سے کم تھے تب تو نماز ہوگئی ورنہ نہیں، اور ثبوت میں شامی اور کبیری پیش کر کے کہتا ہے کہ جنازہ مثل امام کے ہے جس طرح امام کا ایک بالشت سے اوپر کھڑا ہونا مفسدِ صلوٰۃ ہے، اسی طرح جنازہ کی مسہری کے پائے ایک بالشت سے زیادہ اونچے ہوں تو جنازہ جائز نہیں ہے، کیا یہ قول درست ہے، لہٰذا اگر جنازے کی مسہری کے پائے ایک بالشت سے زیادہ بلند ہوں تو نمازِ جنازہ فاسد ہوجائے گی یا ایک بالشت ہونا اولیٰ اور اس سے زائد مکروہ ہے یا مطلقاً خواہ جس قدر بھی پائے لمبے ہوں جائز ہے؟، آپ نے جواب میں لکھا:

''زید کے اقوال سب باطل و بے اصل ہیں، نہ پایوں کی بلندی شرعاً کسی حد پر مخصوص رکھی گئی ہے، نہ ایک بالشت بلندی میں کچھ اَولَوِیَّت (افضلیت)، نہ ایک بالشت یا ایک گز امام کی بلندی مفسدِ نماز، نہ ہر بات میں جنازہ مثل امام، یہ ہَوَساتِ عاطِلہ واَوہامِ باطلہ (یعنی باطل وہم اور بے کار باتیں) ہیں، جنازہ کا زمین پر رکھا ہونا ضرور شرط ہے اگرچہ

پائے کتنے ہی بلند ہوں اور امام کا بقدرِ امتیاز سب مقتدیوں سے اونچا ہونا صرف مکروہ ہے نہ کہ مفسدِ نماز، (فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 190، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

قبرستان میں نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال: 49

کیا قبرستان کے اندر نمازِ جنازہ ادا کی جاسکتی ہے؟ (ملک محمد نذیر، بفرزون، کراچی)

جواب:

قبر کو سامنے رکھ کر فرض نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے۔قبر نمازی کے دائیں یا بائیں جانب ہو تو حرج نہیں ہے۔لیکن نمازِ جنازہ پڑھتے وقت اگر قبر سامنے بھی ہو تو حرج نہیں ہے کہ نمازِ جنازہ دعا ہے، حقیقتاً نماز نہیں۔بہتر صورت تو یہ ہے کہ اگر قبرستان میں نمازِ جنازہ کے لئے کوئی جگہ مختص ہو تو وہاں نمازِ جنازہ ادا کی جائے۔اگر صفیں بنانے میں قبروں کی بے ادبی کا احتمال نہ ہو اور لوگ قبروں پر نہ چڑھیں تو کسی بھی جگہ نمازِ جنازہ پڑھی جاسکتی ہے، بلکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی میت کو نماز جنازہ پڑھے بغیر دفن کر دیا گیا ہو تو اُس کی قبر پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

امالو دُفِنَ بِلاغسل وَلَمْ یُهَلْ علیه التراب فَاِنَّهٗ یُخْرَجُ وَیُغْسَلُ وَیُصَلّٰی عَلَیْه۔ "جوهرة"، قولهٗ (فَیُصَلّٰی عَلٰی قَبرِہٖ بِلا غُسْلٍ) ای قبلَ اَنْ یَّتَفَسَّخَ۔

ترجمہ: "پس اگر میت کو غسل کے بغیر دفن کر دیا گیا ہو تو جب تک اُس پر مٹی نہ ڈالی جائے، اُسے قبر سے نکال کر غسل دیا جائے گا اور نماز جنازہ پڑھی جائے گی، "جوہرۃ النیرۃ" (میں اسی طرح ہے)۔اگر میت کو غسل کے بغیر دفن کیا گیا ہو، تو جب تک میت پھٹ نہ جائے، اس کی قبر پر نماز پڑھی جائے گی"۔علامہ علاؤالدین حصکفی مزید لکھتے ہیں:

(وان دفن) واهیل علیه التراب (بغیر صلاة) او بها بلا غسل او ممن لا ولایة له (صلی علی قبره) استحساناً (مالم یغلب علی الظن تفسخه) من غیر تقدیر هو الاصح،

ترجمہ: "نمازِ جنازہ پڑھے بغیر میت کو دفن کر دیا گیا اور اُس پر مٹی ڈال دی گئی یا میت کو غسل

دیئے بغیر نمازِ جنازہ پڑھ لی گئی یا میت کے قریب ترین ولی (جسے نمازِ جنازہ پڑھنے کا ترجیحی حق حاصل تھا) کے علاوہ کسی دوسرے نے نماز جنازہ پڑھ لی (اور اس نے نمازِ جنازہ نہیں پڑھی) تو جب تک غالب گمان یہ ہے کہ میت پھٹی نہیں ہوگی، استحسان کے طور پر اس کی قبر پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی، اس میں دنوں کی مقدار کا اعتبار نہیں ہے اور صحیح ترین قول بھی یہی ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3،ص: 97، 117)''۔

پس اگر میت کو نمازِ جنازہ پڑھے بغیر دفن کر دیا گیا ہو تو اس کی قبر کے اوپر بھی نمازِ جنازہ پڑھی جاسکتی ہے۔ قبرستان میں نمازِ جنازہ پڑھنے میں کوئی ممانعت نہیں ہے بشرطیکہ ایسی کشادہ جگہ ہو کہ قبروں کی حرمت کو پامال کئے بغیر صف بندی کی جاسکتی ہو۔ اور اگر قبرستان کی حدود میں یا اس کے متصل نمازِ جنازہ کے لئے کھلی جگہ دستیاب نہ ہو تو پھر نمازِ جنازہ وہاں نہ پڑھی جائے، سوائے ایک استثنائی صورت کے کہ میت کو جنازہ پڑھے بغیر دفن کر دیا گیا ہو کیونکہ ایسی صورت میں تو اس کی قبر پر ہی نماز پڑھی جائے گی۔

نمازِ جنازہ سے متعلق چند سوالات

سوال:50

نمازِ جنازہ کے فرائض، واجبات یا ارکان کیا ہیں؟۔

(خورشید احمد یوسفی، R-941/15 دستگیر کالونی، کراچی)

جواب:

نمازِ جنازہ کے دو رکن ہیں، (۱) چار تکبیرات (۲) قیام

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: و رکنھا شیئان (التکبیرات) الأربع فالأولیٰ رکن أیضا لاشرط فلذا لم یجز بناء أخری علیھا (والقیام) فلم تجز قاعداً بلا عذر - (وسنتھا) ثلاثۃ (التحمید، والثناء، والدعاء فیھا) ذکرہ الزاھدی۔

ترجمہ: ''نمازِ جنازہ میں دو رکن ہیں: (۱) چار تکبیرات (اللہ اکبر) کہنا، پہلی تکبیر بھی رکن ہے شرط نہیں، اس لئے اس پر دوسرے جنازے کی بنا درست نہیں ہے، (۲) قیام، شرعی عذر کے

بغیر بیٹھ کر نمازِ جنازہ جائز نہیں۔ نمازِ جنازہ میں سنّتِ مؤکّدہ تین ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ کی حمد کرنا (۲) اللہ تعالیٰ کی ثناء کرنا (۳) میت کے لئے دعا کرنا، ''زاہدی'' نے اس کو ذکر کیا ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

(التحمید، والثناء) کذا فی ''البحر'' عن المحیط ومقتضٰی قولِ الشارح ثلاثۃٌ أنَّ الثناءَ غیرُ التحمید مع أنہٗ فیما یأتی فسّر الثناء بقولہ سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ فَعُلِمَ أنَّ المرادَ بھما واحدٌ علی ما یأتی بیانُہٗ، فکانَ عَلیہ أنْ یذکر الثالث الصلاۃ علی النبی ﷺ

ترجمہ: ''جیسا کہ ''البحرالرائق'' میں ''محیط'' کے حوالے سے ہے، (بظاہر) شارح کے قول کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ثناء اور چیز ہے اور تحمید دوسری چیز، حالانکہ آئندہ سطور میں ثناء کی تفسیر یوں بیان کی ہے کہ ''سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ'' کہے، اس سے معلوم ہوا کہ دونوں سے مراد ایک ہی چیز ہے، تو مناسب تھا کہ یوں ذکر کرتے کہ تیسری سنّت نبی کریم ﷺ پر درود ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص: 99، 100)''۔ علامہ شامی کی اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ نمازِ جنازہ کی سنتیں تین ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء، یعنی نمازِ جنازہ میں جو ثناء پڑھی جاتی ہے، اس میں حمد بھی شامل ہے۔ (۲) رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجنا۔ (۳) میت اور تمام مسلمانوں کے لئے دعا کرنا۔

مقتدی کا درمیان میں آکر نمازِ جنازہ میں شامل ہونا

سوال: 51

اگر کوئی شخص نمازِ جنازہ میں درمیان میں آکر شامل ہو (یعنی مسبوق ہو) تو وہ باقی نماز کس طرح ادا کرے گا؟

جواب:

ایسا شخص جو نمازِ جنازہ میں بعض تکبیروں کے فوت ہوجانے کے بعد جماعت میں شامل ہو، مسبوق کہلاتا ہے۔ نمازِ جنازہ میں مسبوق کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ فوراً شامل نہ ہو

بلکہ جب امام اگلی تکبیر کہے تو یہ تکبیر کہہ کر جماعت میں شامل ہو جائے (اور یہ اس کی ''تکبیرِ تحریمہ'' ہوگی) اور اپنی فوت شدہ تکبیریں امام کے سلام پھیرنے کے بعد کہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(والمسبوق) ببعض التکبیراتِ لَا یُکَبِّرُ فی الحال بل (ینتظر) تکبیرَ (الامام لِیُکَبِّرَ مَعَهٗ) للافتتاح لما مَرَّ أَنَّ کلَّ تکبیرةٍ کرکعةٍ، وَالمسبوقُ لا یبدأُ بما فَاتَهٗ۔

ترجمہ: ''مسبوق، یعنی جس کی نمازِ جنازہ کی ابتدائی کچھ تکبیریں فوت ہوگئی ہوں (اور اب وہ جماعت میں شامل ہونا چاہتا ہے)، تو فوراً تکبیر کہہ کر شامل نہ ہو بلکہ امام کی اگلی تکبیر کا انتظار کرے تاکہ (اپنی نماز کی پہلی تکبیر) امام کے ساتھ کہے، کیونکہ پہلے گزر چکا ہے کہ نمازِ جنازہ کی ہر تکبیر ایک رکعت کے مثل ہے اور مسبوق اپنی نماز اپنی فوت شدہ رکعتوں سے شروع نہیں کیا کرتا (یعنی مسبوق فوت شدہ رکعتیں امام کے سلام پھیرنے کے بعد ادا کرتا ہے)۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں: قَالَ اَبُوْ یُوْسُف یُکَبِّرُ حین یحضُر (کما لا ینتظر الحاضرُ فی حال التحریمةِ) بل یکبر اتفاقاً للتحریمة، لأنّه کالمُدرِکِ، ثُمّ یکبّرانِ ما فاتهما بعد الفراغ نَسَقاً (بلا دعاء اِن خَشِیا رفع المیت علی الأعناق۔

ترجمہ: ''امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے فرمایا: جب مقتدی حاضر ہو اُسی وقت تکبیر کہے، جس طرح نماز میں امام کے تکبیرِ تحریمہ کہنے کے وقت جو شخص موجود ہوتا ہے وہ انتظار نہیں کرتا بلکہ تکبیرِ تحریمہ امام کے ساتھ کہتا ہے تاکہ امام کے ساتھ تکبیرِ تحریمہ میں شامل ہو، کیونکہ وہ شخص مدرک کی مثل ہے (یعنی ایک شخص تکبیر تحریمہ کے وقت موجود ہے مگر امام کے ساتھ تکبیر نہیں کہی تو وہ امام کے دوسری تکبیر کہنے کا انتظار نہیں کرے گا)، پھر مسبوق اور موجود شخص امام کے سلام پھیرنے کے بعد نمازِ جنازہ میں پڑھی جانے والی دعا کے بغیر اپنی فوت شدہ تکبیریں کہیں، اگر انہیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ اگر وہ دعا میں مشغول ہوئے تو میت کو اٹھالیا جائے گا تو دعا کے بغیر ہی تکبیر کہہ دیں (اور سلام پھیر دیں)''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص: 108، 109)

نمازِ جنازہ کی چوتھی تکبیر کے بعد ہاتھ چھوڑ دے اور سلام پھیرے

سوال:52

نمازِ جنازہ کی چوتھی تکبیر کے بعد ہاتھ باندھے ہوئے سلام پھیرے یا چھوڑ کر؟۔

جواب:

کتبِ فتاویٰ میں یہی مسئلہ درج ہے کہ چوتھی تکبیر کے بعد بغیر کوئی دعا پڑھے سلام پھیرنا چاہیے، علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''چوتھی تکبیر کے بعد بغیر کوئی دعا پڑھے ہاتھ کھول کر سلام پھیر دے''۔

(بہارِ شریعت، حصہ چہارم، ص:333، مکتبۂ رضویہ، کراچی)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ نمازِ جنازہ میں ہاتھ باندھے ہوئے سلام پھیرنا چاہیے یا ہاتھ چھوڑ کر، افضل کیا ہے؟ آپ نے جواب میں لکھا: ''ہاتھ باندھنا سُنّت اس قیام کی ہے جس کے لئے قرار ہو، جیسا کہ درمختار وغیرہ کتابوں میں ہے۔ سلام وقتِ خروج ہے، اُس وقت باندھے رکھنے کا کوئی سبب نہیں ہے، تو ظاہر یہی ہے کہ تکبیرِ چہارم کے بعد ہاتھ چھوڑ دیئے جائیں ۔۔۔۔ان سے ایک اور سوال کیا گیا کہ ''بہارِ شریعت جلد ۴ میں ہے: چوتھی تکبیر کے بعد بغیر کوئی دعا پڑھے ہاتھ کھول کر سلام پھیرے (درمختار، ردالمحتار)، حالانکہ ان کتابوں میں ہاتھ کھولنے کا ذکر نہیں، سخت اضطراب ہے، رفع فرمایئے''۔امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز جواب میں لکھتے ہیں:

''جس روز آپ کا سوال آیا اتفاق سے اُس کے دوسرے دن (ہی) بریلی سے مولوی امجد علی صاحب میرے ملنے کے لئے یہاں آئے، میں نے اُن سے پوچھا، اُنہوں نے فرمایا: ''یہ مسئلہ طویل متعدد مسائل پر مشتمل ہے اور اس کے آخر میں، میں نے درمختار ورد المحتار وغیرہما لکھا ہے۔وغیرہما سے یہاں میری مراد فتاویٰ رضویہ ہے، وہاں جو کچھ مذکور ہے اس کا بعض درمختار سے لیا گیا ہے اور بعض ردالمحتار سے، اور یہ مسئلہ فتاویٰ رضویہ سے''۔ظاہر ہے کہ چوتھی تکبیر کے بعد نہ قیامِ ذی قرار ہے، نہ اس میں کوئی ذکر مسنون، تو ہاتھ باندھے رہنے کی کوئی وجہ

نہیں۔ چوتھی تکبیر کے بعد نماز سے نکلنے کا وقت ہے اور نماز سے نکلنے کیلئے ہاتھ باندھے رکھنا کسی مذہب میں نہیں ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 194، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"

علامہ امجد علی اعظمی سے سوال کیا گیا کہ نمازِ جنازہ میں ہاتھ کھول کر سلام پھیرنا چاہیے یا باندھ کر، دونوں طرح جائز ہے یا نہیں؟، آپ نے جواب میں لکھا:

"ہاتھ کھول کر سلام پھیرنا چاہیے یہ خیال کہ تکبیرات میں ہاتھ باندھے رہنا مسنون ہے، لہٰذا سلام کے وقت بھی ہاتھ باندھے رہنا چاہیے، یہ خیال غلط ہے، وہاں ذکرِ طویل مسنون موجود ہے، اُس پر قیاس، قیاس مع الفارق ہے۔ فقہاءِ کرام نے ہاتھ باندھنے اور کھولنے کے لئے جو کلیہ ارشاد فرمایا ہے اس سے استدلال کی ہمیں حاجت نہیں جب کہ خاص اس بارے میں جزئیہ موجود ہے، "خلاصۃ الفتاویٰ" میں ہے: ولا یعقد بعد التکبیر الرابع لانہ لایبقی ذکر مسنون حتی یعقد فالصحیح انہ یحل الیدین ثم یسلم تسلیمتین ھکذا فی الذخیرۃ

ترجمہ: چوتھی تکبیر کے بعد ہاتھ باندھ کر نہ رکھے، کیونکہ اب کوئی ذکرِ مسنون باقی نہیں رہا کہ ہاتھ باندھ کر رکھے جائیں، پس صحیح یہ ہے کہ چوتھی تکبیر کے بعد ہاتھ کھول دے اور دو سلام پھیرے، ذخیرہ میں اسی طرح سے ہے، (فتاویٰ امجدیہ، جلد اول، ص: 317)"۔

مفتی نور اللہ نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: "نمازِ جنازہ" میں چوتھی تکبیر تک ہاتھ باندھے جائیں، بعد ازاں دونوں ہاتھ چھوڑ دے اور پھر دونوں سلام کہے، خلاصۃ الفتاویٰ صفحہ 225، جلد 1 میں ہے: فالصحیح انہ یحل الیدین ثم یسلم تسلیمتین ھکذا فی الذخیرۃ۔ (ترجمہ) صحیح یہ ہے کہ نماز جنازہ پڑھنے والا دونوں ہاتھ کھول دے پھر دونوں سلام کہے، اسی طرح ذخیرہ میں ہے، (فتاویٰ نوریہ، جلد 1، ص 275)

خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ

سوال: 53

اگر کوئی شخص خودکشی کرلے تو اُس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی یا نہیں؟

جواب:

خودکشی کرنے والے شخص کی بھی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

مَنْ قَتَلَ نَفْسَهٗ (ولو عمداً يُغَسَّلُ وَيُصَلّٰى عَلَيْهِ) به يُفتى، وان كان اعظمُ وزراً من قاتل غيرهٖ، ورجّح الكمالُ قولَ الثانی بِمَا فی مسلم ''انه عليه الصلاة والسّلام أُتِیَ برَجُلٍ قتلَ نفسَهٗ فلم يُصَلِّ عَلَيْهِ''۔

ترجمہ: ''اور ایسا شخص، جس نے خودکشی کی ہو، اگرچہ جان بوجھ کر ایسا کیا ہو تو اُسے غسل دیا جائے گا اور اُس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھی جائے گی، اِسی پر فتویٰ ہے اگرچہ اس (خودکشی کرنے والے) کا گناہ اس شخص سے زیادہ ہے جس نے کسی دوسرے شخص سے لڑائی کی ہو (اور خود مارا گیا ہو یا دوسرے کو قتل کیا ہو)، اور علامہ کمال الدین ابن ہمام نے دوسرے (یعنی امام ابویوسف کے) قول کو ترجیح دی، کیونکہ صحیح مسلم میں حدیث ہے: ''ایک خودکشی کرنے والے شخص کا جنازہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لایا گیا تو آپ ﷺ نے اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی''۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

اقول قد يقال لا دلالة فی الحديث علی ذلك لأنه ليس فيه سوی انه عليه الصلاة والسلام لم يصلّ عليه، فالظاهر انه امتنع زجراً لغيره عن مثل هذا الفعل، كما امتنع علی المديون، ولا يلزم من ذلك عدم صلاة أحد عليه من الصحابة،

ترجمہ: ''میں کہتا ہوں کہ: یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس حدیث میں اس امر پر کوئی دلالت نہیں کہ خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، کیونکہ اس میں صرف اتنی بات ہے کہ آپ ﷺ نے خود اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس کا جنازہ اس لئے نہیں پڑھا تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو اور کوئی خودکشی کی جسارت نہ کرے، جیسے آپ ﷺ نے خود مقروض کا جنازہ پڑھنے سے منع فرمادیا تھا (جس کی بنا پر اس کے قرض کی ادائیگی کی سبیل بن گئی)، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کسی صحابی نے بھی

اس کا جنازہ نہ پڑھا ہو، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص: 102)''۔ تاہم رسول اللہ ﷺ کے عبرت آموز طرزِ عمل کی اتباع کرتے ہوئے کسی بڑے عالم کو خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھانی چاہیے، عام آئمہ حضرات پڑھا سکتے ہیں۔

علامہ ڈاکٹر وہبہ الزحیلی نے لکھا ہے کہ ''شوافع کا مفتیٰ بہٖ قول بھی یہی ہے کہ خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی، (الفقہ الاسلامیہ واَدِلّتہٗ، جلد: 02، ص: 1509)''۔

خودکشی کرنے والے کو ایصالِ ثواب

سوال: 54

خودکشی کرنے والے کے لئے ایصالِ ثواب کر سکتے ہیں؟

جواب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ

ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ اِس جرم کو تو معاف نہیں فرماتا کہ کوئی کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھہرائے اور اس سے کم تر کسی بھی گناہ کو جس کیلئے چاہے معاف فرما دیتا ہے، (النساء: 116)

اس آیۂ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کسی کو نصیب ہو جائے، تو وہ جس کے لئے چاہے کفر و شرک سے کم تر ہر گناہ کو معاف فرما دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۵۳﴾

ترجمہ: ''(اے رسول ﷺ!) کہہ دیجئے! اے میرے بندو جو (اپنی بداعمالیوں کے سبب) اپنے اوپر ظلم کر چکے ہو، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، بیشک اللہ تمام گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے، بلاشبہ وہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے، (الزمر: 53)

صحیح بخاری حدیث نمبر: 3470 میں گزشتہ امتوں کے ایسے گناہگار شخص کا ذکر ہے جو سو قتل کر چکا تھا، لیکن جب اس نے صدقِ دل سے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے اس کی مغفرت فرما دی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ لوگ آخرت کی جوابدہی سے بےخوف ہو

کر گناہوں میں مبتلا ہو جائیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر بشری کمزوری سے گناہ صادر ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت سے ہمیشہ کے لئے نا امید نہیں ہونا چاہئے بلکہ ہر حال میں اس کی رحمت کا امیدوار ہونا چاہئے۔ اس لئے جب ہر گناہگار کی مغفرت کی امید کی جاسکتی ہے تو خودکشی کرنے والے کو بھی ایصال ثواب کر سکتے ہیں اور اس کے لئے دعائے مغفرت کی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بعید نہیں کہ وہ اُس کی مغفرت فرمادے اور اُس نے اپنی جان کو ہلاک کر کے جو فعلِ حرام کا ارتکاب کیا ہے، اللہ اُس کے اِس گناہ کو معاف فرمادے یا اُس کے عذاب میں تخفیف فرمادے۔

صحیح مسلم میں ایک طویل حدیث میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت طفیل بن عمرو دوسی بھی اپنی قوم کے ایک شخص کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ آ گئے۔ حضرت طفیل کا وہ ساتھی بیمار ہو گیا اور جب بیماری اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گئی تو اس نے ایک لمبے تیر کے پھل یا چھری سے اپنی انگلیوں کے جوڑ کاٹ ڈالے، جس کی وجہ سے اُس کے دونوں ہاتھوں سے خون بہنے لگا اور اسی سبب سے اُس کا انتقال ہو گیا۔ حضرت طفیل نے اسے خواب میں اچھی حالت میں دیکھا، لیکن انہوں نے دیکھا کہ اُس کے دونوں ہاتھ کپڑے میں لپٹے ہوئے ہیں۔ حضرت طفیل نے پوچھا:

مَا صَنَعَ بِكَ رَبُّكَ؟، فَقَالَ غَفَرَ لِي بِهِجْرَتِي إِلَى نَبِيِّهِ ﷺ، فَقَالَ لَهُ مَا لِي أَرَاكَ مُغَطِّيًا يَدَيْكَ؟، قَالَ قِيلَ لِي لَنْ نُصْلِحَ مِنْكَ مَا أَفْسَدْتَ فَقَصَّهَا الطُّفَيْلُ عَلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ اَللّٰهُمَّ وَلِيَدَيْهِ فَاغْفِرْ۔

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا؟، اُس نے کہا: اللہ تعالیٰ نے مجھے رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت کرنے کے سبب بخش دیا، حضرت طفیل نے پوچھا: تم نے اپنے دونوں ہاتھوں کو کیوں لپیٹ رکھا ہے؟، اُس نے کہا کہ (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) مجھے فرمایا گیا کہ جس چیز کو تم نے خود بگاڑا ہے، ہم اُسے ٹھیک نہیں کریں گے، حضرت طفیل نے یہ خواب رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا تو خواب سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ!

اس کے ہاتھوں کے قصور کو بھی معاف فرما دے''۔اس صحابی کی موت اس کے اپنی انگلیوں کے جوڑ کاٹنے کے سبب زیادہ خون بہ جانے (Bleeding) کی وجہ سے واقع ہوئی، اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے اس کے لیے دعائے مغفرت فرمائی۔

(صحیح مسلم، کتاب الایمان، رقم الحدیث:307)

خودکشی کی شرعی حیثیت

سوال:55

خودکشی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب:

اسلام کی رو سے انسان اپنی جان کا مالک ومختار نہیں ہے، انسان کی جان اور اس کا وجود اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اسکی ودیعت وامانت ہے، انسان کو صرف اس جسم وجان کے تصرف واستعمال کا اختیار دیا ہے اور اس کیلئے شریعت نے حدود وقیود بھی مقرر فرما دی ہیں، اسی تصرفِ اختیاری پر جزا وسزا کا مدار ہے۔انسان چونکہ اپنے جسم وجاں کا مالک نہیں ہے، اس لئے اسے اپنی جان یا کسی عضو کو تلف کرنے، کاٹ پھینکنے یا فروخت کرنے کا اختیار نہیں ہے، یہ تمام افعال وتصرفات ممنوع اور حرام ہیں۔جان لینے اور تلف کرنے کا اختیار صرف اسی قادرِ مطلق اور خالق عزّ وجلّ کا ہے جس نے یہ جان تخلیق فرمائی ہے، وہ جب چاہے اپنی اس امانت کو واپس لے سکتا ہے، کسی کو مجالِ انکار نہیں ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(1) وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ

ترجمہ:''اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو، (البقرہ:195)''۔

(2) وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا

ترجمہ:''اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو، بلاشبہ اللہ تم پر بڑا مہربان ہے(النساء:29)''۔

خودکشی گناہ کبیرہ ہے: اسلام میں خودکشی گناہ کبیرہ ہے اور اس کا مرتکب جہنم کا سزاوار ہوگا، دنیا میں تو وہ ایک مرتبہ اپنی جان تلف کرتا ہے، لیکن اس کی سزا کے طور پر اسے طویل

عرصے تک اور لاتعداد بار اس اذیت سے گزرنا پڑے گا، غور فرمائیے! اس کا انجام کتنا ہیبت ناک اور ہولناک ہے، حدیث پاک میں ہے:

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَنْ قَتَلَ نَفْسَهٗ بِحَدِیْدَةٍ فَحَدِیْدَتُهٗ فِیْ یَدِهٖ یَتَوَجَّأُ بِهَا فِیْ بَطْنِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُّخَلَّدًا فِیْهَا اَبَدًا وَمَنْ شَرِبَ سَمًّا فَقَتَلَ نَفْسَهٗ فَهُوَ یَتَحَسَّاهُ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُّخَلَّدًا فِیْهَا اَبَدًا وَمَنْ تَرَدّٰی مِنْ جَبَلٍ فَقَتَلَ نَفْسَهٗ فَهُوَ یَتَرَدّٰی فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُّخَلَّدًا فِیْهَا اَبَدًا۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی آہنی ہتھیار سے خودکشی کرے، تو (آخرت میں) وہ ہتھیار اس کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ جہنم کی آگ میں (بطور سزا) دائمی طور پر یہ ہتھیار اپنے پیٹ میں گھونپتا رہے گا، اور جو شخص زہر کھا کر خودکشی کرے گا، تو وہ جہنم میں ہمیشہ زہر کھاتا رہے گا، اور جو شخص کسی پہاڑ (یا بلند و بالا عمارت و مینار) سے گر کر یا چھلانگ لگا کر خودکشی کرے گا تو وہ (اس عمل کی سزا کے طور پر) ہمیشہ جہنم (کے گہرے گڑھوں) میں گرتا رہے گا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 296)''۔

نوٹ: خودکشی کی وعید کے سلسلے میں جواب 54 کا مطالعہ بھی مفید رہے گا۔

میت کو دفن کرنے کے بعد آیا ہاتھ دھونا ضروری ہیں؟

سوال: 56

اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ میت دفن کر کے آتے ہیں تو گھر میں داخل ہوتے ہی پہلے ہاتھ منہ دھلائے جاتے ہیں، شرعی طور پر کیا یہ درست ہے؟

(معلمات فاروقیہ تعلیم القرآن اکیڈمی، کراچی)

جواب:

شرعاً اس میں کوئی ممانعت بھی نہیں اور نہ ہی منہ ہاتھ دھونا لازم ہے۔ ہاں! اگر ہاتھ پر مٹی وغیرہ لگی ہو یا چہرہ گرد آلود ہو گیا ہو تو دھو لیا جائے۔ تدفین کے وقت جب قبر پر مٹی ڈالی جاتی ہے تو ہاتھ پر لگنے والی مٹی کو جھاڑ لیں یا دھو ڈالیں، دونوں باتیں جائز ہیں۔

میت کی تدفین والے دن میت کے گھر کھانے کا اہتمام

سوال:57

اگر کسی گھر میں میت ہوجائے تو کہتے ہیں کہ میت کو دفنانے کے فوراً بعد گھر میں کسی میٹھی چیز، سوجی وغیرہ پر دعا کرواکر بچوں کو کھلانا چاہیے، کیا یہ درست ہے؟

جواب:

چونکہ میت کے اہلِ خانہ غم سے دوچار ہوتے ہیں اور میت کی تکفین وتدفین میں بھی مشغول رہتے ہیں اور اس وقت کھانے پینے کا خیال نہیں رہتا، اس لئے میت کے رشتے داروں اور پڑوسیوں کے لئے مستحب یہ ہے کہ وہ میت کے اہل خانہ کے لئے ایک دن کے کھانے کا اہتمام کریں اور انہیں اصرار کر کے کھلائیں، کیونکہ ایسے وقت میں رسول اللہ ﷺ نے میت کے اہل خانہ کی دل جوئی کا حکم ارشاد فرمایا ہے:

عَنْ عَبْدِاللهِ بنِ جعفرَ قَالَ لَمَّا جَاءَ نَعْيُ جعفرَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ اِصْنَعُوا لِأَهْلِ جَعفرَ طَعَاماً فَاِنَّهُ قَدْ جَاءَ هُمْ مَايَشْغَلُهُمْ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ''غزوۂ موتہ'' سے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر آئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جعفر کے گھر والوں کے لئے کھانا تیار کرو کیونکہ ان پر ایسی مصیبت نازل ہوئی ہے کہ انہیں (کھانے کے اہتمام کا) ہوش نہیں ہے، (سنن ترمذی، رقم الحدیث:998)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: حمل الطعام الی صاحب المصیبۃ والاکل معھم فی الیوم الاول جائز لشغلھم بالجھاز وبعدہ یکرہ کذا فی التتارخانیۃ

ترجمہ: ''میت والوں کے گھر پہلے دن کھانا لے جانا اور اُن کے ساتھ ملکر کھانا جائز ہے، کیونکہ وہ میت کے کفن دفن میں مشغول رہتے ہیں اور اس کے بعد مکروہ ہے، جیسا کہ فتاویٰ ''تاتارخانیہ'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص:344، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

ہاں ! اگر کوئی عزیز، رشتے دار ایصالِ ثواب کی غرض سے ایسا کرنا چاہے تو درست

اور جائز ہے۔ ایصالِ ثواب مستحب اور مستحسن امر ہے، شرعاً واجب نہیں ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ کھانا یا جو کچھ بھی ایصالِ ثواب کیا جا رہا ہے، وہ فقراء و مساکین کو دیا جائے۔ تعزیت کرنے والوں کے لئے بطورِ ضیافت کھانے کا اہتمام کرنا مکروہ ہے۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے اس موضوع پر ایک رسالہ ''جَلِیُّ الصَّوت لِنَہیِ الدَّعوَۃِ اَمَامَ مَوت'' (کسی موت پر دعوت کی ممانعت کا واضح اعلان) لکھا، جس میں میّت کی طرف سے تعزیت کے لئے آنے والوں کی ضیافت کی کراہت و ممانعت بیان کی گئی ہے۔ اس کی اہم باتیں درج ذیل ہیں:

''کشف الغطاء میں ہے: ترجمہ: ''تعزیت کرنے والوں کے لئے اہلِ میّت کا ضیافت کرنا اور کھانا پکانا باتفاق روایات مکروہ ہے، اس لئے کہ مصیبت میں مشغول ہونے کی وجہ سے اس کا اہتمام ان کے لئے دشوار ہے''۔ اسی میں ہے: ترجمہ: ''تو یہ جو رواج پڑ گیا ہے کہ تیسرے دن اہلِ میّت کا کھانا پکاتے ہیں اور اہلِ تعزیت اور دوستوں کو بانٹتے کھلاتے ہیں، ناجائز و ممنوع ہے، ''خزانہ'' میں اس کی تصریح ہے۔ اس لئے کہ شرع میں ضیافت خوشی کے وقت رکھی گئی ہے مصیبت کے وقت نہیں اور یہی جمہور کے نزدیک مشہور ہے''۔

مزید لکھتے ہیں: میّت کے یہاں جو لوگ جمع ہوتے ہیں اور اُن کی دعوت کی جاتی ہے اُس کھانے کی تو ہر طرح ممانعت ہے اور بغیر دعوت کے جمعراتوں، چالیسویں، چھ ماہی، برسی میں جو بھاجی کی طرح اغنیاء کو بانٹا جاتا ہے، وہ بھی اگرچہ بے معنی ہے مگر اس کا کھانا منع نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ غنی نہ کھائے اور فقیر کو تو کچھ مضائقہ نہیں کہ وہی اس کے مستحق ہیں''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 661 تا 673، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

قبر میں عہد نامہ رکھنا

سوال: 58

کیا مردے کے کفن میں عہد نامہ رکھ سکتے ہیں؟

جواب:

قبر میں عہد نامہ رکھنا ضروری نہیں ہے۔ہاں! جائز ضرور ہے،لیکن کفن میں یا سینے پر نہ رکھا جائے بلکہ قبلہ کی جانب قبر کی دیوار میں چہرہ کے مقابل طاق بنا کر اس میں رکھ دیا جائے ،علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

کتب علی جبهة المیّت أو عمامته أو کفنه عهدنامه ترجی ان یغفر الله للمیّت۔ أوصیٰ بعضهم ان یکتب فی جبهته وصدره بسم الله الرحمٰن الرحیم ففعل،ثم رئی فی المنام فسئل فقال لما وضعت فی القبر جاءتنی ملائکة العذاب،فلما رأوا مکتوباً علی جبهتی بسم الله الرحمٰن الرحیم قالوا أمِنْتَ من عذاب الله۔

ترجمہ:''میت کی پیشانی یا عمامہ یا کفن پر عہد نامہ لکھا گیا،اللہ تعالیٰ سے اس کی بخشش کی امید کی جاسکتی ہے۔کسی شخص نے وصیت کی کہ میری پیشانی اور سینہ پر''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھ دینا،سولکھ دی گئی۔اس کے مرنے کے بعد کسی نے اس کو خواب میں دیکھ کر اس کا حال پوچھا،اس نے کہا: جب میں قبر میں رکھا گیا تو میرے پاس عذاب کے فرشتے آئے، جب انہوں نے میری پیشانی پر''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم''لکھی دیکھی تو انہوں نے کہا: تو اللہ کے عذاب سے محفوظ ہوا۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں محقق ابن حجر مکی شافعی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ترجمہ: محقق ابن حجر المکی الشافعی کے فتاویٰ میں ہے: ان سے کفن پر عہد نامہ لکھنے کی بابت پوچھا گیا،اس کے کلمات یہ ہیں:

''لا اله الا الله وحده لا شریك له ، له الملك وله الحمد، لا اله الا الله ولا حول ولا قوة الا بالله العلی العظیم''(ایک روایت میں یہ کلمات بھی ہیں)''اللّٰهم فاطر السمٰوٰت والارض عالم الغیب والشهادة الرحمٰن الرحیم، انی اعهد الیك فی هذه الحیٰوة الدنیا، انی اشهد انك انت الله لا اله الا انت وحدك لا شریك لك وان محمداً عبدك ورسولك ﷺ، فلا تکلنی الی نفسی تُقربنی من الشر وتُبعدنی من الخیر، وانا لا اثِقُ الا

برحمتِکَ فاجعل لی عھداً عندک توفنیہ یومَ القیامۃ انکَ لا تُخلِفُ المعیاد''۔

آیا کفن پر یہ کلمات لکھنے جائز ہیں اور اس کی کوئی اصل ہے؟ تو انہوں نے یہ جواب دیا: بعض علماء نے امام (حکیم) ترمذی کی کتاب ''نوادر الاصول'' سے جو کچھ نقل کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دعا کی اصل ہے اور فقیہ ''ابن عجیل'' اس کا حکم دیا کرتے تھے۔ پھر زکوٰۃ کے اونٹوں پر ''اللہ'' لکھنے کے جواز پر قیاس کرتے ہوئے، اس کے بھی جواز کا فتویٰ دیا اور بعض علما نے اسے برقرار رکھا۔ یہ بات محلِ نظر ہے، ''ابن الصلاح'' نے فتویٰ دیا ہے کہ کفن پر یٰس اور الکہف وغیرہ لکھنا جائز نہیں ہے، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ میت کے بدن سے پیپ نکلے اور بے ادبی ہو۔ یہ قیاس ممنوع ہے، کیونکہ اونٹوں پر لکھنے کا مقصد انہیں ممتاز کرنا ہے اور یہاں برکت حاصل کرنا ہے اور کفن پر لکھے ہوئے اسماءِ باری تعالیٰ باقی رہتے ہیں، لہٰذا ان کا نجاست سے آلودہ کرنا جائز نہیں ہے، یہ قول مردود ہے کہ ایسا کرنا (شرعاً) مطلوب ہے، کیونکہ اس طرح کے اقوال سے حجت کرنا مناسب نہیں، جب تک کہ نبی کریم ﷺ سے وہ صحیح طور پر ثابت نہ ہوں اور یہاں ایسا نہیں ہے۔ ہم ''باب المیاہ'' سے کچھ پہلے فتح القدیر کے حوالے سے یہ بیان کرچکے ہیں کہ قرآن اور اللہ تعالیٰ کے اسماء کو دراہم، محرابوں، دیواروں اور فرش پر لکھنا مکروہ ہے۔ اور یہ کراہت محض احترام باقی رکھنے اور پاؤں سے روندے جانے یا اس کی مثل دیگر اہانت والے کاموں کے اندیشہ کی وجہ سے ہے، تو جب تک مجتہد سے ثابت نہ ہو یا اس بارے میں حدیث ثابت نہ ہو منع کرنا بہتر ہے، یہ غور کا مقام ہے۔ ہاں بعض حاشیہ نگاروں نے ''فوائد الشرجی'' سے نقل کیا ہے کہ میت کو غسل دینے کے بعد اور کفن پہنانے سے پہلے روشنائی کے بغیر انگشتِ شہادت سے میت کی پیشانی پر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' اور سینے پر ''لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' لکھ دیا جائے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد:03، ص:146-47)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی نے جو خواب کا ذکر فرمایا (کہ میت کی پیشانی اور سینہ پر بسم اللہ لکھنے سے اس کی بخشش ہوگئی)، شرعاً حجت نہیں بن سکتا کہ شرعی احکام کا مدار خواب پر نہیں ہوسکتا۔

حرفِ آخر: ہمیں دو انتہا پسندانہ رویوں کا سامنا ہے۔ ایک ان لوگوں کا رویہ ہے جو اپنے آپ کو حنفی کہلاتے ہیں، لیکن فقہِ حنفی میں جن چیزوں کا جواز ثابت ہے، ان سے انکار کرتے ہیں اور انہیں بدعت قرار دیتے ہیں۔ دوسرا رویہ ان لوگوں کا ہے جو ایسے امور کو جو محض اباحت وجواز کے درجے میں ہیں، عملاً واجب ولازم سمجھتے ہیں اور پھر اسے مسلکی اختلاف کی علامت بناتے ہیں اور شعارِ اہلسنت قرار دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک حق ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے اور یہ قول راجح ہے کہ روشنائی کے بغیر میت کی پیشانی اور کفن پر انگشتِ شہادت سے خیر وبرکت کے لئے اور عفو ومغفرتِ باری تعالیٰ کی امید پر یہ کلمات لکھ دیئے جائیں۔

لوگوں میں مشہور باتوں کا شرعی حکم

سوال:59

عورتوں کا قبرستان جانا اور قبرستان کی مٹی ہاتھ میں لے کر یہ کہنا کہ اب ہم مردوں کو نظر نہیں آئیں گی، اس کے بارے میں وضاحت فرمائیں۔

جواب:

اس بات کی کوئی اصل نہیں ہے، یہ محض لوگوں کی خودساختہ باتیں ہیں۔ جن کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

سوال:60

کہتے ہیں کہ جس جگہ مردے کو غسل دیا جائے اس جگہ پر چالیس دن روشنی رکھی جائے، اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:

اس بات کی بھی کوئی اصل نہیں ہے۔

جمعرات کو ارواح اموات کا آنا

سوال:61

اکثر گھروں میں جمعرات کو بطورِ خاص مُردوں کے لئے دعا کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے

کہ بروز جمعرات تمام روحیں یہ دیکھنے آتی ہیں کہ کیا اس کے لئے دعا کی گئی ہے یا نہیں؟ اس بات کی بھی وضاحت کر دیں کہ کیا یہ درست ہے؟

جواب:

اس مسئلے کا تعلق نہ تو عقائد سے ہے اور نہ ہی فقہی مسائل سے ہے۔ اس مسئلے سے قبل یہ جان لینا چاہئے کہ تمام روحوں کا مستقر کوئی ایک جگہ نہیں ہے، بلکہ اپنے اپنے مرتبے کے مطابق ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی روحیں مَلاِ اعلیٰ میں علیین میں ہیں اور ان میں بھی فرق مراتب ہے۔ شہداء کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے پوٹوں میں ہیں، بعض روحیں جنت کے دروازوں پر ہوں گی۔ حافظ ابن حجر نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ مومنوں کی روحیں علیین میں ہیں اور کافروں کی روحیں سجین میں ہیں۔ ہر روح کا جسم کے ساتھ ایک قسم کا تعلق ہے جو دنیوی تعلق سے مختلف ہے۔ اس تقریر سے تمام احادیث کا تعارض دور ہو جاتا ہے اور ارواح خواہ علیین میں ہوں یا سجین میں، ان کا اپنے جسموں کے ساتھ اتصال معنوی ہوتا ہے۔ اب اگر میت کو ایک قبر سے دوسری قبر میں منتقل کریں یا اس کے اجزاء منتشر ہو جائیں تب بھی روح کا اپنے جسم یا اس کے اجزاء اصلیہ سے اتصال باقی رہتا ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے ایک رسالہ ''اِتْیَانُ الْاَرْوَاحِ لِدِیَارِھِم بَعْدَ الرَّوَاحِ'' (روحوں کا وفات کے بعد اپنے گھر آنا) تحریر فرمایا، آپ لکھتے ہیں: شیخ الاسلام ''کشف الغطاء عما لزم للموتی علی الاحیاء'' فصل ہشتم میں فرماتے ہیں:

در غرائب وخزانہ نقل کردہ کہ ارواح مومنین می آیند خانہ ہائے خودرا، ہر شب جمعہ وروزِ عید وروزِ عاشورہ وشب برات، پس ایستادہ می شوند بیرون خانہائے خود وندامی کند ہر یکے بآواز بلند اندوہ گین اے اہل واولادِ من ونزدیکانِ من مہربانی کنید برما بصدقہ۔

ترجمہ: ''غرائب اور خزانہ میں منقول ہے کہ مومنین کی روحیں ہر شب جمعہ، روزِ عید، روزِ عاشورہ اور شب برات کو اپنے گھر کے باہر آکر کھڑی رہتی ہیں اور ہر روح غمناک لہجے میں بلند آواز سے ندا کرتی ہے کہ اے میرے گھر والو! اے میری اولاد! اے میرے

قرابت دارو! صدقہ کر کے ہم پر مہربانی کرو"۔

ابن ابی الدنیا وبیہقی سعید بن مسیب رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت سلمان فارسی وعبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہما باہم ملے، ایک نے دوسرے سے کہا کہ اگر تم مجھ سے پہلے انتقال کرو تو مجھے خبر دینا کہ وہاں کیا پیش آیا، کہا: کیا زندے اور مردے بھی ملتے ہیں؟، کہا: نعم اما المومنون فان ارواحھم فی الجنۃ وھی تذھب حیث شاءت۔

ترجمہ: "ہاں مسلمانوں کی روحیں تو جنت میں ہوتی ہیں انہیں اختیار ہوتا ہے جہاں چاہیں، جائیں"۔

ابن المبارک کتاب الزہد وابوبکر ابن ابی الدنیا وابن مندہ سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں: قال: ان ارواح المومنین فی برزخ من الارض تذھب حیث شاءت ونفس الکافر فی سجین

ترجمہ: "بیشک مسلمانوں کی روحیں زمین کے برزخ میں ہیں جہاں چاہتی ہیں، جاتی ہیں اور کافر کی روح سجین میں مُقیّد ہے"۔ ابن ابی الدنیا مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں: قال بلغنی ان ارواح المومنین مرسلۃ تذھب حیث شاءت

ترجمہ: "فرمایا: مجھے حدیث پہنچی ہے کہ مسلمانوں کی روحیں آزاد ہیں، جہاں چاہتی ہیں، جاتی ہیں"۔

دستور القضاۃ مستند صاحبِ مائۃ مسائل میں فتاویٰ امام نسفی ہے: ان ارواح المومنین یاتون فی کل لیلۃ الجمعۃ، ویوم الجمعۃ فیقومون بفناء بیوتھم ثم ینادی کل واحد منھم بصوت حزین یا اھلی ویا اولادی ویااقربائی اعطفوا علینا بالصدقۃ واذکرونا ولا تنسونا وارحمونا فی غربتنا۔

ترجمہ: "بے شک مسلمانوں کی روحیں ہر روز وشبِ جمعہ اپنے گھر آتی ہیں اور دروازے کے پاس کھڑی ہو کر دردناک آواز سے پکارتی ہیں کہ اے میرے گھر والو!، اے میرے بچو!، اے میرے عزیزو! ہم پر صدقہ سے مہربانی کرو، ہمیں یاد کرو بھول نہ جاؤ، ہماری پردیسی

میں ہم پر ترس کھاؤ"۔

نیز خزانۃ الروایات مستند صاحب مائۃ مسائل میں ہے: عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اذا کان یوم عید او یوم جمعۃ او یوم عاشوراء ولیلۃ النصف من الشعبان تاتی ارواح الاموات ویقومون علی ابواب بیوتھم فیقولون هل من احد یذکرنا هل من احد یترحم علینا هل من احد یذکر غربتنا الحدیث۔

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے جب عید یا جمعہ یا عاشورے کا دن یا شب برات ہوتی ہے، اموات کی روحیں آکر اپنے گھروں کے دروازوں پر کھڑی ہوتی اور کہتی ہیں: کوئی ہے کہ ہمیں یاد کرے، کوئی ہے کہ ہم پر ترس کھائے، کوئی ہے کہ ہماری پردیسی ہونے کو یاد رکھے"۔

اسی طرح کنز العباد میں بھی کتاب الروضہ امام زندویسی سے منقول، یہ مسئلہ کہ نہ عقائد کا ہے نہ فقہ کے حلال وحرام کا۔ ایسی جگہ دو ایک سندیں بھی بس ہوتی نہ کہ اس قدر کثیر ووافر۔

امام جلالۃ الملۃ والدین سیوطی مناہل الصفا فی تخریج احادیث الشفاء زیر رثائے امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لم اجدہ فی شئی من کتب الاثر لکن صاحب اقتباس الانوار وابن الحاج فی مدخلہ ذکراہ فی ضمن حدیث طویل وکفی بذلك سندا لمثلہ فانہ لیس مما یتعلق بالاحکام۔

ترجمہ: "میں نے یہ حدیث کسی کتابِ حدیث میں نہ پائی، مگر صاحبِ اقتباس الانوار اور ابن الحاج نے "مدخل" میں اسے ایک حدیثِ طویل میں بے سند ذکر کیا۔ ایسی حدیث کی اتنی ہی سند کافی ہے کہ وہ کچھ احکام سے متعلق نہیں"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 9، رسالہ "اِتْیَانُ الاَرْوَاحِ لِدِیَارِھِم بَعْدَ الرَّوَاحِ"، ص: 649 تا 659)

امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

"اور نیز اکثر کتب معتبرہ اہلسنت وجماعت، فقہ واحادیث وتفاسیر مثلاً دقائق الاخبار،

دار الحسان، دستور القضاۃ، فتاویٰ نسفیہ، الاشباہ والنظائر، روضۃ الریاحین، خزانۃ الروایات، عوارف المعارف، تذکرۃ الموتیٰ، فتاویٰ عزیزی، تفسیرِ عزیزی اور اشعۃ اللمعات میں ارواح کا آنا مسطور، (فتاویٰ رضویہ، جلد 14، ص: 696)''۔

شیخ خلیل احمد انبیٹھوی نے لکھا ہے: ''اور بعد ان سب امور کے یہ سنو کہ یہ اعتقادیات میں داخل ہے کہ ارواح کا شبِ جمعہ کو گھر آنا اعتقاد کرے اور اعتقادیات میں قطعیات کا اعتبار ہوتا ہے، نہ ظنیاتِ صحاح کا، چہ جائے کہ ضِعاف اور موضوعات کا، پس سب قصہ طے ہوگیا، (البراہین القاطعہ علی الانوار الساطعۃ، ص: 89)''۔

شیخ اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں: ''اگر ایسی ویسی کتاب میں لکھا ہوا دیکھو، تب بھی ایسا اعتقاد مت رکھنا، جس کتاب کو عالم سند نہ رکھیں، وہ بھروسے کی نہیں ہے''۔
(بہشتی زیور، جلد: 06، ص: 686، مطبوعہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور)

بعض مبارک ایام میں ارواحِ موتیٰ کا آنا اگرچہ رسول اللہ ﷺ سے کسی صحیح یا ضعیف سند سے ثابت نہیں ہے، تاہم اثر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور مستند و معتبر اکابرِ امت کی کتب سے ثابت ہے، یعنی ان اکابر امت نے ان روایات کو نہ صرف قبول کیا ہے بلکہ نقل بھی کیا ہے۔ اثرِ صحابی کے بارے میں یہ حسنِ ظن ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک بات نقل کی ہے تو ضرور رسول اللہ ﷺ سے سنا ہوگا۔ اصولِ فقہ میں یہ امر مسلّم ہے کہ کسی چیز کے بارے میں شرعی حیثیت سے جس درجے کا دعویٰ کیا جائے، اسی درجے کی دلیل طلب کی جانی چاہئے۔ ہر مسئلے کے لئے ''قطعیّ الثبوت اور قطعی الدلالۃ'' دلیل طلب کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ ایسی دلیل کا انکار تو کفر ہے۔ یہ امر بھی مسلّم ہے کہ فضائلِ اعمال میں ''ظنی الثبوت اور ظنیّ الدلالۃ'' دلیل ہی کافی سمجھی جاتی ہے، اکابر علماءِ دیوبند کے ہاں ایسی متعدد مثالیں ملیں گی، مولانا محمد زکریا نے فضائلِ اعمال میں ایسے کثیر حوالہ جات ذکر کئے ہیں۔ ''اتیانِ ارواح'' کا مسئلہ بھی اسی قبیل سے ہے، چنانچہ امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''بالجملہ یہ مسئلہ نہ بابِ عقائد سے، نہ بابِ احکامِ حلال وحرام سے، اسے جتنا ماننا چاہئے،

اس کے لئے اتنی سندیں کافی ووافی ۔منکر اگر صرف انکارِ یقین کرے، یعنی اس پر جزم ویقین نہیں، تو ٹھیک ہے۔اور عامّہ مسائلِ سِیَر ومغازی واخبار وفضائل ایسے ہی ہوتے ہیں، ان کے باعث وہ مردود نہیں قرار پاسکتے۔اور اگر دعوائے نفی کرے یعنی کہے: مجھے معلوم وثابت ہے کہ روحیں نہیں آتیں تو جھوٹا کذاب ہے۔بالفرض ان روایات سے قطعِ نظر بھی، تو غایت یہ کہ عدمِ ثبوت ہے نہ ثبوتِ عدم، اور بے دلیل عدم محض تحکّم وستم۔آنے کے بارے تو اتنی کتب وعلماء کی عبارات اور اتنی روایات بھی ہیں، نفی وانکار کے لئے کون سی روایت ہے؟۔کس حدیث میں آیا کہ روحوں کا آنا باطل وغلط ہے؟ تو ادِّعائے بے دلیل محض باطل وذلیل"۔

"کیسی ہٹ دھرمی ہے کہ طرفِ مقابل پر روایاتِ موجودہ صرف بربنائے ضُعف مردود اور اپنی طرف روایت نام نہ نشان اور ادِّعائے نفی کا بلند نشان۔روحوں کا آنا اگر بابِ عقائد سے ہے تو نفیاً واثباتاً ہر طرح اسی باب سے ہوگا (یعنی جس درجے کی دلیلِ اثبات ہے، کم ازکم اسی درجے کی دلیلِ نفی پیش کردیجئے)۔اور دعوائے نفی کے لئے بھی دلیلِ قطعی درکار ہوگی (یعنی جب ثبوت کے لئے دلیلِ قطعی طلب کی جاتی ہے تو نفی کے لئے بھی ویسی ہی دلیل چاہئے)۔یا مسئلہ ایک طرف (یعنی طرفِ اثبات) سے بابِ عقائد میں ہے کہ صحاح (کی ضعیف احادیث) بھی مردود، اور دوسری طرف (یعنی طرفِ نفی) سے ضروریاتِ (دین) میں (سے) ہے کہ اصلاً حاجتِ دلیل مفقود، (فتاویٰ رضویہ، جلد:9، ص:656)"

مسلکی خلافیات میں راہِ اعتدال یہ ہے کہ جس درجے کا دعویٰ ہو، اسی درجے کی دلیل طلب کی جائے اور جو فریق کسی دعوے کا منکر ہو وہ اسی درجے کی دلیل پیش کرے۔

لہٰذا بہتر یہ ہے کہ ان باتوں کو مسلکی اختلاف کا سبب نہ بنایا جائے، اگر کوئی ان کو تسلیم نہیں کرتا تو اس پر کوئی شرعی حکم عائد نہیں ہوگا۔اگر کوئی شخص قوی دلائل اور صحیح احادیث کی بنا پر بالعموم یا علیٰ تقدیر التسلیم ان روایات کی تائید کی وجہ سے اپنے مرحومین اور مرحومات کو ان خاص مبارک ایام میں ایصالِ ثواب کرتا ہے تو یہ مستحب اور مستحسن عمل ہے اور اس کا انکار باطل ہے، ہٹ دھرمی ہے اور محض عِناد ہے۔ایصالِ ثواب میں تو بندہ اللہ تعالیٰ ہی کی بارگاہ

میں رجوع کرتا ہے، جو بندگی کا قرینہ ہے اور ایصالِ ثواب اپنی اصل کے اعتبار سے مستحسن ومطلوب ہے۔ البتہ ان روایات کو بنیاد بنا کر اگر کوئی شخص خلافِ شرع کام کرتا ہے یا اپنی طرف سے کوئی طریقہ وضع کرتا ہے، تو یہ یقیناً بدعتِ سیّئہ ہے۔

جنازہ قبرستان لے جاتے وقت میّت کے پاؤں قبلے کی جانب ہونے کا حکم

سوال:62

زید فوت ہوگیا، اس کا گھر مغرب کی سمت واقع ہے، جبکہ قبرستان مشرق میں واقع ہے۔ تدفین کے لئے جب قبرستان جانے لگے تو اس کا سر قبرستان کی طرف رکھیں تو ٹانگیں مغرب یعنی جانبِ قبلہ ہوں گی اور اگر سر مغرب کی طرف رکھیں تو پاؤں قبرستان کی طرف جو معروف طریقے کے خلاف ہے۔ ایک دیہات کے لوگ اس مسئلے میں تذبذب کا شکار ہیں۔ برائے مہربانی قرآن وسنت کی روشنی میں یہ مسئلہ حل فرمائیں۔
(قاری محمد جمیل، خطیب مسجد الغازی، پاکستان رینجرز ہیڈ کوارٹر، غازی روڈ لاہور، پنجاب)

جواب:

جنازہ قبرستان لے جانے کے لئے سنت طریقہ یہ ہے کہ میت کا سرہانا قبرستان کی جانب ہو یعنی اگر قبرستان جانبِ مشرق ہے تو میت کے پاؤں قبلہ کی جانب کیے جائیں، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وفی حالۃ المشی بالجنازۃ یقدم الرأس کذا فی المضمرات
ترجمہ: ''جنازہ لے چلنے میں میت کا سرہانا آگے ہونا چاہیے، جیسا کہ ''مضمرات'' میں ہے''۔
(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:162، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)
مفتی محمد نور اللہ نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا گیا کہ ''اگر قبرستان مشرق کی طرف ہو تو جنازے کے پیر قبلہ کی طرف کیے جائیں یا سامنے؟'' انہوں نے جواب میں لکھا: ''فقہائے کرام نے جنازہ اٹھانے کا جو طریقہ سنتِ کاملہ بیان فرمایا، وہ مستلزم ہے کہ اگر قبرستان جانبِ مشرق ہو تو پاؤں قبلہ کی طرف کیے جائیں، ہندیہ وغیرہا میں ہے: اما کمال السنۃ فلا یتحقق الا فی واحد الخ''۔ ایک اور سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: سر آگے ہی

ہونا چاہیے، فتاویٰ عالمگیری ص:83، جلد 1، البحر الرائق ص:193، جلد 2، فتاویٰ برہنہ ص:357 دفتر اول میں ہے: والنظم من الهندية وفي حالة المشي بالجنازة يقدم الراس كذا في المضمرات۔۔۔۔ مزید لکھتے ہیں: حضرت امام عالی مقام امامِ اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد اور خود ان کا اپنا معمول ہے جو ہماری کتابوں میں مفصل ہے، وہ یہ ہے کہ میّت اٹھانے والا میّت کی اگلی دائیں طرف پہلے اپنے دائیں شانے پر اٹھائے، پھر میّت کی پچھلی دائیں طرف اپنے دائیں شانے پر اٹھائے، پھر اگلی بائیں طرف اپنے بائیں شانے پر، بعد ازاں پچھلی بائیں طرف اپنے بائیں شانے پر اٹھائے، فتاویٰ عالمگیری، صفحہ 83 جلد 1 میں ہے: واما كمال السنة فلا يتحقق الا في واحد وهو ان يبدأ الحامل بحمل يمين مقدم الجنازة كذا في التتارخانية فيحمله على عاتقه الايمن ثم المؤخر الايمن على عاتقه الايمن ثم المقدم الايسر على عاتقه الايسر هكذا في التبيين، ترجمہ: ''کمالِ سنت ایک ہی صورت میں متحقق ہوگی کہ جنازہ اٹھانے والا میت کی اگلی دائیں طرف اپنے دائیں شانے پر اٹھائے جیسا کہ ''تاتارخانیہ'' میں ہے، پھر میت کی پچھلی دائیں طرف اپنے دائیں شانے پر اٹھائے پھر اگلی بائیں طرف اپنے بائیں شانے پر اور پھر پچھلی بائیں طرف اپنے بائیں شانے پر اٹھائے، اسی طرح ''تبیین'' میں ہے۔ جامع صغیر صفحہ 21 میں ہے: قال محمد رحمه الله تعالىٰ رأيت ابا حنيفة رضي الله تعالىٰ عنه يصنع هذا ترجمہ: ''امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اسی طرح کرتے دیکھا''۔ اور جب اس طریقے سے اٹھایا جائے تو سر قبرستان کی طرف ہی ہوگا۔ باقی رہا یہ وہم کہ قبرستان مشرق کی طرف ہو تو میت کے پاؤں کعبہ شریف کی طرف ہو جائیں گے تو وہ بالکل غلط ہے کیونکہ مریض اور میّت کا ایسی صورت میں منہ قبلہ کی طرف سمجھا جاتا ہے۔ اگر کھڑا کر دیا جائے تو قبلہ رخ نظر آئے گا لہٰذا اس صورت میں قبلہ رُخ تصور کیا جائے گا اور کوئی حرج نہیں ہوگا، فتاویٰ عالمگیری صفحہ 81 جلد 1 میں ہے: الوضع طولا كما في حالة المرض اذا اراد الصلوٰة بايماء، ترجمہ: ''میّت کو طولاً لمبائی میں رکھا

جائے گا، جیسے بیماری کی حالت میں جب مریض نہ کھڑے ہونے کی سکت رکھتا ہو اور نہ بیٹھنے کی، تو وہ اس طرح لیٹے لیٹے اشارے سے نماز پڑھے گا کہ اس کے پاؤں قبلہ رُو ہوں گے، (فتاویٰ نوریہ، جلد 1، ص:716،714،713)"۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: وان تعذر القعود أومأ بالرکوع والسجود مستلقیًا علی ظھرہٖ وجعل رجلیہ الی القبلۃ وینبغی أن یوضع تحت رأسہ وسادۃ حتیٰ یکون شبیہ القاعد لیتمکن من الایماء بالرکوع والسجود۔

ترجمہ: "اگر میّت کے لئے بیٹھنا دشوار ہو، تو وہ پیٹھ کے بل چت لیٹ کر اشارے سے رکوع وسجود کرے گا اور اس کے دونوں پاؤں کا رُخ قبلے کی جانب ہوگا اور ایسے (معذور مریض) کے سر کے نیچے تکیہ رکھ لینا چاہئے تاکہ بیٹھے ہوئے شخص کے مشابہ ہو جائے (اور) اشارے سے رکوع وسجود کر سکے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص:136، 137)"۔ تو جب عذر کی صورت میں زندہ معذور مریض کو نماز کے وقت پاؤں قبلے کی جانب رکھنے کی اجازت ہے، تو مُردے کے لئے ایسی اجازت میں ہرگز تردّد نہیں ہونا چاہئے۔ شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول سعیدی صاحب نے بھی اس مسئلے کی تائید فرمائی ہے۔

میّت کو دفن کرنے کے بعد قبر کھودنا جائز نہیں

سوال:63

میرا نام رشید احمد عباسی ہے، میری دوسری والدہ کا ڈیڑھ سال قبل انتقال ہو گیا تھا، اُن سے میرے دو بھائی (محمد نجم، کریم احمد) ہیں، دونوں امام مسجد ہیں۔ چھ ماہ قبل مجھ سے انہوں نے تذکرہ کیا کہ والدہ کی قبر (6 نمبر قبرستان واقع نیو کراچی) پر پختہ مزار تعمیر کرنا چاہتے ہیں اور کوئی صاحب ان کو اس مقصد کے لئے لاکھوں روپیہ عطیہ دینے کو تیار ہیں، ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ والد صاحب کی قبر جو کہ قریب ہی ہے اس کو بھی مزار کے احاطے میں شامل کرنا چاہتے ہیں، جبکہ والد کی وفات کو چوبیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے، میں نے سختی سے منع کر دیا، جبکہ دوسرے بھائی اس معاملے میں بالکل خاموش رہے۔

یکم جون بروز پیر جبکہ میں شہر سے باہر تھا ان دونوں نے والدہ کی قبر کھول کر مسجد میں اعلان کردیا کہ معجزہ رونما ہوا ہے اور قبر ازخود کھل گئی ہے۔ قبر پر لوگوں کا مجمع اکٹھا کرلیا اور قبر کی اندر کی موِوی بھی بنوائی۔ ایک ٹیلی ویژن چینل سے ان لوگوں کا رابطہ ہے اور دیگر لوگوں کا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے ٹی وی پر موِوی دکھائی گئی۔ جمعہ کے روز تفصیلات پمفلٹ (نقل منسلک ہے) کی صورت میں چھپوا کر مساجد میں تقسیم کروائی جو سراسر جھوٹ کا پلندہ ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ اس طرح کسی خاتون کی قبر کھول کر اس کی موِوی بنانا اور لوگوں کو دکھانا کیا اسلام میں اس کی اجازت ہے کہ مردے کی بے حرمتی کی جائے۔ دراصل یہ دونوں بھائی مزار تعمیر کرکے آمدنی کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ (رشید احمد عباسی، R-52 سیکٹر 5B/2 نارتھ کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اس بات سے قطع نظر کہ سوال میں مذکور مندرجات حقیقت پر مبنی ہیں یا نہیں؟، ہم اصلِ مسئلہ بیان کرتے ہیں کہ شریعتِ مطہرہ میں میّت کی تدفین کے بعد اُس کی قبر کھولنا ناجائز وحرام ہے، کیونکہ تدفین کے بعد میت اللہ تعالیٰ کے سپرد کردی جاتی ہے اور وہی اس کے حال کو بہتر جانتا ہے اور تبدیلی احوال پر بھی اسی کو قدرت واختیار حاصل ہے۔ میت کو دفن کرنے کے بعد پھر قبر کو کھودنا جائز نہیں، مگر جب کسی آدمی کے حق کے لئے کھودنا ہو مثلاً کسی کو غصب شدہ زمین میں دفن کیا گیا یا دفن کے وقت کسی کا مال قبر میں گر پڑا تو ایسی صورت میں قبر کھودنے کی اجازت ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (لا یخرج منہ) بعد اہالۃ التراب (الا) لحق آدمی، (کأن تکون الارض مغصوبۃ أو أخذت بشفعۃ) ویخیر المالک بین اخراجہ ومساواتہ بالأرض۔

ترجمہ: ''میت پر مٹی ڈال دینے کے بعد میت کو قبر سے نہیں نکالا جائے گا، سوائے اس کے کہ کسی انسان کا حق اس سے متعلق ہو، مثلاً غصب شدہ زمین میں دفن کیا گیا ہو یا حقِ شفعہ کی بنا پر کسی نے لے لی ہو، تو زمین کے مالک کو اختیار ہوگا کہ میّت کو قبر سے نکلوا دے یا زمین برابر کردے، (ردالمحتار جلد 3 صفحہ 135,136، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: ''مسلمان کی قبر کو کھودنا تو نہایت سخت شدید جرم ہے، اسلامی سلطنت ہو تو ایسا شخص سخت تعزیر کا مستحق ہے یہاں تک کہ سلطانِ اسلام کی اگر رائے ہو تو جو ایسی حرکت کا مرتکب ہوا کرتا ہو، اُسے سزائے قتل دے سکتا ہے، جو شخص ناحق پر اس کی تائید کرتے ہیں سب اسی کی طرح مرتکب جرم و مستحق سزا ہیں۔

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ترجمہ: ''گناہ اور ظلم پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو، (القرآن، المائدہ:2)''۔

رسولِ اکرم ﷺ کا فرمان ہے: مَنْ مَشٰی مَعَ ظَالِمٍ لِیُعِیْنَہٗ وَھُوَ یَعْلَمُ اَنَّہٗ ظَالِمٌ فَقَدْ خَلَعَ مِنْ عُنُقِہٖ رَقْبَۃَ الْاِسْلَامِ۔

ترجمہ: ''جو دانستہ کسی ظالم کی مدد کو چلے اس نے اپنی گردن سے اسلام کی رسی نکال دی''۔

(فتاویٰ رضویہ جلد 16 ص:540 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

مصنف بہارِ شریعت صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا کہ ''ایک بستی میں ہیضہ کی بیماری ہوگئی تو لوگوں نے کہا کہ یہاں کفن چور آگیا ہے، اسی وجہ سے آدمی زیادہ مرتے ہیں چنانچہ لوگوں نے قبریں کھود کھود کر تین چار مردوں کی لاشوں کو جو پندرہ بیس روز کی مدفون تھیں، باہر نکالیں تو دیکھا گیا کہ ان کی لاشیں ویسی ہی تھیں، جیسی دفن کی گئی تھیں بلکہ اُس سے بھی زیادہ بدن فربہ اور حسین ہوگیا تھا، آپ نے جواب میں لکھا: میت کو دفن کرنے کے بعد پھر قبر کو کھودنا جائز نہیں، مگر جب کہ کسی آدمی کے حق کے لئے کھودنا ہو، مثلاً: زمینِ مغصوب میں دفن کیا گیا یا دفن کرتے وقت کسی کا مال قبر میں گر پڑا تو ایسی صورت میں قبر کھودنے کی اجازت ہے اور اگر کسی آدمی کا حق اس کے ساتھ متعلق نہ ہو تو کھودنا جائز نہیں، یہاں تک کہ اگر بغیر غسل میت کو دفن کردیا ہو تو نہلانے کے لئے اس کو قبر کھود کر نکالنا درست نہیں، درمختار میں ہے: لا یخرج منہ بعد اہالۃ التراب الا لحق آدمی، کأن تکون الارض مغصوبۃ ردالمحتار میں ہے: قولہ الا لحق آدمی احتراز عن حق اللہ تعالیٰ کما اذا دفن بلا غسل او صلاۃ او وضع علی غیر یمینہ او الی غیر القبلۃ فانہ

لاینبش علیہ بعد اہالۃ التراب کما مرّ، لہٰذا اس صورت میں جن لوگوں نے قبروں کو کھودا انہوں نے بہت ہی برا کیا۔

ایک اور سوال کہ میّت دفن کرتے وقت قبر پر تختے دیدیئے گئے، لیکن جب مٹی دی گئی تو اس کی وجہ سے قبر دھنس گئی۔ اب ایسی صورت میں قبر کو فوراً درست کرنے کے لئے میت کو قبر سے باہر نکال سکتے ہیں یا نہیں؟، آپ نے جواب میں لکھا: ''جب مٹی دے چکے تو اب میّت کو نکالنا جائز نہیں درمختار میں ہے: لایخرج منہ بعد اہالۃ التراب الا لحق آدمی۔''

(فتاویٰ امجدیہ، جلد اول، صفحہ: 326، 327، مکتبۂ رضویہ، کراچی)

صورتِ مسئولہ میں مذکورہ لوگوں کا قبر کھولنا ناجائز وحرام ہے اگر کسی سبب سے قبر کی سلیب ہٹ جائے یا قبر بیٹھ جائے، تب بھی قبر کھولنا جائز نہیں بلکہ اوپر ہی سے مٹی ڈال کر قبر کو پر کر دیا جائے، سلیب ہٹا کر قبر کھولنا قطعاً جائز نہیں ہے۔

ایصالِ ثواب اور چہلم کی رسوم میں غیر شرعی باتیں

سوال:64

ہمارے علاقے میں جب کسی کا انتقال ہوجاتا ہے تو چالیس دن تک ہر روز رات کے وقت کھانا پکا کر اس پر فاتحہ دی جاتی ہے، جس میں میت کو ایصالِ ثواب کیا جاتا ہے اور یہ شرط رکھی جاتی ہے کہ جس آدمی نے پہلے دن وہ کھانا (یعنی جس کھانے پر فاتحہ دی گئی ہے) کھایا تھا، اب چالیس روز تک وہی کھانا کھائے گا اور اس کے علاوہ کوئی اور شخص وہ کھانا (فاتحہ والا) نہیں کھا سکتا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ شریعت میں اس کی کوئی اصل ہے اور اگر نہیں تو جو اس شرط پر عمل کرتے ہیں ان کے لئے کیا حکم ہے؟۔ ہمارے علاقے میں کسی کی وفات کے بعد ''چہلم'' کیا جاتا ہے، جس کو ہماری زبان میں ''پنڈ ھارہ'' کہا جاتا ہے، اس کا طریقۂ کار یہ ہوتا ہے کہ امیر وغریب کا امتیاز کئے بغیر مطلقاً دعوت کی جاتی ہے، جس میں لوگ آتے ہیں اور کھانا کھا کر واپس چلے جاتے ہیں اور اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ علاقے میں ''چہلم'' کے کھانے کی جو روٹین ہے اس کو مدِ نظر رکھا جائے، چاہے اس کے لئے قرض

ہی کیوں نہ لینا پڑے، آیا شریعت میں اس کی کوئی اصل ہے اور جو شخص قرض لے کر ایصالِ ثواب کرے تو اس کے لئے کیا حکم ہے؟۔ (یاسر رحمٰن، نکیال، آزاد کشمیر)۔

جواب:

اپنے کسی عملِ خیر کا ثواب دوسرے کو پہنچانا، خواہ وہ زندہ ہو یا وفات پاچکا ہو، ایصالِ ثواب کہلاتا ہے، اسی طرح دوسرے کو ثواب پہنچانے کے لئے مالی صدقہ وخیرات بھی کیا جاسکتا ہے اور دعاءِ مغفرت بھی کی جاسکتی ہے، یہ سب امور شریعت میں ثابت ہیں۔ کسی کے ایصالِ ثواب کے لئے چالیس دن تک یا اس سے کم یا زیادہ مدت کے لئے کسی مستحق کو کھلانے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے اور کسی ایک مستحق کو مسلسل کھلانے میں بھی کوئی شرعی مانع نہیں ہے۔ لیکن یہ عقیدہ رکھنا کہ ایک معین فقیر ہی کو چالیس دن تک کھلانا باعث ثواب ہے، متفرق فقراء کو کھلانا کارِ ثواب نہیں ہے، یہ عقیدہ باطل ہے، کیونکہ جس چیز کو شارع نے معین نہیں کیا، اسے تعیینِ شرعی کا درجہ دینا باطل ہے۔ سوئم، چہلم، برسی پر ایصالِ ثواب کا کھانا فقراء کو کھلانا چاہیے وہی اس کے اصل مستحقین ہیں۔ اگر امرا کھالیں تو شرعاً منع بھی نہیں ہے کیونکہ یہ نفلی صدقہ ہے اور اس کا فقراء ومساکین پر تصدق افضل ہے واجب نہیں ہے۔ اپنے خوش حال رشتے داروں اور دوست واحباب کے لئے دعوت کا اہتمام کرنا بھی باعث اجر ہے، ان کے لئے ہدیہ اور ہبہ کی نیت سے کھلانا بہتر ہے، ایصالِ ثواب اس کا بھی ہوسکتا ہے۔ قرض لے کر ایصالِ ثواب کرلیا تو ثواب یقیناً ملے گا، لیکن شریعت نے جس امر کا مکلف نہیں کیا، اپنے آپ کو اُس کا مکلف بنانا اور خود کو زیر بار کرنا شرعاً پسندیدہ امر نہیں ہے۔ اسی سبب رسول اللہ ﷺ نے نذر ماننے کو پسند نہیں فرمایا، لیکن اگر کسی نے مان لی تو واجب ہوجائے گی اور اس کو پورا کرلیا تو اجر بھی ملے گا۔ اگر کسی علاقے میں ایصالِ ثواب تہذیب وثقافت کے طور پر کیا جائے یا محض رسم سمجھ کر کیا جائے، یا نہ کرنے والے کو ملامت کی جائے، خواہ وہ استطاعت نہ رکھتا ہو اور اسے مجبوراً قرض لے کر کرنا پڑے ورنہ طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا جائے گا، تو یہ طرزِ عمل غیر شرعی ہے اور کسی مستحب امر کے نہ کرنے پر ملامت کرنا اسے واجب کا

درجہ دینا ہے اور یہ بدعت ہے، کسی امر کو واجب قرار دینا صرف شارع کا اختیار ہے۔

چہلم میں تین چاند گزرنے کی شرعی حیثیت

سوال:65

میری والدہ کا انتقال 29 شعبان 1430ھ کو ہو چکا ہے، اس کے مطابق چالیس روز 8 یا 9 شوال 1430ء کو ہوں گے۔ چالیسویں کی نیاز میں خاندان کے بزرگوں کا اصرار ہے کہ چہلم کی فاتحہ رمضان المبارک ہی کے مہینہ میں ہونی چاہیے کیونکہ شوال کا چاند انتقال کی تاریخ 29 شعبان سے تیسرا چاند ہوگا اور تیسرے چاند تک چہلم لے جانا بے شُبھ اور خطرناک ہوتا ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں مناسب حل بیان فرمائیں۔ (عبدالوحید، F.B ایریا، کراچی)

جواب:

چہلم ایصالِ ثواب کے لئے ہوتا ہے، اس کے لئے کوئی خاص دن مقرر نہیں ہے کہ اُس دن سے پہلے یا اس کے بعد نہیں ہو سکتا۔ اپنی سہولت کے مطابق کوئی بھی دن مقرر کر سکتے ہیں یا کسی بھی دن کر سکتے ہیں۔ ایصالِ ثواب، دعاءِ مغفرت اور فاتحہ مستحب امور ہیں، شرعاً لازم اور ضروری نہیں ہیں۔ تیسرے چاند کے شروع ہونے کے بعد ایصالِ ثواب کی کوئی ممانعت نہیں ہے، نہ ہی اسے بے شُبھ، خطرناک یا نحس کہنا درست ہے۔ ایصالِ ثواب سال کے کسی بھی دن کر سکتے ہیں، کوئی ممانعت نہیں ہے۔ یہ خیر کا کام ہے، اس میں نحوست کا کوئی تصور نہیں ہے۔

زکوٰۃ کے مسائل

زکوٰۃ کی رقم مصارفِ مسجد میں استعمال نہیں کی جاسکتی

سوال:66

ہمارے علاقے کی مسجد کا بجلی کا بل تقریباً ایک لاکھ روپے تک پہنچ چکا ہے۔ اب مسجد کمیٹی کا کہنا ہے کہ اس بل کی ادائیگی زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم سے کی جاسکتی ہے۔ کیا شرعاً اس کی اجازت ہے کہ مسجد کا بل زکوٰۃ اور فطرے کی رقم سے جمع کرایا جاسکے؟۔

(محمد مہتاب عالم، اورنگی ٹاؤن، کراچی)

جواب:

زکوٰۃ یا فطرے کی رقم تعمیر مسجد یا مصارفِ مسجد میں استعمال نہیں کی جاسکتی، اکثر مساجد کمیٹیاں ان مقاصد کے لئے حیلے کا سہارا لیتی ہیں، یہ حیلہ کا غلط استعمال ہے اور اس سے منشائے شریعت کو باطل کرنا مقصود ہے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ولا یجوز أن یبنی بالزکاۃ المسجد وکذا القناطر والسقایات واصلاح الطرقات وکری النھار والحج والجھاد وکل ما لاتملیک فیہ ولا یجوز أن یکفن بھا میت ولا یقضی بھا دین المیت کذا فی التبیین

ترجمہ: ''اور زکوٰۃ کی رقم سے مسجد کی تعمیر جائز نہیں ہے، اسی طرح پلوں کی تعمیر، کنوؤں کی کھدائی، راستوں کی درستگی، نہروں کی کھدائی اور حج اور جہاد کے لئے (زکوٰۃ کی رقم کا براہِ راست استعمال) جائز نہیں ہے۔ (اسی طرح) ہر اُس کام کے لئے جس میں تملیک نہیں پائی جاتی (زکوٰۃ کی رقم کا استعمال) جائز نہیں ہے۔ (زکوٰۃ کی رقم کو) میت کے کفن دفن اور اُس کے قرض کی ادائیگی کے لئے (براہِ راست استعمال کرنا) جائز نہیں ہے، ''تبیین'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:188، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے خلافت فنڈ میں زکوٰۃ کی رقم دینے کے متعلق سوال کے جواب میں لکھا: ''زکوٰۃ مسجد میں دے تو ادا ہو نہیں سکتی، اسے خلافت فنڈ میں کیسے دیا جاسکتا ہے، زکوٰۃ کا رکن ''تملیک'' (یعنی فقیر کو مالک بنانا) ہے۔ درمختار میں ہے:

لاصرف الی مسجد لعدم التملیك وھو الرکن،

ترجمہ: ''کسی مسجد میں مالِ زکوٰۃ کو خرچ کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ اس میں محتاج کو مالک نہیں بنایا جاتا، جبکہ تملیکِ فقیر زکوٰۃ کا رکن ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 23، ص:106)''۔

اس تفصیل کی روشنی میں مسجد کی بجلی کا بل زکوٰۃ وفطرہ کی رقم سے ادا نہیں کیا جاسکتا، اس طرح زکوٰۃ وفطرہ کی ادائیگی سے بری الذمہ نہیں ہوں گے اور عنداللہ مسجد کی انتظامیہ جوابدہ ہوگی۔ کراچی میں مساجد کی انتظامیہ مساجد میں قائم حفظ وناظرہ کے مدارس کے نام پر، جہاں اہلِ محلہ کے بچے پڑھتے ہیں، زکوٰۃ وفطرہ جمع کرتے ہیں، یہ بھی شرعاً درست نہیں ہے۔ زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ کے مصارف اللہ جل شانہٗ نے قرآن مجید میں سورۂ توبہ آیت نمبر 60 میں بیان فرمادیئے ہیں، ان میں کمی بیشی کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔

حدیث پاک میں ہے:

حَدَّثَنَا عَبْدُ اللہِ بنِ مَسْلَمَۃَ (بِسَنَدِہٖ) اَنَّہٗ سَمِعَ زِیَادَ بْنِ حَارِثِ الصَّدَائِی قَالَ اَتَیْتُ رَسُوْلَ اللہِ ﷺ فَبَایَعْتُہٗ فَذَکَرَ حَدِیْثًا طَوِیْلًا، فَاَتَاہُ رُجُلًا فَقَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ اِنَّ اللہَ لَمْ یَرْضَ بِحُکْمِ نَبِیٍّ وَلَا غَیْرِہٖ حَتّٰی حَکَمَ فِیْھَا ھُوَ فَجَزَّاَھَا ثَمَانِیَۃَ اَجْزَاءٍ فَاِنْ کُنْتَ مِنْ تِلْكَ الْاَجْزَاءِ اَعْطَیْتُكَ حَقَّكَ۔

ترجمہ: ''عبداللہ بن مسلمہ اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ ان کے شیخ الشیخ نے زیاد بن حارث صدائی کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا: ''میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے آپ ﷺ کے دستِ اقدس پر بیعتِ اسلام کی، پھر انہوں نے ایک طویل حدیث بیان کی اور اس دوران انہوں نے بیان کیا کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا: مجھے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ عنایت فرمایئے! تو رسول اللہ ﷺ نے اُس سے فرمایا: (مصارفِ زکوٰۃ کے معاملے کو) اللہ تعالیٰ نے کسی نبی یا غیر نبی کے حکم پر نہیں چھوڑا (یعنی یہ صوابدیدی مسئلہ نہیں ہے)، بلکہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے (سورۂ توبہ:60 میں) خود ہی فیصلہ فرمادیا ہے اور اس کے آٹھ مصارف بیان کئے ہیں۔

پس اگرتم ان میں سے کسی مَصرَف کے تحت حق دار بنتے ہوتو (مالِ زکوٰۃ میں سے) تمہارا حق تمہیں دے دوں گا (ورنہ تمہیں نہیں دوں گا)، (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 1627)"۔

نوٹ: ہمارے ایک فاضل مفتی صاحب نے عالمگیری کی اس عبارت کی طرف متوجہ کیا:

(والحیلة فیه أن یتصدق بها علی فقیر) ثم هو یکفن به المیت فیکون له ثواب الصدقة ولاهل المیت ثواب التکفین وکذلك فی جمیع أبواب البر التی لایقع بها التملیك كعمارة المساجد وبناء القناطیر

ترجمہ: "اور اس میں حیلے کی ایک صورت یہ ہے کہ (غنی) اپنی واجب زکوٰۃ فقیر کو صدقہ کرے، پھر وہ اسے اِن مصارف پر صرف کرنے کا حکم دے تو صدقہ دینے والے کو بھی اس صدقے کا ثواب ملے گا اور اس فقیر کو بھی مسجد اور پل بنانے کا ثواب ملے گا"۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص: 392)

اُن کا مقصد یہ تھا کہ شریعت میں ان حیلوں کی گنجائش موجود ہے، میرا موقف یہ ہے کہ اصل مقصد شریعت یہ ہے کہ مالِ زکوٰۃ کو اس کے حقیقی مصرف پر خرچ کیا جائے اور شدید ضرورت کے بغیر اس اصول سے انحراف نہ کیا جائے، اسی لئے فقہاءِ کرام نے تملیک فقیر پر اس قدر زور دیا ہے۔ ناگزیر حالات یا مواقع پر حیلہ اختیار کیا جاسکتا ہے، مگر اسے اگر عام اصول ورواج (General Practice) بنادیا جائے تو پھر یقیناً اس سے مقصدِ شریعت باطل ہوگا، جیسے آج کل کراچی میں بعض تنظیمیں، انجمنیں اور مساجد کی انتظامیہ کے لوگ رمضان المبارک میں محلے کے بچوں کے مکتب کے نام پر دھڑلے سے زکوٰۃ وفطرہ کی رقوم جمع کرتے ہیں اور پھر شرعی حدود وقیود کی رعایت کئے بغیر خرچ کرتے ہیں، اگر ایسا ہی ہوتا تو شارع علیہ الصلاۃ والسلام مساجد کو براہِ راست مصارفِ زکوٰۃ میں شامل فرمادیتے۔

زکوٰۃ محض وکیل کو دینے سے ادا نہیں ہوتی

سوال: 67

ایک شخص نے اپنی زکوٰۃ کی رقم ہر مہینے ایک بیوہ عورت کو پہنچانے کے لئے ایک قابل

بھروسا نوجوان کے سپرد کی اور وہ یہ سمجھتا رہا کہ مذکورہ رقم بیوہ تک پہنچ رہی ہوگی۔ کئی سال بعد اُس شخص کی بیوہ سے ملاقات ہوئی کسی بات پر یہ راز کھلا کہ چند ماہ تک تو یہ رقم اُسے ملی لیکن تقریباً پانچ چھ سال سے کوئی رقم نہیں ملی۔ جب اُس شخص نے نوجوان سے دریافت کیا تو اُس نے قبول کرلیا کہ ہاں میں نے کئی سال سے یہ گناہ یا بے ایمانی کی ہے۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اس گناہ کی سزا کیا ہے اور کفارہ یا تلافی کس طرح ہوگی؟۔

(محمد حسین، ہارون منزل، کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں مذکورہ نوجوان کی حیثیت زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے محض وکیل کی ہے، اُس پر لازم تھا کہ وکیل کی حیثیت سے بیوہ کو آپ کی زکوٰۃ پہنچاتا، جس میں وہ خیانت کا مرتکب ہوا۔ امانت میں قصداً خیانت سے متعلق قرآنِ مجید میں آیاتِ کریمہ اور احادیثِ مبارکہ بکثرت موجود ہیں اور آخرت میں عذاب کی وعیدیں بھی ہیں۔ مذکورہ شخص پر اس رقم کا تاوان دینا لازم ہے کہ وہ اُس شخص کو (جو زکوٰۃ کی رقم اُس کے سپرد کرتا تھا) تاوان (یعنی اتنی ہی رقم) ادا کرے اور وہ شخص پھر اپنی زکوٰۃ ادا کرے۔

جس عرصے کی زکوٰۃ اس نے مستحق بیوہ تک نہیں پہنچائی، وہ ادا نہیں ہوئی اور اب آپ کے ذمہ اس عرصے کی زکوٰۃ کی ادائیگی لازم ہے۔ البتہ آپ کے وکیل نوجوان نے جو قصداً خیانت کی ہے، اس پر وہ گنہگار ہے اور اس پر توبہ لازم ہے اور یہ بھی لازم ہے کہ وہ ساری رقم آپ کو واپس لوٹائے۔ ایسے شخص کے لئے حدیث پاک میں وعید ہے:

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے اس موضوع پر مندرجہ ذیل حدیث نقل فرمائی:

مَاخَالَطَتْ الصَّدَقَةَ اَوْ مَالَ الزَّكٰوةِ مَالًا اِلَّا اَفْسَدَتْهُ رواه البزاز والبيهقى عن ام المومنين الصديقه رضى الله تعالٰى عنها

ترجمہ: ''بزاز اور بیہقی (شعب الایمان للبیہقی، فصل الاستعفاف عن المسئلۃ، رقم الحدیث: 3522) نے ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالٰی عنہا کی روایت بیان کی: صدقے

اور زکوٰۃ کا مال جس مال میں ملا ہوگا، اُسے تباہ و برباد کردے گا، (فتاویٰ رضویہ، جلد 10، ص:172)"۔

اسی حدیث کی شرح میں علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: "بعض آئمہ نے اس حدیث کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ زکوٰۃ واجب ہوئی اور ادا نہ کی اور اپنے مال میں ملائے رہا تو یہ حرام (یعنی فقراء و مساکین کا حق) اُس حلال کو ہلاک کردے گا۔ اور امام احمد نے فرمایا کہ معنی یہ ہیں کہ مال دار شخص مالِ زکوٰۃ لے تو یہ مالِ زکوٰۃ اس کے مال کو ہلاک کردے گا کہ زکوٰۃ فقیروں کیلئے ہے اور دونوں معنی صحیح ہیں، (بہارِ شریعت، جلد اوّل، ص:357)"۔

ہلاکت کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ وہ مال ہلاک ہوجائے گا اور دوسرا یہ کہ زکوٰۃ کے اختلاط سے اس مال میں برکت نہیں رہے گی۔

زکوٰۃ کے چند مسائل

میری بھانجی جو صاحبِ نصاب نہیں ہے، میں اُن کو زکوٰۃ کی رقم سے مکان یا پلاٹ دینا چاہتا ہوں، جس سے امید ہے کہ اُنہیں مستقبل میں رہنے کی جگہ کا مسئلہ نہیں ہوگا اور اگر اُس میں نہ بھی رہیں تو کرائے پردے کر مالی فوائد حاصل کرسکتی ہیں۔ چند مسائل زکوٰۃ سے متعلق جاننا چاہتا ہوں جو میرے ساتھ دوسروں کی رہنمائی کا بھی ذریعہ بنیں گے۔

(دلاور خان، بلدیہ ٹاؤن، کراچی)

سوال:68

1۔ کیا یہ بتائے بغیر کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے، کسی کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے زبان سے کہنا ضروری ہے یا محض نیت کافی ہے؟، کچھ لوگ ضرورت مند ہوتے ہوئے بھی مروّت یا خودداری کے سبب لینے سے انکار کردیتے ہیں تو کیا اُنہیں زبردستی زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟۔

جواب:

اگر کسی مستحقِ زکوٰۃ کے بارے میں یہ اندیشہ ہو کہ خودداری کی بنا پر نہیں لے گا تو اُس

شخص کو یہ بتائے بغیر بھی زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، بلکہ ھبہ یا قرض کہہ کر بھی دی جاسکتی ہے، جبکہ دل میں یہ نیت ہو کہ واپس نہیں لوں گا اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی نیت کرلے تو یہ ادائے زکوٰۃ کے لئے کافی ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ومن أعطی مسکیناً دراھم وسماھا ھبةً أو قرضًا ونوی الزکاۃ فانھا تُجزیه وھو الاصح ھکذا فی البحر الرائق ناقلاً عن المبتغی والقنیة۔

ترجمہ: ''اور جو شخص کسی مسکین (مستحقِ زکوٰۃ شخص) کو کچھ دراہم (زکوٰۃ کی مد میں) یہ کہہ کر دے کہ یہ ہبہ یا قرضہ ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی نیت کرلے تو یہ عمل ادائے زکوٰۃ کے لئے کافی ہے اور یہی قول صحیح ترین ہے ''البحر الرائق'' میں ''المبتغی'' اور ''قنیہ'' میں اسی طرح منقول ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 171، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

ایسے رشتے دار یا افراد جو زکوٰۃ کے مستحق ہوں، ان کو بتائے بغیر بھی زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے، زبان سے کہنا ضروری نہیں، بلکہ دل میں نیت اور ارادہ کافی ہے۔ رشتے دار اگر مفلس و نادار ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ افضل ہے، کیونکہ اس میں ادائے زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ صلۂ رحمی کا اجر بھی ملتا ہے اور اُن کی خودداری کو قائم رکھتے ہوئے زکوٰۃ کے بجائے ہبہ یا قرض کہہ کر بھی دے سکتے ہیں۔ زکوٰۃ کے مستحق رشتے دار کو مالک بنا کر مکان دیا جاسکتا ہے، اگرچہ سارا یا بیشتر مالِ زکوٰۃ کسی ایک فرد کو دینا پسندیدہ نہیں ہے، شریعت کا منشا یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ ضرورت مندوں کی کفالت ہوسکے۔

سوال:69

2۔ کیا میں یہ مکان یا پلاٹ (زکوٰۃ کی رقم سے) اِس شرط کے ساتھ کہ وہ اُسے نہ بیچیں، دے سکتا ہوں؟۔

جواب:

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے تملیک (مالک بنانا) شرط ہے، یعنی جس مستحق کو زکوٰۃ دی جارہی ہے، اُسے اُس مال پر تصرُّف کا مکمل اختیار حاصل ہونا چاہئے اور آپ کی مذکورہ شرط

سے مالکانہ تصرُّف کا اختیار باطل ہوجاتا ہے۔ علامہ علاؤالدین حصکفی زکوٰۃ کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(هی) لغة الطهارة والنماء ،وشرعاً (تمليك) خرج الاباحة ،فلو اطعم يتيماً ناوياً الزكاة لايجزيه الا اذا دفع اليه المطعوم، كمالو كساه بشرط أن يعقل القبض الا اذا حكم عليه بنفقتهم۔

ترجمہ:''زکوٰۃ کے لغوی معنیٰ ہیں:''(مال کا) پاک ہونا اور (مال کا) بڑھنا''۔ زکوٰۃ کے شرعی معنی ہیں:''فقیر کو مالِ زکوٰۃ کا مالک بنادینا ہے''۔ تملیک کی قید سے محض مباح کردینا (یعنی فقرا کو مالِ زکوٰۃ کے استعمال کی عام اجازت دینا) خارج ہوگیا، پس اگر کسی شخص نے نادار یتیم کو زکوٰۃ کی نیت سے کھانا کھلادیا تو اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ مگر جب وہی کھانا یتیم کے حوالے کردیا جائے تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی، جیسے اگر ادائے زکوٰۃ کے لئے یتیم کو کپڑا پہنایا بشرطیکہ وہ قبضے کی حقیقت کو سمجھتا ہو (تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی)، لیکن اگر حاکم نے اسے یتیم کو نان نفقہ دینے کا حکم دے دیا ہے تو اب یتیم پر خرچ کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی (بلکہ وہ یتیم کی کفالت کرکے اپنا فرض ادا کرے گا)، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:3،ص:161)''۔ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: ویشترط أن یکون الصرف (تملیکاً) لا اباحة كما مرّ (لا) يصرف (الی بناء) نحو (مسجد و) لا الی (كفن ميت وقضاء دينه)۔

ترجمہ:''اور زکوٰۃ ادا کرنے کی شرط یہ ہے کہ نادار کو مالک بنادیا جائے نہ کہ محض استعمال کرنے کی اجازت دی ہو، جیسا کہ (گزشتہ سطور میں) گزرا، زکوٰۃ مسجد وغیرہ کی تعمیر میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی میت کے کفن دفن اور اس کے قرض کی ادائیگی سے زکوٰۃ ادا ہوگی، (حوالہ مذکورہ، ص:263)''۔

لیکن اگر میت کا کوئی وارث مستحقِ زکوٰۃ ہے اور کوئی شخص اسے زکوٰۃ کی رقم دے دیتا ہے اور وہ اس کا مالک بن کر اپنی مرضی سے میت کے کفن دفن اور قرض کی ادائیگی پر خرچ کرتا ہے تو جائز ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: الهبة والصدقة لايفسدان بالشرط الفاسد۔

ترجمہ: ''ہبہ اور صدقہ شرطِ فاسد سے باطل نہیں ہوتے''۔ یعنی اگر کسی شخص نے کسی کو کوئی چیز ہبہ کر دی ہے یا صدقے کے طور پر دے دی ہے اور وہ اس کے تصرف پر کوئی شرط بھی عائد کر دے مثلاً تم اسے بیچ نہیں سکو گے تو یہ شرط باطل ہو جائے گی اور ہبہ یا صدقہ کی ہوئی چیز پر قبضہ اور مِلک قائم ہونے کے بعد اسے ہر قسم کے تصرف کا اختیار ہوگا۔

سوال: 70

3۔ ان پلاٹس یا مکان کی دیکھ بھال، مرمت، بجلی وغیرہ کے بل، ٹیکس کی ادائیگی زکوٰۃ کی رقم سے کی جاسکتی ہے؟۔ اسی طرح مکان یا پلاٹس کو نام کرانے کے اخراجات، حکومتی ٹیکس کی ادائیگی یا کسی مرحلے پر رشوت دینا پڑے تو کیا زکوٰہ کی رقم سے دی جاسکتی ہے؟

جواب:

مذکورہ مدات یعنی مستحقِ زکوٰۃ کو دیئے گئے پلاٹ کی دیکھ بھال، مرمت، بجلی وغیرہ کے بلوں کی ادائیگی اور ٹیکسوں کو براہِ راست ادا کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، البتہ اگر نادار کو زکوٰۃ کی رقم دے دی جائے اور وہ اپنی مرضی سے اسے ان مصارف پر خرچ کرے تو جائز ہے۔ اسی طرح پلاٹ یا مکان کو مستحق کے نام منتقل کرنے کے اخراجات بھی براہِ راست کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، البتہ اگر مستحق کو رقم دے دی جائے اور وہ اپنی مرضی سے ان مصارف پر خرچ کرے تو جائز ہے۔ رشوت کا لین دین شرعاً حرام ہے۔

سوال: 71

4۔ کیا مکان یا پلاٹ کے ساتھ ساتھ نقد رقم بھی دے سکتا ہوں؟۔

جواب:

اگر کوئی شخص کسی مستحق کو مکان یا پلاٹ کا مالک بنا دیتا ہے تو یہ چیزیں حاجتِ اصلیہ میں سے ہیں اور اِس پلاٹ یا مکان کا مالک بننے کے بعد بھی اُس شخص کے پاس کوئی اور مال نہیں ہے تو وہ پھر بھی مستحقِ زکوٰۃ ہے اور اسے زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے۔

سوال:72

5۔کیا میں اِس بھانجی کے علاوہ بھانجے، بھتیجے، بھتیجی بہن، بہنوئی وغیرہ کو بھی زکوٰۃ دے سکتا ہوں؟۔

جواب:

یہ قرابت دار اگر صاحبِ نصاب نہ ہوں بلکہ مفلس و نادار اور مستحقِ زکوٰۃ ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ افضل ہے، کیونکہ اس میں ادائے زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ صلۂ رحمی کا بھی اجر ملتا ہے۔ تاہم اپنے اصول (یعنی ماں باپ، دادا، دادی، نانا، نانی وغیرہ) اور فروع (یعنی بیٹا بیٹی، پوتا پوتی، نواسا نواسی وغیرہ) کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی، یہی حکم صدقۂ فطر، فدیہ، نذر اور کفارہ کی رقوم کا ہے۔ خالہ، خالو، ماموں، ممانی، بہو یا داماد، سوتیلے باپ، سوتیلی ماں، دوسری ازواج سے شوہر کی اولاد یا شوہر کی اپنی بیوی کی کسی سابق شوہر سے اولاد (اگر یہ لوگ صاحب نصاب نہ ہوں تو) ان سب کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے۔ البتہ بہن بھائیوں میں سے کوئی مستحق ہے تو اسے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: والافضل فی الزکاۃ والفطر والنذر الصرف أولا الی ألاخوۃ والاخوات ثم الی اولادھم ثم الی الاعمام والعمات ثم الی اولادھم ثم الی الاخوال والخالات ثم الی اولادھم ثم الی ذوی الارحام ثم الی الجیران ثم الی اهل حرفته ثم الی اهل مصرہ أو قریته کذا فی السراج الوهاج۔

ترجمہ: ''زکوٰۃ، فطرہ اور نذر کی رقوم میں افضل یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنے بہن بھائیوں، پھر ان کی اولاد، پھر چچاؤں اور پھپیوں، پھر ان کی اولاد، پھر خالاؤں اور ماموؤں، پھر ان کی اولاد، پھر ذوی الارحام (دور کے رشتہ داروں)، پھر پڑوسیوں، پھر اپنے پیشے کے افراد، پھر شہر یا بستی والوں کو دی جائے (بشرطیکہ یہ تمام لوگ نادار ہوں اور مستحقِ زکوٰۃ ہوں)، جیسا کہ ''سراج الوہاج'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:190، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

مسجد کی تعمیر میں زکوٰۃ کا استعمال

سوال:73

مسجد کی تعمیر وترقی میں زکوٰۃ، فطرہ، صدقہ وخیرات کی رقم استعمال ہوسکتی ہے یا نہیں؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حیلہ کرکے (کسی محتاج کو دے کر اس سے مسجد کے لئے عطیہ کراکے) استعمال کرسکتے ہیں، اس حیلے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟۔

(صوفی محمد جمیل راجپوت، سیکٹر 34/2 کورنگی 3، کراچی)

جواب:

مسجد کی تعمیر وترقی صدقاتِ واجبہ (یعنی زکوٰۃ/فطرہ/فدیہ/کفارات اور نذر کی رقوم) کا مصرف نہیں ہے، مساجد کی انتظامیہ کا مساجد کے نام پر اِن رقوم کا جمع کرنا درست نہیں ہے، شریعت نے انہیں اس بات کا مُکلّف نہیں بنایا کہ وہ لوگوں سے زکوٰۃ اور فطرے وغیرہ کی رقوم وصول کرکے مسجدیں تعمیر کریں، اس طرح زکوٰۃ وفطرہ کی ادائیگی نہیں ہوگی اور وہ اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ ہوں گے اور لوگوں کے صدقاتِ واجبہ کو باطل کرنے کا سبب بنیں گے۔

جو لوگ ان مقاصد کے لئے حیلہ کا سہارا لیتے ہیں، یہ حیلہ کا غلط استعمال ہے اور اس سے منشائے شریعت کو باطل کرنا مقصود ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: کسی خفیہ طریقہ سے مقصود حاصل کرنے کو حیلہ کہتے ہیں، علما کے نزدیک اس کی کئی اقسام ہیں: (۱) اگر جائز طریقے سے کسی کا حق (خواہ اللہ کا حق ہو جیسے زکوٰۃ یا بندے کا حق) باطل کیا جائے یا کسی باطل مال (مثلاً سود، رشوت، غصب وغیرہ) کو حاصل کیا جائے تو یہ حیلہ حرام ہے۔ (۲) اگر جائز طریقے سے کسی حق کو حاصل کیا جائے یا کسی ظلم یا باطل کو دفع کیا جائے تو حیلہ مستحب یا واجب ہے (۳) اگر جائز طریقے سے کسی ضرر سے محفوظ رہا جائے تو یہ حیلہ مباح ہے (۴) اگر جائز طریقے سے کسی مستحب کو ترک کرنے کا حیلہ کیا جائے تو یہ مکروہ ہے، (فتح الباری، جلد 12، ص:326)۔

پاکستان اسلامی مملکت ہے، یہاں دیہات، قصبوں اور پسماندہ بستیوں اور محلوں میں

بھی لوگ اپنے حلال مال اور عطیات سے مساجد بناتے رہتے ہیں اور ان کے مصارف برداشت کرتے ہیں، میرے نزدیک یہاں کسی ایسے حیلے کا جواز نہیں بنتا۔ اور مسلمان شرعاً اِس بات کے مکلف بھی نہیں کہ ساری کی ساری مسجدیں عالیشان اور حسین وجمیل ہوں۔ مساجد کی اصل آبادی اور رونقیں تو مُصَلِّیان، عابدین، ذاکرین، قارئینِ قرآن اور معتکفین سے ہوتی ہیں، مسلمانوں کو چاہئے کہ اس پر زور دیں اور یہ کام پیسہ خرچ کیے بغیر صرف ذوقِ عبادت سے انجام پاسکتا ہے۔

روزے کے مسائل

سفر میں روزے کا شرعی حکم

سوال:74

رمضانِ مبارک میں حالتِ سفر میں روزہ رکھنا افضل ہے یا چھوڑنا اور سفر کی کم از کم مقدار یا مسافت کتنی ہے، جس کی بنا پر شرعاً روزہ چھوڑنے کی رخصت ہے؟۔

(ڈاکٹر محمد افضل، نوشہرہ فیروز، سندھ)

جواب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ

ترجمہ: ''اور (رمضان میں) جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو (عذر کی بنا پر روزہ چھوڑ سکتا ہے، مگر رمضان کے بعد چھوڑے ہوئے روزوں کی) گنتی دوسرے دنوں میں پورا کر لے، (البقرہ:185)''۔ حدیثِ پاک میں ہے:

(۱) عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا أَنَّ حَمْزَةَ بْنَ عَمْرٍو الْأَسْلَمِيَّ، قَالَ لِلنَّبِيِّ ﷺ أَأَصُومُ فِي السَّفَرِ؟ وَكَانَ كَثِيرَ الصِّيَامِ، فَقَالَ إِنْ شِئْتَ فَصُمْ، وَإِنْ شِئْتَ فَأَفْطِرْ۔

ترجمہ: ''نبی کریم ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حمزہ بن عمرو اسلمی کثرت سے روزے رکھتے تھے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا: کیا میں سفر میں روزے رکھوں؟، آپ ﷺ نے فرمایا: (تمہیں اختیار ہے) اگر چاہو تو روزہ رکھو اور چاہو تو چھوڑ دو (اور بعد میں قضا کر لینا)، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:1943)

(۲) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ غَزَوْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ لِسِتَّ عَشْرَةَ مَضَتْ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ، فَمِنَّا مَنْ صَامَ، وَمِنَّا مَنْ أَفْطَرَ، فَلَمْ يَعِبِ الصَّائِمُ عَلَى الْمُفْطِرِ وَلَا الْمُفْطِرُ عَلَى الصَّائِمِ،

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم 16 رمضان کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد کے لئے نکلے، ہم میں سے بعض نے روزہ رکھا اور بعض نے روزہ چھوڑ

دیا، توکسی نے دوسرے کو ملامت نہیں کیا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2504)"۔

(۳) عَنْ جَابِرٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِیْ سَفَرٍ، فَرَاٰی زِحَامًا وَرَجُلًا قَدْ ظُلِّلَ عَلَیْهِ فَقَالَ مَا هٰذَا؟، قَالُوْا صَائِمٌ، فَقَالَ لَیْسَ مِنَ الْبِرِّ الصَّوْمُ فِی السَّفَرِ،

ترجمہ: "حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ ایک سفر میں تھے (غالباً یہ فتح مکہ کا سفر تھا)، آپ ﷺ نے بھیڑ میں لوگوں کو ایک شخص پر سایہ کیے ہوئے دیکھا، تو فرمایا: یہ کیا ہے؟، صحابۂ کرام نے عرض کیا: یہ ایک روزے دار شخص ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: حالتِ سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 1946)"۔

چونکہ یہ جہاد کا سفر تھا اور حالتِ جہاد میں مجاہد کا تازہ دم رہنا ضروری ہے، اس لئے اس خاص صورتِ حال میں حضور ﷺ نے روزہ چھوڑنے کو افضل قرار دیا۔

(۴) عَنْ اَنَسٍ قَالَ کُنَّا مَعَ النَّبِیِّ ﷺ فِی السَّفَرِ، فَمِنَّا الصَّائِمُ وَمِنَّا الْمُفْطِرُ فَنَزَلْنَا مَنْزِلًا فِیْ یَوْمٍ حَارٍّ، اَکْثَرُنَا ظِلًّا صَاحِبُ الْکِسَاءِ وَمِنَّا مَنْ یَّتَّقِی الشَّمْسَ بِیَدِهٖ، قَالَ فَسَقَطَ الصُّوَّامُوْنَ وَقَامَ الْمُفْطِرُوْنَ فَضَرَبُوا الْاَبْنِیَةَ وَسَقَوا الرِّکَابَ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ذَهَبَ الْمُفْطِرُوْنَ الْیَوْمَ بِالْاَجْرِ،

ترجمہ: "حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ ہم (رمضان کے دوران فتح مکہ کے سفر میں) رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، تو ہم میں سے بعض نے روزہ رکھا اور بعض نے روزہ چھوڑ دیا، پھر ہم ایک دن شدید گرمی میں ایک مقام پر اترے، ہم میں سے اکثر نے اپنے اوپر چادر کا سایہ کر رکھا اور بعض اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو سورج کی تپش سے بچا رہے تھے، (راوی) بیان کرتے ہیں: پس روزے دار گرنے پڑنے لگے اور روزہ چھوڑنے والے (چاک وچوبند) کھڑے رہے، پس انہوں نے خیمے تانے اور مویشیوں کو پانی پلایا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آج روزہ چھوڑنے والے اجر کمانے میں سبقت لے گئے"۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2512)

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت میں سفر میں روزہ رکھنے کی رخصت ہے، سفر کی مشقت

برداشت کر کے روزہ رکھنا عزیمت ہے، لیکن سفرِ جہاد یا بعض خاص صورتوں میں، جہاں آدمی کا ہر وقت تازہ دم رہنا شرعاً ضروری ہو، وہاں روزہ چھوڑ دینے کا اجر زیادہ ہے۔ یعنی خاص حالات میں شرعی احکام کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔

سفر میں عُذر کی بنا پر روزہ چھوڑنے کے لئے شرعی سفر کی مقدار وہی ہے جو نماز کی قصر کیلئے ہے، یعنی اس کے گھر سے منزلِ مقصود تک پیدل چلنے کے اعتبار سے کم از کم تین دن کی مسافت ہو۔ کم از کم مسافتِ سفر جس کے سبب ''قصر'' واجب ہوتی ہے، وہ ہے جو انسان اپنی طبعی ضروریات ولوازمات (یعنی کھانا اور دوسری طبعی حاجات پوری کرنے) اور شرعی فرائض (یعنی نمازوں) کی ادائیگی کے ساتھ اپنی اوسط رفتار سے تین دن میں طے کرے۔ اس میں آرام کے وقفے کے ساتھ دن کا سفر اور رات کا قیام بھی شامل ہے۔ موجودہ دور میں مسافت کے پیمانے بدل گئے ہیں۔ گذشتہ دور میں مسافت کو انگریزی میلوں اور بعد میں کلومیٹر سے ناپا جانے لگا، لہٰذا ماضیِ قریب کے علماء نے مسافتِ قصر کی مقدار انگریزی میلوں سے مقرر کی۔ فقہاءِ کرام کے اقوال میں مفتیٰ بہٖ قول اٹھارہ فرسخ ہے، ایک فرسخ تین شرعی میل کے برابر ہوتا ہے ایک شرعی میل 2000 گز کا ہوتا ہے۔ اور اٹھارہ فرسخ 54 شرعی میل کے برابر ہیں، جو ایک لاکھ آٹھ ہزار گز یعنی 61 انگریزی میل 2 فرلانگ 20 گز بنتے ہیں (واضح رہے کہ انگریزی میل 1760 گز کا ہوتا ہے)۔ اور موجودہ اعشاری پیمانے کے اعتبار سے یہ مسافت یہ 98 کلومیٹر 734 میٹر (یعنی 98.734 کلومیٹر) کے برابر ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

ثم اختلفوا فقیل احد وعشرون، وقیل ثمانیة عشر، وقیل خمسة عشر، والفتویٰ علی الثانی لانه الاوسط

ترجمہ: ''(شرعی سفر کی مسافت کے بارے میں) فقہاءِ کرام کا اختلاف ہے (اور اس سلسلے میں تین اقوال ہیں) ایک قول 21 فرسخ کا ہے، دوسرا قول 18 فرسخ کا ہے اور تیسرا قول 15 فرسخ کا ہے، اور فتویٰ دوسرے قول پر ہے، کیونکہ یہ اوسط قول ہے (یعنی مسافتِ شرعی 18 فرسخ ہے)، (درمختار: جلد نمبر 2 ص: 526 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی)''۔

پس مفتیٰ بہ قول کے مطابق سفرِ شرعی کی کم از کم مسافت 98.734 کلومیٹر ہے، لہٰذا جب بھی کوئی شخص اپنے گھر سے کم از کم 98.734 کلومیٹر یا اس سے زیادہ مسافت کے سفر پر روانہ ہو تو وہ نماز قصر پڑھے اور اسے سفر کی بنا پر رمضانِ مبارک کا روزہ چھوڑنے کی بھی رخصت ہے، جس کی بعد میں قضا لازم ہوگی۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''سفر میں روزہ رکھنا کیسا ہے؟''، آپ نے جواب میں لکھا:

''جو اپنے گھر سے تین منزل کامل یا زیادہ کی راہ کا ارادہ کر کے چلے، خواہ کسی نیت اچھی یا بری سے جانا ہو، وہ جب تک مکان کو پلٹ کر نہ آئے یا بیچ میں کہیں ٹھہرنے کی جگہ پندرہ دن قیام کی نیت نہ کر لے، مسافر ہے۔ ایسے شخص کو جس دن کی صبح صادق مسافرت کے حال میں آئے اُس دن کا روزہ ناغہ کرنا اور پھر کبھی اس کی قضا رکھ لینا جائز ہے، پھر اگر روزہ اسے نقصان نہ کرے، نہ اُس کے رفیق کو اُس کے روزہ سے ایذا ہو، جب تو روزہ رکھنا ہی بہتر ہے ورنہ قضا کرنا بہتر ہے، فی الدر المختار: لمسافر سفرا شرعیا ولو بمعصیة الفطر، ویندب الصوم ان لم یضرہ فان شق علیه او علی رفیقه فالفطر افضل لموافقة الجماعة، ویجب علی مقیم اتمام صوم یوم من رمضان سافر فی ذلك الیوم۔

ترجمہ: ''درمختار میں ہے: وہ مسافر جس کا سفر، شرعی (مقدار کے برابر) ہو خواہ گناہ کی خاطر ہو، تو وہ روزہ چھوڑ سکتا ہے۔ اور اگر اسے روزہ تکلیف نہ دے تو روزہ رکھنا مستحب ہے اور اگر روزہ مشکل ہو یا اس کے ساتھی پر مشکل ہو تو پھر جماعت کی موافقت میں افطار افضل ہے۔ مقیم پر رمضان کے اُس روزے کا پورا کرنا لازم ہے جس دن اس نے سفر شروع کیا ہو، (فتاویٰ رضویہ، جلد 10، ص: 348،347، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

خلاصۂ کلام یہ کہ رمضان کے دوران حالتِ سفر میں روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کے بارے میں مسافر کو اختیار ہے کہ اگر وہ اپنے لئے یا اپنے شریکِ سفر ساتھیوں کیلئے آسانی سمجھے، تو روزہ رکھ لے، ورنہ روزہ چھوڑ دے اور رمضان کے بعد قضا کرے۔ سفر کی شرعی مقدار 98.734 کلومیٹر ہے۔ البتہ اگر سفر جہاد کیلئے ہو یا کسی ایسے نیک مقصد کیلئے جس میں

مشقت زیادہ ہو اور آدمی کا چاک وچوبند رہنا ضروری ہو تو رمضان کا روزہ چھوڑنا افضل ہے۔

دائمی عذر کے سبب روزہ نہ رکھنے والے پر فدیہ ہے، کفارہ نہیں

سوال:75

میرا بائی پاس آپریشن ہوا ہے، روزے نہیں رکھ سکتا، سن رسیدگی اور کمزوری کی وجہ سے قضا بھی نہیں رکھ سکتا، کفارہ دینا چاہتا ہوں۔ روزوں کا کفارہ کیا ہے؟، یہ کفارہ کس کو دے سکتا ہوں؟۔ میری نگرانی میں ایک دینی مدرسہ ہے، جس میں گاؤں اور شہر کے بچے زیرِ تعلیم اور رہائش پذیر ہیں، مدرسے کے اخراجات میں خود برداشت کرتا ہوں، کیا اُن اخراجات میں میرا کفارہ ادا ہو جائے گا، یا کفارہ کی نیت کرنا ضروری ہے؟، یہ کفارہ اپنے دینی مدرسے کے بچوں پر خرچ کر سکتا ہوں؟، (سید محمد عارف شاہ، کوئٹہ)۔

جواب:

جو شخص انتہائی عمر رسیدہ ہو یا جس کو ایسا دائمی مرض (جیسے ذیابیطس وغیرہ) لاحق ہو، جس سے بظاہر شفا کی امید نہیں ہے اور ان وجوہ کے سبب وہ اپنے آپ کو روزہ رکھنے کے قابل نہیں پاتا، تو ایسا شخص شرعاً معذور قرار پاتا ہے اور اس کے لئے روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے۔ دائمی معذور کے لئے فدیہ ہے، کفارہ نہیں ہے۔ اس پر لازم ہے کہ ہر روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو دو وقت کا کھانا کھلائے یا اپنے اوسط معیار کے مطابق ایک دن کے طعام کے لئے نقد رقم دے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ ترجمہ: ''پس تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو (اور عذر کی بنا پر روزہ نہ رکھ سکے) تو دوسرے دنوں میں (روزوں کی) تعداد پوری کرے، اور جن لوگوں پر روزہ رکھنا دشوار ہو (ان پر ایک روزے کا) فدیہ ایک مسکین کا کھانا ہے، پھر جو خوشی سے فدیے کی مقدار میں نیکی کے جذبے کے ساتھ اضافہ کرے، تو یہ اس کے لئے بہتر ہے اور روزہ رکھنا

تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، اگر تم (اس کی حقیقت کو) جان لو، (البقرۃ:184)"۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (وللشیخ الفانی العاجز عن الصوم الفطر ویفدی) وجوباً ولوفی اول الشھروبلا تعدد فقیر

ترجمہ: "ایسا عمر رسیدہ شخص جو روزہ رکھنے سے عاجز ہو، اُسے روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے، اور ہر روزے کا فدیہ اُس پر واجب ہے، خواہ مہینے کے ابتدا ہی میں دیدے اور فدیہ دینے میں فقراء کی (کوئی خاص) تعداد شرط نہیں ہے (یعنی ایک فقیر کو پورے مہینے کا بھی فدیہ دے سکتا ہے)"۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، ص:365، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

زکوٰۃ، فطرہ، نذر، کفّارات اور فدیہ کی رقوم صدقاتِ واجبہ ہیں۔ اور ان کے آٹھ مصارف اللہ تعالیٰ نے سورۂ توبہ آیت 60 میں بیان فرمائے ہیں۔ ایسے دینی مدارس جن میں مستحق اقامتی طلبہ دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں، وہ زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ کی رقوم اور صدقاتِ واجبہ کا بہترین مصرف ہیں۔ محض آپ کا مدرسہ کے اخراجات برداشت کرنا، فدیہ کی ادائیگی کیلئے کافی نہیں بلکہ نیت ضروری ہے اور طالبِ علم کو اس کھانے کا مالک بنانا ہے۔ فدیہ کی رقم مستحق طلبہ کو براہِ راست بھی دی جاسکتی ہے اور تملیک کے بعد اُن پر خرچ بھی کی جاسکتی ہے۔

نمازِ تراویح سنّتِ مؤکدہ ہے

سوال:76

نمازِ تراویح باجماعت سنّت ہے یا رسمِ رمضان؟۔ ایک بالغ لڑکا جس کی عمر چودہ سال ہے، پہلے نوافل میں قرآن مجید سناچکا ہے، اب اگر وہ نمازِ تراویح کی امامت کرے تو کیا اس کی امامت جائز ہے، نیز کیا نابالغ حافظ کی امامت میں فرض اور تراویح پڑھنا درست ہے؟۔ (ڈاکٹر محمد افضل، بھریاسٹی ضلع نوشہرو فیروز، سندھ)۔

جواب:

لڑکے میں جب بلوغت کی علامات پائی جائیں تو عمر جتنی بھی ہو اسے بالغ تصور کیا جائے گا، ہمارے فقہاءِ کرام نے احتلام، انزال اور اس سے کسی عورت کا حمل قرار

پانے کوعلامتِ بلوغ قرار دیا ہے۔لیکن اگر بلوغ کی کوئی علامت نہ پائی جائے، تو پندرہ سال کی عمر مکمل ہونے پر اسے بالغ قرار دیا جائے گا۔اس پر اس حدیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے: ''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ اُحُد کے دن جب کہ ان کی عمر چودہ سال تھی، رسول اللہ ﷺ نے انہیں پیش کیا اور پھر انہیں (جہاد میں شرکت کی) اجازت نہ دی۔اور غزوۂ خندق کے روز جب کہ ان کی عمر پندرہ سال تھی انہیں پیش فرمایا اور انہیں (جہاد میں شرکت کی) اجازت عطا فرمادی، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:4098)''۔

فقہاءِ کرام نے لکھا ہے کہ لڑکے کے لئے کم از کم ممکنہ عمرِ بلوغ بارہ سال ہے، بشرطیکہ اس میں علاماتِ بلوغ ظاہر ہوجائیں، ورنہ عمر کے پندرہ سال مکمل ہونے پر اسے بالغ تصور کیا جائے گا۔

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں: (وادنیٰ مدتہ لہ اثنتا عشرۃ سنۃ ولھا تسع سنین) ھو المختار،

ترجمہ: ''اور (لڑکے کے لئے کم از کم ممکنہ عمرِ بلوغ) بارہ سال ہے اور لڑکی کے لئے نو سال ہے، یہی قولِ مختار ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:9، ص:185)''۔

صورتِ مسئولہ میں آپ کے بیان کے مطابق لڑکا چودہ سال کا ہے اور بالغ ہے تو اگر آپ کا بیان درست ہے اور اس لڑکے میں بلوغ کی علامتیں ظاہر ہوچکی ہیں اور اُس میں امامت کے لئے ممانعت کا کوئی اور سبب بھی نہیں پایا جاتا تو وہ فرائض اور تراویح دونوں کی امامت کرسکتا ہے، فرض اور تراویح دونوں کی امامت کا معیار ایک ہی ہے۔

نابالغ کی امامت کے بارے میں علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وامامۃ الصبی العاقل فی التراویح والنوافل المطلقۃ تجوز عند بعضھم ولا تجوز عند عامتھم کذا فی محیط السرخسی،

ترجمہ: ''بعض علماء کے نزدیک ایسا بچہ جو سمجھ دار ہے، تراویح اور مطلق نوافل میں اس کی امامت جائز ہے اور عام فقہاء کے نزدیک جائز نہیں ہے، ''محیط السرخسی'' میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:117، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا گیا کہ آیا نابالغ کی امامت میں تراویح
سنت اور نفل نماز پڑھنا جائز ہے، تو آپ نے جواب میں لکھا: ''بالغ کے امام کے لئے بالغ
ہونا شرط ہے، پھر آپ نے مندرجہ ذیل فقہی عبارات کے حوالے دیئے: (۱) وشروط
الامامة للرجال الاصحاء ستة اشیاء الاسلام والبلوغ والعقل والذکورة والقراء
والسلامة من الاعذار،

ترجمہ: ''ذی عقل مردوں کی امامت کے لئے چھ چیزیں شرط ہیں: اسلام، بلوغ، عقل، مرد
ہونا، قراءت پر قادر ہونا اور معذور نہ ہونا، (ردالمحتار بحوالہ نور الایضاح)۔ لہٰذا نابالغ کے
پیچھے بالغ کی مطلقاً کوئی نماز نہ ہوگی،

(۲) ولا یصح اقتداء رجل بصبي مطلقًا ولو فی جنازة ونفل علی الاصح ترجمہ: ''صحیح
ترین روایت کے مطابق بچے کے پیچھے مطلقاً مرد کی اقتدا جائز نہیں ہے، خواہ وہ جنازے کی
نماز ہو یا نفل، (درمختار)''۔ ہاں! تراویح وسنن ونوافل میں نابالغ اگر بالغ کی امامت کرے
تو مشائخِ بلخ اِسے جائز بتاتے ہیں، مگر مختار، اَصح اور ظاہر الروایۃ یہی ہے کہ ناجائز ہے اور یہ
عام ائمہ کا قول ہے، اور یہ بات مسلّم ہے کہ ظاہر الروایہ سے عدول نہ کیا جائے گا۔

(۳) وعلی قول آئمة بلخ یصح الاقتداء بالصبیان فی التراویح والسنن المطلقة کذا
فی ''فتاویٰ قاضی خان''، المختار انه لایجوز فی الصلوات کلها کذا فی ''الهدایة''
وهو الاصح هکذا فی ''المحیط'' وهو قول العامة وهو ''ظاهر الروایة'' هکذا فی ''البحر
الرائق''،

ترجمہ: ''ائمۂ بلخ کے قول کے مطابق تراویح اور سنتوں کی جماعت میں بچوں کی اقتداء جائز
ہے، ''فتاویٰ قاضی خان'' میں اسی طرح سے ہے، (لیکن فقہاء کا) مختار قول یہی ہے کہ تمام
نمازوں میں نابالغ کی اقتداء جائز نہیں ہے، ''ہدایہ'' میں اسی طرح ہے، یہی قول صحیح ترین
ہے، ''محیط'' میں بھی اسی طرح ہے، عام فقہاء کا قول بھی یہی ہے اور (فقہِ حنفی)
''ظاہر الروایۃ'' یہی ہے اور ''البحر الرائق'' میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری)''۔

علامہ امجد علی اعظمی کے نزدیک نابالغ کی امامت کے عدمِ جواز کا قول صحیح ترین، مختار اور راجح ہے۔ تاہم انہوں نے تراویح، سُنَن اور نوافل میں نابالغ کی امامت کے جواز کے بارے میں فقہاءِ بلخ کا قول ذکر کر کے اسے ''ظاہر الروایۃ'' کے خلاف اور غیر مختار قرار دیا ہے۔

(فتاویٰ امجدیہ، جلد اول، ص: 117، مکتبۂ رضویہ، آرام باغ، کراچی)

متشرّع و دین دار حافظ و قاری و عالم امام کی موجودگی میں ایسے افراد کو نماز تراویح کا امام بنانا ہرگز درست نہیں ہے جو:

(ا) نابالغ ہوں (ب) تلاوت قرآن میں ایسی غلطیاں کرتے ہوں جو فساد نماز کا باعث بنتی ہیں (ج) داڑھی منڈھواتے ہیں یا کٹواتے ہیں اور حد شرعی سے کم ہوتی ہے (د) یا رمضان مبارک سے قبل محض قرآن سنانے کے لئے داڑھی رکھ لیتے ہیں اور رمضان کے بعد منڈوا دیتے ہیں یا کٹوا کر حد شرعی سے کم کر دیتے ہیں، (ہ) یا سال بھر نماز کے تارک رہتے ہیں۔

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں: (والجماعة فيها سنة على الكفاية) في الاصح، ولو ترکها اهل مسجد اثموا، لا لو ترك بعضهم، وكل ما شرع بجماعة فالمسجد فيه افضل

ترجمہ: ''صحیح ترین روایت کے مطابق تراویح کی جماعت ''سنت علی الکفایہ'' ہے، اگر کسی مسجد کے سب لوگ چھوڑ دیں تو گنہگار ہوں گے، اور اگر بعض چھوڑ دیں (تو مؤاخذہ نہیں ہوگا) اور ہر وہ نماز جو با جماعت مشروع ہو، اس کا مسجد میں پڑھنا افضل ہے۔۔۔۔ اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں کہ اس عبارت کا مفاد یہ ہے کہ اپنی اصل کے اعتبار سے نمازِ تراویح ہر شخص کے لئے سنتِ مؤکدہ ہے، لہٰذا عذر کے بغیر کسی کے لئے اس کا چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ اس کے برعکس تراویح کی جماعت سنتِ کفایہ ہے، اگر سب لوگ چھوڑیں گے تو گنہگار ہوں گے، اگر بعض لوگ جماعت سے رہ جائیں اور اپنے گھر پر پڑھیں تو فضیلت کے تارک ہوں گے۔ اور اگر کوئی اپنے گھر پر با جماعت پڑھے تو مسجد کی جماعت کی فضیلت اسے نہیں ملے گی، ''المکتوبات'' میں اسی طرح ہے، جیسا کہ ''منیہ'' میں

ہے۔ رہا یہ سوال کہ آیا کسی شہر کی ہر مسجد والوں کے لئے سنت کفایہ ہے یا صرف ایک مسجد کے لئے یا محلے کی صرف ایک مسجد کے لئے؟ ۔علامہ حصکفی کے کلام سے پہلا قول راجح معلوم ہوتا ہے، ''طبی'' نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے اور میرے نزدیک تیسرا قول راجح ہے۔ علامہ شامی مزید لکھتے ہیں کہ اگر سب لوگ نمازِ تراویح گھر پر باجماعت پڑھیں تو اس سے مسجد میں تراویح کی جماعت کے سنت ہونے کا ترک لازم آئے گا اور سب گنہگار ہوں گے''۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:02،ص:431)

آج کل حفاظ قرآن کثیر تعداد میں ہیں اور سب کیلئے مسجد میں امامتِ تراویح کے مواقع دستیاب نہیں ہیں۔ اور ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ جو حافظ قرآن چند سال مسلسل نمازِ تراویح میں منزل نہ سنائے تو اس کا حفظِ قرآن محفوظ نہیں رہتا اور قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد بھلانے کی حدیث پاک میں سخت وعید آئی ہے:

(۱) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عُرِضَتْ عَلَيَّ اُجُوْرُ اُمَّتِيْ حَتَّى الْقَذَاةُ يُخْرِجُهَا الرَّجُلُ مِنَ الْمَسْجِدِ وَعُرِضَتْ عَلَيَّ ذُنُوْبُ اُمَّتِيْ فَلَمْ اَرَ ذَنْبًا اَعْظَمَ من سُوْرَةٍ مِنَ الْقُرْاٰنِ اَوْ آيَةٍ اُوْتِيَهَا رَجُلٌ ثُمَّ نَسِيَهَا،

ترجمہ: ''حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھ پر میری امت کے نیکیاں پیش کی گئیں یہاں تک کہ کسی شخص نے مسجد سے کوئی کوڑا کرکٹ نکالا تھا (تو وہ بھی پیش کیا گیا)۔ اور مجھ پر میری امت کے گناہ پیش کئے گئے تو سب سے بڑا گناہ جو میں نے دیکھا وہ یہ تھا کہ کسی شخص کو قرآن کی کوئی سورت یا آیت عطا کی گئی ہو (یعنی اس نے اُسے یاد کیا)، پھر اُسے بھلا دیا، (سنن ترمذی، رقم الحدیث:2916)''۔

(۲) عَنْ سَعْدِ بْنِ عِبَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَا مِنْ اِمْرِئٍ يَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ ثُمَّ يَنْسَاهُ اِلَّا لَقِيَ اللهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَجْذَمَ،

ترجمہ: ''سعد بن عبادہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص قرآن پڑھتا ہے، پھر (یاد کرنے کے بعد) اسے بھلا دیتا ہے، تو وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس طرح

ملے گا کہ جذام کے سبب اس کا ہاتھ کٹا ہوا ہوگا، (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث:1469)''۔

ان احادیث مبارکہ کی رو سے قرآن مجید کے حفظ کی سعادت حاصل کرنے کے بعد اسے محفوظ رکھنا ضروری ہے اور بھلا دینا بدقسمتی کی بات ہے۔ لہٰذا افضل صورت تو یہی ہے کہ نمازِ تراویح کی جماعت مسجد میں ہی پڑھی جائے اور حفاظِ کرام اپنے گھروں پر نوافلِ شب یا تہجد میں گھر والوں کے ساتھ اپنی قرآن کی منزل پڑھ لیا کریں۔ اور اگر وہ صاحبِ عزیمت نہ ہوں تو پھر گھروں پر محدود پیمانے پر تراویح کی جماعت کا اہتمام کرلیا کریں تاکہ قرآن محفوظ رہے، اگرچہ یہ عمل مختار نہیں ہے، لیکن قرآن کی حفاظت بھی ضروری ہے۔

رؤیتِ ہلال کے مسائل

مسئلۂ رؤیتِ ہلال

رمضان المبارک، شوال المکرم اور ذوالحجہ کے مہینوں کے آغاز کے لئے رؤیت ہلال کا مسئلہ عالمی سطح پر انتہائی مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ بلاشبہ ہر مسلمان کی یہ خواہش ہے اور ہونی چاہئے کہ دینی اعتبار سے یہ مُقدّس ایام پوری قوم ایک ساتھ منائے۔ اُن مسلم ممالک میں تو ایسا ہو بھی رہا ہے جہاں ملوکیت ہے یا اُن کی حکومتوں کا انتظامی تسلّط مستحکم ہے، جیسے سعودی عرب، مشرقِ وسطیٰ و دیگر عرب ممالک، انڈونیشیا، ملائشیا و افریقی ممالک وغیرہ، آج کل اسے Writ of the Govt. سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پاکستان یا اُن ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، ایسا نہیں ہوسکتا، چنانچہ برطانیہ اور امریکا میں بھی کم از کم دو عیدیں اور بسا اوقات تین عیدیں ہو جاتی ہیں۔ امریکا میں دو بڑی تنظیمیں اسلامک کونسل آف نارتھ امریکا اور اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکا میں سے ایک (جس پر عرب مسلمانوں کا غلبہ ہے) غیر مشروط طور پر سعودی عرب کی پیروی کرتے ہیں اور دوسرے سائنسی بنیاد پر تاریخ کا تعین کرتے ہیں۔ اور ہمارے پاک و ہند کے دینی وفقہی نظریات پر تصلّب کے ساتھ قائم رہنے والے علماء شرعی اصولوں کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ امریکا جیسے بہت بڑے وسیع وعریض غیر مسلم ملک میں جہاں مسلمانوں کی آبادی جغرافیائی اعتبار سے انتہائی حد تک منتشر ہے، ایسا اہتمام آسان نہیں ہے، اس لئے وہاں بالعموم تین عیدیں ہوتی ہیں۔ برطانیہ، امریکا اور یورپ کے ممالک تو سائنسی اعتبار سے جدید ترین ممالک ہیں، لیکن وہاں بھی یہ مسئلہ آسان نہیں ہے، جبکہ وہ پاکستان کی رویت ہلال کمیٹی کے زیرِ اثر نہیں ہیں کہ اِس پر الزام لگا کر اپنے فریبِ نفس کو تسکین دی جائے۔

دیگر مسلم ممالک میں یہ روِش بھی نہیں ہے کہ پوری قوم، بعض سیاسی رہنما اور پورا پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا ہاتھ دھوکر رویت ہلال کے مسئلے کے پیچھے پڑ جائے اور ہفتوں تک اِس موضوع پر کالم، کارٹون، ٹیلی وژن مباحثے اور بیان بازی کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ شاید قومی انتشار کی واحد وجہ ایک دِن عید کا نہ ہونا ہے۔ یومِ پاکستان اور دیگر

قومی ایام تو پوری قوم ایک ساتھ مناتی ہے، تو پھر سوال یہ ہے کہ 63 سال گزرنے کے باوجود قومی وحدت کیوں قائم نہ ہوسکی؟۔

قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک پورے ملک میں ایک عید کی روایت میرے علم میں نہیں ہے، لیکن ہر سال انتہائی حیرت واستعجاب سے پوچھا جاتا ہے کہ اِس سال دوعیدیں کیسے ہوگئیں؟۔ سابق ادوار میں نسبتاً آسانی تھی کہ چیئرمین اور ارا کینِ کمیٹی اعلان کرنے کے بعد گھر جاکر آرام سے سوجاتے تھے اور صرف سرکاری نشریاتی ادارے پی ٹی وی اور ریڈیو پاکستان تھے، ان سے رویتِ ہلال کمیٹی کا فیصلہ نشر ہوجاتا تھا، کوئی مخالفانہ خبر، فیصلہ یا تبصرہ نشر نہیں ہوتا تھا۔ صرف پشاور کی ڈیٹ لائن سے ایک لائن کی سرخی پر مشتمل خبر اخبارات میں چھپ جاتی تھی کہ مقامی علماء نے مطالبہ کیا ہے کہ چیئرمین کو برطرف کرواور رویت ہلال کمیٹی کو تبدیل کرو، اس سے اگلے دن لوگ اپنے کاموں میں مصروف ہوجاتے تھے۔ اب دسیوں پرائیویٹ ٹیلی ویژن چینلز، ایف ایم ریڈیوز اور سینکڑوں اخبارات ہیں۔ ان سب کی ضرورت ''بریکنگ نیوز''، ''تازہ ترین''، ''فلیش نیوز'' اور انتشار کی ایسی خبریں ہیں، جن میں سسپنس ہو، تجسس ہو اور عوامی دلچسپی کا مرچ مصالحہ ہو۔ اس کے علاوہ تقریباً ہر پاکستانی کے پاس موبائل فون ہے۔ اب آئندہ کوئی بھی چیرمین بنے، یہ تمام آفتیں اس کے استقبال اور خبرگیری کے لئے موجود رہیں گی۔ مزید یہ کہ مذہبی معاملات پرائیویٹ سیکٹر میں ہیں، حکومت کی رِٹ (تحکم) نہ ہے اور نہ ہی مستقبل قریب میں اس کے کوئی آثار ہیں، بلکہ بدقسمتی سے ہر آنے والے دن حالات میں مزید بگاڑ پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ ملک بتدریج مسلح گروہوں کے ہاتھوں یرغمال بنتا جارہا ہے، حکمرانوں کے لئے اپنی سلامتی اور حفاظت ایک سوالیہ نشان ہے، قوم تو اللہ تعالیٰ اور مقدر کے رحم وکرم پر ہے۔ ایسے ماحول اور ایسے ملک میں کسی بھی امام یا خطیب کا یہ فطری حق ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جو چاہے اعلان کرے، جو چاہے اقدام کرے، حکومت کی قائم کردہ قضا کو رد کرے، اسے نہ آج کوئی روکنے والا ہے اور نہ مستقبل میں ایسے آثار نظر آرہے ہیں۔ میڈیا کے لئے 99% فیصد

مسلمانوں کا ایک ساتھ عید منانا کوئی خبر نہیں ہے بلکہ چند افراد کا الگ عید پڑھنا یہ خبر ہے۔ اور جب انحراف واعتزال کا رویہ اپنانے والوں کی اس حد تک حوصلہ افزائی ہوگی تو مستقبل میں اس روش کو مزید فروغ ملے گا۔

جہاں تک عید الفطر کے چاند کے اعلان کا تعلق ہے تو ہماری قوم کو کسی پل قرار نہیں، جلدی اعلان ہوجائے تو مطالبہ ہوتا ہے کہ دیر تک انتظار کیوں نہیں کیا، اعلان میں معمولی تاخیر ہوجائے تو مطالبہ ہوتا ہے کہ انکوائری کی جائے تاخیر کیوں ہوئی؟۔شرعاً رویت کے فیصلے اور اعلان کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں ہے، جب قاضی اور مجلس قضا (جو زیرِ بحث مسئلے میں ''مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان'' ہے) کو اطمینان ہوجائے تو فیصلے کا اعلان کردیا جاتا ہے۔منگل: 29، رمضان المبارک 1429ھ، مطابق: 30، ستمبر 2008ء کو مختلف مقامات سے شہادتیں آئیں، جن میں صوبہ سرحد کے علاوہ پنجاب میں پنڈی گھیپ، جھنگ، بھکر، میلسی، بلوچستان سے چاغی اور کوئٹہ اور سندھ سے سکھر، بدین، تلہار اور دیگر مقامات ہیں۔مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان کے رکن شیعہ عالم دین علامہ قاضی نیاز حسین نقوی کو ان کے ثقہ علماء نے ڈی آئی خان اور بلتستان اور کچھ اور مقامات سے بھی رویت کی شہادت دی۔تلہار کے گردوپیش کی شہادتوں کو جب ٹیلی فون پر ہمارے ماہر فلکیات نے فنی بنیادوں پر درست قرار دیا، تو ہم نے وہاں کے عالم کو ذمہ داری تفویض کی کہ بالمشافہ تعدیل کر کے یہ بتائیں کہ آیا شرعی طور پر یہ شہادتیں قابلِ قبول ہیں اور آپ ان سے شرعاً بالکل مطمئن ہیں؟، کیونکہ یہ کروڑوں مسلمانوں کے روزے کا مسئلہ ہے۔پھر انہوں نے تعدیل کر کے ان شہادتوں کو قابلِ قبول قرار دیا۔دوسری طرف ماہرین عدمِ امکان رویت پر یکسو نہیں تھے، سپارکو کے ماہر غلام مرتضیٰ صاحب اور مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان کے ماہر رکن وعالم دین مولانا شبیر احمد کاکاخیل نے رائے دی کہ ہم امکانِ رویت کو علی الاطلاق مسترد نہیں کرسکتے، لہٰذا ان شہادتوں کو قبول کر کے رویت کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔اس کے بعد مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان (جس میں تمام مکاتبِ فکر کے جید علماء شامل ہیں) نے

اتفاقِ رائے سے رویت کا فیصلہ کیا اور اس متفقہ اور حتمی فیصلے کا میڈیا پر ایک ہی وقت میں اعلان کیا گیا۔ یہاں میں یہ بھی ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ برطانیہ سے ایک مستند عالم دین علامہ ظفر محمود فراشوی (جو ''محقّقِ برطانیہ'' کے نام سے معروف ہیں) نے مجھے فون کر کے بتایا کہ میں نے پہلے یہاں لوگوں کو بتادیا تھا کہ پاکستان میں رویت ہلال کے امکانات ففٹی ففٹی ہیں، بالکل معدوم نہیں ہیں، میری پچیس سالہ طویل تحقیق ہے اور میں کسی بھی فورم پر چیلنج سے ثابت کر سکتا ہوں۔ اس مرحلے پر میں یہ وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ نئے چاند کی ولادت (Birth of Moon) کے ہونے یا نہ ہونے پر تو سائنسدانوں کا کلی اتفاق واجماع ہوتا ہے، لیکن امکانِ رویت (Visibility of Moon) جب خفیف یا اَخَف (Least Chance of Visibility) درجے میں ہو، تو ان کے معیارات میں اختلاف واقع ہو جاتا ہے، مثلاً ماضی میں ایک ماہر فلکیات صمد رضوی صاحب اور سپارکو وکراچی یونیورسٹی کے ماہرین فلکیات کی رائے میں بعض مواقع پر اختلاف رہا ہے، کیونکہ صمد رضوی صاحب سیدھا سادہ البیرونی کے فارمولے کے مطابق رائے دیتے ہیں اور دوسرے ماہرین جدید معیارات (Parameters) کے مطابق رائے دیتے ہیں۔ مکمل عدمِ امکانِ رویت اور صریح امکانِ رویت کے موقع پر ماہرین میں اختلاف کی نوبت نہیں آتی بلکہ خفیف اور اَخَف امکانِ رویت (Least Chance of Visibility) کے موقع پر اختلاف ہو جاتا ہے۔ تو ایسے موقع پر اگر ہم شہادتوں کو آنکھ بند کر کے علی الاطلاق رد کر دیں تو پھر شرعی نظامِ رویت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی اور شہادتوں کا کردار عملاً معدوم ہو جاتا ہے۔ اس مسئلے پر غور کرتے ہوئے اہلِ علم اور اہلِ فن کو اس پیچیدہ صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ ہم اس وقت مسئلۂ رویت میں دو انتہاؤں کے درمیان معلّق ہیں، ایک یہ ہے کہ جدید سائنسی معلومات مطلقاً قابلِ قبول نہیں، خواہ ماہرین فلکیات یہ کہیں کہ چاند کی ولادت بھی نہیں ہوئی، جب رویت کی شہادت آگئی ہے تو ہمارے لئے یہ شرعی حجت کافی ہے۔ دوسری طرف جدت پسند طبقے کا خیال یہ ہے کہ ملک میں شرعی نظامِ

رویت کی کوئی ضرورت نہیں، بس ماہرینِ فلکیات مستقل کیلنڈر بنا کر دے دیں اور اُس کے مطابق رمضان کا آغاز ہو اور عید منائی جائے۔ سب کو پہلے سے معلوم ہوگا کہ رمضان کب شروع ہو رہا ہے اور عید کب ہوگی۔ لیکن اس حقیقت سے قطع نظر کہ شریعت کی رو سے مدار رویت بصری پر ہے، مستقل قمری کیلنڈر کا مشورہ دینے والے بھول جاتے ہیں کہ پاکستان میں مستقل سائنسی کیلنڈر کیسے نافذ کیا جائے گا، کس کس سے منوایا جائے گا اور کیسے منوایا جائے گا، جب کہ ہر مسجد کا خطیب اور ہر ادارے کا مفتی اپنی ذاتی حیثیت میں مفتیٔ اعظم پاکستان ہے اور اسے ملک کی قائم کردہ مجلس قضا کو رد کرنے اور اس کے متوازی فیصلہ کرنے کا مکمل استحقاق ہے، اس کی نظر میں ماہرین فلکیات کے کیلنڈر کی وُقعت ایک پرِ کاہ کے برابر بھی نہیں ہے۔ مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان میں شامل علماء کو پھر بھی ایک حد تک احترام اور مقام ہے، بعض کی بحیثیتِ مجموعی (باستثناءِ چند) تمام حلقوں میں تکریم ہے اور دیگر کا اپنے اپنے مکتبۂ فکر میں ایک مسلّمہ مقام اور مستند حیثیت ہے۔

میں نے بحیثیت چیئرمین، مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان کے تمام ارکان کی حمایت اور اتفاقِ رائے سے گذشتہ نو برسوں میں کوشش کی ہے کہ ہم فیصلہ شرعی بنیاد پر کریں، مگر جدید سائنسی معلومات سے ہر ممکن استفادہ کریں، قرائن عقلیہ کے ساتھ مطابقت پیدا کریں تاکہ ہمارا یہ دعویٰ کہ اسلام دین فطرت ہے اور اس کا کوئی حکم ماوراءِ عقل تو ہوسکتا ہے خلافِ عقل ہرگز نہیں، زمینی حقائق کے مطابق بھی سچ ثابت ہو۔ اور جوں جوں انسانی علم ترقی کرے گا دینی احکام کی حکمتیں اور قدرت کے پوشیدہ راز اس پر منکشف ہوتے چلے جائیں گے اور اسلام کی حقانیت واضح ہوتی چلی جائے گی۔ میں اپیل کرتا ہوں کہ کسی صاحبِ علم کے پاس کوئی ایسا فارمولا ہو تو سامنے لائے، جس سے تمام سائنسی حقائق ومعلومات کو یکسر رد کر کے محض شہادت کو حجت مان کر رویت کا فیصلہ کرنے والے صوبۂ سرحد کے بعض علماء اور ماہرینِ فلکیات بیک وقت مطمئن ہوجائیں اور کسی طرف سے اختلاف وعدمِ اطمینان کی کوئی آواز بلند نہ ہو، جبکہ ان کا دعویٰ ہوتا ہے کہ ہم حلفیہ گواہی لیتے ہیں اور

تمام گواہ متشرِّع بھی ہوتے ہیں۔ باہر بیٹھ کر تبصرہ کرنے والا تبصرہ نگار (Commentator) ہمیشہ کھلاڑی سے ماہر ہوتا ہے، اس کی غلطیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کرتا ہے، خواہ اس نے خود زندگی میں میدان میں اتر کر کوئی کارنامہ انجام نہ دیا ہو۔ شریعت نے قضا میں خطا کے احتمال کو کبھی رد نہیں کیا، ورنہ قاضی کو بھی نبی کی طرح معصوم ماننا پڑے گا، لیکن شریعت نے قضا کو بہر صورت مؤثر مانا ہے اور جدید فلسفۂ قانون بھی یہی ہے۔ ورنہ جب ماہرین کے نزدیک سعودی عرب کا فیصلہ رویتِ حقیقی اور صریح امکانِ رویت کے کسی بھی معیار پر پورا نہیں اترتا، تو اس کے تحت ادا کئے جانے والے امت کے تمام حج باطل قرار پائیں گے، فاعتبروا یا اولی الابصار۔ پاکستان میں کوئی بھی رویتِ ہلال کمیٹی تشکیل پائے اور کوئی بھی چیرمین بنے، کسی نہ کسی گوشے سے ہدفِ طعن بننا اس کا مقدر رہے گا۔ لیکن قرآن و حدیث اور اسلام کا حکم حسنِ ظن کا ہے، بغیر ثبوت و شواہد کے سوءِ ظن کی اجازت نہیں ہے۔

میں اہلِ علم اور اہلِ فتویٰ سے یہ بھی دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا قاضی کو شہادتِ کاذبہ (False Witness) اور شہادتِ مُرتابہ (Doubtful Witness) کو رد کرنے کا اختیار نہیں ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر قضا کا ادارہ قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟۔ پھر تو ہر صورت میں گواہ علی الاطلاق (Absolute) حجت ہو جائے گا اور چاہئے کہ گواہ خود ہی فیصلے کا اعلان کر دے، نہ قضا کی ضرورت، نہ عدالت کی اور نہ ہی گواہ کی جرح و تعدیل کی ضرورت ہے۔

عصرِ حاضر کے مایہ ناز مفسر، محدّث، فقیہ اور محقق علامہ غلام رسول سعیدی مُدظلہم نے اس مسئلے پر مفصل اور مدلل بحث کی ہے کہ حدیث اور فقہاءِ امت سے یہ ثابت ہے کہ قطعی قرائنِ عقلیہ کے خلاف شہادت شرعاً معتبر نہیں ہے اور ایسی شہادت کو قاضی رد کر سکتا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

قرائنِ عقلیہ اور شواہد کے خلاف شہادت کا غیر معتبر ہونا:

سائنسی علوم کے ذریعہ چاند کی رویت اور پہلی تاریخ کے تعین میں بھی مدد ملتی ہے اور اس سے ہمیں شہادتوں کے پرکھنے کا بھی موقع ملتا ہے کہ یہ شہادت سچی ہے یا جھوٹی ہے، جب سائنسی آلات کے ذریعہ یہ معلوم ہو جائے کہ آج چاند کی تولید نہیں ہوئی ہے اور اس کی رویت ممکن نہیں ہے اور مطلع بالکل صاف ہو اور پورے ملک میں کہیں چاند نظر نہ آیا ہو اور ایسے میں چند آدمی یہ گواہی دے دیں کہ ہم نے چاند دیکھا ہے تو ان کی گواہی جھوٹی ہوگی اور سائنسی تحقیقات کے خلاف ان کی گواہی کا شرعاً اعتبار نہیں کیا جائے گا کیونکہ قرائن اور شواہد کے خلاف جو گواہی دی جائے وہ شرعاً معتبر نہیں ہوتی۔

علامہ ابن قیم جوزیہ (متوفی 571ھ) نے اس مسئلے پر کافی بحث کی ہے اور دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ عقلی شواہد اور دلائل کے خلاف گواہوں کی گواہی کا شرعاً اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ علامہ ابن قیم جوزیہ کی چند عبارات ملاحظہ فرمائیں:

(۱) ہمیشہ سے آئمہ اور خلفاء اس صورت میں چور کا ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ کرتے رہے ہیں جب اس شخص سے مال برآمد ہو جائے، جس پر چوری کا الزام ہو اور یہ قرینہ گواہوں اور اقرار سے زیادہ قوی ہے۔ کیونکہ گواہوں میں صدق اور کذب کا احتمال ہے اور جب چور کے پاس سے مال برآمد ہو جائے تو یہ نص صریح ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔

(الطرق الحکمیہ ،ص:2، دارالکتب العلمیہ ، بیروت 1415ھ)

(۲) بہت سے قرائن اور علامتیں انکار قسم سے زیادہ قوی ہوتی ہیں تو ان کو معطل کرنا کس طرح جائز ہوگا، (الطرق الحکمیہ ،ص:2)

(۳) اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ گواہوں کے علاوہ دوسرے دلائل گواہی سے زیادہ قوی ہوتے ہیں، جیسے وہ حال جو صدقِ مدعی پر دلالت کرتا ہو کیونکہ وہ گواہ کی خبر سے زیادہ قوی دلیل ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ امام ابوداؤد اور دیگر آئمہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے خیبر کی طرف سفر کا ارادہ کیا، جب میں نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور میں نے عرض کیا کہ میرا خیبر کی طرف جانے کا ارادہ ہے، تو آپ ﷺ

نے فرمایا: جب تم میرے وکیل کے پاس جاؤ تو اس سے ۱۵ وسق کھجوریں لے لینا (ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے اور ایک صاع چار کلو تین سو گرام کا ہوتا ہے) اور جب وہ تم سے کوئی نشانی طلب کرے تو تم اپنا ہاتھ اپنے گلے پر رکھ دینا، (الحدیث)۔

(سنن ابوداؤ، رقم الحدیث:3632، سنن بیہقی، ج:6، ص:80، مشکوٰۃ، رقم الحدیث:2935)

اس میں یہ دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ نے علامات اور قرائن کو گواہی کے قائم مقام قرار دیا ہے، پس شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرائن، علامات اور دلائل احوال کو لغو قرار نہیں دیا بلکہ ان پر احکامِ شرع کو مرتب کیا، (الطرق الحکمیہ، ص:10)۔

رسول اللہ ﷺ کے حرم محترم کا تہمت سے بری ہونا:

علامہ ابن قیم جوزیہ نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے:

''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص کو رسول اللہ ﷺ کی اُمِ ولد کے ساتھ مُتّہم کیا جاتا تھا، رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: جاؤ اس کی گردن اڑا دو، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے پاس گئے تو وہ ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے ایک کنویں میں غسل کر رہا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: نکلو اور اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اس کو نکالا، دیکھا تو اس کا عضو تناسل کٹا ہوا تھا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کو قتل کرنے سے رک گئے اور نبی ﷺ کی خدمت میں جا کر یہ واقعہ عرض کیا اور کہا: یا رسول اللہ! اس کا عضو تناسل تو کٹا ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی جس اُمِ ولد کا ذکر ہے وہ حضرت ماریہ قبطیہ تھیں، جن سے رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم پیدا ہوئے تھے۔

(الطبقات الکبریٰ، ج:8، ص:172، دارالکتب العلمیہ، بیروت)

علامہ یحییٰ بن شرف نووی متوفی 676ھ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

''وہ شخص منافق تھا اور کسی وجہ سے قتل کا مستحق تھا، نبی کریم ﷺ نے اس کے نفاق یا کسی اور سبب سے اس کے قتل کا حکم دیا تھا نہ کہ زنا کے سبب سے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ سمجھ کر اس کے قتل سے رک گئے کہ آپ نے اس کے زنا کی وجہ سے اس کے قتل کا حکم دیا تھا اور ان کو

یقین ہو گیا تھا کہ اس نے زنا نہیں کیا ہے۔(شرح مسلم للنووی، جلد:2،ص:368)"

میں کہتا ہوں کہ علامہ نووی اور دیگر شارحین کا یہ لکھنا صحیح نہیں ہے کہ آپ نے اس کے نفاق یا کسی اور سبب سے اس کے قتل کا حکم دیا تھا نہ کہ زنا کے سبب سے، کیونکہ اگر یہ وجہ ہوتی تو رسول اللہ ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دوبارہ اس کے قتل کرنے کے لئے بھیجتے اور صحیح یہی ہے کہ اس شخص پر یہ تہمت تھی کہ اس نے حضرت ماریہ سے زنا کیا ہے اور آپ کے نزدیک یہ بات گواہوں سے ثابت ہو گئی تھی، اس لئے آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کے قتل کرنے کے لئے بھیجا۔ قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی متوفّٰی 544ھ، علامہ ابی مالکی متوفّٰی 828ھ اور علامہ سنوسی مالکی متوفّٰی 895ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

"لوگوں نے اس شخص پر حضرت ماریہ قبطیہ کے ساتھ زنا کی تہمت لگائی اور نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا، اس تہمت کا بھی کوئی سبب ہونا چاہئے اور اس کو قتل کرنے کی بھی کوئی وجہ ہونی چاہئے، تہمت کی وجہ یہ ہے کہ وہ شخص قبطی تھا اور چونکہ حضرت ماریہ بھی قبطیہ تھیں اس لئے ہم جنس اور ہم زبان ہونے کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے اور ایک دوسرے سے باتیں بھی کرتے تھے، اس وجہ سے لوگوں نے اس پر تہمت لگادی اور رہی اس کو قتل کرنے کی وجہ تو امام رازی نے یہ کہا ہے کہ اس حدیث میں اس کو ساقط کر دیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ممکن ہے آپ کے نزدیک گواہوں سے یہ ثابت ہو گیا ہو کہ اس شخص نے حضرت ماریہ کے ساتھ زنا کیا ہے، اس لئے آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ اس کو قتل کر دیں۔ لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھا اس کا عضو کٹا ہوا ہے تو انہوں نے اس کو قتل نہیں کیا اور پورے واقعہ میں حکمت یہ تھی کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ نبی کریم ﷺ کا حرم اور آپ کی اُمِ ولد اس تہمت سے بری ہیں (جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر منافقوں نے حضرت صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ کے ساتھ تہمت لگائی تھی حالانکہ حضرت صفوان رضی اللہ عنہ نے بعد میں بتایا کہ وہ نامرد ہیں اور اس فعل کے اہل ہی نہیں ہیں"۔ (صحیح البخاری، رقم: 4757، سنن ابوداؤد، رقم:

2138، سنن ابن ماجہ، رقم: 1970)

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ نے حقیقتاً اس کو قتل کرنے کا حکم نہ دیا ہو اور آپ ﷺ کو یہ علم ہو کہ اس کا آلۂ تناسل کٹا ہوا ہے اور آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس لئے اس کے قتل کا حکم دیا ہوتا کہ اس کا معاملہ منکشف ہوجائے اور آپ کے حرم سے تہمت دور ہوجائے اور یہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کی طرف وحی کی گئی ہو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کو قتل نہیں کریں گے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اس شخص کا نااہل ہونا منکشف ہوجائے گا، جیسا کہ اس کنویں میں اس کو برہنہ دیکھنے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر منکشف ہوگیا اور باوجود علم کے آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس لئے حکم دیا تھا تاکہ حضرت علی بھی اس چیز کو دیکھ لیں اور ان کے نزدیک بھی آپ کی حرم محترم حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کی اس تہمت سے براءت ثابت ہوجائے۔

(اکمال المعلم بفوائد مسلم، جلد: 8، ص: 304، دار الوفائ، بیروت 1419ھ، اکمال اکمال المعلم، جلد: 9، ص: 217-216، معلم اکمال الاکمال علی ھامش شرح الابی، ج: 9، ص: 217-216، دار الکتب العلمیہ، بیروت،: 1415ھ)

قاضی عیاض مالکی کی شرح کی تائید امام محمد بن سعد متوفّٰی 230ھ کی اس روایت میں ہے:

''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی والدہ جو نبی کریم ﷺ کی کنیز تھیں، ان کے بالا خانے میں ایک قبطی آیا کرتا تھا، وہ ان کو پانی اور لکڑیاں لا کر دیتا تھا، لوگ اس کے متعلق چہ مگوئیاں کرنے لگے کہ ایک عجمی مرد عجمی عورت کے پاس آتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ تک یہ بات پہنچی تو آپ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو بھیجا، اس وقت وہ قبطی ایک کھجور کے درخت پر چڑھا ہوا تھا، اس نے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تلوار دیکھی تو وہ گھبرا گیا اور گھبراہٹ میں اس کا تہبند کھل کر گر گیا اور عریاں ہوگیا، حضرت علی نے دیکھا کہ اس کا آلہ تناسل کٹا ہوا تھا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے پاس گئے اور آپ ﷺ کو اس واقعہ کی خبر دی اور کہا: ''یارسول

اللہ ﷺ! جب آپ ہم میں سے کسی شخص کو کسی کام کا حکم دیں، پھر وہ شخص اس کام میں اس کے خلاف کوئی معاملہ دیکھے تو کیا وہ شخص آپ کے پاس (وہ کام کئے بغیر) واپس آجائے؟''۔آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں!، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ انہوں نے دیکھا کہ اس قبطی کا تو آلہ کٹا ہوا تھا، حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: پھر حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کے ہاں حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی، پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور کہا: السلام علیک اے ابو ابراہیم! تب رسول اللہ ﷺ مطمئن ہو گئے (کہ حضرت ماریہ پاک دامن ہیں اور ان سے آپ ہی کے بیٹے کا تولد ہوا ہے)۔

(الطبقات الکبریٰ، جلد:8، ص:172، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

ہر چند کہ مسلم کی روایت میں ہے کہ وہ قبطی کنویں میں نہا رہا تھا اور امام ابن سعد کی روایت ہے میں ہے کہ وہ کھجور کے درخت پر تھا، لیکن بنیادی چیز میں دونوں روایتیں متحد ہیں کہ اس قبطی کی وجہ سے لوگوں نے حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کو متہم کیا تھا اور لوگوں نے اس کے خلاف نبی کریم ﷺ کے سامنے شہادت دی جیسا کہ شارحین نے ذکر کیا ہے اور اس وجہ سے نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ اس کو قتل کر کے آئیں اور اس موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو برہنہ دیکھ لیا اور معلوم ہو گیا کہ اس کا آلہ کٹا ہوا ہے اور اس سے حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کی براءت ثابت ہو گئی۔

تاہم ان دونوں حدیثوں سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ جب کوئی شہادت قرائن اور شواہد کے خلاف ہو تو اس شہادت کا شرعاً اعتبار نہیں کیا جاتا، فقہاء اسلام بھی اس امر پر متفق ہیں کہ اگر گواہوں کی گواہی قرائن اور شواہد کے خلاف ہو تو اس کا شرعاً اعتبار نہیں ہوگا۔ فقہاء اسلام کی تصریحات حسب ذیل ہیں:

قرائن عقلیہ اور شواہد کے خلاف شہادت کے غیر معتبر ہونے کے متعلق فقہاء اسلام کی تصریحات:

علامہ ابن قدامہ حنبلی (متوفی: 620ھ) نے لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا یہ موقف ہے کہ اگر چار گواہ یہ گواہی دیں کہ فلاں عورت نے زنا کیا لیکن بعد

میں معلوم ہوا کہ وہ عورت کنواری ہے تو اس پر حد نہیں لگائی جائے گی۔ اس طرح اگر چار گواہ یہ گواہی دیں کہ فلاں شخص نے زنا کیا ہے لیکن بعد میں یہ معلوم ہوا کہ اس کا آلہ تناسل کٹا ہوا ہے تو اس پر حد نہیں لگائی جائے گی، (المغنی، ج:9،ص:71، دارالفکر، بیروت،1405ھ)۔

فقہاءِ شافعیہ کی تصریحات حسب ذیل ہیں:

علامہ ابوالحسن علی بن محمد الماوردی الشافعی المتوفّٰی:450ھ لکھتے ہیں:

المزنی نے کہا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: اگر چار آدمیوں نے کسی عورت کے خلاف زنا کی شہادت دی اور چار نیک عورتوں نے یہ بتایا کہ وہ کنواری ہے تو اس پر حد نہیں لگائی جائے گی، (الحاوی الکبیر، ج:7،ص:81، دارالفکر، بیروت 1414ھ)۔

علامہ یحیٰی بن شرف نواوی متوفّٰی:676ھ نے بھی اس طرح لکھا ہے۔

(روضۃ الطالبین، جلد:7،ص:315، دارالکتب العلمیہ، بیروت)

فقہاءِ احناف نے اپنی متعدد کتب میں یہ لکھا ہے کہ کسی عورت کے خلاف چار مردوں نے گواہی دی کہ اس نے زنا کیا ہے پھر بعد میں ثابت ہوگیا کہ وہ کنواری ہے تو اس پر حد نہیں لگائی جائے گی۔ اسی طرح اگر کسی مرد کے خلاف چار مردوں نے گواہی دی کہ اس نے زنا کیا ہے پھر بعد میں ثابت ہوا کہ اس کا آلہ تناسب کٹا ہوا ہے تو اس پر حد نہیں لگائی جائے گی، یہ تصریحات فقہاءِ احناف کی درج ذیل کتب میں مذکور ہیں۔

(المبسوط، جلد: 10،ص: 57، ہدایہ اوّلین، ص: 522، الفتاویٰ الولواجیہ، ج: 2 صفحہ: 239، المحیط البرہانی، ج: 5ص: 146، فتح القدیر، جلد: 5،ص: 273، البحرالرائق، جلد: 5،ص: 22، تبیین الحقائق، جلد: 3ص: 598، فتاویٰ شامی، جلد:4،ص:42، مجمع الانھر، جلد:2،ص:355، اعلاء السنن، جلد:11،ص:654، النھر الفائق، جلد: 3، ص: 145، البنایہ، جلد: 6،ص: 287، حاشیۃ الطحطاوی علی الدرالمختار، جلد:2،ص:400، عالمگیری، ج:2،ص:153)۔

فقہاءِ اسلام کی ان تصریحات سے واضح ہوگیا کہ جب کوئی شہادت قرائن عقلیہ اور

شواہد کے خلاف ہو تو اس کا شرعاً اعتبار نہیں ہوگا، اسی طرح اگر ماہرین فلکیات اور محکمۂ موسمیات والے بتائیں کہ آج چاند کی پیدائش ہی نہیں ہوئی ہے یا اس کی رویت ممکن ہی نہیں ہے اور چند آدمی یہ گواہی دیں کہ ہم نے چاند دیکھا ہے تو ان کی گواہی مردود ہوگی۔

اسی طرح اس مسئلے پر عقلی دلیل یہ ہے کہ:

اگر کسی مقتول کے پاس ایک شخص ہاتھ میں پستول لئے کھڑا ہو اور دو شخص یہ گواہی دیں کہ اس نے اپنے پستول سے فائر کر کے اس کو ہلاک کیا ہے اور بعد میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ یہ ہو کہ اس مقتول کے جسم سے جو گولی برآمد ہوئی ہے، وہ اس پستول کی نہیں ہے بلکہ کلاشنکوف کی گولی ہے اور اسلحے کا ماہر یہ رپورٹ دے کہ اس پستول سے گولی چلائی ہی نہیں گئی تو ان گواہوں کی گواہی جھوٹی قرار پائے گی اور اس شخص کو رہا کر دیا جائے گا۔

(تبیان القرآن، جلد: 10، ص: 524 تا 528)

چاند کی پیدائش (Birth Of Moon) کا مفہوم:

رویتِ ہلال کے مسئلے پر جب سائنسی اور فنی گفتگو ہوتی ہے تو چاند کی پیدائش ہوئی یا نہیں، یہ اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ چاند کبھی معدوم نہیں ہوتا، ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ چاند کا سفر اپنے مدار (Lunar Orbit) پر جاری و ساری رہتا ہے۔ چلتے چلتے ایک ایسا مقام آتا ہے جہاں سورج چاند اور زمین ایک لائن میں نظر آتے ہیں، اسے علمِ فلکیات (Astronomy) کی اصطلاح میں چاند کی پیدائش (Birth Of Moon) یا اقتران (Conjunction) کہتے ہیں۔ یہ موقع سال کے مختلف قمری مہینوں میں چاند کی 28 یا 29 تاریخ کو دن یا رات میں کسی وقت بھی آسکتا ہے۔ اسی لئے قمری مہینہ کبھی 29 دن کا ہوتا ہے اور کبھی 30 دن کا۔ فی نفسہٖ ایک اقتران سے دوسرے اقتران تک 29.5 دن لگ جاتے ہیں۔ جب مقام اقتران سے سورج آگے بڑھتا ہے تو نئے مہینے کے اعتبار سے اس کے اوقات کا حساب شروع ہو جاتا ہے۔ اب اگلے دن غروبِ آفتاب کے وقت اس کے قابلِ رویت (Visible) ہونے یا نہ ہونے (Invisible) کے بارے میں

ماہرینِ فلکیات کے معیارات موجود ہیں، جو نیٹ پر ہر شخص مطالعہ کر سکتا ہے۔

اسلام حُسنِ ظَنّ کا حکم دیتا ہے:

اسلام دوسرے مسلمان کے بارے میں حسنِ ظَنّ کا حکم دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ٘ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ

ترجمہ: ''اے مومنو! بہت سے گمانوں سے اجتناب کرو، کیونکہ بعض گمان یقیناً گناہ ہوتے ہیں (اس سے سُوءِ ظن یعنی بدگمانی مراد ہے)، (الحجرات:12)''۔

حدیث پاک میں ہے: اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِیْثِ،

ترجمہ: ''(مومنو!) بدگمانی سے بچتے رہو، کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:6064)''۔لہٰذا ثبوت وشواہد یا غالب قرائن کے بغیر کسی کے بارے میں بدگمانی کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

جہاں تک اس بدگمانی کا تعلق ہے کہ مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان نے کسی دباؤ کے تحت فیصلہ کیا ہے، اس سے بڑا جھوٹ اور بہتان اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ یہ بھی صریح جھوٹ ہے کہ مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان نے پہلے عدمِ رویت کا اعلان کیا اور پھر فیصلہ تبدیل کیا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان نے صرف ایک ہی حتمی اور قطعی اعلان کیا ہے اور سارا میڈیا اس کا گواہ ہے۔ الحمدللہ علیٰ احسانہٖ رویتِ ہلال کا مسئلہ ہو، دینی مدارس کی حریّت فکر وعمل کے تحفظ کا مسئلہ ہو یا حدودِ الٰہی کی حمایت وپاسبانی کا مسئلہ ہو، میں نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہمیشہ اپنے ضمیر، صوابدید اور دینی بصیرت کے مطابق کلمۂ حق کہا ہے اور جب تک جان میں جان ہے، کہتا رہوں گا۔ میرے نزدیک دین کے مسئلے میں دباؤ قبول کر کے کوئی اعلان کرنا یا کروڑوں لوگوں کے روزوں جیسی مقدس عبادت کی ذمہ داری اپنے سر لینے سے مرجانا بہتر ہے۔ ایسے مواقع کے لئے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''زمین کا باطن تمہارے لئے زمین کے ظاہر سے بہتر ہے''، یعنی ایسے حالات میں زندگی سے موت بہتر ہے۔ میں یہ بات بھی ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ میری چیرمَینی

(Chairmanship) کے پورے دور میں وفاق کی سطح پر کبھی کسی نے رویتِ ہلال کے مسئلے میں کوئی مداخلت نہیں کی، نہ کوئی ڈائریکشن دی ہے، نہ ہی کوئی خواہش ظاہر کی ہے، حتیٰ کہ کبھی کسی نے کوئی رابطہ بھی قائم نہیں کیا۔ اس سال بھی جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں (یعنی 04، اکتوبر 2008ء)، اب تک کسی سرکاری اہل کار نے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا۔

اہلِ فکرونظر اور اہلِ وطن کی خدمت میں چند گذارشات:

میں نہایت ادب واحترام اور دردِ دل کے ساتھ رویتِ ہلال کے مسئلے پر اہلِ علم، اہلِ فکر ونظر اور اہل وطن کی خدمت میں چند گذارشات پیش کرنا چاہتا ہوں، امید ہے کہ اس مسئلے سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ان پر توجہ فرمائیں گے۔

حکمتِ نظامِ شمس وقمر:

یہ کائنات اللہ تعالیٰ کے تکوینی نظام کے تحت چل رہی ہے، نظامِ شمس وقمر بھی اسی کا حصہ ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(1) اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝

ترجمہ: ''سورج اور چاند (قادرِ مطلق کے طے کردہ) ایک حساب کے مطابق چل رہے ہیں، (الرحمٰن:5)''۔

(2) وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ

ترجمہ: ''اور سورج (اللہ کی طرف سے) اپنی مقررہ منزل کی جانب (مسلسل) محوِ سفر ہے، یہ بہت علم والی ایک غالب ہستی کا مقرر کیا ہوا نظم ہے اور ہم نے چاند کے لئے منزلیں مقرر کر رکھی ہیں، (یٰسٓ:38،39)''۔

نظامِ شمس وقمر کی من جملہ حکمتوں میں سے کچھ یہ ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(1) یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۚ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ

ترجمہ: ''لوگ آپ سے ہلال (پہلی تاریخ کے چاند) کے بارے میں دریافت کرتے

ہیں آپ کہیے، یہ لوگوں کے (دینی اور دنیوی) کاموں اور حج کے اوقات کی نشانیاں ہیں، (البقرۃ:189)''۔

(2) هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ

ترجمہ: ''وہی ہے جس نے سورج کو روشنی دینے والا اور چاند کو روشن بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب جان لو، (یونس:5)''۔

اسلام کی عبادات میں سے نماز کے اوقات اور روزے کے سحر و افطار کا تعلق نظامِ شمسی سے ہے اور ماہِ رمضان کے آغاز و اختتام اور حج کا تعلق نظامِ قمری سے ہے۔

رمضان مبارک کے آغاز کا مدار ''رویتِ ہلال'' پر ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

لَا تَصُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوُا الْهِلَالَ وَلَا تُفْطِرُوْا حَتّٰى تَرَوْهُ فَاِنْ اُغْمِيَ عَلَيْكُمْ فَاقْدِرُوْا لَهٗ

ترجمہ: ''نئے چاند کو دیکھے بغیر رمضان کا آغاز نہ کرو اور نیا چاند دیکھے بغیر عید نہ مناؤ، اگر مطلع ابر آلود ہونے کی بنا پر (29 رمضان کو) چاند نظر نہ آئے، تو 30 کا مہینہ مکمل کرلو''۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث:1906، صحیح مسلم، رقم الحدیث:1080)

مستقل قمری کیلنڈر کا مسئلہ:

آج کل بعض جدت پسند اہلِ علم یہ کہتے ہیں کہ رویت، علم کے معنیٰ میں ہے اور چونکہ موجودہ دور میں سائنسی اور فنی ذرائع علم سے چاند کی رویت کا ظنِ غالب ہوجاتا ہے، تو اس پر اعتماد کرکے مستقل اسلامی کیلنڈر بنالیا جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ ''رویت'' کا حقیقی معنی آنکھ سے دیکھنا ہے اور اسے علم کے معنیٰ میں لینا مَجاز ہے۔ اور اصولِ فقہ کا مسلّمہ قاعدہ ہے کہ جب تک کسی لفظ کا حقیقی معنی لینا دشوار نہ ہو تو اسے مَجاز پر محمول نہیں کریں گے۔ ہمارے نظامِ رویت کا مدار بنیادی طور پر رویتِ بصری پر ہے۔ لیکن اگر سائنسی اور فنی ذرائع سے ہمیں کسی چیز کا علمِ قطعی یا ظنِ غالب ہوجائے تو شرعاً اس سے استفادہ کرنے میں حرج نہیں ہے بلکہ کرنا چاہیے اور ہم بہت سے دینی معاملات میں ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ ہم

دینی مسائل کو شرعی اصولوں ہی کے مطابق حل کرتے ہیں، لیکن ان اصولوں کا اطلاق کرنے میں قطعی سائنسی معلومات پر مدار رکھ سکتے ہیں، مثلاً ہمارے قدیم فقہاء کا خیال تھا کہ کان میں ایک راستہ یا نالی ہے جو معدے کی جانب جاتی ہے، لہٰذا انہوں نے یہ مسئلہ وضع کیا کہ کان میں دوا یا تیل ٹپکانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ مگر اب چونکہ علمِ تشریح الاعضاء (Anotomy) نے بہت ترقی کر لی ہے اور ہمیں قطعیت کے ساتھ معلوم ہو گیا ہے کہ کان میں کسی مائع (Liquid) چیز کے جانے کا کوئی منفذ (Route) نہیں ہے، لہٰذا اب عصرِ حاضر کے فقہاء نے اس مسئلے کو تبدیل کیا اور قرار دیا کہ کان میں دوا یا تیل ٹپکانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، اگرچہ بعض قدامت پسند علماء ابھی تک سابق تحقیق پر قائم ہیں اور یہ ہوتا رہتا ہے، جیسے لاؤڈ اسپیکر پر نماز پڑھانے کے جواز کے مسئلے کو علماء کے درمیان قبولِ عام ملنے میں کافی وقت صرف ہوا اور اب غالب ترین اکثریت اسے تسلیم کر چکی ہے۔ اسی طرح قرائنِ عقلیہ، جو قطعی ہوں یا ظنِ غالب کے درجے میں ہوں، ان سے بھی قضا کے معاملات میں استفادہ کیا جاتا ہے اور فقہ میں اس کے شواہد (Evidences) بکثرت موجود ہیں۔ ہمارے ہاں چند منحرفین کو موجودہ نظام کا پابند بنانے میں حکومت ناکام ہے تو محض سائنٹفک نظام کا پابند انہیں کون سی اتھارٹی بنائے گی؟۔

۔نئے چاند کا چھوٹا بڑا ہونا:

نئی قمری تاریخ کے تعین کا مدار شرعاً اور سائنسی طور پر ہلال کے چھوٹا بڑا ہونے یا غروب آفتاب کے بعد مطلع پر اس کے موجود ہونے کی مقدار وقت سے نہیں ہوتا، جیسا کہ ہمارے ہاں بعض اوقات اہلِ علم بھی کہہ دیتے ہیں کہ چاند کافی بڑا ہے اور کافی دیر تک مطلع پر موجود رہا، لگتا ہے کہ ایک دن پہلے کا ہے۔ یہ سوچ اور طرزِ فکر غیر شرعی اور غیر سائنسی ہے۔

حدیث پاک میں ہے: عن ابی البختری قال خرجنا للعمرة، فلما نزلنا ببطن نخلة قال تراء ینا الھلال، فقال بعض القوم ھو ابن ثلاث، وقال بعض القوم ھو ابن لیلتین، قال فلقینا ابن عباس فقلنا انا رأینا الھلال، فقال بعض القوم ھو ابن

ثلاث۔ وقال بعض القوم هو ابن ليلتين۔ فقال اى ليلة رأيتموه؟ قال ليلة كذا وكذا۔ فقال انّ رسول الله ﷺ قال ان الله مدّه للرؤية، فهو لليلة رأيتموه،

ترجمہ: ''ابوالبختری بیان کرتے ہیں کہ ہم عمرے کے لئے گئے، جب ہم وادیٔ نخلہ میں پہنچے تو ہم نے چاند دیکھنا شروع کیا، بعض لوگوں نے کہا: ''یہ تیسری تاریخ کا چاند لگتا ہے'' اور بعض نے کہا: ''یہ دوسری تاریخ کا چاند لگتا ہے''۔ راوی بیان کرتے ہیں: پھر ہماری ملاقات حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ہوئی، تو ہم نے (قیاس کی بنیاد پر اختلاف کی) یہ صورتِ حال ان سے بیان کی، تو انہوں نے فرمایا: ''تم نے چاند کس رات کو دیکھا تھا''؟، ہم نے کہا: ''فلاں رات کو''، انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے دیکھنے کے لئے اسے بڑھا دیا، درحقیقت یہ اسی رات کا چاند ہے، جس رات کو تم نے اسے دیکھا ہے''، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:2418)''۔

یہ حدیث اس مسئلے میں شریعت کی اصل ہے کہ نئے چاند کا مدار رویت پر ہے، اس امر پر نہیں ہے کہ اس کا سائز چھوٹا ہے یا بڑا یا مطلع پر اس کے نظر آنے کا دورانیہ کم ہے یا زیادہ۔ اس لئے کسی عالم یا تعلیم یافتہ شخص کا نیا چاند دیکھ کر یہ کہنا کہ یہ دو یا تین تاریخ کا لگتا ہے، یہ غیر شرعی اور غیر عالمانہ ہے۔ اسی طرح سائنسی حقیقت بھی یہی ہے، مثلاً کسی قمری مہینے کی 29 تاریخ گزرنے کے بعد شام کو نئے چاند کا غروبِ آفتاب کے فوراً بعد مطلع پر ظہور تو ہے مگر اس کا درجہ چار یا پانچ ہے، اس کی عمر 18 گھنٹے ہے اور مطلع پر اس کا ظہور پندرہ بیس منٹ ہے، تو اس صورت میں چاند مطلع پر تو موجود ہے لیکن اس کی رویت کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے، لہٰذا یہ قمری مہینہ 30 دن کا قرار پائے گا۔ اب اگلی شام کو اس چاند کی عمر 42 گھنٹے ہو جائے گی، مطلع پر اس کا درجہ 12 یا اس سے اوپر ہو جائے گا اور مطلع پر اس کا استقرار بھی نسبتاً زیادہ وقت کے لئے ہوگا، مثلاً پچاس منٹ اور اس کا حجم (Size) بھی بڑا ہوگا، لیکن یہ قطعیت کے ساتھ چاند کی پہلی تاریخ ہوگی۔ لہٰذا میری اہلِ علم اور اہلِ وطن سے اپیل ہے کہ توہمات کے حصار سے نکلیں اور حقیقت پسند بنیں۔

کیا کئی قمری مہینے مسلسل 29 دن یا 30 دن کے ہو سکتے ہیں؟

قرآن وسنت میں ایسی کوئی تصریح نہیں ہے کہ زیادہ سے زیادہ کتنے قمری مہینے مسلسل 30 دن کے ہو سکتے ہیں اور کتنے مسلسل 29 دن کے ہو سکتے ہیں۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز نے علامہ قطب الدین شیرازی مصنف تحفۂ شاہیہ وزیج الغ بیگی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''زیادہ سے زیادہ مسلسل چار قمری مہینے 30 دن کے ہو سکتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ مسلسل تین قمری مہینے ممکنہ طور پر 29 دن کے ہو سکتے ہیں''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد: 26، ص: 423، رضا فاؤنڈیشن)

امام احمد قسطلانی نے ارشاد الساری شرح صحیح بخاری میں لکھا ہے: ''2 یا 3 قمری مہینے مسلسل 29 کے ہو سکتے ہیں، 4 ماہ سے زائد ناقص نہیں ہو سکتے، (جلد: 3، ص: 357)''۔

ایک ماہرِ فلکیات نے لکھا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مسلسل 5 قمری مہینے 29 دن کے ہو سکتے ہیں، لیکن یہ سب امکانات کی بات ہے، ان پر کسی شرعی فیصلے کا مدار نہیں ہے۔

شہادت کے ردّ وقبول کا اختیار قاضی کے پاس ہے:

شہادت کے ردّ وقبول کا اختیار قاضی کے پاس ہے، شریعت کا اصول بھی یہی ہے اور جدید دور کے قانونی ضوابط بھی یہی ہیں۔ شہادت علی الاطلاق حجت نہیں ہے، ورنہ شاہد خود قاضی بن جائے گا۔ گواہ کا کام قاضی کے سامنے گواہی دینا ہے، فیصلہ کرنا قاضی کا کام ہے۔ میں اس مسئلے کو ایک مثال سے واضح کروں گا، ایک مقدمۂ قتل میں مقتول کی لاش پڑی ہوئی ملی، جسے گولی مار کر قتل کر دیا گیا تھا، دو گواہوں نے عدالت میں حلفیہ گواہی دی کہ ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ فلاں شخص نے اپنے پستول سے گولی مار کر اسے ہلاک کیا ہے۔ مگر وہ شخص کہتا ہے کہ میں نے یہ جرم نہیں کیا، جب لاش کا پوسٹ مارٹم کیا گیا تو اس کے جسم سے ''تھری ناٹ تھری'' کی گولی نکلی اور اسلحے کے ماہر نے کہا کہ اس پستول سے کوئی گولی نہیں چلائی گئی، تو کیا محض دو عینی شاہدوں کی بنیاد پر عدالت قصاص میں اس شخص کی سزائے موت کا حکم صادر

کردے گی، ہرگز نہیں۔ اگر شہادت علی الاطلاق حجت ہو اور جرح کے ذریعے اس کی صداقت کو جانچنے کا کوئی اعتبار نہ ہو تو پھر موجودہ نظام میں وکالت کے ادارے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی، جس کا کام ہی جرح کر کے گواہ کے صدق یا کذب کو جانچنا ہوتا ہے۔ آئے دن ہماری اعلیٰ عدالتیں (بشمول پشاور ہائی کورٹ) قتل اور دیگر مقدمات میں حلفیہ شہادتوں کو رد کرتی ہیں اور ان کے خلاف فیصلے دیتی ہیں، لیکن کبھی یہ سننے میں نہیں آیا کہ مسجد قاسم علی خان پشاور میں مولانا شہاب الدین پوپلزئی نے متوازی عدالت لگا کر ان شہادتوں کی بنیاد پر فیصلہ صادر فرما دیا ہو اور عدالت کے فیصلے کو اپنی یا گواہان کی توہین قرار دیا ہو۔

قضا ریاست کی طرف مفوض ہوتی ہے:

رویتِ ہلال کا فیصلہ ایک قضا ہے اور اس کے لئے ایک ادارہ، مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان، قائم کیا گیا ہے۔ قاضی کے تقرر کا اختیار اسلامی شریعت اور جدید نظامِ آئین وقانون میں بھی خلیفہ یا سربراہِ مملکت کو ہے، کسی شخص کو یہ اختیار نہیں کہ خود قاضی بن بیٹھے اور متوازی عدالت لگائے۔ پاکستان میں بھی (بشمول خیبر پختونخواہ) کسی مسئلے میں پاکستان کی ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کے مقابلے میں متوازی عدالتیں نہیں لگائی جاتیں، یہاں تک کہ جب متحدہ مجلسِ عمل کی حکومت کے حسبہ بل کو سپریم کورٹ نے خلافِ آئین قرار دیا تو اس فیصلے کا بھی ان کی طرف سے ناپسندیدگی کے باوجود احترام کیا گیا۔ اسی طرح چیف جسٹس کیس میں حکومت نے اپنی خواہش کے برعکس سپریم کورٹ فل بنچ کے فیصلے کو تسلیم کیا۔ لیکن صرف رویت ہلال کے مسئلے پر خیبر پختونخواہ میں چند علماء متوازی عدالتیں لگا کر شہادتیں قبول کرتے ہیں اور فیصلے صادر کرتے ہیں۔

یہ شرعی لوگوں کا غیر شرعی اقدام ہے اور یہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آرہا ہے، ہر دور میں ان حضرات کا طرزِ عمل یہی رہا اور ہر دور میں مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان کے فیصلے سے ان چند حضرات نے اختلاف کیا اور اس سے مذہبی انتشار کو فروغ ملا اور مذہبی عناصر طعن وتشنیع کا نشانہ بنے۔ میرے نزدیک اس سلسلے میں متحدہ مجلسِ عمل کے سربراہ قاضی حسین احمد اور

جنرل سیکریٹری مولانا فضل الرحمٰن کہ وہ اس سلسلے کو کنٹرول کریں، کیونکہ متحدہ مجلس عمل کے قیام کا مقصد دینی قوتوں میں اتحادِ عمل اور اشتراکِ عمل کا فروغ تھا نہ کہ انتشار وافتراق۔

قضاءِ قاضی میں خطا واقع ہو، تب بھی وہ شرعاً وقانوناً مؤثر ہے:

اگر کوئی قاضی فیصلے میں دانستہ خیانت کرتا ہے تو وہ آخرت میں عنداللہ مسئول ہوگا، مگر فیصلہ بہر حال نافذ ہوگا۔ اور اگر اس سے فیصلے میں اجتہادی طور پر خطا واقع ہو جاتی ہے تو وہ آخرت میں بری ہے اور اسے ایک اجر بہر حال ملے گا اور اس کا فیصلہ ہر صورت میں مؤثر اور نافذ ہوگا۔ بشرطیکہ اس کا فیصلہ قرآن یا سنتِ مشہورہ کے خلاف نہ ہو۔

حدیث پاک میں ہے: (۱) عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ اِلَيَّ، وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ اَنْ يَّكُوْنَ اَلْحَنَ بِحُجَّتِهٖ مِنْ بَعْضٍ فَاَقْضِيْ لَهٗ عَلٰى نَحْوِ مِمَّا اَسْمَعُ مِنْهُ فَمَنْ قَطَعْتُ لَهٗ مِنْ حَقِّ اَخِيْهِ شَيْئًا فَلَا يَاْخُذْهُ فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَهٗ بِهٖ قِطْعَةً مِّنَ النَّارِ،

ترجمہ: ''حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میرے پاس مقدمات لے کر آتے ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے موقف کو مخالف فریق کے بہ نسبت (اپنے زورِ بیان کی وجہ سے) زیادہ مؤثر انداز میں پیش کرے اور میں اس سے سنے ہوئے واقعات کی روشنی میں اس کے حق میں فیصلہ دے دوں، تو میں جس شخص کو اس کے بھائی کے حق میں سے کچھ دے دوں تو وہ (اللہ کا خوف کرتے ہوئے) اسے نہ لے، بلکہ (وہ یہ سمجھے کہ) میں اسے آگ کا ٹکڑا دے رہا ہوں''۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4364)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ظاہراً قاضی کا فیصلہ نافذ ہو جاتا ہے۔ اور وہ بعض اوقات خلافِ حقیقت بھی ہو سکتا ہے، رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے باطنی امور کا علم بھی عطا فرمایا تھا، لیکن ہر قاضی کے لئے ایسا ممکن نہیں ہے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے تعلیم امت کے لئے فرمایا اگر حقوق العباد کے معاملے میں قاضی کوئی فیصلہ کر دے اور مدعی یا مدعیٰ علیہ یہ جانتا

ہے کہ اس فیصلے کے نتیجے میں اسے عدالت نے جو حق دیا ہے، وہ عند اللہ اس کا حقدار نہیں ہے اور حقیقت اس کے برعکس ہے تو اسے آخرت کی جوابدہی کو پیش نظر رکھتے ہوئے دنیا کی اس عارضی منفعت سے دستبردار ہو جانا چاہئے، ورنہ یہ اس کے لئے آگ کا ٹکڑا ہوگا یعنی ناحق دوسرے کا مال لینا آخرت کے عذاب کا باعث بن سکتا ہے۔

قاضی خطا سے معصوم نہیں ہوتا، وہ اس بات کا مکلف ہے کہ اپنی پوری علمی دیانت اور دستیاب حقائق وشواہد اور قرائن کی روشنی میں فیصلہ کرے، اس پر وہ عند اللہ ماجور ہوگا۔

(۲) عَنْ بُرَيْدَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اَلْقُضَاةُ ثَلَاثَةٌ، وَاحِدٌ فِي الْجَنَّةِ وَاثْنَانِ فِي النَّارِ، فَاَمَّا الَّذِيْ فِي الْجَنَّةِ فَرَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَقَضَا بِهٖ، وَرَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَجَارَ فِي الْحُكْمِ فَهُوَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ قَضَى النَّاسَ عَلٰى جَهْلٍ فَهُوَ فِي النَّارِ۔

ترجمہ: ’’حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: قاضیوں کی تین قسمیں ہیں، (ان میں سے) ایک جنت میں ہوگا اور دو جہنم میں ہوں گے۔ جنت میں وہ شخص ہوگا، جس نے حق کو صحیح طور پر جانا اور اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔ اور جس شخص نے حق کو صحیح طور پر پہچانا مگر (جان بوجھ کر) ظلم پر مبنی فیصلہ کیا تو وہ جہنم میں ہوگا۔ اور جو شخص (قضا کا اہل نہیں ہے مگر وہ منصبِ قضا کو قبول کر کے) جہالت پر مبنی فیصلے دیتا ہے تو وہ جہنم میں ہوگا۔ (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 3573)‘‘۔

(۳) عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ فَاِنِ اجْتَهَدْتَ فَاَصَبْتَ الْقَضَاءَ فَلَكَ عَشَرَةُ اُجُوْرٍ وَاِنِ اجْتَهَدْتَ فَاَخْطَاْتَ فَلَكَ اَجْرٌ وَاحِدٌ،

ترجمہ: ’’عقبہ بن عامر بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اگر تو نے (منصبِ قضا پر فائز ہو کر فیصلہ کرنے کے لئے) اجتہاد کیا اور صحیح فیصلہ کیا تو تیرے لئے دس اجر ہیں اور اگر (تو نے اپنی دیانت کے مطابق حق کو معلوم کرنے کی) پوری کوشش کی، لیکن حق کو سمجھنے میں تجھ سے خطا ہو گئی تو (تب بھی) تیرے لئے ایک اجر ہے‘‘۔ (مسند احمد، جلد، 4، ص: 205)

ہمارے میڈیا کا طرزِ عمل:

ہمارے الیکٹرونک و پرنٹ میڈیا کے طرزِ عمل میں بھی تضاد ہے۔ میڈیا کے معزز ذمہ داران اپنی رپورٹس اور تجزیاتی کالموں میں انتشار پر اظہارِ افسوس بھی کرتے ہیں، لیکن انتشار کی خبروں کو فروغ بھی دیتے ہیں اور کھل کر ان کی مذمت بھی نہیں کرتے۔ پاکستان واحد ملک ہے جہاں رویتِ ہلال کے مسئلے پر کارٹون بھی بنتے ہیں اور کالم بھی لکھے جاتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں اظہارِ رائے کی آزادی ہے، ورنہ دیگر مسلم ممالک میں یہ روش نہیں ہے۔ بہت سے فاضل کالم نگاروں کے کالم پڑھنے کو ملتے ہیں، جن میں وہ آغاز تو اس سے کریں گے کہ سائنس کا دور ہے، دنیا چاند پر پہنچ گئی ہے اور ہم ابھی رویتِ ہلال کے مسئلے پر جھگڑ رہے ہیں، لیکن پھر رویتِ ہلال کے فیصلے کو سائنسی بنیاد پر دیکھنے کے بجائے روزانہ کالم نگاری کی ضرورت کے تحت نشانۂ تضحیک بناتے ہیں۔ چنانچہ کالم کا اختتام آغاز کے برعکس ہو جاتا ہے۔ چونکہ وہ اپنی ریاست کے بادشاہ ہوتے ہیں، اس لئے ہم ان کی خدمت میں یہی گذارش کر سکتے ہیں کہ ع ہر چہ از دوست مے رسد نکوست

نوٹ: ہمارے ہاں بعض اوقات یہ مطالبہ سامنے آتا ہے کہ پاکستان میں رمضان مبارک اور عید الفطر کا فیصلہ سعودی عرب کے فیصلے کے تابع کر دیا جائے۔ یہ مطالبہ کرنے والے خیبر پختونخواہ کے وہ حکمران ہیں جو پشاور، مردان اور چارسدہ کی بعض پرائیویٹ رویتِ ہلال کمیٹیوں کو کنٹرول کرنے اور رویتِ ہلال کے حوالے سے مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان کا فیصلہ تسلیم کرانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ صوبۂ سندھ کی رویتِ ہلال کمیٹی کے ایک معزز رکن مفتی سید صابر حسین صاحب نے ایک مقالہ لکھا ہے، جس کا عنوان ہے:

"سعودی عرب کے ساتھ رمضان و عیدین کیوں نہیں؟"

میں ان کی اجازت سے اس مقالے کو اس مقام پر شاملِ اشاعت کر رہا ہوں تاکہ ہمارے نوجوان علماء اور عام قارئین کو اس مسئلے کے بارے میں صحیح معلومات دستیاب ہوں۔

سعودی عرب کے ساتھ رمضان وعیدین کیوں نہیں؟

گذشتہ کئی سالوں سے مملکت خداداد پاکستان میں دو عیدوں کا مسئلہ انتہائی سنگین صورتِ حال اختیار کرتا جارہا ہے، جو آگے چل کر کسی بڑے فساد وشر کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ اِسے دینی ومذہبی مسئلے سے ہٹا کر قومیت وعصبیت کا رنگ دینے کی گھناؤنی کوشش کی جارہی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر سابقہ ریکارڈ کو دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ عیدین اور رمضان المبارک کے چاند کے بارے میں اختلاف اکثریت کی رائے کے برخلاف پاکستان کے چند مخصوص علاقوں اور افراد کی جانب سے پیدا کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے بالعموم پورے پاکستان اور بالخصوص اُن علاقے کے لوگوں کو دینی تہوار کے پرمسرت موقع پر انتہائی ذہنی کرب سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔اس کے علاوہ سب سے اہم اور قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ اس کی وجہ سے پوری دنیا میں نہ صرف مسلمانوں کو تضحیک وتمسخر کا نشانہ بنایا جاتا ہے بلکہ غیر مسلموں، نام نہاد مغرب زدہ اور مادیّت پرست لوگوں کو اِسلام پر کھل کر اعتراض کرنے کا بہترین موقع مل جاتا ہے۔

مملکتِ پاکستان جو پہلے ہی مختلف قسم کے داخلی وخارجی مسائل سے دوچار ہے، جن میں روز افزوں اضافہ ہی ہوتا چلا جارہا ہے۔عوام الناس دہشت گردی، مہنگائی، غربت وافلاس، بے روزگاری، قتل وغارت گری، بدعنوانی اور دنیا میں پاکستان کی گرتی ہوئی ساکھ جیسے گھمبیر مسائل سے دوچار ہیں اور اس بات کے خواہاں ہیں کہ اے کاش کہ اُن کے موجودہ مسائل کو حل کرنے والا کوئی مسیحا اُنہیں مل جائے۔لہٰذا اگر ان حالات میں رؤیت ہلال کے مسئلے کو بھی قومیت وعصبیت کا جامہ پہنا کر لوگوں کے مسائل میں مزید اضافہ کیا جائے اور اس کی بنیاد پر انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو پھر اس کے قبیح ودوررس نتائج کو سنبھالنا انتہائی مشکل ہوجائیگا۔اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دل کی اَتھاہ گہرائیوں سے دعا ہے کہ ہمارے ملک پر ایسا برا وقت کبھی نہ آئے اور اللہ رب العزّت پاکستان کو موجودہ گرداب سے نکال دے، (آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)۔

ہ اصل موضوع پر آنے سے پہلے قارئین کرام پر یہ واضح کرتا چلوں کہ حکومتِ پاکستان کی قائم کردہ صوبائی اور مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹیوں میں ملک کے تمام مسالک یعنی اہلسنت، دیوبندی، اہلِ حدیث اور اہلِ تشیع کے سرکردہ علماء حضرات کو شامل کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ کمیٹی کے ساتھ فنی ماہرین، جن میں محکمہ موسمیات، پاکستان نیوی اور سپارکو کے نمائندے فنی معاونت کے لئے موجود ہوتے ہیں، اور ان سب کی متفقہ رائے کی روشنی میں تمام ممبران کی موجودگی میں چیئرمین مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی چاند کی رؤیت یا عدمِ رؤیت کا اعلان کرتے ہیں۔ اس موقع پر ممبرانِ کمیٹی کے علاوہ میڈیا کے نمائندے بھی ایک بڑی تعداد میں موجود ہوتے ہیں، جو کمیٹی کی تقریباً کارروائی کی عکس بندی کر رہے ہوتے ہیں۔ راقم الحروف بھی گذشتہ سال سے صوبائی رؤیتِ ہلال کمیٹی، (صوبہ سندھ) میں رکن کی حیثیت سے اپنی خدمات سرانجام دے رہا ہے، لہٰذا اِن تمام معاملات کا چشم دید گواہ بھی ہے۔ علاوہ ازیں کراچی میں موجود مسلکِ دیوبند کی معروف دینی درسگاہ جامعۃ الرشید میں قائم شعبۂ فلکیات کے سربراہ مولانا سلطان ہمیشہ چیئرمین مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی پاکستان کے ساتھ رابطے میں رہتے ہیں، معلومات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ ان کے تقریباً پچاس مراکز قائم ہیں اور ان کی ماہانہ رپورٹس ان کے روزنامہ ''اسلام'' اور ہفت روزہ رسالے میں باقاعدگی سے شائع ہوتی ہیں۔ راقم الحروف نے کئی مرتبہ بچشمِ خود چیئرمین مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کو چاند کے حتمی اعلان سے قبل مزید تشفی کے لئے جامعۃ الرشید کے شعبۂ فلکیات کے ماہرین سے رابطہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ عمل محترم چیئرمین صاحب کی معاملہ فہمی، اعلیٰ ظرفی اور وسعتِ قلبی کا بیّن ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ جامعۃ الرشید کا شعبۂ فلکیات اپنی ویب سائیٹ پر ہر ماہ کے چاند کی رؤیت کے بارے میں اعداد و شمار کے ساتھ تفصیلی معلومات فراہم کرتا ہے۔ گذشتہ سالوں کے ریکارڈ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چاند کی رؤیت اور عدمِ رؤیت کے بارے میں مرکزی رؤیتِ ہلال کے سابقہ تمام اعلانات جامعۃ الرشید کی اِعلان کردہ تاریخ سے موافقت رکھتے ہیں۔ جبکہ مسجدِ قاسم علی خان کے علماء کا اعلانِ رؤیت

جامعۃ الرشید کی اعلان کردہ تاریخ سے عموماً ایک دن پہلے ہوتا ہے۔مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ بات مبنی بر حقیقت ہے کہ چاند کی رؤیت یا عدمِ رؤیت کا اِعلان شخصی رائے پر نہیں کیا جاتا، جیسا کہ بعض کم فہم اور عاقبت نا اندیش لوگ کہتے ہیں بلکہ شہادتوں کو ہر اعتبار سے پرکھنے اور تمام ارکان، علماءِ کرام اور فنی ماہرین سے مشاورت کے بعد متفقہ طور پر کیا جاتا ہے۔

آج کل مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کے ارکان درجِ ذیل ہیں:

(۱) پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن، چیئرمین (اہلِ سنت و جماعت)، مفتی محمد رفیق حسنی (اہلِ سنت و جماعت)، علامہ شبیر احمد اظہری (اہل سنت و جماعت)، مولانا شبیر احمد کاکاخیل (مسلکِ دیوبند و ماہرِ فلکیات)، مولانا عبدالخبیر آزاد (مسلکِ دیوبند)، مولانا عبیداللہ پنہور (مسلکِ دیوبند)، مولانا محمد عبدالقوی (مسلکِ دیوبند)، مولانا قاری روح اللہ مدنی (مسلکِ دیوبند)، میاں نعیم الرحمٰن (اہلحدیث مکتبۂ فکر) اور علامہ قاضی نیاز حسین نقوی (شیعہ اثناعشری)۔ مولانا انوار الحق حقانی، مولانا اخوند زادہ عبدالمبین شاہ بخاری، ایم ایم قریشی (ماہر فلکیات)، مولانا قاری عبدالرشید الازہری۔

جبکہ زونل رؤیتِ ہلال کمیٹی سندھ میں درجِ ذیل افراد شامل ہیں:

(۱) علامہ قاری رضاء المصطفیٰ، خطیب نیومیمن مسجد بولٹن مارکیٹ کراچی (اہلِ سنت و جماعت)
(۲) مولانا بشیر احمد نقشبندی (مسلکِ دیوبند)، (۳) مولانا اسد دیوبندی (مسلکِ دیوبند)
(۴) مولانا شاہ فیروز الدین رحمانی (اہلسنت و جماعت) (۵) مولانا حافظ محمد سلفی، جامعہ ستاریہ (اہلِ حدیث مکتبۂ فکر) (۶) راقم الحروف مفتی سید صابر حسین (اہلِ سنت و جماعت)، (۷) مولانا محمد صابر نورانی (اہلِ سنت و جماعت) (۸) علامہ سید علی کرّار نقوی (شیعہ اثناعشری) (۹) محترم محمد ریاض، چیف میٹرلوجسٹ (نمائندہ محکمہ موسمیات پاکستان) (۱۰) محترم غلام مرتضیٰ، جنرل منیجر (نمائندہ پاکستان سپارکو Pakistan Space & Upper Atmosphere research Commission) (۱۱) جناب محمد توفیق، لیفٹیننٹ کمانڈر (نمائندہ پاکستان نیوی، ہائیڈرو گرافک ڈیپارٹمنٹ

(Hydrographic Department)

ذیل میں زونل رؤیت ہلال کمیٹی (صوبہ سندھ) اور مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کے تمام ارکان کی دستخط شدہ پریس ریلیز کا عکس منسلک کیا جارہا ہے:

ہمارے ہاں رمضان وعیدین کے چاند کے مسئلے کے حل کے لئے مختلف مکتبہ ہائے فکر کی جانب سے کئی حل پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ پاکستان میں رمضان، عیدین اور دوسرے مہینوں کو سعودی عرب کے ساتھ منسلک کردیا جائے یعنی سعودی عرب کے اِعلان کے مطابق پاکستان میں بھی رمضان اور عیدین کی جائیں تاکہ پوری دنیا میں رمضان وعیدین کے حوالے سے مسلم اُمّہ کے درمیان یکسانیت ووحدت پیدا ہوجائے، جو ہر ایک دردِ دل رکھنے والے مسلمان کی دیرینہ خواہش ہے۔

ایسا ممکن ہے یا نہیں؟ اِس کا حتمی اور یقینی فیصلہ اکابر علماءِ کرام اور فلکیات کے ماہرین کریں گے۔ لیکن جہاں تک راقم الحروف کی رائے کا تعلق ہے، تو میری رائے میں ایسا ہونا چند وجوہ کی بنا پر عملاً ممکن نہیں کیونکہ سعودی عرب میں رؤیتِ ہلال کا موجودہ طریقۂ کار شرعی اور تکنیکی اِعتبار سے درست اور قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سعودی عرب کا بسا اوقات پاکستان کی قمری تاریخ سے ایک دن اور بعض اوقات دو دنوں کا فرق ہوجاتا ہے، جس پر ہر ذی شعور مسلمان سوچنے پر مجبور ہے کہ سائنسی عروج وترقی کے اِس زمانہ میں ایک دن کا فرق تو کسی حد تک قابلِ فہم ہے لیکن دو دنوں کے فرق کو سمجھنا انتہائی مشکل اور مضحکہ خیز ہے۔ دو دِنوں کا فرق یہ ظاہر کرتا ہے کہ واقعۃً اُن کے طریقۂ کار میں خامی ہے، اور اس میں اِصلاح کی گنجائش موجود ہے کیونکہ فلکیاتی اِعداد وشمار اور جغرافیائی اِعتبار سے بھی یہ ناممکن ہے کہ سعودی عرب میں چاند نظر آجائے اور اُس کے اگلے روز پاکستان میں چاند نظر نہ آئے۔ جغرافیہ اور فلکیات کے ماہرین کی رائے کے مطابق دنیا کے وہ خطے، جو مغرب کی جانب واقع ہیں، وہاں مشرقی علاقوں کی بہ نسبت سورج دیر سے غروب ہوتا ہے اور غروبِ شمس میں تاخیر کی وجہ سے چاند کی عمر میں اضافہ ہوجاتا ہے اور یہ بھی

سائنسی حقیقت ہے کہ چاند کی عمر میں جتنا اضافہ ہوگا، اُس کا نظر آنا اتنا ہی یقینی ہوجاتا ہے۔
اب اگر محلِ وقوع کے اعتبار سے پاکستان اور سعودی عرب کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ پاکستان سعودی عرب کے مقابلے میں مشرق کی جانب واقع ہے، جس کی وجہ سے یہاں سعودیہ سے تقریباً دو گھنٹے پہلے سورج غروب ہوتا ہے لہٰذا پاکستان کا سعودیہ کی بہ نسبت مشرقی جانب ہونے کی وجہ سے یہ تو ممکن ہے کہ پاکستان میں چاند نظر نہ آئے اور سعودی عرب، جو مغرب کی جانب ہے، میں چاند نظر آجائے کیونکہ سعودی عرب میں غروبِ آفتاب کے وقت چاند کی عمر میں پاکستان کے مقابلے میں دو گھنٹے کا اضافہ ہوجاتا ہے اور اُس کا نظر آنا کسی حد تک ممکن ہوجاتا ہے (اگر دوسری شرائط پوری ہورہی ہوں، جن کا ذکر آگے آرہا ہے) لہٰذا اگر چاند سعودی عرب میں نظر آجائے تو اگلے دن اگر موسم ابر آلود نہ ہو تو چاند کی عمر میں مزید چوبیس گھنٹے کے اضافے کی وجہ سے پاکستان میں اس کا نظر آنا یقینی ہوتا ہے۔ لیکن اگلے دن پاکستان میں چاند نظر نہ آئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سعودی عرب کے نظامِ رؤیت میں کہیں نہ کہیں کوئی بڑی خرابی موجود ہے۔ انٹرنیٹ پر دستیاب مواد اور مختلف ذرائع سے یہ معلوم ہوا ہے کہ سعودی عرب کی عوام بھی اکثر و بیشتر اس طریقہ کار پر صدائے احتجاج بلند کرتی رہتی ہے لیکن چونکہ وہاں شاہی حکم نامے کے تحت یہ سب کچھ ہوتا ہے، لہٰذا یہ آواز دبادی جاتی ہے۔ اور تشویش میں مبتلا لوگوں کو ڈرا دھمکا کر خاموش رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ چاند کی رؤیت کے حوالے سے تحریر کردہ ایک تحقیقی مقالہ بعنوان ''سعودی رؤیت کے بارے میں ذاتی نوٹس Personal Notes on the Subject of Following Saudi Moon Sighting'' میں مقالہ نگار نے سعودی محکمہ قضا الاعلیٰ کے رئیس شیخ صالح الحید ان کے ایک دھمکی آمیز بیان، جو انہوں نے ''عکاظ'' نامی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا، کو درج کیا کہ ''میں تمام لوگوں کو اللہ کے تقویٰ اور سچائی کی وصیت کرتا ہوں، وہ ان معاملات میں دخل اندازی نہ کریں، جو ان کا میدان نہیں اور مجلس اس بات پر غور کررہی ہے کہ جو لوگ ہلال کے بارے میں اخبارات میں لکھتے ہیں، انہیں اس جرم پر ''سزا''

دی جائے۔ کیونکہ اس سے عدمِ واقفیت کی بنیاد پر عوام میں بہت انتشار ہوتا ہے''، (انٹرنیٹ ایڈیشن، صفحہ نمبر ۲۰: مقالہ نگار سے رابطے کیلئے: globalpeace@gmail.com)۔

گویا رئیس محکمہ قضاء اعلیٰ جہاں لوگوں کو خشیتِ الٰہی کا درس دے رہے ہیں، وہاں اس سے کوسوں دور جاتے ہوئے اہلِ علم کی ہر قسم کی تنقید کو قابلِ تعزیر قرار دیتے ہوئے مثبت تنقید کا دروازہ بھی بند کر رہے ہیں۔ گویا وہاں پر سرکاری سطح پر اعلانِ رؤیت کے خلاف بات کرنا یا علمی بحث کرنا جرم ہے۔ اور وہاں کی حکومت اس بات کی پابند نہیں ہے کہ رؤیت کی شرعی و فنی وجوہ کو ریکارڈ پر لائے۔ یہ سب کچھ تو صرف پاکستان میں ممکن ہے، لہٰذا اہلِ پاکستان کو اس نعمتِ آزادی پر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ ساتھ ہی اُن کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ خالص دینی و شرعی مسئلے کو لطیفوں، مزاحیہ کارٹونوں اور غیر سنجیدہ سیاسی بحث و تمحیص کا موضوع نہ بنائیں۔ البتہ اگر اس موضوع پر اخبارات اور ٹیلی ویژن چینلز سنجیدہ انداز میں علمی و فنی بحث کریں تو اس سے عوام میں آگہی (Awareness) اور شعور پیدا ہوگا۔

دنیا بھر کے مسلم اور غیر مسلم ماہرینِ فلکیات اور ریاضی دان اس بات پر انتہائی حیران و ششدر رہتے ہیں کہ سعودی عرب کے اربابِ اقتدار کس ذہنیت کے حامل ہیں کہ چاند کے مطلع پر ممکنہ طور پر نظر نہ آنے کے باوجود بھی اسے بڑی آسانی سے دیکھ لیتے ہیں اور غیر حقیقی رؤیت کا اعلان بھی کر دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں بعض عرب ممالک میں بھی اِس حوالے سے تشویش پائی جاتی ہے، جن میں مراکش پیش پیش ہے، جہاں زیادہ تر رمضان و عیدین پاکستان کے مطابق ہوتی ہیں۔ انٹرنیٹ پر دستیاب معلومات کے مطابق گذشتہ سال بھی مراکش میں عید الفطر ۲۱ ستمبر ۲۰۰۹ بروز پیر کو منائی گئی ہے حالانکہ مراکش پاکستان سے وقت کے اعتبار سے پانچ گھنٹے اور سعودی عرب سے تین گھنٹے پیچھے ہے لہٰذا اگر سعودی عرب میں چاند نظر آجائے تو مراکش میں بدرجہ اولیٰ نظر آنا چاہئے کہ اُس وقت تک چاند کی عمر میں سعودی عرب کے مقابلے میں تقریباً تین گھنٹے اضافہ ہو چکا ہوتا ہے، لیکن ایسا نہیں ہوتا، بلکہ سعودی عرب میں رؤیتِ ہلال کے اعلان کے باوجود مراکش والے چاند دیکھنے سے اکثر

محروم رہ جاتے ہیں حالانکہ وہاں چاند کو دیکھنے کے لئے پاکستان کی طرح ملکی سطح پر باقاعدہ ایک ادارہ قائم ہے جو علماءِ کرام اور ماہرینِ فلکیات وموسمیات پر مشتمل ہے۔ قارئین کی دلچسپی ومعلومات کے لئے دوبارہ یہ تحریر کرتا چلوں کہ ماہرینِ فلکیات کی آراء کے مطابق مغربی ممالک میں رؤیتِ ہلال مشرقی ممالک کی رؤیت سے پہلے ہوگی اور سعودی عرب جغرافیائی اعتبار سے دنیا کے مشرقی ممالک میں شامل ہے لہٰذا اگر سعودی عرب میں رؤیتِ ہلال ہوجائے تو یقینی طور پر (اگر مطلع ابر آلود نہ ہو) مغربی ممالک میں بھی ہونی چاہیے جبکہ مراکش میں (جس کا ذکر پہلے بھی آیا ہے) سعودی عرب کے کافی مغرب میں واقع ہونے کے باوجود (بلکہ مراکش کا تو ایک نام ہی "المغرب" ہے) اکثر اُس دن رؤیتِ ہلال نہیں ہوتی، جس دن سعودی عرب میں چاند کا اعلان کردیا جاتا ہے۔ اسی پر اکتفا نہیں بلکہ کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ امریکہ، کینیڈا اور ویسٹ انڈیز جہاں سعودی عرب کے آٹھ گھنٹے بعد سورج غروب ہوتا ہے، مطلع صاف ہونے کے باوجود اکثر چاند نظر نہیں آتا، انتہائی تعجب کی بات ہے اور اہلِ فکرونظر کے لئے قابلِ غور بھی۔ پس یہ امر شرعی وسائنسی دونوں اعتبار سے غیر معقول ہے کہ سعودی عرب کے اعلانِ رؤیت کو پاکستان میں نافذ کیا جائے۔

قارئینِ کرام کو آگاہ کرتا چلوں کہ پشاور، مردان اور چارسدہ پاکستان کے وہ علاقے ہیں، جہاں سے ہر سال چاند کے پہلے نظر آنے کا اعلان کردیا جاتا ہے اور اِن ہی علاقوں میں مرکزی اور رؤیتِ ہلال کمیٹی سے بالاتر ہوکر الگ کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ مذکورہ بالا شہر جغرافیائی اِعتبار سے پاکستان کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں انتہائی مشرق کی جانب واقع ہیں۔ لہٰذا اُوپر بیان کردہ مسلمہ اُصول کے مطابق اگر اِن علاقوں میں چاند نظر آجاتا ہے، تو پھر پاکستان کے وہ علاقے، جو مغرب کی جانب واقع ہیں اور جہاں سورج مشرقی علاقوں کی بہ نسبت دیر میں غروب ہوتا ہے، وہاں اگر مطلع ابر آلود نہ ہو تو پھر یقینی طور پر وہاں چاند نظر آنا چاہیے۔ مگر مشاہدہ اور سابقہ ریکارڈ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مطلع صاف ہونے کے باوجود مغربی علاقوں کے لوگ اکثر وبیشتر محروم رہ جاتے ہیں۔ اِس پر ہر صاحبِ عقل

شخص سوچنے پر مجبور ہے کہ یقینا دال میں کچھ کالا ہے۔اِس حوالے سے سندھ کے ساحلی علاقے کراچی اور بدین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، کیونکہ ان علاقوں میں عام طور پر پاکستان کے مشرقی علاقے پشاور، مردان اور چارسدّہ کی بہ نسبت سورج آدھا گھنٹہ تاخیر سے غروب ہوتا ہے، جس کی وجہ سے چاند کی عمر میں آدھا گھنٹہ اضافہ ہوجاتا ہے۔اور اُس کے نظر آنے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ سعودی حکومت رؤیت کے معاملے میں غیر معمولی حساسیت کا مظاہرہ کرتی ہے۔وہ نہ صرف اپنے ملک کے باشندوں کو بلکہ دنیا کے کسی دوسرے اسلامی ملک کے ماہرین کو ایک خالص دینی معاملے میں اپنا شریک بنانا گوارا نہیں کرتی اور نہ ہی اُن کی مہارت و تجربات سے فائدہ اُٹھانے کی روادار ہے۔کئی دفعہ ایسا ہوا کہ کچھ ماہرین نے سعودیہ کے نظامِ رؤیت کو دیکھنے اور اُس کی شرعی حیثیت معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن اُنہیں ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔چنانچہ محترم خالد اِعجاز مفتی لکھتے ہیں ''سن ۱۹۷۹ عیسوی کے رمضان المبارک کے آخری عشرے میں اِسلامی ملک ترکی کا پانچ افراد پر مشتمل ماہرین کا ایک وفد شوّال المکرم کے چاند کو دیکھنے کے لئے سعودی عرب آیا۔ اور اُس نے اُس وقت کے سعودی رئیس مجلسِ قضاء شیخ عبدالعزیز بن باز سے ملاقات کر کے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا اور ہدی یا شفا پہاڑ، جو کہ عرب کے بلند ترین پہاڑوں میں سے ہے پر چڑھ کر چاند کی رؤیت کی اجازت طلب کی تو انہوں نے یہ کہہ کر وفد کی خواہش کو رد کر دیا کہ اِس کی کوئی ضرورت نہیں۔بعد میں ۲۲ اگست ۱۹۷۹ کی شام سعودی حکومت نے یہ اِعلان کر دیا کہ ۲۳ اگست ۱۹۷۹ کو یکم شوّال المکرم ہے لہٰذا کل عید ہوگی۔وفد نے بعد میں اپنی جاری کردہ رپورٹ میں انکشاف کیا کہ اُس نے ۲۳ اگست کی شام شفاء پہاڑ پر چڑھ کر چاند کی رؤیت کی کوشش کی لیکن اُس دن بھی چاند نظر نہیں آیا حالانکہ اگر ۲۲ اگست کو چاند نکل چکا تھا تو ۲۳ اگست کو چاند دیر تک نظر آنا چاہئے تھا، (رؤیت ہلال۔مسئلہ اور حل، صفحہ نمبر ۱۱۰ تا ۱۱۲)۔''اِسی طرح ایک اور مقام پر مصنف رقمطراز ہیں:''سعودی عرب کی

شاہ سعود یونیورسٹی ریاض کے شعبہ طبیعات ونجوم کے عالم جناب این کردی نے اپنے ملک کے نظامِ رؤیتِ ہلال کے بارے میں انگریزی میں ایک مقالہ تحریر کیا جو'' دی آبزرویٹری The Observatory'' کے شمارہ اگست ۲۰۰۳ء کے صفحات ۲۱۹ اور ۲۲۲ پر شائع ہوا۔ یہ مقالہ ویب سائیٹ www.articles.adsabs.harward.edu پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اِس مقالے میں انہوں نے محکمۂ عدل کی جانب سے اعلان کردہ آغازِ رمضان کی تاریخوں کی ایک فہرست ترتیب دی ہے، جو مسلسل ۴۲ برسوں کا احاطہ کرتی ہے۔ انہوں نے درجِ ذیل پانچ مقامات کو اپنے مطالعہ کا محور بنایا، جہاں رؤیتِ ہلال کی شہادتوں کے زیادہ تر دعوے کیے گئے ہیں۔ یہ مقامات دوامی، سودیر، حریق، تبوک اور دمام ہیں۔'' آگے تحریر کرتے ہیں:'' اِن ۴۲ برسوں میں صرف دو تاریخیں ایسی ہیں، جن کی شام ماہرینِ فلکیات کے مطابق رؤیتِ ہلال ممکن تھی، پہلی ۲۶ جنوری ۱۹۶۳ء اور دوسری ۳۱ مئی ۱۹۸۴ء۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مؤخر الذکر مہینے کی درست رؤیت کو یوں غلط کر دیا گیا کہ اِس مہینے کے آخر میں ۲۸ رمضان المبارک (28 جون 1984ء) کی شام حیرت انگیز طور پر شوّال کا چاند دکھائی دیے جانے کا اعلان ہو گیا۔ جواز یہ قائم کیا گیا کہ غلطی کے باعث رمضان کے آغاز میں ایک روز کی تاخیر ہو گئی تھی، (رؤیت ہلال۔ مسئلہ اور حل۔ صفحہ نمبر ۱۳۰، ۱۳۱)''۔ دار العلوم کراچی کے مفتی تقی عثمانی صاحب اِس حوالے سے سعودی عرب کی رؤیت کے طریقۂ کار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:'' سعودی عرب میں کئی مرتبہ چاند کی ولادت سے پہلے ہی شہادت کو معتبر ماننے کا جو واقعہ پیش آیا ہے، وہ احقر کی نظر میں محلِ نظر ہے اور متعدد سعودی علماء سے احقر نے گفتگو کی ہے، وہ بھی اِس معاملے میں پریشان نظر آئے، لیکن چونکہ مسئلے کا تعلق مجلسِ قضاء الاعلیٰ (ریاض) سے ہے، اِس لئے وہ بے بس تھے، (رؤیت ہلال۔ مسئلہ اور حل، بیک ٹائٹل)''۔ اسی طرح دار العلوم دیوبند کے مفتی حبیب الرحمٰن برطانیہ میں سعودی عرب کے اعلانِ رؤیت کو بنیاد بنا کر عید وغیرہ کرنے کے حوالے سے پوچھے گئے ایک استفتاء کا جواب دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:'' سہولت

پسندی میں پڑ کر سعودی عرب کے مطابق اپنے یہاں رمضان اور عید کا اعلان کرنا درست نہیں۔ اگر کوئی فتویٰ بھی اس طرح کا حاصل کرلیا گیا ہے تو یہ شرعی اُصول کے خلاف ہے۔ پھر سعودی رؤیت کا جو حال آپ نے تحریر فرمایا ہے، نیز اس کے مفاسد کی طرف جو توجہ دلائی ہے، اس کو پڑھنے کے بعد بھی آنکھ بند کرکے سعودیہ کی رؤیت پر اپنے یہاں فیصلہ نہ کرنا چاہئے۔ آپ پوری قوت کے ساتھ مراکش کی رؤیت کے قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کا رواج ڈالیں۔ یہی اقرب الی الصحۃ ہے"۔ یہ وہ فتویٰ ہے، جو ۱۸ صفر المظفر ۱۴۲۴ ہجری بمطابق ۲۰ اپریل ۲۰۰۳ عیسوی کو جاری ہوا اور اس کی تصدیق دوسرے کئی دوسرے مفتیوں کی جانب سے کی گئی۔ اسی طرح ملتان شہر کے معروف مدرسہ خیر المدارس کے مفتی عبدالستار صاحب اپنے ایک فتویٰ میں لکھتے ہیں: "انتہائی معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ سعودیہ میں ۳۲ سال کا کیلنڈر گرین وچ کے مطابق مرتب کرلیا گیا ہے۔ اسی کے مطابق رمضان وعید کا اعلان ہوتا ہے، چاند دیکھ کر یا شہادتِ شرعیہ کے مطابق فیصلہ نہیں کیا جاتا"۔ اسی طرح احسن الفتاویٰ میں سعودی عرب کی رؤیت کے بارے میں لکھا ہے کہ حکومتِ سعودیہ میں رؤیت ہلال کا فیصلہ مسلک حنفیہ کے خلاف ہونے کے علاوہ بداہت کے خلاف بھی ہوتا ہے، اس لئے پاکستان کے لئے حجت نہیں۔۔۔۔۔ صرف یہی فتاویٰ جات نہیں بلکہ اِس طرح کے کئی مشاہدات و تجربات اور اقوال سے اخبارات بھرے پڑے ہیں۔ اِن حقائق کی موجودگی میں کس طرح سعودی عرب کی اندھی تقلید کرتے ہوئے، اُن کے ساتھ رمضان وعیدین میں اتفاق ممکن ہے؟ کیا محض عقیدت کی بنیاد پر رمضان اور شوّال کے آغاز کو مقدم کرکے مسلمانوں کے ایک یا دو روزوں کو کوئی اپنے سر لے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ شریعت کے منشاء اور حکم کے عین مطابق نظر آنے والے چاند کو دیکھ کر روزہ رکھا جائے گا اور چاند کو دیکھ کر ہی عید منائی جائیگی۔ واضح رہے کہ درجِ بالا اقتباسات اُن لوگوں کے فتاوٰی سے لئے گئے ہیں، جنہیں پشاور اور مردان میں قبل از وقت چاند کا اعلان کرنے والے بھی اپنا پیشوا و مقتدیٰ تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن شاید صرف اُن

مسائل میں اپنا پیشوا تسلیم کرتے ہیں، جن سے اُن کی نفسانی خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے۔

سعودی عرب کے ساتھ عید کے ممکن نہ ہونے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں قمری تاریخ کے تعین کے لئے جو اُمّ القریٰ کیلنڈر وضع کیا گیا ہے، وہ اِس لئے قابلِ اعتبار نہیں کہ پہلے اُس میں قمری مہینے کی ابتدا کرنے کے لئے چاند کی پیدائش کو اور پھر بعد میں تھوڑی تبدیلی کے ساتھ چاند کی پیدائش اور مطلعِ افق پر اُس کے مطلق ٹھہراؤ (جسے وجودِ قمر کہا جاتا ہے) کو معیار بنایا گیا ہے، یعنی اِعلانِ رؤیت کے لئے دو شرائط عائد کی گئی ہیں: (۱) چاند کی پیدائش سورج کے غروب ہونے سے پہلے ہوئی ہو، (۲) غروبِ قمر آفتاب کے غروب ہونے کے بعد ہو یعنی سورج کے غروب ہوجانے کے بعد اُفق پر چاند کے مطلق ٹھہراؤ، خواہ چند منٹ ہی کیوں نہ ہو، کو معیار بنایا گیا ہے۔ چاند کی پیدائش سے مراد یہ ہے کہ چاند زمین کے گرد تقریباً ۲۹.۵ دن میں ایک چکر مکمل کرتا ہے۔ اس چکر کے دوران ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ سورج چاند اور زمین ایک لکیر کی طرح ہوجاتے ہیں اور چاند زمین اور سورج کے درمیان آجاتا ہے، سائنسی اعتبار سے یہ کیفیت ''چاند کی پیدائش یا نیا چاند'' کہلاتی ہے۔ اس وقت چاند پر گرنے والی سورج کی روشنی زمین پر نہیں پہنچتی ہے، جس کی وجہ سے دنیا کی طاقتور ترین ٹیلی سکوپ سے بھی چاند کو دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔

اب اگر شرعی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مذکورہ بالا دونوں شرائط کا مطلق لگانا درست نہیں ہے۔ پہلی شرط اس لئے درست نہیں کہ شرعی اعتبار سے پیدائشی نیا چاند اُس وقت تک ہلال نہیں بن سکتا، جب تک کہ اُسے کھلی آنکھوں سے دیکھ نہ لیا جائے۔ اور سائنسی اعتبار سے یہ تب ہی ممکن ہے جب چند اور عوامل کی موجودگی میں چاند کی عمر کم از کم بیس گھنٹے یا اُس سے زائد ہوجائے۔ جیسا کہ محترم خالد اعجاز مفتی اپنی کتاب ''رؤیت ہلال مسئلہ اور حل'' میں ''چاند کی عمر سے رویتِ ہلال معلوم کرنے کے نکات'' بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

(۱) بیس گھنٹے سے کم عمر کا چاند دکھائی نہیں دیتا۔ (۲) بیس سے تیس گھنٹوں کی عمر کا چاند کبھی دکھائی دے جاتا ہے، کبھی نہیں۔ اس کا انحصار متعدد فلکیاتی کیفیات پر ہوتا ہے۔ تیس گھنٹوں

سے زائد عمر کا چاند مطلع صاف ہونے کی صورت میں چند مستثنیات کو چھوڑ کر عموماً نظر آ جاتا ہے"۔۔۔(رؤیتِ ہلال: مسئلہ اور حل، صفحہ نمبر ۲۱۰)۔بعض ماہرینِ فلکیات کم از کم تیس گھنٹے چاند کی عمر کو رؤیت کے لئے شرط قرار دیتے ہیں۔لہٰذا درجِ بالا سائنسی حقائق کی روشنی میں چاند کو ہلال بننے کے لئے اپنی پیدائش کے بعد کبھی ایک دن اور کبھی ڈیڑھ دن بلکہ اِس سے بھی زیادہ درکار ہوتے ہیں۔لہذا چاند کی پیدائش اور قابلِ رؤیت ہونے میں کم از کم ایک دن یا اس سے زیادہ کا فرق لازمی ہے۔اور سعودی عرب نے جب تک چاند کی پیدائش (نیا چاند) کو قمری تاریخ کے لئے معیار بنائے رکھا، اُس وقت تک پاکستان کے ساتھ قمری مہینے کی ابتدا کرنے میں بعض دفعہ ایک دن اور کبھی دو دِنوں کا فرق سامنے آتا رہا، کیونکہ نئے چاند اور ہلال میں اتنا فرق کا آنا ممکن ہوتا ہے۔حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد یہ ہے کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ہی افطار کرو یعنی شوّال کا آغاز کرو اور عید الفطر مناؤ۔اب اگر سعودی عرب کی مطابقت کی جائے تو لازمی طور پر ایسا ہوگا کہ روزے پہلے شروع ہو جائیں اور عید الفطر رمضان ہی میں منالی جائے، دونوں صورتوں میں متعدد شرعی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں، جن کا ذکر کتابچے کی اخیر میں آرہا ہے۔

جہاں تک دوسری شرط یعنی سورج کے غروب ہو جانے کے بعد اُفق پر چاند کے مطلق ٹھہراؤ، خواہ چند منٹ ہی کیوں نہ ہو، کو معیار بنانے کا تعلق ہے، تو اِس حوالے سے عرض یہ ہے کہ یہ بھی سائنسی و شرعی اعتبار سے درست نہیں ہوگا۔کیونکہ چاند کی حقیقی رؤیت کے لئے جہاں اُس کی پیدائش کے بعد ایک مخصوص مدت کا گذر جانا شرط ہے بالکل اِسی طرح سورج کے غروب ہو جانے کے بعد چاند کا مطلعِ اُفق پر ایک مخصوص وقت ٹھہرا رہنا بھی ضروری ہے وگرنہ اُس کی رؤیت یعنی اسے دیکھنا مشکل ہو جائے گا۔ماہرین کے مطابق عام طور پر نیا چاند دوسرے عوامل کی موجودگی میں اُس وقت تک رویت کے قابل نہیں ہوتا، جب تک وہ سورج کے غروب ہو جانے کے بعد تقریباً پچاس منٹ یا اُس سے زائد وقت تک اُفق پر نہ رہے۔اس سے کم وقت میں اُس کے نظر آنے کا امکان نہیں ہوتا ہے البتہ اگر دیگر کیفیات

اپنے اپنے معیار سے کافی بلند ہوں تو مطلع غیر معمولی طور پر صاف ہونے کی صورت میں اس سے کم وقت میں بھی رؤیت ممکن ہوسکتی ہے مگر ایسا کبھی کبھار ہوتا ہے، (تلخیص از رؤیت ہلال مسئلہ اور حل)۔ اسی طرح اگر چاند سورج سے پہلے غروب ہوجائے تو پھر اس کا نظر آنا ناممکن ہوجاتا ہے کیونکہ چاند اُفق کے نیچے جاچکا ہوتا ہے۔

مہینے کی ابتداء کرنے کے لئے چاند کی پیدائش کو معیار بنانے کی بجائے رؤیت یعنی دیکھنے کو معیار بنانے کا ثبوت قرآنِ مجید کی کئی آیاتِ کریمہ سے ملتا ہے۔ سورۂ بقرہ آیت نمبر ۱۸۹ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "اے (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) لوگ آپ سے ہلالوں (ہلال کی جمع) کے بارے میں پوچھتے ہیں، تو آپ (اُن سے) کہہ دیجئے کہ یہ (ہلال) مقررہ اوقات ہیں، لوگوں کے لئے (معاملات وعبادات) اور حج کے تعین کے لئے"۔ مذکورہ بالا آیتِ کریمہ میں اُس ہلال کا ذکر ہے جو لوگوں کو نظر آئے اور نیا چاند پیدا ہوتے ہی نظر نہیں آتا بلکہ اُس کے نظر آنے کے لئے کچھ وقت کا گذر جانا بھی ضروری ہے۔ اِسی طرح چاند کے بارے میں مشہور حدیثِ مبارک میں بھی پیدائش کا ذکر نہیں ہے بلکہ "رؤیت" کے الفاظ آئے ہیں، جس کے معنیٰ "دیکھنے" کے ہیں۔ یہ دیکھنا خود سے بھی ہوسکتا ہے اور کسی شرعی شہادت کے ذریعے سے بھی۔

سعودی عرب میں رؤیت کے حوالے سے اِن بنیادی خرابیوں کا پتا اس سے بھی چلتا ہے کہ ایک دفعہ چاند کی تاریخ کے اعلان کئے جانے کے بعد اکثر و بیشتر تاریخوں میں کمی بیشی کی جاتی ہے۔ اِس حوالے سے ۲۰۰۵ء اور ۲۰۰۷ عیسوی کے ذوالحج کے مہینوں کے اعلان اور بعد میں کئے جانے والے ردّ و بدل کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اِس حوالے سے سعودی اخبار "الوطن" میں حمزہ المزنی نامی کالم نگار کا ایک مضمون انتہائی اہم ہے، جس میں ماہِ ذی الحج ۱۴۲۵ھ کے چاند کا پہلے اعلان کرتے ہوئے ۱۲ جنوری بروز بدھ یکم ذی الحج قرار دیا گیا۔ پھر کئی دنوں کے بعد اسّی سالہ دو بوڑھوں کی شہادت کو قبول کرتے ہوئے تاریخ کو پیچھے کردیا گیا اور یکم ذی الحج ۱۱ جنوری کو قرار دے دیا گیا۔ کنگ عبدالعزیز کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے ماہرین نے مجلس قضاء کے

اس فیصلے کو چیلنج کرتے ہوئے، اُن دونوں بوڑھوں کا انٹرویو لیا لیکن اُن سے مطمئن نہ ہو سکے۔ ماہرین کا اُن بوڑھوں کی رؤیت کو چیلنج کرنے کی وجہ یہ تھی کہ جس دن کے بارے میں اُنہوں نے رؤیت کا اقرار کیا تھا، اُس دن غروبِ آفتاب کے وقت چاند کی عمر صرف ۳ گھنٹے تھی اور وہ سورج کے طلوع ہونے سے ۳ منٹ پہلے غروب ہو چکا تھا۔ کالم نگار حمزہ المزنی کا یہ مضمون ویب سائٹ www.alwatan.com.sa/2005-01-20/writers پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک سعودی عرب اور ہمارے ملک میں ناممکن دنوں میں شہادتوں کے آنے کا مسئلہ ہے، تو اس حوالے سے بھی چند اہم باتوں کو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے:

سعودی عرب میں عام طور پر رؤیتِ عامہ نہیں ہوتی ہے یعنی مطلع صاف ہونے کے باوجود صرف چند لوگ ہی چاند کو دیکھ پاتے ہیں، جبکہ فقہاءِ کرام نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ اگر مطلع ابر آلود نہ ہو تو رمضان المبارک اور عیدین کے چاند کے ثبوت کے لئے رؤیتِ عامہ کا ہونا ضروری ہے یعنی یہ ضروری ہے کہ ایک جمِ غفیر چاند کے دیکھنے کی شہادت دے صرف چند افراد کی شہادت معتبر نہیں ہوگی۔ جمِ غفیر کی شہادت کے علاوہ فقہاءِ کرام ایک شرط یہ بھی لگاتے ہیں کہ اُس دن چاند کے نظر آنے کا اِمکان بھی ہو۔

آسان لفظوں میں یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ چاند کی رؤیت اس وقت معتبر ہوگی جب اِس کی رؤیت پر کثرتِ شہادت اور اُس کے نظر آنے کا امکان بھی موجود ہو۔ اگر چاند کی رؤیت کی شہادت ایسے دنوں میں دی جائے، جن دنوں میں اُس کی پیدائش ہی نہ ہوئی ہو یا پیدائش تو ہوگئی ہو لیکن اُس کی عمر کے کم ہونے کی وجہ سے اُس کا منظر آنا ناممکن ہو، تو پھر شہادت معتبر نہ ہوگی۔

تبلیغی جماعت کے معتبر عالم مولانا انعام الحسن کاندھلوی لکھتے ہیں:

''حساب دان، جس تاریخ کو امکانِ رویت بتاتے ہیں اس دن سے پہلے اگر رویتِ ہلال کو ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی، تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا اور یہ جمہور کے تعامل کے بھی خلاف ہے۔'' (رؤیتِ ہلال: مسئلہ اور حل، بیک پیج)۔

درج بالا حقائق کے تناظر میں سعودی عرب کی رؤیتِ ہلال کے طریقۂ کار کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہاں کبھی بھی رؤیتِ عامہ نہیں ہوتی بلکہ صرف ایک یا دو افراد کی شہادت پر اعلان کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ اعلان بھی اس اعتبار سے مشکوک ہے کہ ان لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ شہادتیں کہاں سے آئیں؟ کس نے لیں اور شہادت دینے والوں کی شرعی حیثیت مسلّم ہے یا نہیں؟ اس حوالے سے سعودی عرب میں رؤیتِ ہلال کی شہادت کو قبول کرنے والی چھ رکنی کمیٹی کے ایک رکن ڈاکٹر صالح کا بیان جو روزنامہ جنگ میں شائع ہوا، بہت اہم ہے۔ روزنامہ جنگ لکھتا ہے کہ ''ڈاکٹر صالح اس چھ رکنی سرکاری سعودی رؤیتِ ہلال کمیٹی کے رکن ہیں، جن کے ذمے چاند دیکھے جانے کی شہادتیں لینے کی ذمہ داری ہے۔ انہوں نے ۴، اکتوبر کو انٹرنیٹ پر اپنا بیان جاری کیا کہ ان کو کسی نے چاند دیکھنے کی اطلاع نہیں دی اور نہ ہی وہ اس فیصلے سے مطمئن ہیں۔ انہوں نے انٹرنیٹ پر اپنا موبائل فون نمبر بھی دیا ہے اور کہا ہے کہ وہ پچھلے بیس سالوں سے سعودی حکمرانوں کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ رمضان اور عیدین کے ایام کے غلط فیصلوں کو نافذ نہ ہونے دیں لیکن مجلسِ اعلیٰ سے فیصلے صادر ہو جاتے ہیں،'' (روزنامہ جنگ لندن، ۱۱، اکتوبر ۲۰۰۵)

سعودی عرب میں رؤیت کے حوالے سے انتہائی باخبر ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہاں پہلے شہادت دینے والوں کو شاہی حکم نامے کے تحت انعام و اکرام سے نوازا جاتا ہے۔ احقر کی نظر میں یہ عنصر بھی غیر شرعی شہادت کا باعث بن سکتا ہے۔

پاکستان کے چند شہروں میں قبل از وقت رویت کی شہادت کا واقع پیش آتا ہے، اُن کے بارے میں بھی اخبارات وغیرہ میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ایسی خبریں بھی چھپی ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ بعض لوگ محض جلد بازی کی وجہ سے وقت سے پہلے چاند کی رؤیت کی جھوٹی شہادت دیتے تھے۔ اس بارے میں ایک واقعہ مفتی تقی عثمانی صاحب کے حوالے سے روزنامہ جنگ کے ۵، اکتوبر ۲۰۰۵ء کی لندن اشاعت میں چھپا، جسے ذیل میں درج کیا جا رہا ہے:

''جسٹس مفتی تقی عثمانی نے ایک جگہ لکھا کہ انہوں نے ایک مولوی صاحب کو بیت اللہ پر زاروقطار روتے ہوئے دیکھا۔ تحقیق کی تو پتہ چلا کہ یہ حضرت جلد بازی کر کے وقت سے پہلے روزہ اور عید کرواتے رہے، اب رو رو کر خدا سے معافی مانگ رہے ہیں''

اسی طرح ماہنامہ ''الخیر'' ملتان کی اکتوبر ۲۰۰۵ء کی اشاعت میں جناب بشیر نامی مضمون نگار نے ایک واقعہ یوں درج کیا ہے کہ ''احقر کے ہمسائے اچھے پکے تبلیغی اور ریلوے ملازم جناب ملک محی الدین لہڑی نے فرمایا کہ جماعت کے ایک ساتھی مقیم قریب سرحد نے روتے ہوئے بتایا کہ میں اور چند ساتھی رمضان اور عیدین کے چاند دیکھنے کی غلط شہادت دیتے تھے۔ چند غلط بہانوں اور تاویلات کا سہارا لے کر دل کو سمجھاتے اور ضمیر کو سلاتے تھے۔ اب توبہ و استغفار کیا ہے، دعا فرمادیں اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ بذریعہ خط یا ذاتی طور پر تصدیق کرا سکتے ہیں''۔

یہاں یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے ممالک کے لوگ بھی سعودی عرب کے ساتھ چاند نہیں دیکھ پاتے بلکہ وہ محروم رہتے ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو خیبر پختونخواہ کے چند علماء اور اُن کے متبعین نے رمضان المبارک و عیدین کے چاند کو اپنے لئے ایک نفسیاتی مسئلہ بنالیا ہے۔ کیونکہ اُنہوں نے یہ تصور قائم کرلیا ہے کہ انہیں رمضان وعیدین سعودی عرب کے ساتھ ہی کرنی ہے۔ لہٰذا اکثر اوقات چاند کے نظر نہ آنے کے باوجود بھی انہیں چاند نظر آجاتا ہے۔ اِس دعوے کا بین ثبوت یہ ہے کہ وہاں کے لوگ ان مہینوں کے علاوہ دوسرے مہینوں میں مرکزی وزونل رؤیت کمیٹیوں کے اعلان کردہ تاریخ کے مطابق اپنے معاملات کرتے ہیں۔ اِس حوالے سے ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ گذشتہ سال پشاور، چارسدہ اور مردان کے کچھ علاقوں میں مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی کے اِعلان کے بجائے خود ساختہ رؤیتِ ہلال کمیٹی کے اعلان کے مطابق مورخہ ۲۰ ستمبر ۲۰۰۹ء بروز اتوار عید کی گئی۔ حالانکہ اُس دن کسی بھی طور پر چاند کے نظر آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ پورے پاکستان کے ماہرین اِس غیر حقیقی

اِعلان پر حیران و ششدر تھے۔ مسجد قاسم علی خان پر آنے والی اِن جھوٹی شہادتوں کی قلعی اُس وقت کھلی، جب اگلے ماہ ذی القعدہ کا چاند ۳۰ شوال المکرم کی شام نظر نہیں آیا بلکہ اگلے دن نظر آیا حالانکہ اُس دن مسجد قاسم علی خان سے کئے گئے اعلان کے مطابق ۳۱ شوال المکرم کی تاریخ تھی۔ اور یہ بات ہر خاص و عام جانتا ہے کہ ۳۱ دنوں پر مشتمل کوئی قمری مہینہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ واقعہ بھی سب کے لئے لمحۂ فکریہ ہے اور اُن علماء اور لوگوں کے لئے سامانِ عبرت ہے، جو چاند کو عزّتِ نفس اور مسلکی مسئلہ بنا کر حق کا ساتھ دینے کی بجائے باطل کی تائید کرتے ہیں یا پھر خاموشی اِختیار کر کے نہ صرف مجرمانہ کردار ادا کرتے ہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کے اُس ارشاد کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہیں کہ جس میں آپ ﷺ نے برائی کو روکنے کے طریقے ارشاد فرمائے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے جو کوئی کسی برے کام کو ہوتے ہوئے دیکھے تو اُسے چاہئے کہ وہ اُسے ہاتھ سے روکے، اگر ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہیں رکھتا تو پھر زبان سے روکے اور اگر ایسا بھی نہیں کر سکتا تو پھر اُسے دل میں برا جانے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے''، (اَربعین نووی، حدیث نمبر ۳۴)۔

خیبر پختونخواہ کے بعض علماء کی جانب سے کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ اُنہوں نے رمضان و عید کے چاند کی رؤیت کے بارے میں حتمی طور پر پیشگی اِطلاع دیدی کہ فلاں تاریخ کو چاند نظر آجائیگا اور عید فلاں دن ہوگی۔ جیسا کہ حضرت پیر محمد کرم شاہ صاحب الازہری علیہ الرحمۃ نے اپنے ایک مضمون بنام ''صوبہ سرحد اور رؤیتِ ہلال'' میں لکھا کہ ''لوگ اطمینان سے رمضان المبارک کی برکتوں سے بہرہ اندوز ہو رہے تھے کہ یکا یک معلوم ہوا کہ سرحد کے بعض علماء کا ایک اجلاس 21 رمضان المبارک مطابق 11 جون 85ء منعقد ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ چاند کی رؤیت ہو یا نہ ہو اٹھارہ جون کو تیس ماہ رمضان قرار دیا جائے اور انیس جون کو عید الفطر منائی جائے۔

یہ فیصلہ سراسر احکام شریعت کے خلاف ہے کیونکہ چاند انتیس کا بھی ہو سکتا ہے اور تیس کا بھی، انہیں کس نے بتایا کہ اس دفعہ چاند تیس کا ہوگا اور عید بروز بدھ 19 جون کو منائی جا

گی۔ ہوسکتا ہے کہ چاند انتیس کا ہوتا اور ایک روز قبل طلوع ہوتا اور ان کے حساب کے مطابق عید منگل کو منائی جاتی۔ دس دن قبل عید کا یہ تعین کم از کم شریعت اسلامیہ سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتا''۔

(انٹرنیٹ ایڈیشن، http://www.urduweb.org/mehfil/showthreS.PHP)۔

رؤیت ہلال کے طریقۂ کار میں درجِ بالا بنیادی خرابیوں کی موجودگی میں سعودی عرب کے ساتھ رمضان وعیدین کو منسلک کرنا اپنی عبادتوں اور خاص دنوں کے فیوض وبرکات کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اسلام میں رمضان المبارک اور عیدین وغیرہ محض تہوار نہیں ہے کہ غیر مسلموں کی طرح ان میں خوشیاں منالی جائیں اور بس بلکہ انہیں عبادت کا درجہ حاصل ہیں، جنہیں بجالانے کی صورت میں ثواب کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا وہ لوگ، جو حرمین شریفین کے ساتھ محض اِعتقادی اور جذباتی وابستگی کی وجہ سے سعودیہ کے ساتھ اِن ایامِ مبارکہ کو منسلک کرنے کے خواہش مند ہیں، وہ اِس پر غور کریں کہ چاند کا مسئلہ صرف جذباتی نہیں بلکہ اِس کا تعلق عبادات ومخصوص اوقات سے ہے، جو اپنے اندر بے انتہاء فوائد وبرکات رکھتے ہیں۔ لہٰذا اگر انہیں اپنے دنوں سے ہٹا کر آگے یا پیچھے کردیا جائے تو یہ برکات حاصل نہیں ہوتیں۔ واضح رہے کہ اگرچہ تمام ایام اور مہینے اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہونے میں اِن میں کوئی فرق نہیں لیکن قرآنِ مجید اور احادیثِ نبوی ﷺ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فضائل کے اعتبار سے اِن ایام اور مہینوں میں فرق ہے یعنی بعض ایام کو دوسرے ایام پر اور بعض مہینوں کو دوسرے مہینوں پر درجہ اور فضیلت حاصل ہے۔ مثال کے طور پر جمعۃ المبارک کو ہفتے کے باقی چھ ایام پر باعتبارِ درجہ فضیلت حاصل ہے۔ اسی طرح رمضان المبارک کے مہینے کو دوسرے مہینوں پر فضیلت حاصل ہے۔ قرآن وحدیث اور بزرگانِ دین سے ماخوذ کچھ اوراد ووظائف کا بھی یہی معاملہ ہے کہ اُن کو مقررہ دنوں یا وقت پر کرنے کی صورت ہی میں فوائد وثمرات حاصل ہوتے ہیں۔ مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں اگر سعودی عرب کے ساتھ رمضان وعیدین

کے انعقاد کو منسلک کیا جائے تو احقر کی نظر میں درجِ ذیل خرابیاں پیدا ہونگی۔

(۱) رمضان کی صورت میں اگر رؤیت کا اعلان پہلے کر دیا گیا تو پہلا روزہ شعبان کی آخری تاریخ میں واقع ہوگا۔ اَحناف کے نزدیک اسے "یومِ شک" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس دن روزہ رکھنے کی ممانعت احادیثِ مبارکہ میں وارد ہے۔ واضح رہے کہ ہمارے ملک پاکستان میں اکثریت اَحناف کی ہے۔ اسی طرح یہ صریح حدیث کے بھی خلاف ہوگا کیونکہ حدیث مبارک میں رمضان کو پہلے شروع کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

(۲) رمضان المبارک اگر ایک دن پہلے شروع کر دیا جائے تو اس کا اثر اس کے آخری عشرے میں واقع طاق راتوں پر پڑے گا۔ وہ اِس طرح کہ جن راتوں کو لوگ طاق رات سمجھ کر عبادت کررہے ہونگے حقیقت میں وہ طاق نہیں بلکہ جفت راتیں ہونگی۔ اور قرآنِ مجید اور احادیثِ مبارکہ میں جس شبِ قدر کا تذکرہ ہے، وہ طاق راتوں میں پوشیدہ ہے۔ لہٰذا لازمی طور پر اعتکاف کرنے والے اور دوسرے لوگ شبِ قدر کی فضیلت اور برکات کو پانے سے محروم رہ جائینگے۔

(۳) اسی طرح اگر عید الفطر کا اعلان ایک روز پہلے کر دیا جائے تو اس سے ایک بہت بڑی خرابی یہ پیدا ہوگی کہ لوگ رمضان کے آخری دن میں روزہ رکھنے کی بجائے کھاپی رہے ہونگے۔ یہ ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ فرضیت کے اعتبار سے رمضان کا ہر روزہ ایک جیسی اہمیت اور فضیلت رکھتا ہے۔ اور حدیثِ مبارک میں ہے کہ رمضان کے ایک روزے کے کفارے میں کوئی شخص پوری زندگی بھی روزہ رکھے تو اِس کا کفارہ ادا نہیں ہوسکتا۔ ہائے افسوس! کہ ہمارے ملک کے کچھ نادان لوگ اِس حقیقت کو سمجھے بغیر محض لوگوں کی اندھی تقلید میں روزے کے دن عید الفطر منا لیتے ہیں۔ اور روزہ چھوڑنے کے گناہ میں شریک ہوجاتے ہیں۔

(۴) عید الفطر کے ایک روز پہلے ہونے کی صورت پر غور کیا جائے تو ایک اور خرابی معلوم ہوتی ہے کہ بعض لوگ حدیث مبارک پر عمل کرتے ہوئے عید کے دوسرے روز شوّال المکرم

کے چھ روزوں میں سے پہلا روزہ رکھتے ہیں۔ اب اگر انہوں نے ایک دن پہلے عید کر لی تو اس صورت میں یہ ہوگا کہ انہوں نے عید کے روز شوال المکرم کا پہلا روزہ رکھ کر اس حدیث مبارک کی عملی مخالفت کی کہ جس میں عید کو "یومِ ضیافت یعنی مہمان نوازی کا دن" قرار دے کر روزہ رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔ بلکہ ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس دن شیطان اپنے غم کے اظہار کے لئے روزہ رکھتا ہے۔ گویا یہ روزہ شیطان کی موافقت میں ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں شیطان ملعون و مردود کی پیروی سے محفوظ رکھے۔

(۵) اسی طرح ذی الحج کے چاند کا اعلان پہلے کر دیا جائے تو مناسکِ حج اور قربانی کے دنوں کو اُن کے اصل دنوں سے ہٹا کر دوسرے دنوں میں کرنا لازم آئے گا اور پوری دنیا کے لاکھوں فرزندانِ توحید کا حج اور قربانی اپنے اصل دنوں سے ہٹنے کی وجہ سے شرفِ قبولیت نہیں پا سکے گی۔ کیونکہ حدیث مبارک کا مفہوم ہے کہ وقت سے پہلے کی جانے والی قربانی قبول نہیں ہوتی۔

(۶) قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے نافرمانیوں اور نافرمانیوں کی وجہ سے اُن پر آنے والے عذاب کا تذکرہ بھی فرمایا ہے۔ یہودیوں کی جملہ نافرمانیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ دن ہفتہ کی تعظیم نہیں کرتے بلکہ اُس کی توہین و بے ادبی کرنے کے لئے مختلف قسم کے حیلے بہانے اختیار کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس نافرمانی کی وجہ سے اُن کی صورتوں کو مسخ کر دیا۔ لہٰذا ہمیں بھی یہ سوچنا ہے کہ صرف خوش اعتقادی کی وجہ سے کہیں ہم بھی اس گناہ کے مرتکب نہ ہو جائیں۔ کیونکہ باوثوق ذرائع سے یہ معلوم ہوا کہ سعودیہ میں سالانہ تعطیلات کے تعین کی غرض سے بھی عید و حج کے ایام کو آگے پیچھے کر دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اس عملِ قبیح سے محفوظ و مامون فرمائے، (آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)۔

آخیر میں سعودی عرب کے ساتھ رمضان و عیدین کرنے کے خواہاں علماء حضرات اور عام لوگوں سے درمندانہ درخواست ہے کہ وہ درجِ بالا سطور کو پڑھنے کے بعد انتہائی تحمل

مزاجی کے ساتھ غور کریں کہ کیا سعودی عرب کے ساتھ رمضان و عیدین کر کے ہم اپنی عبادتوں کو ضائع نہیں کریں گے اور کیا ہمارا یہ عمل اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب نہیں بنے گا؟۔ یقیناً ناراضی کا سبب بنے گا تو پھر ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ہمیں کس کا ساتھ دینا ہے؟ اگر واقعی سعودی عرب کے ساتھ عید منانے کے خواہش مند ہیں تو پھر اِن لوگوں پر لازم ہے کہ وہ سعودی حکمرانوں سے مطالبہ کریں کہ وہ اپنے فیصلے زبردستی دوسروں پر مسلط کرنے کی بجائے پوری دنیا بالخصوص پاکستان کے مسلمانوں میں سعودیہ کے موجودہ نظامِ رؤیت کے بارے میں پائے جانے والے تحفظات (Reservations) کا تدارک کریں اور اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ سعودی حکومت پوری دنیا کے ہر مکتبۂ فکر کے علماءِ کرام، ماہرینِ فلکیات و موسمیات کو اپنے نظامِ رؤیت کو عملی طور پر دیکھنے کا بھرپور موقع دیں اور اُن کو شرعی اور فنی ہر اعتبار سے مطمئن کریں۔ اگر سعودی حکومت ایسا کرنے پر راضی ہو جائے تو پھر ممکن ہے کہ علماءِ کرام سعودی عرب کے ساتھ عید کے انعقاد یا عدمِ انعقاد کے بارے میں شرعی اُصولوں کے تحت اپنی رائے دے سکیں۔

رؤیتِ ہلال کے شرعی ثبوت کے لئے فقہاءِ کرام کے بیان کردہ اُصول

(۱) شعبان المعظم کی ۲۹ تاریخ کی شام رمضان المبارک کے چاند دیکھنے کا اہتمام کیا جائے۔ چاند نظر آ جانے کی صورت میں اگلے دن رمضان المبارک کی ابتداء کر دی جائے، دگرنہ شعبان المعظم کے ۳۰ دن پورے کر کے رمضان المبارک کا آغاز کیا جائے۔

(۲) اگر ۲۹ شعبان المعظم کو مطلع ابر آلود نہ ہو تو رمضان المبارک اور عید دونوں کے چاند کے نظر آنے کی شہادت جمِ غفیر یعنی ایک بڑی جماعت کے جانب سے دی گئی ہو۔ اگر چند افراد نے شہادت دی تو قاضی اُسے قبول نہیں کرے گا۔ جمِ غفیر کی تعداد کے بارے میں فقہاءِ کرام کی متعدد آراء ہیں۔ بعض کے نزدیک ۵۰۰ سو، بعض کے نزدیک ۱۰۰۰ جمِ غفیر ہے۔ امام ابو یوسف علیہ الرحمہ سے مروی ہے کہ جمِ غفیر سے مراد کم از کم پچاس افراد ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قاضی کی صوابدید پر ہے کہ حالات و واقعات کو دیکھ کر جمِ غفیر ہونے

یا نہ ہونے کا فیصلہ کرے۔جیسا کہ درّ مختار میں بھی یہی درج ہے۔

(۳) مطلع ابر آلود ہو، تو عید کے چاند کے شرعی ثبوت کے لیے ضروری ہے کہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں قاضی کے روبرو شہادت دیں اور قاضی ہر اعتبار سے اطمینان حاصل کرنے کے بعد اُن کی شہادت کو قبول بھی کرلے۔لیکن اگر شہادت اِمکانِ رؤیت کے مسلمہ سائنسی اُصولوں کے قطعی خلاف ہو تو جرح کر کے اُسے ردّ کیا جا سکتا ہے۔شہادت کا ردّ و قبول قاضی کا اختیار ہے۔

چاند کے متعلق چند ماثورہ دعائیں:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

ترجمہ: اے ہمارے ربّ تو نے یہ (سب کچھ) بیکار پیدا نہیں کیا۔تو پاک ہے لہٰذا ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا

اَللّٰهُ اَكْبَرُ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ خَیْرَ هٰذَا الشَّهْرِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ الْقَدْرِ وَمِنْ سُوْءِ الْحَشْرِ

ترجمہ: اللہ سب سے بڑا ہے۔تمام تعریفیں اللہ تعالٰی کے لئے ہے۔ساری قوت و قدرت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔اے اللہ! میں اس (نئے) مہینے میں تجھ سے خیر کا طالب ہوں۔ اور بری تقدیر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔اور اس بات سے بھی تیری پناہ چاہتا ہوں کہ قیامت کے دن میں برے طریقے سے تیرے حضور جمع کیا جاؤں''۔

اَللّٰهُمَّ اَهِلَّهُ عَلَیْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِیْمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالْاِسْلَامِ وَالتَّوْفِیْقِ لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی رَبِّیْ وَرَبُّكَ اللّٰهُ

اے اللہ ہم پر اس چاند کو امن اور ایمان اور خیریت اور سلامتی والا کر دے اور (ہمیں) توفیق دے اُس عمل کی جو تجھے پسند اور مرغوب ہو۔اے چاند! میرا اور تیرا ربّ اللہ ہے۔

تمت بالخیر

اِظہارِخیال!

حمد وثنا اور درود برخیر الانام کے بعد فاضلِ نوجوان مفتی حافظ سید صابر حسین شاہ ممبر زونل رؤیتِ ہلال کمیٹی (سندھ) کا تصنیف کردہ کتابچہ بنام ''سعودی عرب کے ساتھ رمضان وعیدین کیوں نہیں؟'' کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا۔ مولانا اس سے پہلے بھی کئی اہم موضوعات پر کتب لکھ چکے ہیں۔ رؤیتِ ہلال کمیٹی سے منسلک ہونے کے بعد جب انہوں نے دیکھا کہ ایک ہی ملک میں دو تین عیدیں منائی جارہی ہیں تو انہوں نے فلکیات کے متعلق مطالعہ اور شرعی رؤیتِ ہلال کی حیثیت اور اس سے متعلقہ شرعی احکام کو محسوس کیا۔ چنانچہ انہوں نے اس کتابچہ کو مرتب کیا۔ کتابچہ نہایت سلیس، عام فہم اور مدلّل ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ جو لوگ سعودی کے عرب کے ساتھ رمضان وعیدین کے اِنعقاد کو ترجیح دیتے ہیں، مولانا نے انہی کے اسلاف کی تحریر سے انکار ردّ بلیغ فرمایا۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے مطالع مختلف ہیں اور دن رات میں کافی فرق ہے، لہذا اسی وجہ سے عید کا ایک ساتھ ہونا بھی بہت مشکل ہے۔ نیز شرعاً ایک ساتھ عید کرنا کوئی فرض، واجب یا مستحب نہیں ہے، جس پر اصرار کیا جائے۔ جب نماز کے اوقات مختلف ہیں، روزہ رکھنے اور کھولنے کے اوقات بھی مختلف ہیں جبکہ اس پر کوئی یہ نہیں کہتا کہ روزہ بھی سعودی عرب کے وقت کے مطابق کھولیں گے تو عید منانے میں اصرار کیوں؟ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت اور عقلِ سلیم عطا کرے۔ یہ کتابچہ یقیناً صائب الرّائے اور متلاشیانِ حق کیلئے مفید ہوگا۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کی اس سعیٔ جمیلہ کو قبول فرمائے۔

(محمد اسماعیل غفرلہ، خادمِ دار الحدیث و دار الافتاء، دار العلوم امجدیہ کراچی)

اِظہارِخیال!

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَبْدَعَ الْاَفْلَاكَ وَالْاَرْضِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ كَانَ نَبِیًّا وَّ اٰدَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ وَعَلٰی اٰلِهِ الطَّیِّبِیْنَ وَاَصْحَابِهِ الطَّاهِرِیْنَ اَمَّا بَعْدُ

میں نے حضرت علامہ مولانا سید صابر حسین شاہ زید مجدہ الکریم مدرس دار العلوم امجدیہ کراچی کا

زیرِ نظر مقالہ ''سعودی عرب کے ساتھ رمضان وعیدین کیوں نہیں؟'' اول سے آخر تک پڑھا۔ میں ان کی تائید کرتا ہوں۔ مولانا نے نہایت اِختصار کے ساتھ حقائق کا ذکر فرمایا ہے۔ اُمید ہے کہ قارئین اتفاق کریں گے۔ ہوسکتا ہے کہ مولانا کی یہ کاوش سعودی عربیہ کے علماء کے لئے غور وفکر کی دعوت ثابت ہو۔ اللہ تعالیٰ اہلِ اسلام کو حق قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

محمد رفیق حسنی، رکن مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی پاکستان
شیخ الحدیث ومفتی جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم، گلستانِ جوہر کراچی

حج کے مسائل

نابینا شخص پر بذاتِ خود حج کرنا فرض نہیں ہے، اُسے حجِ بدل کرانا ہوگا

سوال: 77

میں شمشاد علی کراچی پورٹ ٹرسٹ میں ملازم ہوں، نابینا ہوں۔ میں اپنی والدہ مرحومہ کے حج بدل کے لئے اپنے بھانجے کو بھیج رہا ہوں اور میری خواہش ہے کہ میں اپنا بھی فریضۂ حج ادا کرلوں، مجھے دورانِ سفر مددگار کی ضرورت ہوگی اور بھانجے کے ساتھ جانے میں مجھے سہولت ہوگی۔ میرا سوال یہ ہے کہ میرے نابینا ہونے کی وجہ سے کیا مجھ پر حج فرض ہے یا نہیں؟ اگر فرض نہیں ہے لیکن میں پھر بھی جانا چاہوں تو کوئی شرعی مسئلہ تو نہیں۔

(2) دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جب میں پیشاب سے فارغ ہوکر باہر آجاتا ہوں تو اٹھنے یا بیٹھنے میں پیشاب میں ایک چکنا قطرہ آجاتا ہے، میں دوبارہ استنجا کرتا ہوں، سوال یہ ہے کہ اگر حالتِ احرام میں ایسا ہو تو کیا احرام دھونا پڑے گا یا دوسرا احرام باندھنا پڑے گا؟۔

شمشاد علی، لیاقت آباد، کراچی

جواب:

حج کے فرض ہونے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ترجمہ: ''جو لوگ بیت اللہ تک سفر کے اخراجات برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہیں، ان پر اللہ (کی عبادت) کے لئے بیت اللہ کا حج کرنا فرض ہے، (آل عمران: 97)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی صاحب علامہ ابوالحسن علی بن محمد حبیب ماوردی شافعی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

استطاعت میں تین قول ہیں: امام شافعی کے نزدیک استطاعت مال سے ہوتی ہے اور یہ سفر خرچ اور سواری ہے۔ امام مالک کے نزدیک استطاعت بدن کے ساتھ ہوتی ہے یعنی وہ شخص صحت مند اور تندرست ہو۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک استطاعت مال اور بدن دونوں کے ساتھ مشروط ہے، (تبیان القرآن، جلد 2، ص: 278)''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

والاعمیٰ اذا ملك الزاد والراحلة ان لم یجد قائدا لایلزمه الحج بنفسه فی قولهم، وهل یجب علیه حج بالمال؟، فعند ابی حنیفة رحمه الله تعالیٰ لایجب وعندهما یجب، وان وجد قائدا عند ابی حنیفة رحمه الله تعالیٰ لایجب الحج بنفسه وعن صاحبیه فیه روایتان كذا فی فتاویٰ قاضی خان۔۔۔۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں: ولو تكلف هؤلاء الحج بأنفسهم سقط عنهم حتی صحوا بعد ذلك لایجب علیهم الاداء هكذا فی فتح القدیر،

ترجمہ: ''اور نابینا شخص اگر زادِراہ اور سواری کی استطاعت تو رکھتا ہے، مگر کوئی اُسے لے کر جانے والا نہیں ہے، تو آئمۂ احناف کے قول کے مطابق اس پر بذاتِ خود حج کرنا فرض نہیں ہے۔ آیا اس پر اپنے مال سے حجِ (بدل) کرانا فرض ہے؟ تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس پر حج (بدل کرانا) فرض نہیں ہے اور امام ابویوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس پر اپنے مال سے حجِ بدل کرانا واجب ہے۔ اگر اس کو قائد (ساتھ لے جانے والا) میسر ہو تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک پھر بھی اس پر بذاتِ خود حج کرنا فرض نہیں ہے اور امام ابویوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک اس میں دو روایتیں ہیں، جیسا کہ ''فتاویٰ قاضی خان'' میں ہے۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: اگر اُن معذور افراد نے تکلیف اٹھا کر بذاتِ خود حج کرلیا تو اُن کے ذمے سے فرض ساقط ہوگیا، یہاں تک کہ اگر یہ معذور افراد بعد میں (اللہ تعالیٰ کے کرم سے) تندرست بھی ہوجائیں تو (چونکہ ان کا حَجَّۃُ الاسلام ادا ہوچکا ہے، اس لئے دوبارہ) ان پر حج ادا کرنا واجب نہیں ہے، جیسا کہ ''فتح القدیر'' میں ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:218، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''جس شخص کے پاس روپیہ واسطے خرچ حجِ بیت اللہ شریف موجود ہے، لیکن وہ شخص بوجہ پوری تندرستی نہ ہونے کے خود جانے سے معذور ہے تو اس پر حج فرض ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس صورت سے ادا ہوسکتا

ہے کہ جس سے یہ شخص سبکدوش ہو؟''۔

آپ نے جواب میں لکھا: ''عذر اگر ایسا ہو کہ مانع سفر ہے مثلاً آنکھیں یا پاؤں نہیں اور اس عذر کے زوال کی کوئی امید نہیں تو اپنی طرف سے حجِ بدل کرادے اور اگر عذر مانع سفر نہیں تو خود جائے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 10، ص:709، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

آپ پر حج فرض ہے، مگر بذاتِ خود حج پر جانا فرض نہیں ہے، آپ کسی کو اپنی طرف سے ''حجِ بدل'' ادا کرنے کے لئے بھیج دیں اور بہتر یہ ہے کہ ایسے شخص کو بھیجیں جس نے اپنا فریضۂ حج پہلے ادا کرلیا ہو۔ اگر آپ اپنے بھانجے کے ساتھ سفرِ حج پر چلے گئے اور ان کی مدد سے ارکانِ حج ادا کردیئے تو اس صورت میں بھی آپ کا فریضۂ حج ادا ہوجائے گا۔

(2) اس طرح کا قطرہ ''مذی'' کہلاتا ہے، اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، دوبارہ کرنا ہوگا۔ احرام کا اتنا حصہ جو ناپاک ہوا، اس کا دھونا لازمی ہے، احرام تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔

قرض پر عمرہ کی ادائیگی

سوال:78

میں نے عمرہ کی ادائیگی کے لئے ایک ماہانہ بیسی ڈالی تھی جو مجھے ماہِ اگست 2009ء میں ملے گی۔ میرے ایک دوست جون 2009ء میں عمرے کی ادائیگی کے لئے جارہے ہیں اور مجھے اُن کے ساتھ جانے میں بہت آسانی ہوجائے گی۔ اگر میں تین ماہ قبل کسی سے ادھار لے کر عمرہ ادا کرنے چلا جاؤں تو عمرہ ادا ہوگا یا نہیں؟۔ جبکہ تین ماہ بعد بیسی ملتے ہی میں قرض کی رقم ادا کردوں گا، (عبدالرؤف خان، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

عمرہ نفلی عبادت ہے، واجب نہیں ہے کہ نہ کرنے سے کوئی گنہگار قرار پائے یا آخرت میں مواخذہ ہو، تاہم اللہ تعالیٰ کسی کو توفیق دے تو عمرہ کرنا سعادت ہے اور رسولِ اکرم ﷺ کی سنت ہے۔ آپ اپنی سہولت کے مطابق قرض لے کر عمرے پر جاسکتے ہیں، بعد میں قرض کی ادائیگی کی جاسکتی ہے۔

دورانِ حج حلق یا قصر کا حکم

سوال:79

حج کے دوران جو بال کٹوائے جاتے ہیں، ان کی دلیل کیا ہے؟۔

(منور احمد، لیاقت مارکیٹ، ملیر کراچی)

جواب:

سر منڈانا اور بال کٹوانا اللہ تعالیٰ نے حج کرنے والوں کے وصف میں بیان فرمایا ہے:

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ ۙ مُحَلِّقِیْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِیْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ

ترجمہ: ''(ایک وقت آئے گا کہ) تم ضرور بالضرور پر امن حالات میں ان شاء اللہ مسجدِ حرام میں داخل ہوگے، (اس طرح کہ) تم نے اپنے سروں کو منڈا رکھا ہوگا یا بال تراشے ہوئے ہوں گے، (الفتح:27)''۔

اس کی دلیل یہ آیت مبارکہ اور نبی کریم ﷺ اور آپ کے اصحاب کا عمل ہے۔حدیث پاک میں ہے:

(۱) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ حَلَقَ النَّبِیُّ ﷺ رَاْسَهٗ وَطَائِفَةٌ مِنْ اَصْحَابِهٖ وَقَصَّرَ بَعْضُهُمْ

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ (حجۃ الوداع کے موقع پر) نبی ﷺ اور آپ کے بعض اصحاب نے سر منڈایا اور بعض صحابۂ کرام نے بال کٹوائے''۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث:1729، صحیح مسلم، رقم الحدیث:3142)

(۲) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ فِی حَجَّةِ الْوَدَاعِ اَللّٰهُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِیْنَ، قَالُوْا وَالْمُقَصِّرِیْنَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ؟ قَالَ اللّٰهُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِیْنَ، قَالُوْا وَالْمُقَصِّرِیْنَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ؟ قَالَ اَللّٰهُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِیْنَ، قَالُوْا وَالْمُقَصِّرِیْنَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ؟ قَالَ وَالْمُقَصِّرِیْنَ

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا فرمائی: اے اللہ! سر منڈانے والوں پر رحم فرما، صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! اور بال کٹوانے والوں کے لئے کیا ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! سر منڈانے والوں پر رحم فرما، صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! بال کٹوانے والوں کے لئے کیا ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! سر منڈانے والوں پر رحم فرما، تو صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! بال کٹوانے والوں کے لئے کیا ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: (اے اللہ!) اور بال کٹوانے والوں پر بھی رحم فرما''۔
(صحیح بخاری، رقم الحدیث 1727)

عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بال منڈانے والوں کے لئے ایک یا دو بار اور ایک روایت میں تین بار دعا فرمائی اور کٹوانے والوں کے لئے ایک بار دعا فرمائی۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ حج اور عمرے کے احرام سے نکلنے کے لئے حلق (بال منڈانا) یا قصر (بال کٹوانا) واجب ہے، مگر بال منڈوانے کا اجر زیادہ ہے، کیونکہ اس کے لئے رسول اللہ ﷺ نے زیادہ مرتبہ دعا فرمائی۔

مَحرَم کے بغیر ارکانِ حج کی ادائیگی

سوال: 80

زید اپنے خاندان کے ساتھ حج پر روانہ ہوا، جس میں دو تعلیم یافتہ بیٹیاں بھی شامل تھیں، جن کا زید مَحرَم تھا۔ جانے سے قبل ان بیٹیوں نے حج کے بارے میں لٹریچر کا مطالعہ کیا اور تربیتی نشستوں میں شرکت کی۔ مکہ پہنچتے ہی وہ مَحرَم اور اس کی اجازت کے بغیر عمرہ، طواف اور نمازوں کے لئے جاتی رہیں۔ مکے میں قیام کے دوران وہ اپنے والدین جو اچھی طرح چل پھر سکتے تھے اور ان کا ایک بھائی جو ذرا کمزور تھا، ہجوم سے بچنے کے لئے اس کا ساتھ ضروری تھا، انہیں کبھی ساتھ نہیں لے گئیں۔ دوران حج وہ اپنے والدین اور کمزور بھائی کو صبح مزدلفہ چھوڑ کر فجر کی نماز کے بعد منیٰ چلی گئیں، ساتھ ہی والدہ کا ایک خادم بھی لے

گئیں۔ یہ قربانی کا اہم دن تھا، والدین اور کمزور بھائی صبح تین بجے سے شام پانچ بجے تک بھوکے پیاسے بھٹکتے رہے۔ اسی شام دونوں لڑکیاں بغیر محرم کے طواف وزیارت کے لئے مکہ گئیں اور واپس آگئیں۔ دوسرے روز بھی بغیر محرم کے طوافِ وداع کے لئے چلی گئیں۔ دس تا پندرہ ذوالحجہ نہ تو والدین سے معذرت کی اور نہ ہی اپنی شکل دکھائی۔ مدینے میں بھی یہی رویہ اپنائے رکھا۔ مندرجہ بالا گزارشات پر فقہ حنفی بریلوی مسلک کے مطابق فتویٰ درکار ہے۔ کیا ان دونوں کا حج مقبول ہے؟، (آزاد بن حیدر، گلستانِ جوہر، کراچی)۔

جواب:

سوال میں بیان کردہ صورتِ حال کے مطابق مذکورہ خواتین نے اپنے گھر سے حرمین طیبین اور حج کا سفر محرم کے ساتھ کیا، لہٰذا ان کا اپنا حج شرعاً درست ہے۔ شریعت کے احکام کا اطلاق ظاہر پر ہوتا ہے اور ہم شریعت کے مطابق کسی عبادت کے صحیح یا باطل ہونے کا حکم ظاہری فقہی احکام کے مطابق لگاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عبادت کے قبول ہونے یا نہ ہونے کے سرٹیفکیٹ ہم جاری نہیں کرتے۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں فیصلہ اخلاصِ عمل اور نیت پر ہوگا اور نیتوں کا حال اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

امام مسلم ایک طویل حدیث میں غزوۂ تبوک کے موقع پر پیچھے رہ جانے والوں کے حالات بیان کرتے ہوئے نقل فرماتے ہیں:

وَصَبَحَ رَسُوْلُ اللهِ قَادِمًا وَكَانَ إِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ بَدَأَ بِالْمَسْجِدِ، فَرَكَعَ فِيْهِ رَكْعَتَيْنِ، ثم جَلَسَ لِلنَّاسِ، فَلَمَّا فَعَلَ ذَالِكَ، جَاءَهُ الْمُخَلَّفُوْنَ فَطَفِقُوْا يَعْتَذِرُوْنَ إِلَيْهِ وَيَحْلِفُونَ لهُ وكانوا بِضْعَةً وَّثمانِينَ رَجُلًا، فقبِل منهم رسولُ الله ﷺ علَانِيَتَهم وبَايَعَهُمْ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمْ وَوَكَلَ سَرَائِرَهُمْ إِلَى اللهِ

ترجمہ: ''صبح کے وقت رسول اللہ ﷺ (غزوۂ تبوک سے مدینۂ منورہ) تشریف لائے، اور آپ (کا معمول یہ تھا کہ) جب سفر سے واپس تشریف لاتے تو پہلے مسجد میں جاتے اور دو رکعت نماز (نفل) پڑھتے۔ پھر لوگوں کے احوال معلوم کرنے کے لئے بیٹھ جاتے، جب

آپ نے ایسا کیا، تو غزوۂ تبوک کے مُخَلَّفِین (جہاد سے پیچھے رہ جانے والے) آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور (جہاد سے پیچھے رہ جانے پر) قسمیں کھا کر اپنے عذر پیش کرنے لگے، ان لوگوں کی تعداد اسّی سے کچھ زائد تھی، رسول اللہ ﷺ نے ظاہری اعتبار سے ان کے عذر قبول فرمالئے اور ان سے بیعت لے لی اور ان کے لئے استغفار کیا اور ان کے باطنی معاملات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد فرما دیا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 6947)''۔

امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں روایت کرتے ہیں:

عن ابی فراس قال خطب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فقال یا ایھا الناس! الا انما کنا نعرفکم اذ بین ظھرینا النبی ﷺ واذ ینزل الوحی واذ یُنَبِّئُنَا اللہُ من اخبارکم، الا وان النبی ﷺ قد انطلق وقد انقطع الوحی، وانما نعرفکم بما نقول لکم، مَنْ أظھرَ منکم خیراً ظَنَنَّا بہٖ خیراً واحببناہ علیہ، ومن أظھر منکم لنا شرا ظننا بہ شرا وابغضناہ علیہ، سرائرکم بینکم وبین ربکم

ترجمہ: ''ابوفراس بیان کرتے ہیں کہ (ایک بار) عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: اے لوگو! سنو! ہم تمہاری (حقیقتِ حال) کو جان لیتے تھے، کیونکہ نبی کریم ﷺ ہمارے درمیان موجود تھے اور نزولِ وحی کا سلسلہ جاری تھا اور اللہ تعالیٰ (رسول اللہ ﷺ پر وحی کے ذریعے) ہمیں تمہاری (پوشیدہ) خبریں بھی بتادیتا تھا، (مگر) سنو! (اب) نبی ﷺ (دنیا سے) تشریف لے جاچکے ہیں اور وحیٔ (ربانی) کا سلسلہ منقطع ہوچکا ہے (اب ہم) تمہارے بارے میں وہی کہتے ہیں جو (ظاہری طور پر) جانتے ہیں۔ سو تم میں سے جس سے خیر ظاہر ہوتی ہے تو ہم اس کے بارے میں اچھا گمان کرتے ہیں اور اس بناء پر اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور تم میں سے جس سے شر کا ظہور ہوتا ہے، اس کے بارے میں ہم برا گمان کرتے ہیں اور اس پر ناراض ہوتے ہیں۔ تمہارے پوشیدہ امور کا فیصلہ تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان ہوگا (کیونکہ وہی نیتوں اور سب کے پوشیدہ احوال کا جاننے والا ہے)، (مسند امام احمد بن حنبل، رقم الحدیث: 286)''۔

مکۂ مکرمہ میں مقیم ہونے کے بعد خواتین مَحرَم کے بغیر طواف کرسکتی ہیں۔ منیٰ، مزدلفہ وعرفات میں ارکانِ حج بھی تنہا ادا کرسکتی ہیں، وہاں ہر مرحلے پر مَحرَم کا ساتھ ہونا ضروری نہیں ہے، کیونکہ ان مقامات کے درمیان فاصلہ اتنی مقدارِ سفر سے کم ہے، جس کے لئے عورت کو مَحرَم کے بغیر سفر کی اجازت نہیں ہے۔ البتہ مکہ اور مدینہ منورہ اور مدینہ منورہ اور جدہ کے درمیان اور جدہ سے واپس اپنے گھر تک سفر کے لئے مَحرم کی رفاقت ضروری ہے۔

عَنِ ابنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُولَ اللہ ﷺ قَالَ لَا تُسَافِرِ الْمَرْاَۃُ ثَلَاثًا اِلَّا وَمَعَهَا ذُو مَحْرَمٍ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی عورت مَحرَم کے بغیر تین دن کا سفر نہ کرے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:3200)''۔

علماء نے ایسی مسافتِ سفر کی کم از کم مقدار جو عورت مَحرَم کے بغیر نہیں کرسکتی، جدید پیمائش کے اعشاری نظام کے مطابق تقریباً 98 کلومیٹر بتائی ہے۔

والدین اور بھائی اگر ان خواتین کی خدمت کے محتاج تھے، تو اُن کی خدمت اِن کے لئے باعثِ سعادت تھی اور اس سے اُن کے اجر میں اضافہ ہوتا۔ اور حج ودیگر عبادات کی بارگاہِ الٰہی میں قبولیت کی زیادہ امید کی جاسکتی ہے۔ اگر وہ یہ خدمت نہیں کرسکیں تو یہ ان کے لئے اجرِ کامل سے محرومی کا باعث ہے، لیکن شرعی اعتبار سے اُن کی اپنی عباداتِ حج، طواف وارکانِ حج کی صحتِ ادا سے اس کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے یا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کا حج صحیح طور پر ادا نہیں ہوا۔

حاجی پر قربانی کا واجب ہونا

سوال:81

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے ذیل میں کہ ایک شخص حج کرنے جاتا ہے تو وہاں پر قربانی کرتا ہے، کیا اُس کے گھر پر اُس کی طرف سے قربانی کرنا ضروری ہے؟ جبکہ وہ صاحبِ ثروت ہے، (محمد افتخار اللہ قادری، مانسہرہ، اوگی)۔

جواب:

ادائیگیِ حج کے موقع پر رمی سے فارغ ہوکر جو قربانی کی جاتی ہے اور یہ صرف منیٰ میں ادا

کی جاسکتی ہے، یہ قربانی حج کا شکرانہ ہے۔ حجِ تمتُّع (یعنی کوئی شخص حج کے مہینوں میں عمرہ کرکے احرام کھول دے اور پھر ایامِ حج میں حج کا احرام باندھ کر حج مکمل کرلے) اور حجِ قِران (حج وعمرہ دونوں کا ایک ساتھ احرام باندھے) والے پر دو عبادتوں (حج وعمرہ) کے شکرانے کے طور پر واجب ہے، حجِ اِفراد (تنہا حج کا احرام باندھنے) والے پر قربانی واجب نہیں۔ یہ وہ قربانی نہیں ہے جو عیدالاضحیٰ کے موقع پر کی جاتی ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: بعد الرمی (ذبح ان شاء) لانه مفرد

ترجمہ: ''رمی کے بعد (حجِ اِفراد کرنے والا) اگر چاہے تو ذبح کرے (یعنی یہ قربانی اس کے لئے مستحب ہے) اس لئے کہ وہ فقط حج کرنے والا ہے، (اور صرف حج کرنے والے پر قربانی واجب نہیں)۔ علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں: والذبح له افضل ویجب علی القارن والمتمتع ۔ وأما الاضحیة فان کان مسافراً فلا یجب علیه، والا کالمکی فتجب کما فی ''البحر''۔

ترجمہ: ''(مفرد یعنی صرف حج کرنے والے پر قربانی واجب نہیں ہے اگر کرلے تو) مفرد کا قربانی کرنا افضل ہے اور حجِ قِران اور حجِ تمتُّع کرنے والے پر واجب ہے۔ لیکن عام قربانی جو ہر صاحبِ استطاعت پر واجب ہے تو حج کرنے والا اگر مسافر ہے، تو اُس پر (مسافر ہونے کی وجہ سے) یہ قربانی واجب نہیں ہے اور اگر حاجی مکہ میں مقیم ہے تو مکی کی طرح اس پر بھی یہ قربانی واجب ہے، جیسا کہ ''البحر الرائق'' میں ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص: 474، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

قربانی کے واجب ہونے کی شرائط میں ایک شرط مقیم ہونا بھی ہے یعنی مسافر پر قربانی واجب نہیں ہے اور مقیم مالدار پر واجب ہے، اگرچہ وہ حج کررہا ہو۔ لیکن اگر مسافر بھی قربانی کرے تو بطور نفل ثواب پائے گا، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: (والاقامة) فالمسافر لاتجب علیه، وان تطوع بها أجزأته عنها

ترجمہ: ''(قربانی کے واجب ہونے کی ایک شرط مقیم ہونا ہے) پس مسافر پر (قربانی)

واجب نہیں ہے اور اگر نفل کے طور پر کرلے تو ثواب پائے گا۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: **فلا تجب علی حاج مسافر فأما أهل مكة فتلزمهم وان حجوا**

ترجمہ: ''مسافر حاجی پر قربانی واجب نہیں ہے، پس اگر مکہ کے رہنے والے حج کریں، تب بھی ان پر قربانی واجب ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 9، ص: 378، 382، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مکہ کے رہنے والے صاحبِ نصاب شخص پر قربانی واجب ہے اگرچہ وہ حج ادا کر رہا ہو، لیکن کسی دور دراز مقام سے حج کے لئے آنے والا چونکہ مسافر ہے، لہٰذا اس پر قربانی واجب نہیں ہے۔ پس اگر وہ مالدار ہونے کے باوجود قربانی نہ کرے، تو اسے اس کی رخصت ہے۔ اور اگر وہ کسی کو وکیل مقرر کردے اور اُس کی جانب سے وطن میں کوئی شخص قربانی کرے تو جائز ہے اور اس پر ثواب پائے گا۔ امامِ حرم کا ایک فتویٰ ہمارے پاس ہے، اس کی رُو سے منیٰ وعرفات اب شہر مکہ کا حصہ ہیں، کیونکہ شہر کی وہاں تک توسیع ہوچکی ہے، لہٰذا اگر کسی حاجی کا مکہ میں قیام (حج سے پہلے کے ایام، ایامِ حج اور بعد کے ایام ملاکر) پندرہ دن بنتے ہوں تو وہ مقیم ہے اور اس پر قربانی واجب ہے، کیونکہ ہر حاجی صاحبِ استطاعت ہوتا ہے۔ اور یہ قربانی حدودِ حرم میں کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اپنے وطن میں کسی کو وکیل بنا کر بھی کرسکتا ہے۔

قربانی کے مسائل

دنیاداری کی خاطر قربانی کرنے اور نیاز کا حکم

سوال:82

میری رہائش بیوی، ایک بیٹے اور دو بیٹیوں سمیت اپنے ذاتی مکان میں ہے۔ پنشن اور دیگر ذرائع سے تقریباً ماہانہ آمدنی 19,800/ روپے بنتی ہے، جبکہ میرے ذمے مندرجہ بالا رقم سے کہیں زیادہ قرض واجب الادا ہے اور مقروض ہونے کے باوجود بیوی بچوں کے اصرار اور دنیاداری کی وجہ سے قربانی اور ماہِ صفر کی حلیم کی نیاز کرتا رہا ہوں، جس کے لئے بسا اوقات قرض بھی لیتا رہا ہوں۔ ان حالات کی روشنی میں قربانی اور نیاز کی بابت میرے لئے شرعی احکامات کیا ہیں؟ اگر شرعاً یہ دونوں چیزیں مجھ پر واجب نہیں اور میری مرضی پر ہیں تو اگر میں یہ نہ کروں تو میرا یہ فعل گناہ میں تو داخل نہیں ہوگا؟۔

(عبدالخالق، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب:

آپ نے لکھا ہے: ''مقروض ہونے کے باوجود بیوی بچوں کے اصرار اور دنیاداری کی وجہ سے قربانی اور ماہِ صفر کی حلیم کی نیاز کرتا رہا ہوں''۔ آپ اگر عبادت اور حصولِ ثواب کی نیت سے نہیں بلکہ محض دنیاداری کی خاطر یہ امور انجام دیتے رہے ہیں تو آپ اجرِ آخرت کے حقدار نہیں ہیں، کیونکہ آخرت میں اجر وثواب اسی عمل پر ملے گا جو ثواب کی نیت سے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کیا جائے نہ کہ دنیاداری اور دکھاوے کے لئے، اسے ریاکاری کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾

ترجمہ: ''بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے، (الانعام:162)''۔

قربانی ہر صاحبِ نصاب بالغ مرد اور عورت پر واجب ہے۔ مقروض اگر قرض ادا کرنے کے بعد صاحبِ نصاب نہیں رہتا تو اُس پر قربانی واجب نہیں، علامہ نظام الدین

رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ولوکان علیہ دین بحیث لوصرف فیہ نقص نصابہ لاتجب،
ترجمہ: ''اگر اُس پر قرض ہے اور قرض کی ادائیگی کے بعد نصاب ناقص ہوجاتا ہے تو اُس پر قربانی واجب نہیں، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص:294)''۔

جبکہ آپ کا کہنا ہے کہ ''ان امور کے لئے آپ قرض بھی لیتے رہے ہیں''، آپ پر تو بدرجۂ اولیٰ قربانی واجب نہیں۔ آپ کے لئے بہتر تو یہ ہے کہ پہلے قرض سے سبکدوش ہوں کیونکہ قرض کی ادائیگی واجب ہے جبکہ قربانی (آپ پر واجب نہ ہونے کے سبب) نفلی ہوگی لیکن اگر قرض لے کر عبادت کی نیت سے قربانی کردی تو ادا ہوجائے گی اور اس پر ثواب ملے گا۔

عاشورہ یا ماہِ صفر کے موقع پر حلیم یا نیاز کا اہتمام کرنا درحقیقت ایصالِ ثواب ہے جو جائز، مستحسن اور مستحب ہے، جس کے نہ کرنے پر آپ گناہ گار نہیں ہوں گے۔ نیاز کے معنیٰ: تبرُّک، تحفۂ درویشاں، نذر بھینٹ چڑھاوا، منت، التجا (فیروز اللغات) آرزو، غنا، میل، خواہش، اظہارِ محبت، عاجزی، مسکینی، انکسار، تحفۂ درویش، تبرُّک، درود فاتحہ، بھینٹ چڑھاوا، منت، التجا (فرہنگ آصفیہ جلد 4)۔ اگر آپ مختصر طور پر اپنے وسائل کے مطابق گھر ہی میں نیاز کا اہتمام کریں تو بھی ثواب پائیں گے۔ یہ ''نیاز'' بنیادی طور پر ایصالِ ثواب ہے، اور اس پر نذر کا اطلاق عرفی ہے، یہ نذرِ شرعی نہیں ہے۔ لہٰذا بھینٹ یا چڑھاوا کے معنیٰ میں ہرگز نہیں ہے۔ ایصالِ ثواب میں بھی تصدُّق اللہ تعالیٰ کے نام پر ہوتا ہے، صرف ثواب بندوں کو پہنچانا مقصود ہوتا ہے۔ شرعاً نذر اللہ جلّ شانہٗ کے نام پر ہی دی جاتی ہے، لیکن نذر ماننے کو رسول اللہ ﷺ نے پسند نہیں فرمایا۔ حدیث پاک میں ہے: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اَلنَّذْرُ لَا یُقَدِّمُ شَیْئًا وَلَا یُؤَخِّرُہٗ۔ وَاِنَّمَا یُسْتَخْرَجُ بِہٖ مِنَ الْبَخِیْلِ۔

ترجمہ: ''نذر کسی چیز کو مقدم یا مؤخر نہیں کرتی، یہ صرف بخیل سے مال نکلوانے کا ذریعہ ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:4129)''۔

کیونکہ بندہ ایک ایسے امر کو اپنے اوپر لازم اور واجب قرار دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ یعنی شریعت نے اس پر واجب قرار نہیں دیا۔ لیکن جب کوئی نذر مان لے تو اس کے لئے حکمِ باری تعالیٰ یہ ہے: وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ ترجمہ: ''اور اپنی نذروں کو پورا کرو، (سورۃ الحج:29)''۔ اور اگر پورا نہیں کرے گا تو گنہگار ہوگا۔

بھینس نر یا مادہ کی قربانی جائز ہے

سوال:83

بھینس نر یا مادہ دونوں کی قربانی کیا شریعت میں ثابت ہے؟ اگر ثبوت ہے تو ہماری رہنمائی فرمائیں، (شہریار، سیالکوٹ)۔

جواب:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق قربانی کے جانوروں کی چار اقسام ہیں: دنبہ، بکرا، اونٹ اور گائے (اِن کی جس قدر اقسام ہیں سب اِن میں) داخل ہیں۔

نر، مادہ، خصی اور غیر خصی سب کا ایک ہی حکم ہے، بھینس گائے میں شمار ہے اس کی بھی قربانی ہوسکتی ہے، علامہ حسن بن منصور اوزجندی لکھتے ہیں:

الاضحية تجوز من أربع من الحيوان الضان والمعز والبقر، والابل ذكورها وانا ثها وكذلك الجاموس لانه نوع من البقر الاهلی، ولا يجوز البقر الوحشی۔

ترجمہ: ''چار قسم کے جانوروں کی قربانی جائز ہے: دنبہ، بکرا، گائے، اونٹ، نر اور مادہ (سب کا ایک حکم ہے) اور اسی طرح بھینس (نر و مادہ) کی قربانی بھی جائز ہے کیونکہ وہ پالتو گائے کی قسم میں سے ہے، وحشی (نیل) گائے کی قربانی جائز نہیں ہے''۔

(فتاویٰ قاضی خان علی ہامش ہندیہ، جلد 3، ص:348)

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں: اِتَّفَقَ العلماءُ علیٰ ان الاضحيةَ لاتصحُّ الأ مِن نَعم أبلٌ وبقرٌ (ومنها الجاموس) وغنم (ومنها المعز) بسائرِ انواعِها، فيشمل الذكر والانثىٰ والخصىَّ والفحلَ فلايجزئُ غيرالنَّعَمِ من بقرِ الوحشِىِّ وغيرهِ، والظباءِ وغيرها لقوله

تعالیٰ وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ (الحج 34) ولم ينكر عنه ﷺ ولا عن اصحابه التضحية بغيرها، ولأن التضحية عبادة تتعلق بالحيوان فتختص بالنعم كالزكاة

ترجمہ: ''اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ مویشیوں کے سوا (کسی اور جانور کی) قربانی جائز نہیں ہے (اور وہ یہ ہیں): اونٹ، گائے (اور بھینس بھی اسی میں شامل ہے)، بکری اپنی تمام اقسام کے ساتھ (یعنی دنبہ، بھیڑ وغیرہ)، تمام اقسام کے مذکر و مؤنث، خصی و نر (بھی اس میں شامل ہیں)، ان مویشیوں کے علاوہ نیل گائے اور ہرن وغیرہ کی قربانی جائز نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہر امت کے لئے ہم نے ایک قربانی مقرر کی تا کہ اس کے دیئے ہوئے بے زبانوں چوپایوں پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیں، (الحج: 34)۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب سے ان مویشیوں کے علاوہ اور جانوروں کی قربانی منقول نہیں ہے۔ اور چونکہ قربانی ایسی عبادت ہے جو حیوان سے متعلق ہے، جیسے زکوٰۃ (مال سے متعلق ہے)، (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ، جلد: 04، ص: 20-2719)''۔

ایسے جانور کی قربانی جائز ہے جس کا سینگ نکال دیا گیا ہو

سوال: 84

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک جانور جس کے سینگ اُس کی خوبصورتی بڑھانے کے لئے کاٹے جاتے ہیں، سینگ جڑ سے نکالے جاتے ہیں اور دوبارہ سینگ نہیں نکلتے۔ اس تمام عمل سے جانور کی صحت اور تندرستی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور خوبصورتی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جانوروں کے بیوپاری عموماً ایسا کرتے ہیں لیکن عوام اسے نہیں پہچان پاتے اور منڈی میں کئی کئی لاکھ روپے میں فروخت ہونے والے جانور اکثر ایسے ہی ہوتے ہیں کہ جن کو خوبصورت بنانے کے لئے اُن کے سینگ نکال دیئے جاتے ہیں۔ کیا ایسے جانور کی قربانی جائز ہے؟، (محمد وسیم، ناظم آباد، کراچی)۔

جواب:

قربانی کا جانور تمام ظاہری عیوب سے سلامت ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ میں فقہائے کرام نے یہ ضابطہ مقرر کیا ہے کہ ہر وہ عیب جو کسی منفعت اور جمال کو بالکل ضائع کردے، اس کی وجہ سے قربانی جائز نہیں ہے۔ اور جو عیب اس سے کم تر درجے کا ہو، اس کی وجہ سے قربانی ناجائز نہیں ہوتی۔ جس جانور کے پیدائشی سینگ نہ ہوں، یا سینگ اوپر سے ٹوٹا ہوا ہے، اُس کی قربانی جائز ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

(ویضحی بالجماء) ھی التی لاقرن لھا خلقۃ ، وکذا العظماء التی ذھب بعض قرنھا بالکسر أو غیرہ فان بلغ الکسر الی المخ لم یجز۔ "قھستانی"۔ وفی "البدائع" ان بلغ الکسر المشاش لایجزء والمشاش رؤوس العظام مثل الرکبتین والمرفقین۔

ترجمہ: "(جماء کی قربانی جائز ہے) یہ وہ جانور ہے جس کے سینگ پیدائشی طور پر نہ ہوں اور اسی طرح عظماء (یعنی ایسا جانور جس کے سینگ کا کچھ حصہ ٹوٹا ہوا ہو) کی قربانی بھی جائز ہے اور اگر سینگ دماغ تک ٹوٹا ہو تو ناجائز ہے، "قہستانی" اور "بدائع" میں ہے اگر سینگ ہڈی کی جڑ تک ٹوٹا ہو تو اُس کی قربانی بھی ناجائز ہے اور مشاش ہڈی کی اصل ہے جیسے گھٹنے اور کہنیاں ہیں۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9، ص: 391، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

مفتی نوراللہ نعیمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس مسئلے پر ایک طویل فتویٰ لکھا، جس کا خلاصہ درج ذیل ہے::

مشائخِ عظام نے تو یہ تصریح بھی فرمادی کہ پیدائشی بے سینگ کی بہ نسبت ٹوٹے سینگ والا جانور بطریقِ اولیٰ جائز ہے (تبیین الحقائق جلد ۶ ص ۵، عینی علی الکنز ص: ۴۴۸، مجمع الانہر جلد ۲ ص ۵۱۹) طحطاوی علی الدر جلد ۴ ص ۱۶۴ میں ہے: والنظم منه بل ھو اولیٰ منه، یعنی جماء جائز ہے تو شکستہ شاخ بطریقِ اولیٰ جائز ہے کہ اس میں سینگ کا کچھ تو نشان ہوتا ہے۔ پھر فقہائے کرام نے اس کی تعلیل وتوجیہ میں یہ فرمایا کہ قربانی کا مقصود اصلی یعنی گوشت سینگ سے متعلق نہیں تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ مبسوط، ہدایہ، عینی، طحطاوی کے

انہی صفحات میں ہے: والنظم من المبسوط فلان مافات منها غیر مقصود لان الاضحیة من الابل افضل ولا قرن له۔

مزید لکھتے ہیں: فقہاء کرام نے یہ تصریح بھی فرمائی ہے کہ یہ جواز تب ہے کہ انکسار (سینگ کے ٹوٹ جانے کا اثر) دماغ تک نہ پہنچے ورنہ جائز نہیں۔ فتاویٰ بزازیہ علی ہامش الہندیہ مصریہ جلد ۶ ص ۲۹۳ میں ہے: والتی لاقرن لها من الاول یجوز فان انقطع او انکسر یجوز الا اذا بلغ الدماغ۔ خلاصۃ الفتاویٰ جلد ۴ ص ۳۲۰، کتاب الفقہ جلد ۱ ص ۵۹۵، فتاویٰ برہنہ جلد ۱ ص ۳۵۳، جامع الرموز ص ۴۵۷، شامی جلد ۵ ص ۲۸۲ میں ہے: ان بلغ الکسر المُخَّ لایجوز، لسان العرب جلد ۳ ص ۵۲، قاموس اور اس کی شرح تاج العروس جلد ۲ ص ۲۷۷، منجد ص ۳۵۰ میں ہے: والنظم من اللسان المُخَّ الذِی ماغ حالانکہ روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ قرنِ داخل نصف سے زائد بھی کٹ جائے تب بھی کٹاؤ دماغ تک نہیں پہنچتا، البتہ اگر جڑ سے اکھڑ جائے چونکہ جڑ اور کھوپڑی کی اوپر کی ہڈی کا خِلقۃً اتصال ہے لہٰذا وہ کٹاؤ دماغ تک پہنچ سکتا ہے جو حقیقۃً اِنقلاعُ القرن یا اِستیصالُ القرن (یعنی سینگ کا جڑ سے اکھڑ جانا) ہے اور ایسے جانور کو مستأصلہ کہا جاتا ہے، جس کی ممانعت ایسی حدیث مرفوع ومسند میں آئی ہے کہ جس کی تصحیح حاکم نے فرمائی ہے وَقَرَّرَهُ الذهبِیُّ نَصّاً وسکتَ علیه ابوداؤد ومعلومٌ اَنَّ سکوتَهٗ دلیلُ الرِّضا (ابوداؤد جلد ۲ ص ۳۱)، مستدرک جلد ۴ ص ۲۲۵ میں ہے: النظم لابی داؤد انما نهی رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم عن المُصفرةِ والمستَأصلةِ (الی ان قال) والمستاصلة التی یستأصل قرنها من اصله اور ہر صورت میں عدمِ جواز اس لئے نہیں کہ قرنِ داخل ٹوٹ گیا ہے بلکہ اس لئے کہ اس کے اکھڑنے سے کھوپڑی ٹوٹ گئی اور جانور بیمار ہو گیا، جس کی بیماری بیّن ہے یا اس لئے کہ شدّتِ درد سے دُبلا ہو جائے گا تو خارج فی المقصود بن جائے گا۔

مزید لکھتے ہیں: روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکا ہے کہ قرنِ داخل کا انکسار مانع نہیں تو اس کی صرف بالائی طرف کا انکسار کیسے مانع بن سکتا ہے اور وہ "کالمرفقین والکتفین

والرکبتین'' بھی نہیں اور نہ ہی ایسا نرم کہ چبانے اور کھانے کے قابل ہو لہٰذا وہ مراد نہیں۔
البتہ قرنِ داخل کا حصۂ زیریں یعنی اس کی جڑ جو سَر کی کھوپڑی میں ہی پیوست ہے، مراد ہو سکتا ہے کہ وہ بھی رأس بمعنی طرف ہے اور وہی جڑ کھوپڑی کے لئے بمنزلہ رأس ہے کیونکہ کھوپڑی کا وہ حصہ جو قرن کے ساتھ مشترک ہے دائرہ نما خلا ہوتا ہے، کھوپڑی کی ہڈی ہر طرف سے وہیں آ کر ختم ہو جاتی ہے اور اس کا ٹوٹنا سَر کی ہڈی کا ٹوٹنا ہے، جس سے انکسار دماغ تک پہنچ جاتا ہے اور وہی صورت پیدا ہو جاتی ہے جس کا ذکر عون المعبود میں گذرا اور اس کا مانع ہونا بھی اس لئے نہیں کہ وہ وہ انکسار القرن (یعنی سینگ کا ٹوٹ جانا) ہے بلکہ اس لئے کہ یہ انقلاع القرن (یعنی سینگ کا جڑ سے اکھڑ جانا) ہے اور انجراح الرأس (یعنی سر کا زخمی ہونا) ہے جو ایسا مرض ہے کہ مہلک بن سکتا ہے اور دردِ شدید کے باعث مقصود کو بھی نقصان پہنچاتا ہے، تو فقہائے کرام کی وہ مختلف عبارات جن میں ''بلوغ الی المخ او الدماغ او المشاش'' کا ذکر ہے، سب متفقۃ المعنی بن گئیں اور مکسورۃ القرن (ٹوٹے ہوئے سینگ والا ہونا) کا عموم وشمول بھی برقرار رہا بلکہ ''بلوغ الی المخ'' وغیرہ فرمانا ہی اس عموم کو ظاہر کر رہا ہے، کیونکہ بلوغ الی المخ وغیرہ کی صورت میں کسر القرن مانع نہیں کہ وہ مرض مہلک یا نقصان دہ مقصود نہیں بلکہ مانع جواز انقلاع القرن یا انجراح الرأس ہے جو کسر القرن پر موقوف نہیں بلکہ صحیح وسالم پورے قرن کا قلع بھی یہ صورت پیدا کر دیتا ہے، تو ماہِ نیمروز ومہر نیمروز کی طرح نمایاں ہوا کہ کسر القرن مانع جواز نہیں اگرچہ قرن داخل سے ہی متعلق ہو۔
البتہ اس میں شک نہیں کہ کسر القرن ایک عیب یسیر (معمولی نقصان) ضرور ہے تو جس طرح اس قسم کے دوسرے چھوٹے عیبوں سے مبرّا (یعنی بے عیب) ہونا مستحب ہے اسی طرح اس سے بَری ہونا بھی مستحب ہے، شامی جلد ۵، ص: ۲۸۲ میں ہے: واعلم ان الکل لایخلو عن عیب والمستحب ان یکون سلیما عن العیوب الظاھرۃ فما جوز ھٰھنا جوز مع الکراھۃ، (فتاویٰ نوریہ، جلد 3، ص: 371 تا 380)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا ''ایک راس عقیقے کے لئے

خریدی، اس کا سینگ ٹوٹ گیا، اب دوبارہ پھر نکل آیا، یہ راس قابلِ قربانی ہے یا نہیں؟،
آپ نے جواب میں لکھا: ''سینگ ٹوٹنا اس وقت قربانی سے مانع ہوتا ہے جبکہ سر کے اندر جڑ
تک ٹوٹے، اگر اوپر کا حصہ ٹوٹ جائے تو مانع نہیں پھر اگر ایسا ہی ٹوٹا تھا کہ مانع ہوتا، مگر اب
زخم بھر گیا، عیب جاتا رہا تو حرج نہیں لان المانع قد زال وھذا ظاھر۔
مزید لکھتے ہیں: قرن اوپر ہی کے حصے کو کہتے ہیں، جو ظاہر ہوتا ہے، وہ اگر کُل ٹوٹ گیا
حرج نہیں ولہٰذا ہدایہ میں مکسورۃ القرن کو جائز فرمایا، ہاں! اگر اندر سے اس کی جڑ نکل آئی کہ
سر میں جگہ خالی ہوگئی تو ناجائز ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 20، ص:488، 460)''۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر مذکورہ عمل سے جانور میں عیب ظاہر ہوگیا ہو یا اُس میں کمزوری
ولاغری پیدا ہوگئی ہو یا دماغ تک جگہ خالی ہوئی ہو اور جانور کی جسمانی یا دماغی صحت متاثر
ہوئی ہو تو قربانی جائز نہیں۔ لیکن اگر جانور میں کوئی عیب پیدا نہ ہوا ہو اور جیسا کہ آپ نے
لکھا کہ جانور کی خوبصورتی میں اضافہ ہوجاتا ہے تو قربانی جائز ہے۔ لیکن ایسے جانور کی قربانی
کے جواز کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ جانوروں کے ساتھ یہ عمل کیا جائے۔ ظاہری نظر میں بھی آدھا
یا اس سے زیادہ ٹوٹا ہوا سینگ (اس سے قطع نظر کہ دانستہ ایسا کیا گیا ہو یا کسی اتفاقی حادثے
کے نتیجے میں) عیب دار لگتا ہے اور اِس سے یقیناً جانور کی قیمت بھی کم ہوجاتی ہے، لیکن جو
صورت آپ نے بیان کی ہے وہ ظاہری نظر میں بھی عیب بالکل نہیں لگتا، بلکہ بقول آپ کے
جانور کے حسن اور قیمت میں اضافے کا باعث ہے، بشرطیکہ دماغ کے اندر کی جڑ نکل جانے
سے سوراخ یا نقص نہ پیدا ہوگیا ہو، تو اس کے جواز میں تامل نہیں ہونا چاہیئے۔

قربانی کی کھال کا مصرف

سوال: 85

ایک تنظیم جو تحفظِ ناموسِ رسالت کا کام کررہی ہے اور مدارسِ دینیہ کو بھی چلا رہی ہے
اور ورکرز کو چرمِ قربانی جمع کرنے پر کمیشن بھی دیتی ہے۔ کیا ایسی تنظیم کے لئے قربانی کی
کھالیں لینا جائز ہے یا نہیں؟، (محمد صدیق راٹھور، کراچی)

جواب:

قربانی کی کھال صدقۂ نافلہ ہے اور ہر نیک کام میں خرچ کی جاسکتی ہے اس میں مالک بنانا بھی شرط نہیں ہے، فقہاء نے لکھا کہ غنی (مالدار) کو بھی دے سکتے ہیں، لیکن دینا صحیح نہیں کیونکہ مقصدِ تصدُّق کے خلاف ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ قربانی کی کھال بیچ کر مسجد بنانا درست ہے یا نہیں؟ اور کوئی عمارت مثل مسافر خانہ، نشست کی چوپال جس میں مسافر یا اپنے ہم قوم مقیم ہوسکیں، آپ نے جواب میں لکھا: مسجد یا لوجہ اللہ مسافر خانہ وغیرہ مسلمانوں کے آرام کی خاطر بنانا جس میں اجر ہو اور حصول اجر ہی کی نیت ہو، بالجملہ ہر اس نیک کام میں جو شرعاً قربت ہو، قربانی کی کھال صرف کرنا ہرگز ممنوع نہیں، رسول اللہ ﷺ نے اضحیہ کی نسبت جیسے "تصدقوا" فرمایا، صدقہ کرو، یونہی "وائتجروا" بھی ارشاد فرمایا، وہ کام کرو جس میں ثواب ہو، رواہ ابو داؤد عن نبیشۃ الھذلی رضی اللہ تعالی عنہ (اسے ابوداؤد نے نبیشہ ہذلی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا)۔ امام زیلعی شرح کنز میں فرماتے ہیں: لوباعھا بالدراھم لیتصدق بھا جاز لانہ قربۃ کالتصدق۔

ترجمہ: "اگر قربانی کی کھالوں کو دراہم کے بدلے فروخت کیا تاکہ دراہم کو صدقہ کرے تو جائز ہے کیونکہ یہ صدقہ کی طرح قربت ہے"۔ معلوم ہوا کہ عینِ تصدُّق لازم نہیں، بلکہ قربت (ثواب کی نیت) ہونا درکار ہے، تصدُّق بھی اسی لئے مطلوب ہوا کہ قربت ہے، تو قربت کی جو بھی صورت ہو، سب کی گنجائش ہے، ہاں! تمول (مال بنانے) کی نیت سے اپنے صرف میں لانے کو اس کے دام کرنا جائز نہیں"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 20، ص: 475-474، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: "چرمِ قربانی کو کارِ خیر میں صرف کرنا جائز ہے، دینی مدرسہ بھی امورِ خیر سے ہے، اس میں بھی صرف کرسکتے ہیں۔ حدیث میں فرمایا: کلوا وادخروا وائتجروا اور درمختار وغیرہ میں ہے: ویتصدق بجلدھا اویعمل منہ نحو غربال

وجراب ويبدله بما ينتفع به باقيا (ترجمہ: ''قربانی کی کھال کو صدقہ کرے یا اس سے چھلنی اور موزے وغیرہ بنائے یا کسی ایسی چیز سے تبدیل کردے جس کا نفع باقی رہے''۔ مسجد میں صرف کرنا بھی جائز ہے۔ مزید لکھتے ہیں: ''متولی یا مہتمم مدرسہ اگر مالدار ہو جب بھی اس کو دے سکتے ہیں کہ پوست (کھال) قربانی میں یہ شرط نہیں کہ فقراء ہی کو دیا جائے۔

(فتاویٰ امجدیہ، جلد سوم، ص:326)

مفتی وقارالدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ''قربانی کی کھال کو صدقہ کرنا واجب نہیں ہے بلکہ مستحب ہے، ہر نیک کام میں خرچ کر سکتے ہیں اور مسجد کی ضروریات میں خرچ کرنا جائز ہے، عام طور پر جو قربانی مالک نصاب ہونے کی وجہ سے واجب ہوتی ہے، اس کی کھال کے بارے میں ہمارے فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بعینہٖ کھال کو اپنے کام میں بھی لا سکتا ہے یا گوشت کی طرح کسی مالدار اور غریب سب کو دے سکتا ہے، لہٰذا کھال اگر فقیر کو دے دی اور فقیر اسے بیچ کر رقم خرچ کر دے تو جائز ہے''۔ (وقار الفتاویٰ، جلد دوم، ص:479)

صورتِ مسئولہ میں مذکورہ تنظیم کا قربانی کا کھال لینا جائز ہے۔ علامہ غلام رسول سعیدی نے ''شرح صحیح مسلم'' میں جلد 6، ص:154 تا 158 قربانی کی کھال کے مصارف اور مساجد و مدارس میں استعمال کے جواز پر تفصیلی دلائل تحریر فرمائے ہیں، اہلِ علم اس کا مطالعہ کریں۔ تاہم میرے نزدیک افضل یہ ہے کہ یہ رقم فقراء و مساکین پر صرف کی جائے اور اس سے دینی مدارس کی اعانت کی جائے۔ دینی کام رضا کارانہ طور پر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اور اجرِ آخرت کے لئے کرنا افضل ہے۔ تاہم قرآن مجید میں صدقاتِ واجبہ (زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ، کفارات و نذر وغیرہ) کے جہاں مصارف بیان کئے گئے ہیں، وہاں چوتھا مصرف ایسے کارکنان کو بھی بیان کیا ہے جو زکوٰۃ و صدقات کی وصولی پر مامور ہوں، انہیں ''عاملینِ زکوٰۃ'' سے تعبیر کیا ہے، لہٰذا شرعاً اس کا جواز موجود ہے۔ کسی کارِ خیر کی اجرت مطلقاً معیوب بات نہیں ہے۔ ریاست و مملکت اور حکومت کا سربراہ تنخواہ لیتا ہے، ہر سطح کے عادلین و قُضاۃِ کرام (Judges) کو بھی تنخواہ یا اجرت دی جاتی ہے۔ یہ سارے مناصب قابلِ احترام ہیں، محض

اس بات پر کوئی ان مناصب یا اہل منصب کو معیوب نہیں سمجھتا کہ وہ اجرت یا تنخواہ لیتے ہیں، بلکہ عنداللہ وعندالناس جو بات معیوب ہے، وہ یہ ہے کہ یہ لوگ امانت میں خیانت کریں، اختیارات کا ناجائز استعمال کریں، رشوت لیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پامال کریں۔

قربانی کے جانور کو خصی کرانے کا حکم

سوال:86

حنفی مسلک کے مطابق قربانی کا جانور بالکل بے عیب ہونا چاہیے یعنی کچھ بھی کٹا پھٹا نہ ہو، صحیح سالم ہو پھر یہ جو جانور کو خصی کرایا جاتا ہے، یہ تو جانور کے ساتھ بڑا ظلم ہے، جس وقت جانور کی نسیں دبائی جاتی ہیں تو درد کی شدت سے جانور تڑپ اٹھتا ہے اور تکلیف کے مارے دو چار گھنٹے کھڑا رہنے کے قابل نہیں رہتا۔ اب یہ تکلیف جو صرف اپنے فائدے کے لئے جانور کو دی جاتی ہے، کیا شریعت میں جائز ہے؟ کیونکہ قربانی کے جانور کو یہ تکلیف صرف وزن بڑھانے اور خوبصورتی کے لئے دی جاتی ہے۔ (احترام صدیقی، ناظم آباد نمبر 4 کراچی)

جواب:

خصی جانور کی قربانی نہ صرف جائز بلکہ سنّت ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ قَالَ ذَبَحَ النَّبِيُّ ﷺ يَوْمَ الذَّبْحِ كَبْشَيْنِ أَقْرَنَيْنِ أَمْلَحَيْنِ مُوجَئَيْنِ

ترجمہ: ''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے قربانی کے دن دو سفید وسیاہ رنگ کے سینگوں والے خصی مینڈھے ذبح کئے، (سنن ابوداود، رقم الحدیث:2788)''۔

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ نر جانور کا خصی ہونا، قربانی کے معاملے میں عیب نہیں ہے، بلکہ فقہاء نے اسے افضل قرار دیا ہے کیونکہ اس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے۔

بلاشبہ قربانی کے جانور کا عیب سے پاک ہونا شرعاً ضروری ہے اور عیب دار جانور کی قربانی جائز نہیں ہے۔ مثلاً جس کے تھن کٹے ہوئے ہوں، سینگ جڑ سے ٹوٹے ہوئے ہوں، کان تہائی سے زائد کٹا ہوا ہو، لنگڑا ہو، کانا ہو وغیرہ۔ عیب سے مراد وہ عیب ہے جو

تاجروں کے نزدیک عیب شمار ہوتا ہو اور قیمت میں کمی کا باعث ہو۔ خصی ہونا، تاجروں کے نزدیک عیب نہیں ہے بلکہ خصی جانور کی قیمت زیادہ ہوتی ہے اور سنت سے بھی خصی جانور کی قربانی ثابت ہے۔ البتہ جو شخص افزائش نسل کے لئے حلال نر جانور خریدنا چاہتا ہے تو اس کے نزدیک اس کا خصی ہونا ضرور عیب ہوگا۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''بکرے دو طرح خصی کئے جاتے ہیں، ایک یہ کہ رگیں کوٹ دی جائیں، اس میں کوئی عضو کم نہیں ہوتا، دوسرے یہ کہ آلت تراش کر پھینک دی جاتی ہے، اس صورت میں ایک عضو کم ہوگیا، آیا ایسے خصی کی بھی قربانی جائز ہے یا نہیں؟''، آپ جواب میں لکھتے ہیں: ''جائز ہے کہ اس کی کمی سے اس جانور میں عیب نہیں آتا بلکہ وصف بڑھ جاتا ہے کہ خصی کا گوشت بہ نسبت فحل (آنڈو) کے زیادہ اچھا ہوتا ہے، فی الھندیۃ عن الخلاصۃ یجوز المجبوب العاجز عن الجماع (ترجمہ: ہندیہ میں خلاصہ سے منقول ہے کہ ذکر کٹا جو جفتی کے قابل نہ رہا وہ قربانی میں جائز ہے''، (فتاویٰ رضویہ، جلد 20، ص: 458، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

اگر جانور کو خصی کئے جانے کو آپ ظلم قرار دیتے ہیں تو پھر ذبح کرنا بھی شاید آپ کے نزدیک ظلم ہوگا۔ قصاب کی دکان سے جو لوگ گوشت خریدتے ہیں، وہ بھی خصی جانور کو ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ آنڈو (غیر خصی) جانور بعض اوقات اپنا پیشاب پینے کا عادی ہوتا ہے، جسے فقہ میں ''جَلّالہ'' کہتے ہیں اور اس سے اس کے گوشت میں بدبو آجاتی ہے، اس لئے فقہاءِ کرام نے کہا ہے کہ ''جَلّالہ'' جانور کو ذبح کرنے سے پہلے اس طرح باندھ کر رکھا جائے کہ اپنا پیشاب نہ پی سکے، آپ کا کبھی ریوڑ کے پاس سے گزر ہو تو آپ آنڈو بکروں کی بدبو کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں: ویکرہ أکل لحوم الابل الجلالۃ وھی التی الاغلب من أکلھا النجاسۃ لانہ اذا کان غالب أکلھا النجاسۃ یتغیر لحمھا وینتن فیکرہ أکلہ کالطعام المنتن۔۔۔۔ مزید لکھتے ہیں: عن محمد رحمہ اللہ تعالیٰ فی

الناقة الجلالة والشاة الجلالة والبقرة الجلالة انما تكون جلالة ذا نتن وتغير لحمها ووجدت منه ريح منتنة فهي الجلالة حينئذ لا يشرب لبنها ولا يؤكل لحمها وبيعها وهبتها جائز،

ترجمہ: ''اور جلالہ اونٹ کا گوشت کھانا مکروہ ہے جبکہ غالب گمان یہ ہو کہ وہ نجاست کھاتے ہیں اس لئے کہ جب نجاست زیادہ کھاتے ہوں تو اُن کا گوشت متغیر اور بدبودار ہوجاتا ہے، پس بدبودار گوشت کا کھانا مکروہ ہے، جس طرح بدبودار کھانے کا استعمال مکروہ ہے۔

مزید لکھتے ہیں: امام محمد رحمہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ جلالہ اونٹنی، جلالہ بکری اور جلالہ گائے، اس وقت جلالہ شمار ہوں گی جب اُن کا گوشت بدبودار اور متغیر ہو اور اُن میں بدبو پائی جائے، پس وہ جلالہ ہے اُس کا دودھ نہیں پیا جاسکتا اور نہ ہی اُس کا گوشت کھایا جاسکتا ہے، اُس کی فروخت اور ہبہ کرنا جائز ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5،ص:289، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

علامہ امجد علی اعظمی لکھتے ہیں: '' بکرا جو خصی نہیں ہوتا وہ اکثر پیشاب پینے کا عادی ہوتا ہے اور اس میں ایسی سخت بدبو پیدا ہوجاتی ہے کہ جس راستے سے گزرتا ہے وہ راستہ کچھ دیر کے لئے بدبودار ہوجاتا ہے اس کا حکم بھی وہی ہے، جو''جلالہ'' کا ہے اگر اس کے گوشت سے بدبو دفع ہوگئی تو کھاسکتے ہیں ورنہ مکروہ و ممنوع ہے، (بہارِ شریعت، حصہ پانزدہم،ص:128)

مشینی ذبیحے کا حکم

سوال:87

کیا مشین سے ذبح کیا ہوا چکن کھانا مسلمانوں کے لئے جائز ہے؟ اس کا طریقہ یہ ہے کہ شفٹ شروع کرتے وقت مسلمان ذابح بسم اللہ اکبر کہہ کر مشین کا بٹن آن کرتا ہے، پھر ایک گھنٹہ میں تقریباً 8000 چکن ذبح ہوتے ہیں، (اشرف پٹیل، امریکا)۔

جواب:

اگر ذابح (ذبح کرنے والا) ہر مرغی یا جانور کے ذبح کرتے وقت ''بسم اللہ اکبر'' کہہ کر خواہ ہاتھ سے چھری پھیرے یا کسی آلے کے ذریعے چھری پھیرے، جائز ہے، لیکن

اگر یہ شرط نہ پائی جاتی ہو تو ایک وقت میں ایک ہی تکبیر کے ساتھ بہت سے جانوروں یا مرغیوں کا ذبح کرنا جائز نہیں ہے۔ ذبح کے لئے چھری پھیرتے وقت ''بسم اللہ اللہ اکبر'' کہنا بھی لازمی شرط ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾، ترجمہ: ''اگر تم اللہ کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو تو اس ذبیحہ سے کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، (الانعام: 118)''۔ اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ

ترجمہ: ''اور اس ذبیحہ سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا، (الانعام: 121)''۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ومن شرائط التسمية أن تكونَ التَّسمِيةُ مِن الذابِح حتّى لَو سَمّٰى غيرُهٗ والذابح ساكتٌ وَهو ذاكِرٌ غيرُ ناسٍ لَا يَحِلُّ

ترجمہ: ''ذبح کے وقت شرط یہ ہے کہ ذبح کرنے والا خود ''بسم اللہ اللہ اکبر'' کہے، یہاں تک کہ اگر دوسرے شخص نے ''بسم اللہ اللہ اکبر'' پڑھا اور ذبح کرنے والا خاموش رہا حالانکہ اسے یاد ہے، وہ بھولا نہیں، تو وہ جانور حلال نہیں ہوگا۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 5 ص: 286، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ غلام رسول سعیدی مصری علماء کی جانب سے جاری کردہ ایک فتویٰ کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''اگر مدیر الآلہ (مشینی ذبیحہ کا آپریٹر) مسلمان ہو یا اہلِ کتاب سے ہو اور مشین میں چھری لگی ہو جس سے مذکور الصدر رگیں (ساری یا کم از کم تین) کٹ جائیں (اس جگہ یہ شرط بھی ہونی چاہئے کہ مدیر الآلہ ہر جانور کے ذبح کے وقت الگ الگ بسم اللہ پڑھے، سعیدی غفرلہ) تو اس برقی آلہ کو ذابح کے ہاتھ میں چھری کے قائم مقام قرار دیا جائے گا اور یہ ذبیحہ حلال ہوگا اور جب یہ شرائط پوری نہ ہوں تو ذبیحہ حلال نہیں ہوگا''۔

(شرح صحیح مسلم، جلد 6، ص: 123)

آپ نے جو صورتِ مسئلہ بیان کی ہے، یہ طریقہ شرعاً درست نہیں ہے اور اس طرح ایک بار ''بسم اللہ اللہ اکبر'' کہہ کر بٹن دبانے سے ایک گھنٹہ میں آٹھ ہزار جانور ذبح کرنے

سے یہ سارے جانور حلال نہیں ہوں گے۔

حلال ذبیحہ جانور کے مکروہ اجزا کا حدیث سے ثبوت

سوال:88

آپ نے قربانی کے فقہی مسائل کے پمفلٹ میں حلال جانور کے سات اعضاء کو مکروہ تحریمی لکھا ہے لیکن کسی حدیث کا حوالہ نہیں ہے لہٰذا آپ سے استدعا ہے کہ متذکرہ مسئلہ کا حل حدیث پاک کی روشنی میں بیان فرمائیں۔ اس کے علاوہ کن اعضاء کے استعمال میں کراہت پائی جاتی ہے؟، (حافظ فقیر اللہ، صادق آباد)۔

جواب:

حدیث پاک میں ہے: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُمْ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَكْرَهُ مِنَ الشَّاةِ سَبْعًا الْمَرَارَةَ وَالْمَثَانَةَ وَالْحَيَاءَ وَالذَّكَرَ وَالْاُنْثَيَيْنِ وَالْغُدَّةَ وَالدَّمَ وَكَانَ اَحَبُّ الشَّاةِ اِلَيْهِ مُقَدَّمَهَا،

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ذبیحہ جانور کے سات اعضاء کو مکروہ فرماتے تھے، وہ سات یہ ہیں: مُرارہ (پِتہ)، مثانہ، حیاء (شرم گاہ)، ذَکَر (عضو تناسل)، خُصیے، غدود اور ذبح کے وقت بہنے والا خون۔ اور آپ ﷺ کو بکری کے ذبیحہ کا اگلا حصہ (یعنی دستی اور گردن) پسند تھا''۔

(سُنن الکبریٰ للبیہقی، رقم الحدیث: 19702، ص: 12، مطبوعہ: دار الکتب العلمیہ، بیروت)

حلال جانور کے جسم کے سات اعضاء کو حرام بتایا گیا ہے، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) دمِ مسفوح یعنی ذبح کے وقت بہتا ہوا خون (۲، ۳) نر و مادہ کی شرمگاہ (۴) خصیتین (کپورے) (۵) پیشاب کا مثانہ (۶) پِتہ (۷) غدود، اس سے مراد حلال جانور کی جلد اور گوشت کے درمیان ابھرا ہوا سخت گوشت جو کسی بیماری کے سبب گلٹی (Tumor) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:

واما بيان مايحرم أكله من اجزاء الحيوان سبعة الدم المسفوح والذكر

والانثیین والقبل والغدۃ والمثانۃ والمرارۃ کذا فی البدائع۔

ترجمہ: "حلال جانور کے ان اجزاء کا بیان جن کا کھانا حرام ہے، وہ سات ہیں: (ذبح کے وقت) بہنے والا خون، ذکر، خصیے، شرمگاہ، غدود، مثانہ اور پتّہ، "بدائع الصنائع" میں بھی اسی طرح ہے (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص: 290، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

ان میں سے "دمِ مسفوح" حرامِ قطعی ہے کیونکہ یہ نصِ قرآنی سے ثابت ہے اور باقی چیزیں مکروہِ تحریمی ہیں۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ "بدنِ ماکول اللحم" (جس جانور کو ذبح کر کے گوشت کھانا شرعاً حلال ہے، اس کے بدن) میں کیا کیا چیزیں مکروہ ہیں"، آپ نے جواب میں مذکورہ حدیث کے حوالے سے لکھا: "سات چیزیں تو حدیثوں میں شمار فرمائی گئیں: (۱) مرارہ یعنی پتّہ (۲) مثانہ یعنی پھکنا (۳) حیا یعنی فرج (۴) ذکر (۵) انثیین (۶) غدہ (۷) دَم یعنی خونِ مسفوح۔ اس کے بعد آپ نے طبرانی کی "المعجم الاوسط" کی حدیث نمبر 9484 کا حوالہ دیا، جو عبداللہ بن عمر و اور ابن عدی سے روایت ہے اور "سننِ بیہقی" کی مذکورہ بالا حدیث کا حوالہ دیا"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 20، ص: 234، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

قال الحنفیۃ لاتوکل سبعۃ اشیاء من اجزاء الحیوان الماکول وھی الدم المسفوح، والذکر، والانثییان، والقبل، والغدۃ، والمثانۃ والمرارۃ لقولہ عزشانہٗ (ویحل لھم الطیّبات ویحرم علیھم الخبائث) وھذہ الاشیاء السبعۃ مما تستخبثہ الطباع السلیمۃ۔ "وروی عن مجاھد انہ قال کرہَ رسولُ اللہِ ﷺ من الشاۃِ الذکر والانثیین، والقبل، والغُدّۃ، والمُرارۃ والمثانۃ والدمُ"۔ والمراد منہ کراھۃ التحریم بدلیل انہ جمع بین الاشیاء الستۃ وبین الدم فی الکراھۃ ودم المسفوح محرّمٌ والمروی عن ابی حنیفۃ انہ قال: "الدم حرامٌ واکرہ الستۃ"، اطلق اسم الحرام علی الدم المسفوح لأنہ ثبت بدلیلٍ مقطوعٍ بہٖ وھو النص القرآنِ "قُل لاَّ

أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا ۔۔۔ الی قولہ تعالیٰ او دما مسفوحا، (الانعام:145)''
وستٰی ما سواہٗ مکروھا لثبوتہ بدلیل ظنی،

ترجمہ: ''احناف نے کہا ہے کہ حلال جانور کی سات چیزیں نہ کھائی جائیں، وہ یہ ہیں: ذبح کے وقت بہنے والا خون، ذَکَر، خُصیتین، شرمگاہ، غدہ، مثانہ اور پتہ، کیونکہ اللہ عزّوجلّ کا ارشاد ہے: ترجمہ: ''اور ان کے لئے پاک چیزیں حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزیں حرام کرتے ہیں، (الاعراف:157)''۔ اور یہ سات اشیاء ایسی ہیں جنہیں پاکیزہ طبیعتیں ناپسند کرتی ہیں اور مجاہد سے روایت ہے، انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے بکری سے ذَکَر، انثیین، قُبُل، غُدّہ، مُرارہ، مثانہ، دمِ مسفوح کو مکروہ قرار دیا، اس سے مراد مکروہِ تحریمی ہے، دلیل یہ ہے کہ انہوں نے چھ اشیاء اور دمِ مسفوح کو کراہت میں جمع کیا اور دمِ مسفوح حرامِ قطعی ہے، اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ذبح کے وقت بہنے والا خون حرامِ قطعی ہے اور بقیہ چھ چیزوں کو مکروہِ تحریمی کہا، دمِ مسفوح پر حرام کا اطلاق کیا، کیونکہ اس کی حرمت دلیل قطعی سے ثابت ہے اور وہ نص قرآنی ہے، (اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے): ''آپ فرما دیجئے میں نہیں پاتا اس وحی میں جو میری طرف کی گئی ہے حرام کی ہوئی ۔۔ یہاں تک کہ فرمایا یا بہتا ہوا خون، (الانعام آیت نمبر:145)''، اور اس کے سوا باقی اشیاء کو مکروہ کہا، کیونکہ ان کی ممانعت دلیلِ ظنی سے ثابت ہے۔

(اَلفِقهُ الاسلامی واَدِلَّتُهٗ' جلد3، ص:79-2778)

امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اوجھڑی اور آنتوں کو محلِ نجاست ہونے کی بنا پر مکروہ قرار دیا ہے، اسی طرح آپ نے حرام مغز کو بھی مکروہ لکھا ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد20، ص:241)

سیہہ (Hedgehog) کا شرعی حکم

سوال:89

بکری کے سائز کا ایک خاردار جانور ہے، جس کے جسم پر لمبے لمبے کانٹے ہوتے ہیں،

جب یہ جانور جھرجھری لیتا ہے تو کانٹے جھڑتے ہیں اور کسی کو ضرر بھی پہنچا سکتے ہیں، اسے اردو میں ''سیہہ'' کہتے ہیں۔ یہ جانور مکئی کے بٹے، زمین پر اگنے والے پھل سبزیاں وغیرہ کھاتا ہے، اس کا شرعی حکم کیا ہے، یہ حلال ہے یا حرام؟۔(نوید عباسی، گلیات، ہزارہ)۔

جواب:

اس جانور کو عربی میں ''قُنفُذ''(Hedgehog) کہتے ہیں، المنجد میں اس کے معنی یہ لکھے ہیں:

ایک خاردار جانور، بلی کے برابر، جس کے جسم پر تکلے کی طرح کانٹے ہوتے ہیں اور خطرہ کے وقت ان کو پھیلا کر ان میں چھپ جاتا ہے، مؤنث ''قُنفُذَۃٌ'' ہے، اس کی کئی قسمیں ہیں۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ اَبِی نُمَیْلَۃَ قَالَ کُنْتُ عِنْدَ ابْنِ عُمَرَ فَسُئِلَ عَنْ اَکْلِ الْقُنْفُذِ، فتلا (قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَا اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُہٗ) الآیۃ، قَالَ قَالَ شَیْخٌ عِنْدَہٗ سَمِعْتُ اَبَا ھُرَیْرَۃَ یَقُوْلُ ذُکِرَ عِنْدَ النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ خَبِیْثَۃٌ مِنَ الْخَبَائِثِ، فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ اِنْ کَانَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ ھٰذَا فَھُوَ کَمَا قَالَ

ترجمہ: ''ابونُمیلہ بیان کرتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس موجود تھا۔ اُن سے قُنفُذ (کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں شرعی حکم) معلوم کیا گیا تو آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَا اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُہٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَۃً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّہٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُہِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ بِہٖ۔

ترجمہ: ''فرمادیجئے! میں نہیں پاتا اس وحی میں جو میری طرف کی گئی ہے، کسی کھانے والے پر کوئی حرام کی ہوئی چیز، جسے وہ کھاتا ہو، مگر یہ کہ وہ مردار ہو یا (ذبح کے وقت رگوں سے) بہتا ہوا خون یا خنزیر کا گوشت، تو بے شک وہ نجاست ہے یا نافرمانی کے لئے ذبح کے وقت جس جانور پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے، (الانعام:145)''۔ابونُمیلہ کہتے ہیں اس وقت اُن کے پاس ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے کہا: میں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو

یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس قُنفُذ کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ ناپاک چیزوں میں سے ایک ہے''، تو ابن عمر نے کہا اگر یہ بات رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے تو پھر اس کا وہی حکم ہے جو آپ ﷺ نے فرمایا، (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: 3793)۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''حیوان کی اصل میں دو قسمیں ہیں، ایک قسم وہ جو سمندر میں رہتے ہیں، دوسری قسم وہ جو خشکی میں رہتے ہیں۔ جو جانور سمندر میں رہتے ہیں، تو تمام بحری جانوروں کا کھانا حرام ہے، مگر خاص طور پر مچھلی کا کھانا حلال ہے، سوائے اس کے جو پانی کی بالائی سطح پر رہتی ہے (حاشیہ میں لکھا ہے: یہ وہ ہے جو طبعی موت مرجائے اور الٹ کر اس کا پیٹ اوپر کو آجائے، تو اگر اوپر سے نظر آئے تو وہ طافی (یعنی پانی کے اوپری سطح پر رہنے والا جانور) ہے یہ وہ طافی نہیں ہے، تو جیسا کہ درمختار میں ہے اس کا گوشت کھایا جائے گا)، وہ جانور جو خشکی میں رہتے ہیں، ان کی تین قسمیں ہیں: ایک وہ جن میں بالکل خون نہیں ہوتا، دوسرے وہ جن میں (خون ہوتا تو ہے لیکن) بہنے والا خون نہیں اور تیسرے وہ جن میں بہنے والا خون ہوتا ہے۔ تو جن میں بالکل خون نہیں ہوتا، جیسے ٹڈی، بھڑ، مکھی، مکڑی، گبریلا، بچھو، طوطا اور ان کی مانند دوسرے جانوران کا کھانا حلال نہیں ہے، صرف ٹڈی اس سے مستثنیٰ ہے (کہ یہ حلال ہے)۔۔۔۔اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

وَكَذٰلِكَ مَالَيْسَ لَهُ دَمٌ سَائِلٌ مِثْلُ الْحَيَّةِ وَالْوَزْغِ وَسَامٌّ أبرص وجميعُ الْحَشَرَاتِ وهوامّ الارض من الفارِ والجرادِ والقنافذِ وَالْضَّبِّ والْيَربوع وابنُ عرسٍ ونحوها، ولا خلاف في حرمة هذه الاشياءِ الّا في الضبّ فانه حلالٌ عند الشافعي رحمه الله تعالى

ترجمہ: ''اسی طرح وہ جانور جن میں بہنے والا خون نہیں ہے جیسے سانپ، چھپکلی اور تمام حشرات اور خشکی پر رہنے والے چھوٹے جانور، جیسے چوہا، ٹڈی، سیہہ (Hedgehog)، گوہ، وہ چوہا جس کے اگلے پیر چھوٹے اور پچھلے پیر لمبے ہوں اور نیولا اور ان کی قسم کے جانور، تو ان کے حرام ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، سوائے گوہ کے کہ وہ امام

شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک حلال ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص: 289)

علامہ ابن قدامہ حنبلی متوفی 620ھ لکھتے ہیں:

وَالْقُنْفُذُ حَرَامٌ قَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ هُوَ حَرَامٌ وَكَرِهَهُ مَالِكٌ وَاَبُوْحنيفة وَرَخَّصَ فِيهِ الشَّافِعِيُّ وَاللَّيْثُ وَاَبُوْثَوْرٍ۔ وَلَنَا اَنَّ اَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ ذُكِرَ الْقُنْفُذُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ هُوَ خَبِيْثٌ مِنَ الْخَبَائِثِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُد وَلِاَنَّهُ يُشْبِهُ الْمُحَرَّمَاتِ وَيَاْكُلُ الْحَشَرَاتِ فَاَشْبَهَ الْجُرَذَ۔

ترجمہ: ''قُنفُذ حرام ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اسے حرام قرار دیتے تھے اور امام مالک اور امام ابو حنیفہ نے اسے مکروہ قرار دیا ہے، امام شافعی، ابو اللیث سمرقندی اور سفیان ثوری نے اس کے (استعمال کے بارے میں) رخصت دی ہے، ہماری دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے، جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ''قُنفُذ'' کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ ناپاک چیزوں میں سے ایک ہے''۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے روایت کیا، (المغنی، جلد 9، ص: 324، مطبوعہ: دار الفکر، بیروت)''۔

علامہ شیخ کمال الدین دمیری شافعی متوفی 808ھ لکھتے ہیں:

اَلْقُنْفُذ اَلْبَرِّی مِنه، کُنیتہٗ ابوالشوك، وَالاُنثٰی اُمّ دُلْدُل، وَالْجمع قَنَافِذ، وَيقال لَها العَساعس لكثرة ترددها بالليل ويقال للقنفذ أنقذ، وهو صنفان يكون بارض مصر قدر الفار ودلدل يكون بارض الشام والعراق فی قدر الكلب القلطی، والفرق بينهما كالفرق بين الجرذ والفار، قالوا ان القنفذ اذا جاع يصعد الكرم منكسا فيقطع العناقيد ويرمی بها ثم ينزل فياكل منها ما اطاق، فان كان له فراخ تمرغ فی الباقی ليشتبك فی شوكه ويذهب به الی اولاده۔ وهو مولع باكل الافاعی ولا يتالم لها، واذا لدغته الحية اكل السعتر البری فيبرا له خمسة اسنان فی فيه۔۔۔۔ الحكم قال الشافعی يحل اكل القنفذ لان العرب تستطيبه، وقد افتی ابن عمر باباحته وقال ابوحنيفة والامام احمد لايحل لما روی ابوداؤد۔۔۔۔ جاءت أم

حفید رضی اللہ تعالیٰ عنہا بقنفذ الی رسول اللہ ﷺ فوضعتہ بین یدیہ فنحاہ رسول اللہ ﷺ ولم یاکلہ۔

نوٹ: علامہ دمیری شافعی نے اس پر کافی تفصیلی گفتگو کی ہے، ہم نے اس کے ضروری حصے کا حوالہ دیا ہے، جس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

ترجمہ: ''قُنفُذ خشکی کا جانور ہے، اس کی کنیت ابوالشوک (یعنی کانٹے دار، شوک کانٹے کو کہتے ہیں)، اس کی مؤنث کو ''اُمِ دُلدُل'' کہتے ہیں، اس کی جمع ''قنافذ'' ہے اور ''عَسا کس'' بھی کہا جاتا ہے کیونکہ رات کے وقت زیادہ گھومتی پھرتی ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں:

قنفذ: وہ (سیہہ) جو سرزمین مصر میں رہتی ہے، وہ چوہے کی مانند ہے اور ''دُلدُل'' (سیہی) جو شام اور عراق میں پائی جاتی ہے وہ کتے کی مانند ہوتی ہے، قُنفُذ کو جب بھوک لگتی ہے تو یہ انگور پر چڑھتی ہے اور اس کے خوشوں کو کاٹ کر نیچے پھینکتی ہے، ان میں سے جو کھانا ہو کھالیتی ہے اور اگر اس کے بچے بھی ہیں تو باقی خوشوں کو اپنے کانٹوں سے ڈھانپ لیتی ہے اور پھر اپنے بچوں کو لاکر کھلاتی ہے، یہ سانپ کھانے کی شوقین ہے اور سانپ اسے تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔ اور اگر اس کو سانپ کاٹ لے تو یہ ایک قسم کا پہاڑی پودینہ کھالیتی ہے اور زہر کا اثر زائل ہو جاتا ہے، اس کے منہ میں پانچ دانت ہوتے ہیں۔۔ اس کے بعد اُنہوں نے کافی تفصیل لکھی ہے۔۔ آگے چل کر اس کا حکم بیان کیا ہے کہ امام شافعی کے نزدیک اس کا کھانا حلال ہے، کیونکہ عرب اسے پسند کرتے تھے، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے مباح قرار دیا ہے (ابوداؤد کی ایک روایت جو پیچھے گزری، اس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس کے برعکس منقول ہے، یعنی انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو تسلیم کر لیا تھا)۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک یہ حلال نہیں ہے اور انہوں نے سنن ابی داؤد کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔

ہمارے استدلال کی بنیاد یہ بھی ہے کہ ام حُفید رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کے پاس سیہہ لائیں اور اسے آپ کے سامنے رکھا تو آپ ﷺ نے اسے ایک طرف کر دیا اور نہیں کھایا

، (حیوٰۃ الحیوان، جز ثانی، ص: 90 تا 92،)''۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کا اسے نوش نہ فرمانا اور ایک طرف کر دینا آپ ﷺ کی ناپسندیدگی کی دلیل ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سیہہ حرام قطعی تو نہیں ہے، البتہ مکروہ تحریمی ہے۔ آئمۂ اربعہ رحمہم اللہ میں سے امام شافعی نے اس کے کھانے کو مباح قرار دیا ہے، ممکن ہے ان کی تاویل اور توجیہ یہ ہو کہ رسول اللہ ﷺ کا ناپسندیدہ فرمانا آپ ﷺ کی طبعی نفاست کی وجہ سے تھا، لیکن چونکہ سنن ابی داؤد کی روایت میں آپ ﷺ نے اسے خبیث یعنی ناپاک فرمایا ہے، اس لئے مکروہ تحریمی کا قول ہی زیادہ صحیح اور صواب ہے۔

نکاح کے مسائل

شادی کی رسم

سوال:90

ہمارے ہاں یہ روایت ہے کہ نکاح کے وقت ایک شربت کا پیالہ رکھ لیا جاتا ہے، جب نکاح ہو جاتا ہے تو وہ پیالہ آدھا دولہا اور آدھا دلہن کو پلایا جاتا ہے، ہمارے ہاں کے بزرگ اس کو سنت قرار دیتے ہیں، قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں کہ شریعت میں اس کی کوئی اصل ہے یا نہیں؟ (محمد اقبال، بخشی اسکوائر، عائشہ منزل، کراچی)

جواب:

اِس عمل کے سنت ہونے کی کوئی دلیل ہماری نظروں سے نہیں گزری۔ اور ثبوت کے بغیر رسول اللہ ﷺ کی طرف کوئی قول یا فعل منسوب نہیں کرنا چاہیے، اس پر بڑی وعید آئی ہے، ارشادِ مبارک ہے: مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ، ترجمہ: ''جو میری طرف دانستہ جھوٹی بات منسوب کرے، وہ اپنا ٹھکانا جہنم بنالے،

(صحیح بخاری، رقم الحدیث :1291)

نبی مکرم ﷺ کے عقدِ مبارک کے موقع پر ایسا عمل ثابت ہے اور نہ ہی آپ ﷺ کی صاحبزادیوں کے نکاح کے موقع پر ایسا کوئی عمل کیا گیا۔ تاہم سیدۃ النساء حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے نکاح کی بابت حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں لکھا ہے:

''کہ نکاح ماہِ رجب 1 ہجری میں ہوا اور رخصتی غزوۂ بدر کے بعد 2 ہجری میں ہوئی۔ اُس وقت حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کی عمر مبارک اٹھارہ سال تھی۔ شب زفاف کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دونوں کو کہلا بھیجا کہ میرے آنے سے پہلے کچھ نہ کرنا، حضور ﷺ تشریف لے گئے وضو فرمایا پھر پانی پر دم کیا اور ان دونوں پر چھڑک دیا، پھر دعا فرمائی:

اَللّٰهُمَّ بَارِكْ فِيهِمَا وَبَارِكْ عَلَيْهِمَا وَبَارِكْ لَهُمَا فِي نَسْلِهِمَا

ترجمہ: ''اے اللہ! اِن دونوں میں برکت عطا فرما، اِن دونوں پر برکت نازل فرما اور ان (کی آنے والی) نسل میں بھی برکتیں عطا فرما، (الاصابہ، جلد 4، ص: 366)''۔ اگر کوئی

بزرگ دولہا اور دلہن کے لئے یہ عمل کرلے، تو اس میں شرعاً کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔ یہ ایک مستحسن امر ہے اور رسولِ اکرم ﷺ کا عملِ مبارک ہے اور دعائیہ کلمات ہیں۔ زوجین خود بھی یہ دعا پڑھ کر اپنے آپ کو دم کرسکتے ہیں، خود پڑھنے کی صورت میں کلماتِ دعائیہ ہوں گے: اَللّٰهُمَّ بَارِكْ فِيْنَا وَبَارِكْ عَلَيْنَا وَبَارِكْ لَنَا فِيْ نَسْلِنَا۔

حدیث پاک میں ہے: (۱) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ كَانَ اِذَا رَفَّاَ الْاِنْسَانَ اِذَا تَزَوَّجَ قَالَ بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ، وَبَارَكَ عَلَيْكَ، وَجَمَعَ بَيْنَكُمَا فِی الْخَيْرِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب کسی کی شادی کے موقع پر مبارک باد دیتے تو یہ دعائیہ کلمات ارشاد فرماتے: (ترجمہ) اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا فرمائے، تم پر برکت نازل فرمائے اور تمہیں خیر پر یکجا رکھے''۔

(سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1094، ابوداؤد: 2130، ابن ماجہ: 1905)

(۲) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ لَوْ اَنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا اَتٰى اَهْلَهٗ قَالَ ''بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا''، فَاِنْ قَضَى اللّٰهُ بَيْنَهُمَا وَلَدًا لَمْ يَضُرَّهُ الشَّيْطَانُ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم میں سے جب کوئی (قربت کے لئے) اپنی بیوی کے پاس آئے تو یہ دعا پڑھے: (ترجمہ) ''اللہ تعالیٰ کے نام کی برکت سے، اے اللہ! ہمیں شیطان سے محفوظ فرما اور تو (جو نعمتِ اولاد) ہمیں عطا فرمائے، اسے بھی شیطان کے اثر سے محفوظ فرما''، (آپ ﷺ نے فرمایا) اگر اس قربت کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ انہیں اولاد عطا فرمائے گا تو شیطان اسے نقصان نہیں پہنچا سکے گا''۔

(صحیح بخاری 5165، صحیح مسلم: 1434، ابوداؤد: 2161، سنن ترمذی، رقم الحدیث: 1092)

مایوں، مہندی اور سہرا بندی کی رسومات کی شرعی حیثیت

سوال: 91

رسمِ مایوں ومہندی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا سہرا بندی جائز ہے؟ سہرا بندی میں کُلَہ یا عمامہ باندھنا چاہئے؟۔ (امیر ممتازی، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

مایوں اور مہندی کی شرعی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے، یہ معاشرتی رسوم ہیں۔ لیکن اگر ان میں خلافِ شرع باتیں شامل ہوں، مثلاً بے پردگی، گانا بجانا، مردوں اور عورتوں کا آزادانہ میل جول وغیرہ، تو ان محرمات کے سبب یہ حرام ہوں گی۔ نکاح کی حقیقت یہ ہے کہ دو گواہوں کی موجودگی میں لڑکا اور لڑکی براہِ راست یا وکیل کے ذریعے ایجاب وقبول کریں۔ گواہوں کی موجودگی اس لئے ضروری ہے تاکہ شادی کا اعلان ہوجائے، نکاح سے پہلے خطبہ سنت ہے۔ اس کے بعد شرعی حجاب کے ساتھ باوقار انداز میں رخصتی ہے اور شبِ زفاف کے بعد ولیمہ سنت ہے۔

شادی کے موقع پر پھولوں کا سہرا باندھنا جائز ہے۔ البتہ ایسا سہرا جس میں چہرہ چھپ جاتا ہے، اُس کی حکمت ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ چہرہ کھلا ہوا ہو تو ہار پہنے ہوئے آدمی باوقار لگتا ہے۔ بعض لوگ ان رسوم کو ہندوانہ کہتے ہیں، ہر ملک، قوم اور علاقے کی اپنی رسوم اور ثقافتی روایات ہوتی ہیں۔ اگر وہ کسی مخصوص مذہب کا شِعار نہ ہوں اور نہ ہی ان میں کوئی چیز خلافِ شرع ہو یعنی ان سے کسی سنت کا ترک یا کسی مکروہ کا ارتکاب نہ ہو رہا ہو تو یہ باتیں مباح کے درجے میں ہوتی ہیں۔ اسی لئے سنتوں کو بھی ''سُنَنِ ہُدیٰ'' اور ''سُنَنِ زوائد'' میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سُنَنِ ہُدیٰ ایسے مشروع امور ہیں، جن کا رسول کریم ﷺ نے شارع کی حیثیت سے حکم فرمایا ہے یا عمل فرمایا ہے، خواہ یہ وجوب کے درجے میں ہوں یا سنت واستحباب کے درجے میں۔ ''سُنَنِ زوائد'' وہ امور ہیں جنہیں رسول پاک ﷺ نے عرب کے مخصوص حالات میں لباس، وضع یا رہن سہن کے انداز کے طور پر اختیار فرمایا۔

شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ ''الاصل فی الاشیاء الاباحۃ'' یعنی اشیاء میں اصل اباحت (جواز) ہے، علامہ ابن عابدین شامی نے اس موضوع پر ''کتاب الطہارۃ'' میں ایک باب ''مطلب، اَلمختارُ أنَّ الاصلَ فی الاشیاءِ الاباحۃ'' قائم فرمایا، (یعنی مختار قول یہ ہے کہ اشیاء میں اصل جواز ہے تاوقتیکہ اس کی ممانعت شریعت سے ثابت ہو جائے)''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 1، ص:199)

لہٰذا قرآن وسنت میں جب تک کسی شے کی ممانعت نہ ہو اور اس کام کے کرنے میں کسی گناہ کا احتمال نہ ہو تو اس وقت تک وہ جائز ہے، ممانعت ہونے کے بعد وہ ناجائز ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''فَمَا اَحَلَّ فَهُوَ حَلَالٌ، وَمَا حَرَّمَ فَهُوَ حَرَامٌ، وَمَا سَكَتَ عَنْهُ فَهُوَ عفو، وَتَلَا قُلْ لَّاۤ أَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا۔

ترجمہ: '' جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حلال فرمایا، وہ حلال ہے اور جسے حرام قرار دیا، وہ حرام ہے۔ اور جس چیز کے بارے میں سکوت اختیار فرمایا، وہ معاف ہے اور یہ آیت تلاوت فرمائی: قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا، (الانعام :145)۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث:3794)

لہٰذا جب سہرے کی ممانعت قرآن وحدیث اور فقہ میں نہیں ہے تو اس میں کوئی شرعی قباحت بھی نہیں۔ کُلّہ باندھنے میں بھی کوئی شرعی قباحت نہیں، عمامہ باندھنا نبی کریم ﷺ کی سنت ہے۔ عمامے کو ٹوپی پر باندھنا چاہئے، کُلاہ پر بھی باندھا جاسکتا ہے۔ کوئی شخص اگر عمامے کو سنت سمجھ کر حصولِ ثواب کے لئے باندھے تو اسے اجر ملے گا۔ اور اگر محض فیشن کے طور پر باندھا جائے تو اس کی ممانعت تو نہیں ہے، لیکن اس پر وہ اجر کا حق دار نہیں رہے گا۔

مہر مقررہ مقدار سے زیادہ ہوسکتا ہے؟

سوال:92

میرے شوہر نے 1977ء میں ایک عدد فلیٹ بطور مہر مکمل مالکانہ حقوق کے ساتھ مجھے

دیا تھا۔ اِس بات کے دو افراد گواہ بھی ہیں اور تحریری کاغذات بھی میرے پاس موجود ہیں، روزِ اوّل سے میں اسی میں رہائش پذیر ہوں۔ میرے شوہر کا انتقال 2004ء میں ہوگیا تھا۔ اب میرے شوہر کے رشتہ دار اس فلیٹ پر وراثت کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ:

(1) مہر کی ادائیگی کسی بھی شکل میں کی جاسکتی ہے؟۔

(2) دو گواہوں کی موجودگی میں مہر ادا کر دیا گیا، کیا محض زبانی طور پر اتنا کافی ہے؟۔

(3) نکاح نامہ میں جو مہر درج کیا گیا، کیا اُس مقدار سے بڑھا کر مہر دیا جاسکتا ہے؟۔

(سعیدہ الیاس، بلڈنگ 11، ڈیفنس، کراچی)

جواب:

قرآن و حدیث میں مہر کے لئے صَداق، صِداق، صَدُقہ کے الفاظ آئے ہیں۔ ان الفاظ کا مادہ اور ماخذ ''صدق'' ہے۔ ملا علی القاری مرقات شرح مشکوٰۃ شریف میں اس کی وجہ تسمیہ ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مہر کو ان الفاظ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ عورت کی جانب شوہر کے میلان کی صداقت کی دلیل اور علامت ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن میں ''اُجُور'' کا لفظ بھی آیا ہے۔ اسلام کے سوا دنیا کے کسی بھی مذہب میں نکاح کے ساتھ مہر مقرر نہیں کیا گیا۔ اسلام نے مہر عورت کی تکریم کی علامت کے طور پر مشروع کیا ہے، کیونکہ ایک اجنبی عورت جو نکاح سے پہلے حرام ہوتی ہے، عقدِ نکاح کے نتیجے میں شوہر پر حلال ہوجاتی ہے۔ مہر کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر خاوند عورت کو طلاق دے دے تو دوسری جگہ نکاح ہونے تک یا گذر اوقات کا کوئی معاشی ذریعہ مقرر ہونے تک اس کے پاس اتنی رقم ہو جس سے وہ اپنی کفالت کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے مردوں کو سخت تاکید کی ہے کہ وہ عورتوں کو ان کا مہر ادا کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً۔

ترجمہ: ''جن عورتوں سے (بذریعہ نکاح) تم فائدہ اٹھا چکے ہو، تو ان کا مقررہ مہر ادا کردو'' (النساء: 24)

فقہاءِ کرام نے اصولِ شرع سے استنباط کرتے ہوئے نکاح میں مہر مقرر کرنے کی تین قسمیں بیان کی ہیں: (1) مہر معجّل (2) مہر مؤجل (3) مہر مؤخر

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''فقہاء نے مہر کو مؤخر کرنے کی اجازت دی ہے، احناف نے کہا کہ مہر کا معجّل ہونا بھی صحیح ہے (یعنی جس کو فوراً ادا کرنا لازم ہو)۔ اور کل مہر یا اس کا بعض حصہ مؤخر بھی کر سکتے ہیں اور یہ تاخیر یا مہلت کم مدت کے لئے بھی ہو سکتی ہے اور زیادہ کے لئے بھی یا اسے طلاق یا وفات تک مؤخر بھی کیا جا سکتا ہے، جیسے کسی علاقے کا عرف یا رواج ہو۔ البتہ ایسی تاخیر نہ ہو جس کی مدت مجہول ہو۔ مہر قسط وار بھی وصول کیا جا سکتا ہے، اگر نکاح کے وقت مہر کی ادائیگی کا طریقہ طے نہ ہو تو اس علاقے کے عرف کا اعتبار ہوگا۔ آج کل مہر عند الطلب (On Demand) بھی مقرر کیا جاتا ہے یہ بھی درست ہے، جہاں کوئی عرف نہ ہو وہاں فوری ادائیگی پر ہی محمول ہوگا، (خلاصہ، الفقہ الاسلامی وادلتہٗ، جلد: 9، ص: 6787)۔

شوہر اپنی مرضی سے مقررہ مہر سے زائد نقد رقم یا کوئی جائیداد یا زیور وغیرہ کی صورت میں اپنی بیوی کو ''ہبہ (Gift)'' کر سکتا ہے۔ اسے مہر میں شامل بھی کر سکتا ہے اور مہر کے علاوہ ہبہ بھی کر سکتا ہے۔ اور شرعاً وہ عورت مہر کے طور پر دی گئی اس تمام مال کی مالک اور مختار ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا

ترجمہ: ''اور (اپنی بیویوں) میں سے کسی ایک کو اگر تم بہت مال دے چکے ہو تو اس مال میں سے کچھ واپس نہ لو''، (النساء: 20)۔

شرعاً دو عادل گواہوں کی موجودگی میں دیا گیا مہر ثابت ہوگا۔ مذکورہ صورت میں مہر کی جو مقدار مقرر کی گئی تھی، اُس کے بدلے میں جو فلیٹ بیوی کو دیا، وہ بیوی کی ملکیت ہو گیا اور اس میں کسی وارث کا کوئی حصہ نہیں، علامہ نظام الدین علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

الزیادۃ فی المھر صحیحۃ حال قیام النکاح عند علمائنا الثلاثۃ کذا فی المحیط فاذا زادھا فی المھر بعد العقد لزمتہ الزیادۃ کذا فی السراج الوھاج ھذا اذا قبلت

المرأة الزيادة سواء كانت من جنس المهر او لا۔

ترجمہ: ''ہمارے تینوں آئمہ کے نزدیک نکاح کے وقت مقررہ مہر میں اضافہ کرنا صحیح ہے، جیسا کہ محیط میں ہے۔ اگر نکاح کے بعد شوہر نے عورت کے مہر میں اضافہ کیا ہو، تو اس کی ادائیگی شوہر پر لازم ہوگی، جیسا کہ ''سراج الوہاج'' میں ہے۔ یہ لزوم اس وقت ہے کہ جب عورت نے مہر میں زیادتی کو قبول کرلیا ہو، خواہ یہ اضافہ مقررہ مہر کی جنس سے ہو یا اس کی جنس کے علاوہ کوئی اور چیز ہو، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:312)''۔

مہر شرعی کیا ہے؟

سوال:93

لڑکی کا مہر کم سے کم سنّتِ محمدی میں کتنا ہے؟۔ آج کل کے دور میں کس مقدار سے تعین کریں؟، (خورشید احمد یوسفی، دستگیر، کراچی)۔

جواب:

حضور نبی مکرّم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کا مہر بارہ سو اوقیہ یعنی پانچ سو درہم تھا جیسا کہ صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے اور حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کا مہر چار ہزار درہم تھا جو نجاشی نے خود اپنی جانب سے ادا کئے تھے (ابوداؤد، رقم الحدیث:2100) فقہاء کرام نے مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم یعنی 30.618 گرام چاندی یا اُس کی مساوی قیمت مقرر فرمائی ہے۔ امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی 297ھ لکھتے ہیں:

وَاخْتَلَفَ اَهْلُ الْعِلْمِ فِي الْمَهْرِ فَقَالَ بَعْضُ اَهْلِ الْعِلْمِ اَلْمَهْرُ عَلٰى مَا تَرَاضَوْا عَلَيْهِ، وَهُوَ قَوْلُ سُفْيَانَ الثَّوْرِيِّ وَالشَّافِعِيِّ وَاَحْمَدَ وَاِسْحَاقَ، وَقَالَ مَالِكُ بْنُ اَنَسٍ لَا يَكُوْنُ الْمَهْرُ اَقَلَّ مِنْ رُبْعِ دِيْنَارٍ، وَقَالَ بَعْضُ اَهْلِ الْكُوْفَةِ لَا يَكُوْنُ الْمَهْرُ اَقَلَّ مِنْ عَشَرَةِ دَرَاهِمَ،

ترجمہ: ''مہر کے بارے میں اہلِ علم کا اختلاف رہا ہے، بعض اہلِ علم فرماتے ہیں: مہر وہی ہے جو فریقین کی باہمی رضامندی سے طے پا جائے۔ اور یہ قول امام سفیان ثوری، امام شافعی اور امام احمد اور امام اسحاق کا ہے۔ امام مالک بن انس فرماتے ہیں: مہر چوتھائی دینار سے کم نہیں ہوتا اور

بعض اہلِ کوفہ (اس سے مراد احناف ہیں) کہتے ہیں کہ دس درہم سے کم مقدار میں مہر نہیں ہوتا، یعنی مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم (چاندی) ہے۔ (سُنن ترمذی، کتاب النکاح، ص: 191)

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: اَقَلُّ الْمَهْرِ عشرۃ دراھم،

ترجمہ: ''مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم ہے'' (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 302)۔

اگر زوجین موجودہ دور میں کم از کم مہر پر متفق ہوں تو اس کی مقدار 30.618 گرام چاندی یا اس کی مروجہ قیمت (Current Market Value) ہے۔

یہاں پر عام لوگوں کی ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ عام طور پر لوگ پوچھتے ہیں کہ شرعی مہر کیا ہے؟، یا یہ کہ شرعی مہر لکھ دیجئے، تو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ مہر کی ہر وہ مقدار ،مہرِ شرعی ہے جس پر نکاح کے وقت زوجین کا اتفاق ہو جائے، خواہ اس کی مقدار کم ہو یا زیادہ، ایک ہزار روپے ہو یا ایک لاکھ روپے یا کم وبیش جو بھی چاہے مقرر کر سکتے ہیں۔ مہر کی زیادہ سے زیادہ حد شریعت نے مقرر نہیں کی، کیونکہ مہر کے تعیّن میں مختلف امور کو دیکھا جاتا ہے، دونوں کی مالی حیثیت، دونوں کی خاندانی حیثیت (Status) اور آج کل تعلیم بھی ایک بڑا فیصلہ کن عامل بن جاتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں جب خلیفۂ وقت نے بڑی مقدار میں مہر مقرر کرنے کی روش کو ناپسندیدہ قرار دیا اور اس کی کوئی حد مقرر کرنا چاہی تو ایک صحابیہ نے کھڑے ہو کر اعتراض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو ایسی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی بلکہ اسے فریقین کی مرضی اور حالات پر چھوڑ دیا ہے اور انہوں نے یہ آیت قرآنی اپنے موقف کے حق میں پیش کی: وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ

ترجمہ: ''اور اگر تم اپنی ایک بیوی کو چھوڑ کر اس کی جگہ دوسری بیوی سے نکاح کرنا چاہو اور تم ان میں سے ایک کو ڈھیروں مال دے چکے ہو، تو اس مال میں سے کچھ بھی واپس نہ لو، (النساء: 20)''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر سے نیچے اتر آئے اور فرمایا: میں نے تم کو

زیادہ مہر رکھنے سے منع کیا تھا، سنو! اب جو شخص جتنا چاہے مہر رکھ سکتا ہے۔
(سنن کبریٰ للبیہقی، جلد 7، ص:233)

ایک شخص کے بیٹے کا اس کی مطلّقہ کے دوسرے شوہر سے بیٹی سے نکاح

سوال:94

ایک شخص ''عبداللہ'' نے ''زینب'' نامی خاتون سے نکاح کیا، ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ پھر کسی وجہ سے اُس شخص مُسمّٰی ''عبداللہ'' نے اپنی زوجہ مسماۃ ''زینب'' کو طلاق دے دی۔ بعدازاں اُس شخص مسمّٰی ''عبداللہ'' نے ایک اور خاتون مسمّاۃ ''مریم'' سے نکاح کرلیا اور دونوں سے ایک بیٹا ''ارشد'' پیدا ہوکر جوان ہوا۔ اسی طرح اُس مُطلّقہ خاتون مسمّاۃ ''زینب'' نے ایک اور شخص مُسمّٰی ''عبدالرحمٰن'' سے نکاح کرلیا اور ان کے ہاں ایک بیٹی ''رشیدہ'' پیدا ہوئی، اس صورت مسئلہ کو ایک نقشہ سے سمجھئے۔

عبداللہ (زوج) ☆ زینب، زوجۂ اُولیٰ (مُطلّقہ)، ان دونوں کی کوئی اولاد نہیں ہے۔

مریم، زوجۂ ثانیہ ☆ عبداللہ اور مریم سے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ارشد ہے۔

عبدالرحمٰن (زوج) ☆ زینب (زوجہ)، عبدالرحمن اور زینب سے ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام رشیدہ ہے۔

کیا مذکورہ بالا نقشے کے مطابق ''ارشد'' اور ''رشیدہ'' کا آپس میں نکاح جائز ہے؟

(معاذ احمد، ملیر، کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں شریعت کی رو سے ارشد اور رشیدہ کا آپس میں نکاح جائز ہے، کیونکہ حرمتِ نکاح کے اسباب میں سے یہاں کوئی سبب نہیں پایا جاتا۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

لابأس بان یتزوج الرجل امرأۃ ویتزوج ابنہ ابنتھا او اُمّھا کذا فی محیط السرخسی۔

ترجمہ: ''اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ ایک شخص ایک عورت سے نکاح کرے اور اُس کا وہ بیٹا

(جو اِس عورت کے بطن سے نہیں ہے)، اُس عورت کی ایسی بیٹی سے نکاح کرے (جو اُس کے سابق شوہر سے ہے) یا اُس کی ماں سے نکاح کرے۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 1، ص: 277)

نکاحِ شِغار یا وَٹہ وسٹہ

سوال 95:

زید وعمر دونوں دوست ہیں، زید کی بھی بیٹی ہے اور عمر کی بھی۔ زید، عمر کی بیٹی سے اور عمر، زید کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ شریعت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ یہ جائز ہے یا نہیں؟۔ (محمد نعمان خان، کراچی)

جواب:

ایسا نکاح جس میں دو افراد یا دو خاندان ایک دوسرے کو رشتہ دیتے ہیں، ایک جانب کی لڑکی کا نکاح دوسرے جانب کے لڑکے سے منعقد کرلیا جاتا ہے، اس میں دونوں جانب سے لڑکیوں کا مہر مقرر نہیں ہوتا، بلکہ یہ نکاح بلا مہر ہوتا ہے اور عملاً ایک لڑکی دوسری کا بدلِ مہر بن جاتی ہے۔ ایسا نکاح زمانۂ جاہلیت یعنی قبل از اسلام رائج تھا اور اِسے ''نکاحِ شِغار'' کہا جاتا تھا۔ پاکستان کے بعض علاقوں میں اس سے ملتی جلتی اصطلاح ''وٹہ سٹہ'' ہے، اسلام نے اس رسم کو باطل قرار دیا ہے۔ لیکن یہ نکاح اپنی اصل کے اعتبار سے صحیح ہوتا ہے اور اس میں اصل کے اعتبار سے حرمت کا کوئی سبب نہیں ہوتا، فساد کا سبب صرف یہ ہے کہ عورت کو اس کے حق مہر سے محروم کر کے دوسری عورت کا بدل مہر بنا دیا جاتا ہے، اس لئے یہ شرط کالعدم ہو جائے گی۔ نکاح اگر ان عورتوں کی آزادنہ رضامندی سے گواہوں کی موجودگی میں ہو تو ایسا نکاح شرعاً جائز ہے اور اگر ان دونوں عورتوں کا مہر مقرر نہیں ہوا تو وہ مہرِ مثل کی حقدار ہوں گی۔ ''مہرِ مثل'' سے مراد یہ ہے کہ ان کے خاندان میں اِس حیثیت کی حامل خواتین کا عام طور پر جو مہر مقرر ہوتا ہے، وہ اس کی حقدار پائیں گی۔ اور اگر دونوں کا اپنا اپنا مہر مقرر ہوا ہے تو وہ اسی کی حقدار ہوں گی۔ ''نکاحِ شِغار'' کے متعلق چند احادیثِ مبارکہ ملاحظہ ہوں:

(1) عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ نَهٰى عَنِ الشِّغَارِ۔ وَالشِّغَارُ اَنْ يُّزَوِّجَ الرَّجُلُ

اِبْنَتَهُ، عَلَى أَنْ يُزَوِّجَهُ اِبْنَتَهُ، وَلَيْسَ بَيْنَهُمَا صِدَاقٌ۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر بیان کرتے ہیں کہ رسول پاک ﷺ نے ''شِغار'' سے منع فرمایا ہے۔ شِغار یہ ہے کہ ایک شخص اپنی بیٹی کا نکاح دوسرے شخص سے اس کی بیٹی کے عوض کر دے (یعنی وہ بھی اپنی بیٹی کا نکاح پہلے شخص سے کردے) اور ان دونوں نکاحوں میں مہر مقرر نہ ہو، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3354)''۔

(۲) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنِ الشِّغَارِ، زاد ابن نمير وَالشِّغَارَ: أن يقول الرجل للرجل زوجني ابنتك وأزوجك ابنتي، أو زوجني أختك وأزوجك أختي،

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ''شِغار'' سے منع فرمایا۔ ابن نمیر کی روایت میں ان کلمات کا اضافہ ہے: اور شغار یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص سے یہ کہے کہ تم اپنی بیٹی کا نکاح مجھ سے کردو اور میں (اس کے عوض) اپنی بیٹی کا نکاح تم سے کردوں گا یا یہ کہ تم اپنی بہن کا نکاح مجھ سے کردو اور میں (اس کے عوض) اپنی بہن کا نکاح تم سے کردوں گا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث 3358)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں: علامہ بدرالدین عینی حنفی نے لکھا ہے: احناف کے نزدیک شِغار یہ ہے کہ ایک شخص اپنی بیٹی یا بہن کا کسی شخص سے اس کی بیٹی یا بہن کے ساتھ اپنے نکاح کے عوض میں نکاح کرے اور ہر ایک کا عقد دوسرے عقد کے عوض میں ہو، یہ نکاح صحیح ہے اور اس میں مہر مثل واجب ہے۔ علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں: حدیث میں نکاح شِغار کی ممانعت ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ نے بلا مہر نکاح کرنے اور ایک عورت کے حق زوجیت کو دوسری کا مہر قرار دینے سے منع فرمایا اور ہم بھی اس کو باطل قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ چیز شرعاً مہر نہیں ہے، پس یہ ایسا نکاح ہو گیا جس میں ایسی چیز کو مہر بنایا گیا ہے جو مہر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی، جیسے کوئی شخص خمر یا خنزیر کو مہر مقرر کر کے نکاح کرلے تو ایسی صورت میں بالاتفاق نکاح ہو جائے گا اور خمر یا خنزیر کی جگہ مہر مثل دینا

واجب ہوگا، نکاحِ شغار بھی اسی طرح ہے، (شرح صحیح مسلم، جلد 3:819)۔

خطبۂ نکاح کے بغیر نکاح کا انعقاد

سوال:96

فاروق اور شازیہ دونوں عاقل وبالغ ہیں، ان کا نکاح ان کے اولیاء اور گواہوں کی موجودگی میں پڑھایا گیا مقرر کردہ مہر ادا کردیا گیا اور دیگر علاقائی رسوم بھی ادا کی گئیں، صرف نکاح کا خطبہ نہیں پڑھا گیا۔ کیا نکاح میں خطبہ پڑھنا شرط ہے؟ مذکورہ نکاح منعقد ہوا یا نہیں؟، (محمد فاروق، ضلع مظفر آباد)۔

جواب:

مرد وعورت عاقل وبالغ کا نکاح دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول سے منعقد ہو جاتا ہے، خطبۂ نکاح، نکاح کے مستحبات میں سے ہے، ارکانِ نکاح میں سے نہیں، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں :

ویندب اعلانہ وتقدیم خطبۃ

ترجمہ: ''اور نکاح کا علانیہ ہونا اور اس سے پہلے خطبہ پڑھنا مستحب ہے۔۔۔۔آگے چل کر انہوں نے لکھا:

وکونہ فی مسجد یوم جمعۃ بعاقد رشید وشھود عدول،

ترجمہ: ''کسی نیک شخص کا عادل گواہوں کی موجودگی میں جمعہ کے دن مسجد میں نکاح پڑھانا مستحب ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 4، ص:57)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ مجلس میں نہ ذکر نکاح کا ہوا نہ خطبہ پڑھا گیا، نہ مہر کا ذکر ہوا، اب یہ نکاح ہوگا یا خطبہ یا کچھ نہیں؟۔ آپ نے جواب میں لکھا: ''خطبہ پڑھا جانا یا ذکرِ مہر ہونا کچھ شرطِ نکاح نہیں، وہ مجلس اگر عقد کے لئے تھی، عقد ہوگیا اور اگر مجلسِ وعدہ تھی اور حاضرین نے اسے وعدہ ہی سمجھا تو وعدہ ہوا، نکاح نہ ہوا۔

فی الدرالمختار ان المجلس للوعد فوعد وللعقد فعقد

ترجمہ: ”درمختار میں ہے کہ اگر یہ مجلس وعدہ (منگنی) کے لئے ہے تو منگنی ہے اور مجلس نکاح ہے تو نکاح ہوگا۔ نکاح بالفاظِ صریحہ میں نیت شرط نہیں، الفاظِ ایجاب وقبول ہونا اور دو شاہدوں (گواہوں) کا سمجھنا کہ یہ نکاح ہورہا ہے، کافی ہے۔ ذکرِ مہر نہ ضروری نہ قرینہ اور خطبہ اگرچہ ضروری نہیں، مگر قرینہ نکاح ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 11، ص:259)“۔

لہٰذا اگر یہ مجلسِ نکاح تھی اور باقاعدہ ایجاب وقبول ہوا تو نکاح شرعاً منعقد ہوگیا، اگرچہ خطبہٴ نکاح نہ پڑھا گیا ہو۔

باپ کا بیٹے کی خواہر نسبتی (سالی) سے نکاح

سوال:97

میرا ایک ساتھی اور اس کا بیٹا دو سگی بہنوں سے شادی کرنا چاہتے ہیں، ان لڑکیوں سے پہلے ان کا کوئی رشتہ نہیں ہے، مہربانی فرما کر بتائیں کہ یہ دونوں (باپ بیٹا) اُن دونوں سگی بہنوں سے شادی کرسکتے ہیں یا نہیں؟۔

(محمد اقبال طاہر، فائبر ٹیکس لمیٹڈ C-11، سائٹ ایریا، کوٹری، ضلع جامشورو)

جواب:

دو سگی بہنوں سے اس طرح کا نکاح جائز ہے کہ ایک باپ کے نکاح میں ہو اور دوسری بیٹے کے نکاح میں، جیسا کہ سوال میں دریافت کیا گیا ہے، بشرطیکہ وہ اس کی حقیقی ماں نہ ہو بلکہ سوتیلی ماں ہو، کیونکہ حقیقی ماں کی بہن تو خالہ ہوتی ہے اور خالہ کے ساتھ نکاح حرام ہے۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا کہ زید اپنی سوتیلی والدہ کی سگی ہمشیرہ سے نکاح کرسکتا ہے یا نہیں؟ آپ نے جواب میں لکھا: سوتیلی ماں، ماں نہیں (تمہاری مائیں وہی ہیں جنہوں نے تمہیں جنم دیا ہے)، لہٰذا اس کی سگی بہن سے نکاح جائز ہے، (محرمات کے علاوہ عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں)، (فتاویٰ رضویہ، جلد 11، ص:452)“۔

علامہ امجد علی اعظمی سے سوال کیا گیا کہ دو شخص زید وعمرو آپس میں باپ بیٹے ہیں، جو دو

حقیقی بہنوں ہندہ و بکرہ سے عقد کرنا چاہتے ہیں، ایسی صورت میں یہ دونوں عقد جائز ہیں یا نہیں؟۔آپ نے جواب میں لکھا: ''اگر فقط اتنی بات ہے کہ دونوں بہنوں میں ایک زید کے نکاح میں آئے گی اور ایک عمرو کے، اور کوئی دوسری وجہ نہ ہو، جس سے حرمت ہوتی ہو، تو دونوں نکاح جائز ہیں، ۔۔۔ایک اور مقام پر لکھتے ہیں: ''سوتیلی ماں کی بہن سے نکاح جائز ہے، بیٹے کی سالی سے بھی نکاح جائز ہے (فتاویٰ امجدیہ، جلد دوم، ص: 5961)''۔

بیٹی کے ساتھ بدفعلی کرنے سے بیوی حرام ہو جاتی ہے:

سوال:98

ایک شخص نے اپنی 13 سالہ بیٹی سے زنا کیا۔لوگ کہتے ہیں کہ ایسا کرنے سے بیوی کو طلاق واقع ہو جاتی ہے، کیا یہ صحیح ہے؟، نیز اُس شخص کے لئے کیا حکم ہے؟۔

(منظور احمد، موسیٰ کالونی، کراچی)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اُس کی بیوی اُس پر ہمیشہ کے لئے حرام ہو گئی، اُس پر لازم ہے کہ اپنی بیوی سے فوراً علیحدگی اختیار کرے، اس کے ساتھ ازدواجی تعلق قائم رکھنا حرام ہے۔ زنا تو بہت برا فعل ہے، محض شہوت کے ساتھ چھونے پر بھی حرمتِ مصاہرت ثابت ہو جاتی ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں :

ولا فرق فیما ذکر بین اللمس والنظر بشھوۃ بین عمد ونسیان وخطا واکراہ، فلو أیقظ زوجتہ أو ایقظتہ ھی لجماعھا فمست یدہ بنتھا المشتھاۃ او یدھا ابنہ حرمت الأم ابداً۔ ''فتح''

ترجمہ: ''اس سے حکمِ شرعی میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ چھوا یا شہوت سے دیکھا ہو، خواہ یہ فعل دانستہ ہو یا بھول کر، خطا سے ہو یا جبر کے تحت، ہر صورت میں حرمتِ مصاہرت ثابت ہو جاتی ہے۔پس اگر اپنی بیوی کو جگایا یا بیوی نے شوہر کو قربت کیلئے جگایا اور اس دوران مرد کا ہاتھ بیٹی کو لگا جو بالغہ یا مراہقہ (قریب البلوغ) تھی یا بیوی کا ہاتھ بیٹے کو لگ گیا تو بیوی ہمیشہ کیلئے شوہر

پر حرام ہو جائے گی، "فتح القدیر" میں بھی اسی طرح ہے"۔ (رد المحتار علی الدر المختار، جلد 4، ص:90)
ایسا شخص انتہائی خبیث الفطرت ہے، اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نصیب فرمائے اور توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔

بیوی کی بھتیجی کے ساتھ زنا سے نکاح باطل نہیں ہوتا

سوال:99

ایک شخص نے اپنی زوجہ کی سگی بھتیجی سے زنا کیا۔ از روئے شرع اب اس کی زوجہ کے نکاح پر اس فعلِ شنیع کی وجہ سے کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟ قرآن وسنّت کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمادیں۔ (ہند، صدر ٹاؤن، کراچی)

جواب :

شریعت کی رُو سے زنا حرامِ قطعی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے:
وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِیْلًا ۝۳۲
ترجمہ: "اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ، بے شک یہ بڑی بے حیائی ہے اور برا راستہ ہے"، (بنی اسرائیل:32)۔

مذکورہ بالا آیتِ کریمہ کے علاوہ دیگر کئی نصوصِ قرآنیہ اور روایات احادیث سے زنا کا حرام ہونا ثابت ہے، لہٰذا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے کہ وہ زنا کے ارتکاب سے بچے، اگر کسی سے یہ غلط کام سرزد ہو جائے تو اُس کو چاہئے کہ عذابِ آخرت سے بچنے کے لئے توبہ واستغفار کرے۔ اس تمہید کے بعد فقہاء کرام کی تصریحات کی رو سے حرمتِ نکاح کے اسباب میں سے ایک سبب حرمتِ مصاہرت ہے یعنی سسرالی رشتہ۔ حرمتِ مصاہرت رشتۂ نکاح سے بھی ثابت ہوتی ہے اور اسی طرح زنا اور اسبابِ زنا (جیسے شہوت سے بوس وکنار وغیرہ) سے بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ زنا یا اسبابِ زنا سے سات عورتیں حرام ہو جاتی ہیں: (۱) مزنیہ کی ماں (۲) دادی (۳) نانی (۴) بیٹی (۵) پوتی (۶) نواسی (۷) باپ کی مزنیہ (یعنی جس سے باپ نے زنا کیا ہو)

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں :

فمن زنی بامرأۃ حرمت علیہ اُمّھا وان علت وابنتھا وان سفلت وکذا تحرم المزنی بھا علی اٰباء الزانی واجدادہ وان علوا الخ،

ترجمہ: ’’جس شخص نے کسی عورت کے ساتھ زنا کیا، تو اس شخص پر اس عورت کی ماں (اوپر تک یعنی دادی، نانی وغیرہ) حرام ہے اور نیچے تک اس کی بیٹی بھی حرام ہے (یعنی پوتی، نواسی وغیرہ)، اسی طرح جس عورت سے زنا کیا ہو، وہ زانی کے باپ دادا (اوپر تک) حرام ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:274)‘‘

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ زانی مرد پر مزنیہ (یعنی جس عورت کے ساتھ زنا کیا گیا ہے) عورت کے اصول وفروع حرام ہو جاتے ہیں اور بھتیجی پھوپھی کے نہ اصول میں ہے اور نہ فروع میں ہے، بلکہ یہ پھوپھی کے باپ کی فروع میں سے ہے۔ لہٰذا بھتیجی کے ساتھ زنا کرنے سے نکاح پر اثر نہیں پڑے گا اور مذکورہ شخص کا اپنی بیوی کے ساتھ جو مزنیہ کی پھوپھی ہے، نکاح قائم ہے۔ جہاں تک زنا کی حرمت اور قبیح ترین کبیرہ گناہوں میں سے ہونے کا تعلق ہے، اس کی شدت میں کسی کمی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر نظامِ شریعت نافذ ہو تو اقرارِ جرم یا گواہوں کے ذریعے عدالت میں جرم ثابت ہونے کی صورت میں زنا کی حد نافذ ہوگی، ورنہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے معافی کے لئے توبہ ہی کا راستہ ہے، جس کی قبولیت اس کے کرم پر موقوف ہے۔

دو بیویوں کے درمیان باری مقرر کرنا

سوال:100

میرے بھائی نے چھ ماہ قبل دوسری شادی کر لی ہے اور اسی کے ساتھ رہتے ہیں۔ پہلی بیوی سے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں اور حافظِ قرآن ہیں۔ میرے بھائی 15 دن یا مہینے بعد گھر آتے ہیں، گھر کا راشن، بچوں کی فیس، کپڑے وغیرہ لاتے ہیں۔ دو چار گھنٹے بیٹھتے ہیں، لڑتے جھگڑتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ جب سے دوسری شادی کی ہے حقِ زوجیت بھی

ادا نہیں کرتے۔دوسری شادی کے بعد شوہر پر پہلی بیوی اور بچوں کے کیا حقوق اور ذمہ داری ہے؟، کیا پہلی بیوی سے نکاح قائم ہے؟،(سید زبیر علی، نارتھ کراچی)

جواب:

شرعاً دوسرا نکاح کرنے میں کوئی ممانعت نہیں ہے بشرطیکہ شوہر دونوں بیویوں کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے، دونوں کے درمیان عدل قائم کرے، یعنی دونوں کو ایک معیار کی رہائش، ایک ہی معیار کی خوراک اور مصارف زندگی فراہم کرے اور دونوں میں ایام کی تقسیم بھی برابر برابر کرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً

ترجمہ: ''یعنی اگر تمہیں خدشہ ہو کہ تم (ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان) عدل قائم نہیں کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو، (النساء:3)۔

اس آیت میں دلیل ہے کہ جو شخص مالی اور جسمانی طور پر متعدد بیویاں رکھ سکتا ہو، وہ بشرط عدل وانصاف ایک سے زیادہ نکاح کرسکتا ہے، اور اگر وہ عدل انصاف کے تقاضے پورے نہ کرسکے، تو وہ صرف ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے۔ احادیث مبارکہ میں ہے:

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ،عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: مَنْ کَانَتْ لَهٗ امْرَأَتَانِ فَمَالَ اِلٰی اِحْدَاهُمَا جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَشِقُّهٗ مَائِلٌ

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ (اُن کے درمیان عدل قائم نہ کرتا ہو بلکہ) ایک کی طرف مائل ہو تو قیامت کے دن اِس طرح حاضر ہوگا کہ اُس کا آدھا دھڑ مائل (جھکا ہوا) ہوگا۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث:2126)

(۲) اِذَا کَانَ عِنْدَ الرَّجُلِ امْرَأَتَانِ فَلَمْ یَعْدِلْ بَیْنَهُمَا جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَشِقُّهٗ سَاقِطٌ۔

ترجمہ: ''جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ اُن کے درمیان عدل نہیں کرتا، تو قیامت کے دن اِس طرح حاضر ہوگا کہ اُس کا آدھا دھڑ ساقط (بے کار) ہوگا''۔

(سُنن ترمذی، رقم الحدیث:1144، ابوداؤد:2132، سنن ابن ماجہ:1969)

ازدواجی تعلقات میں مساوات سے متعلق علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

(یجب ان یعدل) ای ان لا یجور (فیہ) ای فی القسم بالتسویۃ فی البیتوتۃ (وفی الملبوس والماکول) والصحبۃ (لافی المجامعۃ) کالمحبۃ بل یستحب۔

ترجمہ: ''(جس کی ایک سے زائد بیویاں ہوں) اُس پر دونوں کے درمیان عدل کرنا واجب ہے یعنی کسی ایک پر ظلم نہ کرے، اس کی صورت یہ ہے کہ دونوں کے ساتھ شب باشی اور لباس وطعام میں مساوات برتے، محبت کی طرح مباشرت میں بھی مساوات مستحب ہے (کیونکہ بعض امور کی جانب طبعی میلان میں انسان کا بس نہیں چلتا)۔۔۔۔۔اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قَالَ فِی ''الفتح'': وَاعلَم ان ترک جماعِھا مطلقًا لایَحِلُّ لَہٗ، صرّح اصحابُنا بأنّ جماعَھا احیانًا واجبٌ دیانۃً، لایدخل تحت القضاء۔

ترجمہ: ''فتح القدیر'' میں ہے: کسی ایک بیوی سے مباشرت ترک کردینا جائز نہیں ہے، ہمارے اصحاب نے صراحت کی ہے کہ وقتاً فوقتاً ہر بیوی کے ساتھ مباشرت دیانتاً واجب ہے، لیکن قضاءً نہیں (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 4، ص:283-282)''۔

یہ بہر حال لازم ہے کہ وہ دونوں بیویوں کے ہاں رہنے کے لئے دن مقرر کرے اور ایام کی تقسیم برابر برابر رکھے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

ویقیم عند کل واحدۃ منھن یومًا ولیلۃً لکن انما تلزمہ التسویۃُ فی اللیل، حتی لو جاء لِلاولیٰ بعدَ الغروب وللثانیۃِ بعدَ العشاء فقد ترکَ القسم، ولایجامعھا فی غیر نوبتھا ولونھارًا وکذا لایدخل علیھا الّا لعیادتھا ولواشتدّ

ترجمہ: ''اور (جس کی دو یا زائد بیویاں ہوں تو) ہر بیوی کے پاس شوہر دن رات (برابر) قیام کرے، لیکن برابری رات میں لازم ہے (کہ جتنی رات پہلی بیوی کے پاس رہا اتنا ہی دوسری کے پاس رہے) یہاں تک کہ اگر ایک بیوی کے پاس غروبِ آفتاب کے بعد آیا اور دوسری کے پاس عشاء کے بعد آیا تو عدل جاتا رہا (یعنی دونوں بیویوں کے درمیان

مساوات کا تقاضا پورا نہیں ہوا)۔ اور کسی بیوی کے ساتھ اُس کے باری کے سوا مباشرت نہ کرے اگرچہ دن ہی میں ہو اور اسی طرح باری کے سوا اُس کے پاس رات کو نہ جائے سوائے اِس کے کہ اگر وہ بیمار ہے تو اس کی عیادت کے لئے جا سکتا ہے۔۔۔ مزید لکھتے ہیں:

(وان شاء ثلاثاً) ای ثلاثۃ أیام ولیالیھا (ولا یقیم عندھا اکثرالا بأذن الاخریٰ)

ترجمہ: ''اگر چاہے تین دن اور تین راتیں ہر ایک کے پاس رہے، دونوں میں سے کسی ایک کے پاس دوسری بیوی کی اجازت کے بغیر (باری سے) زیادہ دن قیام نہ کرے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 4، ص: 288، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)

الغرض شرعاً قیامِ عدل کی شرط کا لحاظ کرتے ہوئے ایک سے زائد نکاح کی اجازت ہے بشرطیکہ تمام ازواج کے درمیان ایام کی تقسیم برابر برابر کرے اور رہائش، لباس اور طعام (یعنی نان ونفقہ) کا معیار بھی یکساں رکھے۔

آپ نے جو صورتِ حال بیان کی ہے اس کی رو سے آپ کے بھائی کا طرزِ عمل شریعت کے بالکل خلاف ہے۔ انہیں چاہئے کہ حدیث مبارک میں بیان کی ہوئی ''وعید'' کی روشنی میں آخرت کے خسارے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگیں اور توبہ کریں۔ اور اپنی پہلی بیوی اور بچوں سے بھی معافی مانگیں اور اپنی ازواج کے درمیان عدل قائم کریں۔ تاہم نکاح اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک خدانخواستہ طلاق نہ ہو جائے یا شوہر وفات نہ پا جائے۔

دوسری شادی کی بابت شرعی حکم اور مسائل

میرے شوہر کی ایک بیوی پہلے سے ہے، پہلی بیوی سے اُن کی دو بیٹیاں ہیں۔ دونوں کے حقوق و فرائض سے متعلق مجھے چند سوالات کے جوابات چاہئیں۔

(ثمرین رحمانی A-35 بھایانی ہائٹس گلشن اقبال، کراچی)

سوال: 101

1۔ اگر کوئی شخص دوسری شادی کرنا چاہتا ہو، تو اس سلسلے میں پہلی بیوی کی شرعی ذمہ داری کیا ہے؟

جواب :

شریعت میں شوہر کو دوسری شادی کی اجازت ہے لیکن یہ اجازت مطلق نہیں ہے بلکہ دونوں ازواج کے درمیان عدل کے ساتھ مشروط ہے، چنانچہ اللہ جل شانہٗ نے فرمایا وَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً

ترجمہ: ''اور اگر (ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی صورت میں) تمہیں اندیشہ ہو کہ (تمام ازواج کے درمیان) عدل قائم نہیں کر سکو گے تو صرف ایک نکاح پر اکتفا کرو، (النساء:3)

دوسری شادی کو مغرب میں غیر قانونی قرار دیا گیا ہے، مگر وہاں دوسری عورتوں کے ساتھ ان کی رضامندی سے جنسی تعلقات رکھنے کی کھلی آزادی ہے، نہ قانوناً جرم ہے اور نہ ہی معاشرے میں اسے معیوب سمجھا جاتا ہے، جبکہ اسلامی تعلیمات اور مسلم معاشرے کا مزاج مغرب کے اباحتِ کلی (Total Permissibility) سے بالکل مختلف ہے، یعنی سب جائز ہے کا اصول اسلام میں قابلِ قبول نہیں ہے۔ لہٰذا اگر شوہر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنے حالات وضروریات کے مطابق قائل کریں کہ وہ اپنا فیصلہ بدل دے، ورنہ اسے اجازت دیدیں اور اپنے اور اپنی بچیوں کے جائز شرعی حقوق پر اصرار کریں، چاہیں تو اس کی بابت اس سے ایسا اقرار نامہ لے لیں جسے قانونی تحفظ حاصل ہو۔

دو بیویوں کے درمیان ایام کی تقسیم

سوال: 102

2۔ دو بیویاں رکھنے کی صورت میں شوہر مہینے کے کتنے دن اور کتنی راتیں دونوں کے گھروں میں گزارنے کا پابند ہے اور وسائل کو ان کے درمیان کس طرح تقسیم کرے؟ دونوں کے اخراجات کے درمیان کس تناسب سے خرچ کرے؟۔

جواب:

مرد کے دوسرا نکاح کرنے میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے بشرطیکہ وہ دونوں بیویوں کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے اور دونوں کے درمیان عدل قائم کرے، یعنی دونوں کو یکساں

معیار کی رہائش، نان ونفقہ اور مصارف زندگی فراہم کرے۔اور دونوں میں ایام کی تقسیم بھی برابر برابر کرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً
ترجمہ: ''یعنی اگر تمہیں خدشہ ہو کہ تم ایک سے زیادہ ازواج کے درمیان عدل قائم نہیں کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو، (النساء:3)۔

اس آیت میں یہ مشروط اختیار ہے کہ جو شخص مالی اور جسمانی طور پر متعدد بیویاں رکھ سکتا ہو، وہ عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ایک سے زیادہ نکاح کرسکتا ہے، اگر وہ انصاف قائم نہ کرسکتا ہو تو صرف ایک بیوی نکاح میں رکھے۔

نوٹ: اس موضوع پر سوال نمبر:100 کے جواب میں درج احادیث مبارکہ اور فقہاء کرام کے ارشادات ملاحظہ فرمائیں۔

دوسری بیوی کو طلاق دلانے کے جتن کرنا

سوال:103

3۔اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی دوسری بیوی کو اپنے لئے بے عزتی تصور کرتے ہوئے اپنے شوہر کو اُسے طلاق دینے پر مجبور کرتی ہے، اور اس کے لئے وہ ہر جتن کرتی ہے، تو کیا اُس کا مطالبہ اور اِس سلسلے میں اُس کی کوششیں جائز ہیں؟ اگر شوہر اپنی کسی ایک بیوی کی باتوں میں آکر یا اُن دونوں بیویوں کی ضد اور بحث سے تنگ آکر کسی ایک کو یا دونوں کو چھوڑ دیتا ہے تو کیا شوہر کا یہ عمل جائز ہے؟۔

جواب:

کسی عورت کا اپنے شوہر کے دوسرے نکاح کو اپنے لئے بے عزتی تصور کرنا، شرعی احکام سے جہالت کی بنا پر ہے۔کیا آپ کو یہ بات پسند ہے کہ آپ کا شوہر حرام کاری میں مبتلا ہو، لہٰذا مذکورہ عمل کسی طرح بھی درست نہیں، اگر دونوں بیویوں کے حقوق پورے ہو رہے ہیں تو کسی ایک بیوی کا دوسری بیوی کو طلاق دینے کیلئے شوہر کو مجبور کرنا ناجائز ہے۔تمام مباح امور میں طلاق اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ "اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ الطَّلَاقُ"۔
ترجمہ: "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "(تمام) حلال امور میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ امر طلاق ہے۔
(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 2171)

(۲) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَيْسَ مِنَّا مَنْ خَبَّبَ اِمْرَاَةً عَلٰى زَوْجِهَا
ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایسا شخص جو کسی عورت کو اُس کے شوہر کے خلاف برگشتہ کر کے اُن کے درمیان فساد پیدا کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے، (سُنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 2168)"۔

جس طرح شرعی جواز کے بغیر شوہر کا طلاق دینا جائز نہیں ہے، اسی طرح بیوی کا شوہر سے دوسری بیوی کو طلاق دینے کا مطالبہ بھی جائز نہیں ہے۔ شوہر کو چاہیے کہ طلاق دینے سے گریز کرے، طلاق دینا، اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے نزدیک ناپسندیدہ فعل ہے۔ بعض لوگ وقتی طور پر مغلوب الغضب ہو کر تین طلاقیں دے بیٹھتے ہیں، بعد میں دونوں ہی پشیمان ہوتے ہیں، نتیجتاً بچوں کی تربیت اور پرورش کا معاملہ ابتری کا شکار ہو جاتا ہے۔

دوسری بیوی سے ملنے سے روکنا

سوال:104

4۔ پہلی بیوی شوہر کو دوسری بیوی سے ملنے سے روکنے کا حق رکھتی ہے جبکہ وہ اُس کی ضروریاتِ زندگی کا بھی خیال رکھتا ہے؟۔

جواب:

شریعت مطہرہ میں بیویوں کے حقوق مساوی رکھے گئے ہیں، یعنی شوہر پر یہ لازم ہے کہ اگر اس کی دو یا دو سے زیادہ بیویاں ہوں، تو وہ سب کے پاس برابر وقت گزارے۔ اُس کی کسی بیوی کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسری بیوی کے پاس رہنے یا ملنے سے اپنے شوہر کو روکے۔ قرآن مجید میں ایک سے زائد نکاح کرنے کا حکم ہی اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ اُن

کے درمیان عدل کرے، اگر عدل پر قادر نہ ہو، تو ایک ہی نکاح پر اکتفا کرے۔

شوہر کے فرائض

سوال:105

5۔ جو بیوی شوہر کی اطاعت نہ کرے اور شوہر اُسے کسی وجہ سے چھوڑنا بھی نہ چاہتا ہو تو ایسی بیوی کے معاملے میں شوہر کے کیا فرائض ہیں؟۔

جواب :

بیوی پر فرض ہے کہ وہ اپنے شوہر کی اطاعت اور فرماں برداری کرے، قرآن مجید میں شوہر کی فرماں بردار عورت کو نیک قرار دیا گیا ہے:

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ

ترجمہ: ”نیک عورتیں (شوہر کی) فرمانبرداری کرتی ہیں اور شوہر کی غیر موجودگی میں (اس کے مال اور اپنی عِفت وحیا کی) حفاظت کرتی ہیں، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے حفاظت کا حکم دیا ہے، (النساء:34)“۔

ایک حدیث پاک میں بیوی کے ناشکرے پن کو جہنم کے عذاب کا سبب قرار دیا گیا ہے،

عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِذَا صَلَّتِ الْمَرْأَةُ خَمْسَهَا وَصَامَتْ شَهْرَهَا وَحَفِظَتْ فَرْجَهَا وَاَطَاعَتْ زَوْجَهَا قِيْلَ لَهَا اُدْخُلِيْ مِنْ اَيِّ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ شِئْتَ، رواہ احمد والطبرانی فی الاوسط فیہ ابن لھیعہ۔ وحدیثہ حسن وبقیۃ رجالہ رجال الصحیح۔

ترجمہ: ”حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب عورت پانچ وقت کی نمازیں پڑھے اور رمضان کے روزے رکھے اور اپنی عصمت (شرمگاہ) کی حفاظت کرے اور اپنے شوہر کی فرمانبرداری کرے، (قیامت کے دن) اس سے کہا جائے گا: جس دروازے سے چاہو جنت میں داخل ہو جاؤ، یہ حدیث مسند احمد اور معجم طبرانی میں ہے، اس کے راویوں میں عبداللہ بن لھیعہ ہے، جس کی احادیث حسن

ہیں اور اس حدیث کے باقی راوی حدیث صحیح کے راوی ہیں۔(مجمع الزوائد، جلد 4 ص:306)

شریعتِ مطہرہ میں عورتوں کو بھی مردوں کے مساوی حقوق دیئے گئے ہیں، لیکن مردوں کو ایک درجہ فضیلت عطا کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ

ترجمہ:''اور عورتوں کے مردوں پر وہی حقوق ہیں جو دستور کے مطابق مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں، البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت ہے(البقرہ:228)''۔

اسلامی تعلیمات کی رو سے میاں بیوی کو ازدواجی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ سلوک اور اتحاد و اتفاق سے گزارنی چاہئے، ایک دوسرے کی خامیوں سے حتی الوسع صرف نظر کرنا چاہئے۔خاص طور پر شوہروں کو اُن کی بیویوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ﴿١٩﴾

ترجمہ:''اور تم اُن کے ساتھ نیک سلوک کرو، پھر اگر وہ تمہیں پسند نہ آئیں تو ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند نہ کرو اور اللہ اس میں بھلائی رکھ دے،(النساء:19)''۔

یعنی اگر تمہیں اپنی بیویاں پسند نہ آئیں تو صبر سے کام لو، ممکن ہے کہ اس میں تمہارے لئے کوئی بہتری ہو۔ان کلماتِ مبارکہ میں شوہروں کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ اگر بالفرض تمہاری بیوی تمہیں بدصورتی کی وجہ سے ناپسند ہو، تب بھی حتی الامکان اپنی طبیعت پر جبر کر کے اسے برداشت کرو اور طلاق نہ دو۔ہو سکتا ہے شکل وصورت کی کمی کو اللہ تعالیٰ اس کے حسنِ اخلاق سے پورا فرما دے اور اس کی اچھی سیرت و کردار کی بدولت تمہارا گھر امن وسکون کا گہوارہ بن جائے۔اور اگر وہ بد اخلاق ہے اور تم اس کی اخلاقی کمزوری برداشت کرلو تو کوئی بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس صبر کی جزا وانعام کے طور پر تمہیں خوبصورت اور اعلیٰ ذہنی وجسمانی استعداد کی حامل اولاد سے نواز دے۔ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ شوہر اور بیوی کے مزاج میں پوری مطابقت ہو جائے، دونوں کی سوچ ایک ہو جائے۔اگر ایسا حسنِ اتفاق

ہو جائے تو یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا بندے پر بے پایاں فضل وانعام اور کرم ہوگا۔ شکل وصورت، رنگ روپ اور مزاج میں تنوع اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ۝

ترجمہ: ''اس کی (قدرت) کی نشانیوں میں سے (ایک) آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا (ایک دوسرے سے) مختلف ہونا ہے، بے شک اس میں دنیا والوں کے لئے نشانیاں ہیں، (الروم: 22)''۔

لہٰذا اگر شوہر اور بیوی کی سوچ میں فرق ہو بلکہ تضاد ہو تو ایسے شوہروں کو رسول اللہ ﷺ کے اس ارشادِ مبارک کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ مَنْ كَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَاِذَا شَهِدَ اَمْرًا فَلْیَتَكَلَّمْ بِخَیْرٍ اَوْ لِیَسْكُتْ وَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَیْرًا فَاِنَّ الْمَرْاَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ وَاِنَّ اَعْوَجَ شَیْءٍ فِی الضِّلَعِ اَعْلَاهُ اِنْ ذَهَبْتَ تُقِیْمُهٗ كَسَرْتَهٗ وَاِنْ تَرَكْتَهٗ لَمْ یَزَلْ اَعْوَجَ اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، وہ جب کسی چیز کو دیکھے تو یا تو اچھی بات کہے ورنہ خاموش رہے۔ عورتوں کے ساتھ خیر خواہی کرو کیونکہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی کا اوپر کا حصہ زیادہ ٹیڑھا ہے اگر تم اس کو سیدھا کرنے لگو گے تو توڑ دو گے اور اگر تم نے اس کو (اُس کے حال پر) چھوڑ دیا تو وہ ہمیشہ ٹیڑھی رہے گی، عورتوں سے خیر خواہی کرو (یعنی حکمت وتدبیر اور صبر واستقامت کے ساتھ ان کی اصلاح کرو)، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 3539)''۔ ایک اور روایت میں ہے:

اِنَّ الْمَرْاَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ لَنْ تَسْتَقِیْمَ لَكَ عَلٰی طَرِیْقَةٍ، فَاِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا، اِسْتَمْتَعْتَ بِهَا وَبِهَا عِوَجٌ، وَاِنْ ذَهَبْتَ تُقِیْمُهَا كَسَرْتَهَا وَكَسْرُهَا طَلَاقُهَا۔

ترجمہ: ''عورت ''پسلی'' سے پیدا کی گئی ہے، وہ سیدھا کرنے سے سیدھی نہیں ہوگی، اگر تم اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو اس کی کجی کے باوجود اس سے فائدہ اٹھاؤ، اگر تم اس کو سیدھا کرنے لگو گے تو اس کو توڑ دو گے، اور اس کا توڑنا اسے طلاق دینا ہے۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث:3536)

عورت کو ٹیڑھی پسلی سے تشبیہ دینے کا مقصد یہ نہیں کہ اُس کی اصلاح کی کوشش نہ کی جائے، بلکہ شوہر کو تعلیم دی گئی ہے کہ پیار و محبت اور نرمی سے اسے سمجھائے۔ اور بعض صورتوں میں اس کی طبعی کمزوریوں کے باوجود اس سے نباہ کرے۔ جو عورت شوہر کے لئے تکلیف و ایذا کا سبب بنتی ہو، اُس کے لئے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

عَنْ مُعَاذِبْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لَاتُوْذِيْ اِمْرَأَةٌ زَوجَهَا اِلَّا قَالَتْ زَوجَتُهُ مِنَ الْحُوْرِ الْعِيْنِ لَاتُوْذِيْهِ قَاتَلَكِ اللهُ! فَاِنَّمَا هُوَعِنْدَكَ دَخِيلٌ أَوْشَكَ اَنْ يُّفَارِقَكِ اِلَيْنَا۔

ترجمہ: ''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب کوئی عورت اپنے شوہر کو تکلیف پہنچاتی ہے، تو حوروں میں اس کی بیوی کہتی ہے کہ اسے تکلیف نہ دو، اللہ! تجھے ہلاک کرے، یہ تو تیرے پاس چند روز کے لئے ہے۔ عنقریب یہ (وفات کے بعد) تجھے چھوڑ کر ہمارے پاس آجائے گا''۔

(سنن ترمذی، رقم الحدیث :1177، سنن ابن ماجہ 2014 ، مسند احمد:22162)

اگر کوئی عورت شریعت کے احکام سن کر بھی اپنے رویے سے باز نہ آئے تو قرآن مجید میں اسے ''ناشزہ'' (نافرمان) قرار دیا گیا ہے اور اس کیلئے قرآن مجید میں تدریجی اصلاح کا جو طریقہ تعلیم فرمایا ہے، وہ یہ ہے: وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ

ترجمہ: ''اور تمہیں جن عورتوں کی نافرمانی کا اندیشہ ہو، انہیں سمجھاؤ اور (اگر نصیحت بے اثر ثابت ہو تو) خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو اور (پھر بھی باز نہ آئیں تو) انہیں (تنبیہ

کے طور پر معمولی) مار پیٹ کرو، (النساء: 34)''۔ اس آیت مبارکہ میں نافرمان بیوی کی اصلاح کے لئے تین مرحلے تجویز کئے گئے ہیں:

(۱) اُسے پیار و محبت سے سمجھائیں، واعظانہ اور ناصحانہ انداز میں اسے اس کے رویئے کے برے نتائج سے آگاہ کریں، چنانچہ فرمایا: فَعِظُوْهُنَّ، یعنی انہیں نصیحت کرو۔

(۲) اگر وعظ و نصیحت کارگر ثابت نہ ہو تو تنبیہ کے طور پر خواب گاہ میں اس سے علیحدگی اختیار کرو، شاید اُسے سمجھ آجائے۔ یہ قطع تعلق نفرت کے جذبے سے نہیں بلکہ اصلاح کی نیت سے کیا جائے، اس کے لئے فرمایا: وَاهْجُرُوْهُنَّ، یعنی عارضی طور پر ان سے دوری اختیار کرو۔

(۳) اگر یہ تدبیر بھی کارگر ثابت نہ ہو تو تنبیہ کے طور پر معمولی مار پیٹ کی اجازت ہے، لیکن چہرے پر تھپڑ مارنے یا ضربِ شدید کی اجازت نہیں ہے۔

بیوی کے دائمی مریض ہونے کی صورت میں دوسری شادی کا حق

سوال:106

ایک شخص جس کی شادی چار پانچ سال قبل ہوئی، اس کے تین بچے بھی ہیں۔ ابھی بلڈ ٹیسٹ سے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی کو ہیپاٹائٹس سی یعنی انتہائی درجے کا یرقان ہے، جو بہت خطرناک مرض ہے۔ میاں بیوی کے ازدواجی تعلق سے شوہر کو یہ بیماری لگنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نے بھی آپس میں ملنے (یعنی ازدواجی تعلق قائم کرنے) سے سختی سے منع کر دیا ہے۔ گذارش یہ ہے کہ کیا ایسی صورت میں مرد کو دوسری شادی کی اجازت ہے؟، جبکہ وہ اپنی پہلی بیوی اور بچوں کی کفالت کی ذمہ داری لیتا ہے۔ اس صورت میں پہلی بیوی اور اس کے والدین دوسری شادی کی اجازت نہ دیں تو مرد کو کیا کرنا چاہئے جب کہ دوسری شادی اس کی ضرورت ہے، برائے کرم قرآن و سنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔

(محمد الطاف قادری، بلاک 20 فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب:

اگر آپ کا بیان درست ہے اور آپ پہلی بیوی اور بچوں کے حقوق کی مکمل پاس داری

کرتے ہیں اور آپ کو اپنے فطری تقاضے کی تکمیل کے لئے دوسری بیوی کی ضرورت ہے اور آپ اس کی مالی استطاعت بھی رکھتے ہیں، تو آپ کو دوسری شادی کی اجازت ہے۔ شرعاً اس کے لئے آپ اپنی پہلی بیوی یا سسرال کی اجازت و منظوری کے پابند نہیں ہیں۔ لیکن آپ کو دونوں بیویوں کے درمیان مساوات برتنی ہوگی، ایام کی تقسیم اور نان نفقے میں ایک ہی معیار رکھنا ہوگا۔

مفتی وقارالدین قادری رحمۃ اللہ علیہ سے دوسری شادی کے لئے پہلی بیوی سے اجازت سے متعلق سوال ہوا، آپ نے اس کے جواب میں لکھا: ''قرآن کریم میں آزاد مرد کو ایک سے زائد شادیاں کرنے کی اجازت دی گئی ہے، اس میں پہلی بیوی کی رضامندی یا عدمِ رضامندی کو کوئی دخل نہیں ہے، ہاں یہ تاکید فرمائی ہے کہ جب ایک سے زائد بیویاں ہوں تو ان میں عدل کرے گا۔ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ اور بود و باش رکھے گا اور اگر برابری نہیں کرے گا، تو اس پر حدیثوں میں سخت وعیدیں ہیں۔ (وقارالفتاویٰ جلد سوم، 95-94)

آپ کی پہلی بیوی کو چاہئے کہ آپ کو بخوشی دوسری شادی کی اجازت دے دیں، اگرچہ یہ اجازت لینا شرعاً ضروری نہیں ہے۔ اور اگر آپ اپنی اولاد کی خیر خواہی کے لئے اپنی خواہشات پر قابو پا سکتے ہوں، تو اس ایثار پر آپ اجر کے مستحق ہوں گے۔

خلع کے بعد دوبارہ نکاح کا حکم

سوال: 107

میری شادی جولائی 1997ء میں ہوئی۔ ایک سال کے بعد اللہ نے ایک بیٹے سے نوازا۔ حالات شروع دن سے ہی اچھے نہیں تھے، رفتہ رفتہ اس نہج پر پہنچ گئے کہ مجھے مجبوراً والدہ کے گھر آنا پڑا، جس میں بڑا کردار ان کے گھر والوں کا تھا۔ عدالت جانے سے پہلے میرے گھر والوں نے مصالحت کی ہر ممکن کوشش کی۔ 30 اکتوبر 2001ء کو عدالت سے خلع ہوگئی، تب سے اب تک میرے شوہر اپنے بیٹے سے متواتر ملتے رہے۔ اب وہ اپنی غلطیاں تسلیم کرتے ہیں اور صلح کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا ایسی حالت میں ہم میں صلح کی کوئی

گنجائش ہے۔کیا ہم پھر ایک ہو سکتے ہیں اور اس کا کیا طریقہ ہوگا؟۔کیا واپس جانے کے لئے حلالہ کرنا ہوگا؟ (شمع سلطانہ، ابوالحسن اصفہانی روڈ، کراچی)

جواب:

ابتدائی طور پر فیملی کورٹ میں دو مقدمے دائر کئے گئے تھے، ایک شمع سلطانہ بنت شوکت علی خان کی جانب سے اپنے شوہر محمد داؤد ولد سلیمان کے خلاف ''فسخِ نکاح بر بنائے خلع'' کا اور دوسرا مطالبہ محمد داؤد ولد سلیمان کی جانب سے اپنی بیوی شمع سلطانہ بنت شوکت علی خان کے خلاف حقوقِ زوجیت کا۔ بعدازاں فیملی جج کی عدالت میں محمد داؤد ولد سلیمان نے خلع پر رضامندی ظاہر کردی، لہٰذا یہ خلع درست ہے اور خلع ایک طلاق بائن کے حکم میں ہوتا ہے اور عورت پر لازم ہوتا ہے کہ اگر اس نے مہر وصول کیا ہے تو شوہر کو واپس کردے، وصول نہیں کیا تو مطالبۂ مہر سے دستبردار ہوجائے۔ خلع کے بعد زوجین عدت کے اندر اور عدت گذرنے کے بعد دونوں صورتوں میں باہمی رضامندی سے نیا مہر مقرر کر کے عقدِ ثانی کرسکتے ہیں، لیکن یہ طلاق بائن بصورتِ خلع آئندہ ممکنہ طلاقوں کے ساتھ جمع ہونے کے لئے مؤثر رہے گی۔ اگر خدانخواستہ شوہر نے دو طلاقیں مزید دیدیں، تو اس کے ساتھ جمع ہوکر طلاقِ مغلظہ ہوجائے گی، پس زوجین کو محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی۔

نکاح میں لڑکے اور لڑکی کی رضامندی ضروری ہے

سوال:108

کیا شرعی طور پر بالغ لڑکے اور لڑکی کو اپنی پسند کی شادی کرنے کا حق اسلام میں حاصل ہے؟، کیا اُن کے والدین اُن کی مرضی کے خلاف نکاح کرسکتے ہیں؟۔

(محسن مسعود، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب:

شرعاً عاقل و بالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح اُن کی مرضی کے بغیر منعقد نہیں ہوتا۔ نکاح کے صحیح طور پر منعقد ہونے کے لئے دونوں کی رضامندی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ

ترجمہ: "تو تمہیں جو عورتیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو، (النساء:3)"۔شرعاً عاقلہ بالغہ عورت کی مرضی کے بغیر اس کا نکاح نہیں ہوسکتا، حدیث پاک میں ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ جَارِيَةً بِكْرًا أَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ ، فَذَكَرَتْ أَنَّ أَبَاهَا زَوَّجَهَا وَهِيَ كَارِهَةٌ، فَخَيَّرَهَا النَّبِيُّ ﷺ ۔

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک نوجوان لڑکی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ اس کے باپ نے اُس کا نکاح کردیا ہے اور وہ اس کو ناپسند کرتی ہے، نبی کریم ﷺ نے اُسے اختیار دیا کہ چاہے تو اس نکاح کو قائم رکھے ورنہ رَد کردے، (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث:2089)۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

لا یجوز نکاح أحد علی بالغة صحیحة العقل من أب أو سلطان بغیر اذنها بکرا کانت أو ثیبا فان فعل ذلك فالنكاح موقوف على اجازتها فان اجازته جاز وان ردته بطل كذا في السراج الوهاج۔

ترجمہ: "کسی بھی عاقلہ، بالغہ کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر جائز نہیں، خواہ وہ نکاح اس کے والد یا حاکمِ وقت نے منعقد کیا ہو، وہ ثیبہ (شوہر دیدہ) ہو یا کنواری، اگر کسی نے یہ نکاح کر بھی دیا تو اُس (لڑکی) کی اجازت پر موقوف ہوگا، اگر اطلاع ملنے پر وہ اسے قبول کرلے (اور قائم رکھے) تو جائز ہوگا اور اگر وہ رَد کردے تو باطل ہوجائے گا، "السراج الوہاج" میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:287، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)"۔

عاقل وبالغ لڑکی اور لڑکا والدین کی مرضی کے بغیر بھی اپنے کفو (Equal Status) کے ساتھ نکاح کرسکتے ہیں لیکن سعادت مندی یہ ہے کہ والدین کو راضی کرلیں۔

نکاح پر نکاح کا حکم

سوال :109

اگر کسی لڑکی یا عورت کا دوسرا نکاح کروا دیا جائے اور وہ پہلے سے کسی کے نکاح میں ہو، شرعی اعتبار سے اُس کا کون سا نکاح صحیح ہے؟۔جن لوگوں نے لڑکی کی رضامندی کے بغیر زبردستی دوسرا نکاح کروایا، اُن کے متعلق کیا حکم ہے؟ (محسن مسعود، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب :

شادی شدہ عورت کا نکاح کسی دوسرے شخص سے قطعاً نہیں کیا جا سکتا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ، ترجمہ: ''اور (تم پر حرام کی گئی ہیں) وہ عورتیں جو پہلے سے دوسروں کے نکاح میں ہیں، (النساء:24)۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:

لایجوز للرجل أن یتزوج زوجۃ غیرہ وکذلک المُعتَدَّۃ کذا فی السراج الوھاج

ترجمہ: ''کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے شخص کی بیوی سے نکاح کرے اور اسی طرح ایامِ عدت میں مطلقہ عورت سے بھی نکاح جائز نہیں ہے، ''السراج الوہاج'' میں اسی طرح لکھا ہے''، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:280)۔

شادی شدہ عورت کا جان بوجھ کر دوسری جگہ نکاح کرنا ہرگز جائز نہیں، باطل و حرام ہے۔جن لوگوں کو معلوم تھا کہ یہ عورت منکوحہ ہے اور یہ جاننے کے باوجود وہ لوگ نکاح کے گواہ بنے یا نکاح پڑھایا، یا یہ نکاح کروایا، اگر انہوں نے یہ کام حلال سمجھ کر کیا ہے، تو ان سب پر توبہ و تجدیدِ اسلام لازم ہے اور شادی شدہ ہیں تو تجدیدِ نکاح بھی لازم ہے۔اور اگر اس کو حرام سمجھتے ہوئے کیا ہے، تو یہ فسق و فجور ہے اور ضلالت ہے، اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے، وہ سب لوگ اپنی اس معصیت پر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں۔

باپ کی بیوی کی (سابق شوہر سے) بیٹی سے بیٹے کا نکاح

سوال :110

ایک بیوہ یا مطلقہ عورت کسی شخص سے شادی کرے تو اس کے سابق شوہر سے جو بیٹی ہے، اس کا اُس شوہر ثانی کے کسی دوسری بیوی کے بطن سے پیدا ہونے والے بیٹے سے نکاح ہوسکتا ہے؟، (ڈاکٹر اشفاق احمد، راولپنڈی)۔

جواب:

یہ نکاح شرعاً جائز ہے۔ایک شخص نے کسی مُطلّقہ یا بیوہ عورت سے عدّت گذرنے کے بعد نکاح کیا ہو اور اُس عورت کی سابق شوہر سے بیٹی ہو، تو اس کے ساتھ اِس زوجِ ثانی کے اُس بیٹے کا نکاح جائز ہے، جو اُس کی کسی اور بیوی کے بطن سے ہے۔اسی طرح اگر ایک شخص نے کسی مُطلّقہ یا بیوہ عورت سے عدت گزرنے کے بعد نکاح کیا ہو اور اُس عورت کی سابق شوہر سے بیٹی ہے، تو اُس بیٹی سے اِس زوجِ ثانی کا باپ نکاح کرسکتا ہے، کیونکہ ان دونوں نکاحوں میں بیوی اور شوہر کے درمیان حرمتِ نکاح کا کوئی سبب نہیں ہے۔علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

واما بنت زوجة أبيه أو ابنه فحلال، ترجمہ:''اور باپ کی بیوی کی بیٹی اور بیٹے کی بیوی کی بیٹی حلال ہے (یعنی یہ نکاح جائز ہے)، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:4،ص:84)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا: زید کا ایک بیٹا ہے اور ہندہ کی ایک بیٹی، زید کا بیٹا ہندہ سے نکاح کرنا چاہتا ہے اور زید ہندہ کی بیٹی سے، اس صورت میں یہ دونوں نکاح ہوسکتے ہیں یا نہیں؟، آپ نے جواب میں لکھا:''یہ دونوں نکاح حلال ہیں، قال اللہ تعالیٰ وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ (آیت میں جن محرمات کا ذکر ہے) ان کے سوا باقی عورتوں کے ساتھ تمہارے لئے نکاح حلال ہے، النسا: 24)۔ظاہر ہے کہ زید کے بیٹے کے لئے ہندہ اگر ہوگی تو باپ کی ساس ہوگی۔ وذالك اذا تقدم نكاح زيد (اور یہ جب ہے کہ زید کا نکاح پہلے ہوا ہو) اور باپ کی ساس حلال ہے جبکہ وہ نانی نہ ہو۔ف

ردالمحتار قال الخیرالرملی لا تحرم ام زوجۃ الاب۔ ترجمہ: ''ردالمحتار میں ہے کہ خیر الدین رملی نے فرمایا: باپ کی ساس حلال ہے۔ اور زید کے لئے ہندہ کی بیٹی اگر ہوگی، تو بہو، یعنی زوجۂ پسر کی بیٹی ہوگی۔ وھذا اذا سبق نکاح ابن زید (یہ جب ہے کہ زید کے بیٹے کا نکاح پہلے ہوا ہو) اور بہو کی بیٹی حلال ہے جبکہ وہ اپنی پوتی نہ ہو۔ فی ردالمحتار اما بنت زوجۃ ابنہ فحلال۔ ردالمحتار میں ہے: بیٹے کی بیوی کی بیٹی حلال ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد: 11، ص: 316-317، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

بالغہ لڑکی کی رضامندی کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا

سوال: 111

میرے شوہر کئی مرتبہ (تین بار سے زائد) مجھے طلاق دے چکے ہیں۔ ان سے کوئی پوچھتا ہے کہ تمہاری بیوی کیا ہے؟، تو کہتے ہیں: ''وہ میری طرف سے فارغ ہے''۔ مجھے یہ بتائیے کہ مجھے طلاق ہوئی یا نہیں اور کتنی طلاقیں ہوئیں؟، یہ مغلّظہ ہے یا رجعی؟، کیا عدت گزرنے کے بعد میں دوسری شادی کے لئے آزاد ہوں؟، اگر والدین میرا زبردستی نکاح کرادیں، تو شرعاً منعقد ہوگا یا نہیں؟، (عالیہ، کراچی)۔

جواب:

اگر آپ کا دعویٰ درست ہے اور گواہوں کے ذریعے یا شوہر کے اقرار سے طلاقِ صریح ثابت ہے، تو آپ پر تین طلاقیں ہوگئیں اور تین طلاق کے بعد تحلیلِ شرعی کے بغیر رجعت کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ارشادِ ربانی ہے: فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا

ترجمہ: ''پھر اگر (وہ شوہر) اسے (تیسری) طلاق دیدے، تو وہ (عورت) اس (تیسری طلاق) کے بعد اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ (عورت) اس کے علاوہ کسی اور مرد سے نکاح کرلے۔ پھر اگر وہ (دوسرا خاوند) اسے طلاق دے دے، تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ (عدت کے بعد نکاح کرکے) آپس میں رجوع کرلیں، (البقرۃ: 230)۔

آزاد عاقل و بالغ لڑکی کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر منعقد نہیں ہوتا۔

رسول پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: (۱) اَلثَّیِّبُ اَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِیِّهَا، والبکر تستامر واذنها سکوتها، ترجمہ: ''بیوہ (یا مطلّقہ عورت) اپنے ولی کی بہ نسبت اپنے (نفس کی) زیادہ حق دار ہے اور کنواری لڑکی سے بھی اجازت لی جائے گی، اس کی اجازت اس کی خاموشی ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث:3366)''۔

(۲) لَاتُنْکِحُ الثَّیِّبُ حَتّٰی تُسْتَاْمَرُ، وَلَاتُنْکَحُ الْبِکْرُ حَتّٰی تُسْتَاْذَنُ، وَاِذْنُهَا الصُّمُوْتُ

ترجمہ: ''بیوہ یا مطلقہ عورت کا نکاح اس کے مشورے کے بغیر نہ کیا جائے اور کنواری لڑکی کا نکاح بھی اس کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے اور اس کا خاموش رہنا اس کی اجازت ہے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:5136، صحیح مسلم :1419 سنن ترمذی:1109)۔

بالغہ لڑکی (خواہ کنواری ہو یا بیوہ یا مطلّقہ) کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر صحیح نہیں ہے، وہ اپنے نکاح کی اپنے ولی کی نسبت زیادہ حق دار ہے۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

لا یجوز نکاح أحد علی بالغة صحیحة العقل من أب أو سلطان بغیر اذنها بکرا کانت أو ثیّباً فان فعل ذلك فالنکاح موقوف علی اجازتها فان اجازته جاز وان ردته بطل کذا فی السراج الوهاج۔

ترجمہ: ''کسی بھی عاقلہ بالغہ لڑکی کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر جائز نہیں، خواہ وہ نکاح اس کے والد یا حاکمِ وقت نے منعقد کیا ہو، اگر کسی نے (اس کی اجازت کے بغیر) یہ نکاح کر بھی دیا ہو، تو یہ نکاح اُس (لڑکی) کی اجازت پر موقوف ہے، اگر اطلاع ملنے پر وہ اسے قبول کرلے (اور قائم رکھے) تو جائز ہے اور اگر وہ رَد کردے تو نکاح باطل ہوجائے گا۔ ''السراج الوہاج'' میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:287)۔

لہٰذا آپ عدت گزرنے کے بعد اپنی مرضی سے جہاں چاہیں، نکاح کرسکتی ہیں، لیکن اپنے والدین کو بھی اس پر راضی کرلیں تو یہ بات آپ کے لئے سعادت کا باعث ہوگی۔

شوہر کا بیوی کو یہ کہنا کہ: ''تو میری طرف سے فارغ ہے''، یہ کنایہ ہے اور اس کا مدار

شوہر کی نیت پر ہے، اگر اس نے طلاق کی نیت سے یا غصے کی حالت میں کہا ہو تو ایک طلاقِ بائن واقع ہوگی اور عدت گزرنے کے بعد وہ عورت آزاد ہے۔ اگر اس کلمے کا اعادہ عدت گزرنے کے بعد کیا ہو، تو وہ غیر مؤثر ہے۔ عدت کے دوران یا عدت گزرنے کے بعد وہ دونوں تجدیدِ نکاح کر سکتے ہیں۔ پہلا مہر عدمِ ادائیگی کی صورت میں شوہر پر واجب رہے گا اور عقدِ ثانی کی صورت میں از سرِ نو مہر مقرر کرنا ہوگا۔

بلوغت کے بعد نابالغ لڑکی کے نکاح کے فسخ کا مسئلہ

سوال:112

ایک لڑکے اور لڑکی کا نکاح سنِ بلوغت سے پہلے ان کے والدین نے کر دیا تھا، اب بلوغت کے بعد لڑکی اس نکاح پر راضی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا لڑکی کو نکاح فسخ کرنے کا حق ہے یا نہیں؟، فقہ حنفی کی رُو سے جواب عنایت فرمائیں، (غلام فرید، آزاد کشمیر)

جواب:

فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق نابالغ لڑکی کا نکاح اگر اس کے باپ نے کیا ہو، تو وہ صحیح طور پر منعقد ہو جاتا ہے اور بالغ ہونے کے بعد لڑکی کو اسے فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

فان زوجهما الابُ والجدُّ فلا خیارَ لهما بعد بلوغهما وان زوجهما غیر الابِ والجدِّ فلکلِّ واحدٍ منهما الخیارُ اذا بلغَ، ان شآءَ اقام علی النکاح وان شآءَ فسخ وهذا عند ابی حنیفة ومحمد رحمهما الله تعالیٰ ویشترط فیه القضاءُ۔

ترجمہ: "اگر نابالغ لڑکے اور لڑکی کا نکاح ان کے باپ اور (باپ کی عدمِ موجودگی میں) دادا نے کیا ہو، تو ان دونوں کو بالغ ہونے کے بعد (فسخِ نکاح کا اختیار نہیں ہے)، اور اگر ان دونوں کا نکاح باپ اور دادا کے علاوہ کسی اور ولی نے کیا ہو، تو بالغ ہونے پر ان دونوں کو اختیار حاصل رہے گا کہ اگر چاہیں تو نکاح کو قائم رکھیں اور چاہیں تو فسخ کر دیں، اور یہ امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہے اور اس میں قضا شرط ہے"، (فتاویٰ عالمگیری، جلد:1،ص:285)

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں: وللولی انکاح الصغیر والصغیرۃ جبراً۔۔۔۔ لزم النکاح ان کان الولی ابا اوجدا،

ترجمہ: ''اگر ولی باپ اور دادا ہوں تو انہیں نابالغ لڑکے اور لڑکی کا نکاح جبراً کرنے کا اختیار ہے اور نکاح لازم ہوجاتا ہے، (یعنی ان کی اجازت پر موقوف نہیں ہے اور نہ ہی اس میں خیارِ بلوغ ہے، یہ اس صورت میں ہے) جب کہ ولی باپ یا دادا ہوں''۔
(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد:4، ص:127)

مسئلۂ خیارِ بلوغ کی وضاحت

گزشتہ دنوں خیارِ بلوغ کے موضوع پر ایک فتویٰ ہم نے روزنامہ ایکسپریس کے کالم ''تفہیم المسائل'' میں شائع کیا، اس مسئلے کی تفصیل نہ ہونے کی وجہ سے کئی علماءِ کرام نے ٹیلیفون پر وضاحت چاہی، لہٰذا ہم اس مسئلے کی تفصیل قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تاکہ ہماری طرف سے اختصار کی بنا پر جو غلط فہمی ہوئی، اس کا ازالہ ہو اور قارئین حقیقت حال سے آگاہ ہوں۔ نابالغ لڑکے اور لڑکی کے نکاح کی بابت فقہاءِ کرام فرماتے ہیں کہ اگر ان کا نکاح ان کے باپ یا دادا نے کیا ہو، تو بالغ ہونے پر لڑکی یا لڑکے کو نکاح کے فسخ کا اختیار حاصل نہیں ہے، جو عبارت ہم نے گزشتہ فتوے میں نقل کی اس کا مفاد یہ ہے کہ ''اگر باپ یا دادا کے علاوہ دیگر اَولیاء (یعنی سرپرستوں Guardians) میں سے کسی اور نے ان کا نکاح کردیا ہو، تو بالغ ہونے پر انہیں خیارِ بلوغ حاصل ہے''۔

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر المرغینانی لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''نابالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح ان کے باپ یا دادا نے کروایا، تو انہیں بالغ ہونے کے بعد (نکاح فسخ کرنے کا) اختیار نہیں، (ہدایہ اولین، ص:317)۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

فان زوجها الاب والجد فلا خیار لهما بعد بلوغهما وان زوجها غیر الاب، والجد فلکل واحد منهما الخیار اذا بلغ ان شاء أقام علی النکاح وان شاء فسخ وهذا عند

ابی حنیفة ومحمد رحمهما الله تعالیٰ ویشترط فیه القضاء بخلاف خیار العتق کذا فی الهدایة۔

ترجمہ:''نابالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح ان کے باپ اور دادا نے کروایا، تو انہیں بالغ ہونے کے بعد (نکاح فسخ کرنے کا) اختیار نہیں، اگر باپ اور دادا کے علاوہ کسی اور شخص یا ولی نے ان کا نکاح کیا، تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو یہ اختیار ہے کہ جب بالغ ہو جائیں تو چاہیں تو اس نکاح کو قائم رکھیں اور اگر چاہیں تو فسخ کر دیں، یہ (حکم) امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک ہے، اور اس فسخ کے لئے قضا (قاضی کا حکم) شرط ہے، یہ خیارِ عتق کے خلاف ہے (یعنی خیارِ عتق میں قضاءِ قاضی شرط نہیں ہے)، ہدایہ میں بھی اسی طرح ہے''۔
(فتاویٰ عالمگیری، جلد اول، ص:285، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

مذکورہ فتوے میں امام احمد رضا قادری قُدِّس سرُّہ العزیز کی مُحوَّلہ عبارت کا تعلق اس نکاح سے ہے جو باپ یا دادا کے علاوہ کسی اور ولی نے کیا ہو، جس کی پوری عبارت مع سوال پیش کی جاتی ہے: سوال: زید نابالغ کا نکاح ہندہ نابالغہ کے ساتھ ان کے وارثوں نے کیا، یہ نکاح جائز ہے یا نہیں؟ اور زید یا ہندہ بعد بلوغ اسے فسخ کر سکتے ہیں یا نہیں؟۔

جواب: سائل مظہر کہ زید کا نکاح اُس کے باپ نے کیا، اور باپ کا کیا ہوا نکاح لازم ہوتا ہے یعنی اولاد کو اس کے فسخ کا اختیار نہیں ہوتا۔

فی الدر المختار لزم النکاح ولو بغبن فاحش بزیادة مهره او بغیر کفؤ ان کان الولی ابا او جدا ولم یعرف منهما سُوٓ الاختیار

ترجمہ:''درمختار میں ہے: جب باپ یا دادا نے اپنی ولایت میں نکاح کیا ہو، تو اگر چہ مہر میں غیر معمولی کمی یا اضافہ کیا ہو یا غیر کفؤ میں کیا ہو، تو وہ نکاح لازم و نافذ ہوگا، بشرطیکہ باپ اور دادا کا اس سے پہلے اِس اختیار کا غلط استعمال مشہور نہ ہو''۔

اور ہندہ کا نکاح اس کے چچا نے کیا کہ ہندہ کا باپ مر چکا تھا، اس صورت میں اگر زید ہندہ کا کفو نہیں یعنی اس سے قوم یا دین یا پیشہ وغیرہ امور معتبرہ میں ایسا گھٹا ہوا ہے، جس کے

ساتھ نکاح ہونا باعثِ عار و بدنامی ہو یا یہ کہ ہندہ کا جس قدر مہر مثل تھا اُس سے بہت کم باندھا گیا تو ان صورتوں میں نکاح اصلاً صحیح نہ ہوا، یہاں تک کہ اگر ہندہ بالغہ ہوکر اسے جائز رکھے تب بھی جائز نہ ہوگا۔

فی الدر المختار ان کان المزوج غیر الاب وابیه ولو الام لایصح النکاح من غیر کفؤ اوبغبن فاحش اصلا ومافی صدر الشریعة صح ولهما فسخه وهم ۔

ترجمہ: ''درمختار میں ہے: اگر نکاح کرانے والا باپ اور دادا کے علاوہ کوئی اور ہو، خواہ ماں ہی ہو، تو غیر کفو میں یا مہر میں غیر معمولی کمی یا زیادتی کی صورت میں ایسا نکاح بالکل صحیح نہیں ہوگا اور جو صدر الشریعہ میں کہا گیا کہ ایسا نکاح صحیح ہے اور نابالغ لڑکا، لڑکی کو (بلوغت کے) بعد فسخ کا اختیار ہے، یہ محض وہم ہے''۔ اور اگر یہ بات نہیں بلکہ زید کفو ہے اور مہر مثل میں غیر معمولی کمی نہ کی ہو، تو نکاح صحیح ہو گیا مگر ہندہ کو اختیار ہے کہ بعد بلوغ فوراً اس نکاح کو رَد کردے اور حاکمِ شرع کے حضور دعویٰ کر کے فسخ کرائے۔

فی الدر المختار وان کان من الکفؤ وبمهر المثل صح ولصغیر وصغیرة خیار الفسخ ولو بعد الدخول بالبلوغ اوالعلم بالنکاح بعده لقصور الشفقة بشرط القضاء للفسخ

ترجمہ: ''درمختار میں ہے: ''اگر مہرِ مثل پر اور کفوٗ میں نکاح کیا ہو، تو صحیح ہے، لیکن نابالغ لڑکے اور لڑکی کو فسخ کا اختیار ہے، اگرچہ (بلوغ سے پہلے) دخول ہو چکا ہو اور یہ اختیار بالغ ہونے کے ساتھ ہوگا (اگر نکاح ہونے کا علم نہیں تھا تو) بلوغ کے بعد نکاح کے علم ہونے کے ساتھ ہوگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ باپ اور دادا کے غیر میں شفقت کمزور ہوتی ہے، تاہم فسخ کرنے کے لئے قاضی کا حکم شرط ہے''۔

مگر اس صورت میں کہ ہندہ کنواری ہے، تو حالتِ بلوغ میں جس وقت نکاح پر مطلع ہو فوراً رَد کردے اور پہلے سے مطلّع تھی تو بالغ ہوتے ہی معاً نکاح کو رد کردے، تو نکاح فسخ ہوجائے گا لیکن اگر ذرا بھی دیر کی، تو نکاح لازم ہوجائے گا اور اسے فسخ کرانے کا اختیار نہ

رہے گا، بحوالہ درمختار لکھتے ہیں:

فی الدرالمختار بطل خیار البکر بالسکوت لو مختارۃ عالمۃ باصل النکاح ولایمتد الی آخر المجلس

ترجمہ: ''درمختار میں ہے: ''اطلاع ملنے پر باکرہ (کنواری) کا ارادۃً سکوت اس کے فسخ کے اختیار کو باطل کردیتا ہے، بشرطیکہ اپنے نکاح کے بارے میں اس کو علم ہو اور وہ بالغ ہو، تاہم فسخ کا اختیار مجلس کے آخر تک دراز نہیں ہوگا'' (فتاویٰ رضویہ، جلد 11، ص:529)۔

نافرمان بیوی

سوال:113

میری اہلیہ گذشتہ چھ سال سے اپنی مرضی سے اپنی والدہ کے گھر رہ رہی ہیں۔ میں نے بہت کوششیں کیں کہ وہ میرے ساتھ آکر رہیں لیکن وہ میرے گھر واپس آنے کے لئے تیار نہیں۔ اُن کا موقف یہ ہے کہ اُن کی والدہ تنہا رہتی ہیں، لہٰذا میں اُن کے ساتھ سسرال میں رہوں جبکہ میرے والد بھی تنہا ہی ہیں، میں اُنہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ کیا میں اس صورت میں دوسری شادی کرسکتا ہوں، کیا مجھے اس کے لئے پہلی بیوی سے اجازت لینا ہوگی؟ اگر میں دوسری شادی کرلیتا ہوں تو کیا مجھے پہلی بیوی کو خرچہ دینا ہوگا؟۔ دو بیٹے ہیں ایک کی عمر 11 سال اور دوسرے کی 9 سال ہے، بچوں کے اخراجات کے لئے کیا حکم ہے؟

(کاشف عباسی، پی۔ آئی۔ بی کالونی، کراچی)

جواب:

اگر آپ کا بیان درست ہے اور آپ کی بیوی گذشتہ چھ سال سے آپ سے الگ رہ رہی ہیں اور آپ کے بلانے کے باوجود آپ کے ساتھ آپ کے گھر میں رہنے کے لئے تیار نہیں ہیں جب کہ آپ ان حقوق میں کوتاہی نہیں کرتے، تو ایسی بیوی کو فقہ کی اصطلاح میں ''ناشزہ (نافرمان)'' کہا جاتا ہے اور ایسی بیوی کا نفقہ شوہر کے ذمے نہیں ہوتا۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وان نشزت فلا نفقۃ لھا حتیٰ تعود الی منزلہ

ترجمہ: ''اگر عورت نافرمان ہو کر شوہر کے گھر سے نکل جائے تو جب تک وہ واپس (شوہر کے) گھر لوٹ کر نہ آجائے، اس کا نان نفقہ شوہر کے ذمے نہیں''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:545، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز ''الانوار لاعمال الابرار'' کی عبارت کا خلاصہ لکھتے ہیں:

لانفقة للناشزة وان قدر علی ردها الی الطاعة قهرا ولوهربت منه او خرجت بلا اذنه من بيته فناشزة

ترجمہ: ''نافرمان بیوی کے لئے نفقہ کا استحقاق نہیں اگر بیوی شوہر کا گھر چھوڑ کر بھاگ گئی ہو یا اُس کی اجازت کے بغیر گھر سے نکل گئی ہو تو وہ نافرمان ہی قرار پائے گی، خواہ وہ جبراً اُسے واپس لانے پر قدرت رکھتا ہو'' (فتاویٰ رضویہ، جلد 12، ص:473)۔

آپ کے بیٹے چونکہ اب شعور کی عمر کو پہنچ چکے ہیں، اس لئے آپ اُنہیں اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں۔ بیوی کا آپ کی مرضی کے خلاف اپنی والدہ کے ہاں رہنا درست نہیں ہے اور نہ ہی اُسے یہ حق حاصل ہے کہ آپ کو سُسرال میں رہنے پر مجبور کرے۔ اگر آپ کی بیوی کے بھائی یا غیر شادی شدہ بہنیں ہیں، تو وہ اپنی ماں کی خدمت کر سکتی ہیں، لیکن اگر آپ کی ساس کی خدمت کے لئے آپ کی بیوی کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں ہے، تو شریعت یہ چاہتی ہے کہ ضابطے سے ہٹ کر تبرُّع اور فضل واحسان کی بنیاد پر ازدواجی رشتے کو قائم رکھا جائے۔ لہٰذا اگر آپ کے مکان میں اتنی گنجائش ہو کہ الگ کمرے میں آپ کی ساس رہ سکیں اور آپ کی بیوی آپ کے حقوق کو ادا کرتے ہوئے اپنی ماں کی خدمت بھی کر سکے اور آپ اُنہیں اِس کی اجازت دے دیں، تو یہ صلۂ رحمی ہوگی اور اس پر آپ اللہ تعالیٰ سے اجر کے حق دار ہوں گے یا آپ کے سُسرال کے مکان میں اتنی گنجائش ہو کہ آپ میاں بیوی کے ساتھ آپ کے والد کو بھی وہاں الگ کمرے میں رکھا جا سکتا ہو اور آپ اُن کی دیکھ بھال کر سکتے ہوں اور آپ کی سُسرال والے اس کے لئے وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کریں، تو یہ بھی ایک بہتر متبادل صورت ہوگی۔

ایک صورت فضل واحسان کی یہ ہوسکتی ہے کہ اگر آپ کی ساس کا گھر قریب ہے اور آپ کی بیوی دن کے وقت کچھ وقت کے لئے جاکر اپنی ماں کی دیکھ بھال کرسکتی ہیں، تو آپ اسے اس کی اجازت دے دیں۔ تاہم اگر اس طرح کی درمیانی صورت پیدا نہ ہوسکتی ہو تو بیوی پر شوہر کا حق مقدم ہے، حدیثِ پاک میں ہے:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا قَالَتْ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! مَنْ أَعْظَمُ النَّاسِ حَقًّا عَلَی الْمَرْأَۃِ؟، قَالَ زَوْجُھَا، قُلْتُ مَنْ أَعْظَمُ النَّاسِ حَقًّا عَلَی الرَّجُلِ؟ قَالَ أُمُّہٗ۔

ترجمہ: ''ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: عورت پر لوگوں میں سے سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اُس کے شوہر کا۔ میں نے عرض کیا: مرد پر سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اُس کی ماں کا''۔ (المستدرک للحاکم، رقم الحدیث: 7418)۔

آپ کی بیوی کے بلااجازت یا آپ کی اجازت کے ساتھ کافی عرصے تک الگ رہنے سے رشتۂ نکاح ازخود ختم نہیں ہوتا۔ شوہر پر شریعت کی رُو سے عقدِ ثانی کی کوئی پابندی نہیں ہے، صرف ایک سے زیادہ بیویوں کی صورت میں ان سب کے درمیان عدل قائم کرنا اور برابری کا سلوک کرنا لازم ہے۔ اور اگر شوہر عدل قائم نہ کرسکتا ہو تو ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے۔ اگر آپ کا بیان درست ہے، تو بیوی کا نافرمان ہونا آپ کے لئے عقدِ ثانی کی ضرورت کو واضح کرتا ہے۔

اگر آپ دوسری شادی کرلیتے ہیں اور پہلی بیوی کو اپنی مرضی سے اُس کی ماں کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دیتے ہیں، تو اُس کا نفقہ آپ کے ذمے ہوگا۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

النفقة فتجب للزوجة علی زوجها ولو هی فی بیت أبیها اذالم یطالبها الزوج بالنقلة، به یفتیٰ، وکذا اذا طالبها ولم تمتنع أو امتنعت للمهر لاخارجة من بیته بغیر حق وهی الناشزة حتیٰ تعود ملخصا

ترجمہ: ''اگر بیوی اپنے باپ کے گھر پر ہو بشرطیکہ شوہر اُس سے اپنے گھر منتقل ہونے کا مطالبہ نہ کرے، تو اس بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب ہے، اسی قول پر فتویٰ ہے۔ یا جب وہ مطالبہ کرے تو بیوی اس کے گھر آنے سے انکار نہ کرے یا شوہر کے گھر آنے سے انکار کا سبب یہ ہو کہ وہ مہر کی ادائیگی کا مطالبہ کررہی ہے، تو ان تمام صورتوں میں شوہر پر اُس بیوی کا نفقہ واجب ہوگا۔ ہاں! البتہ اگر وہ ناحق شوہر کے گھر سے باہر رہ رہی ہو تو جب تک وہ شوہر کے گھر واپس نہ آئے، وہ ''ناشزہ (نافرمان)'' قرار پائے گی (اور اس کا نفقہ شوہر کے ذمے واجب نہیں ہوگا)، جب تک کہ وہ شوہر کے گھر واپس نہ آئے (یہ) درمختار کی عبارت کا خلاصہ ہے'' (ردالمحتار علی الدر المختار جلد 5، ص: 222 تا 227)۔

خاتون کے پہلے شوہر سے اولاد کی کفالت دوسرے شوہر کی ذمہ داری نہیں

سوال:114

میرے پہلے شوہر سے 3 بچے موجود ہیں، میرے پہلے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ میرے اس شوہر سے تین بچے ہیں اور میرا ایسا کوئی محرم مرد نہیں ہے جو میری اور میرے بچوں کے معاملات کی دیکھ بھال کرتا۔ ایک شخص نے مجھ سے میرے بچوں کی دیکھ بھال کا وعدہ کر کے نکاح کیا۔ میرے پاس میرے پہلے شوہر کا مکان اور پلاٹ بھی ہے، اب میرا دوسرا شوہر یہ چاہتا ہے کہ میں اپنے پہلے شوہر کا مال اُس کے سپرد کردوں، جبکہ میں اُس سے اپنے بچوں کی پرورش اور اخراجات پورے کرتی ہوں۔ میرا دوسرا شوہر مجھ سے یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ بچوں کو خود سے الگ کر کے اکیلے اس کے ساتھ رہوں، کیا میرے شوہر کے یہ مطالبات شرعاً جائز ہیں؟۔

میرے دوسرے شوہر کی ایک پہلی بیوی بھی ہے اور اس سے اولاد بھی ہے جبکہ اس دوسرے شوہر کی مجھ سے کوئی اولاد نہیں ہے۔ میرے دوسرے شوہر نے اپنی پہلی بیوی، بچوں کو گھر، خرچہ، نان نفقہ ہر چیز دے رکھی ہے اور مجھ پر کچھ خرچ نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے کہ تم اپنے سابقہ شوہر کی جائیداد سے اپنا خرچہ پورا کرو۔ سوال یہ ہے کہ مرد کے ذمے عورت کے

کیا حقوق ہیں اور آیا میرے شوہر کا میرے سابق شوہر سے ملے ہوئے ترکے اور میرے موروثی مال پر کوئی حق ہے اور آیا میرے لئے رہائش کا انتظام اور نان نفقہ میرے موجودہ شوہر کے ذمے نہیں ہے؟۔ اگر میرا موجودہ شوہر مجھے نان نفقہ اور گھر دیتا ہے تو اس پر میرے سابق شوہر سے جو بچے ہیں ان کا بھی کوئی حق ہے؟۔ میرے موجودہ شوہر کی ماہانہ آمدنی ڈیڑھ لاکھ روپے ہے، اس میں سے میرا حصہ کتنا بنتا ہے؟۔ میرے موجودہ شوہر نے نکاح کے وقت دس لاکھ روپیہ اور 25 تولے سونا حق مہر عند الطلب مقرر کیا تھا، کیا میں اس کی حقدار ہوں؟ اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے موجودہ شوہر نے مال کی وجہ سے مجھ سے نکاح کیا تھا اور اس کی نظر اسی مال پر تھی، کیونکہ وہ مجھ سے مطالبہ کرتا رہتا ہے کہ میں مکان بیچ کر سارا مال اسے کاروبار کے لئے دے دوں، (ایک دینی بہن، گلستان جوہر، کراچی)۔

جواب:

نکاح کے نتیجے میں مرد پر عورت کے جو حقوق واجب ہوتے ہیں، اُن میں بیوی کا نان نفقہ، بنیادی ضروریات اور رہائش کا انتظام کرنا شوہر کے ذمے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِیُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَ مَنْ قُدِرَ عَلَیْهِ رِزْقُهٗ فَلْیُنْفِقْ مِمَّاۤ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَا ؕ

ترجمہ: ''گنجائش والے کو چاہیے کہ وہ اپنی گنجائش کے مطابق خرچہ دے اور جس پر رزق کی تنگی ہو تو وہ اسی میں سے (حسب حیثیت) خرچہ دے جو اللہ نے اسے دیا ہے، اللہ کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتا مگر اسی کے مطابق جو اس نے اسے عطا کر رکھا ہے''، (الطلاق: 7)

اس آیت کی تفسیر میں علامہ محمود آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ مالدار اور تنگدست میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ اپنی مالی حیثیت کے مطابق اپنی بیوی کو نفقہ دے''۔ (روح المعانی ج 15 ص 207)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَ لَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَیِّقُوْا عَلَیْهِنَّ ؕ**

ترجمہ: ''اپنی بیویوں کو وہاں رکھو جہاں اپنی حیثیت کے مطابق تم خود رہتے ہو، اور ان پر تنگی کرنے کے لئے انہیں تکلیف نہ پہنچاؤ''۔ (الطلاق: 6)

علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں: ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے یوں پڑھا ہے کہ جہاں تم خود رہتے ہو وہاں اپنی بیویوں کو رکھو اور اپنی مالی حیثیت کے مطابق انہیں نفقہ دو''۔ (روح المعانی جلد: 15 صفحہ: 206)۔

صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث خطبۂ حجۃ الوداع کی بابت مذکور ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ترجمہ: ''عورتوں کا شوہروں پر یہ حق ہے کہ وہ دستور کے مطابق انہیں نفقہ دیں''۔

علامہ محمود آلوسی روح المعانی جلد نمبر 15، صفحہ: 205, 206 پر ''اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

من تبعیض کے لئے ہے، یعنی اپنے رہائشی مکان کے کسی حصے میں اپنی بیوی کو رہائش دو''۔

اور ''وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''کہ رہائش میں انہیں تکلیف نہ دو''۔

اور ''لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''یوں کہ مکان یا مکان میں بیوی کے لئے مخصوص رہائشی حصے کو کسی دوسرے استعمال میں لاکر یا اس کے ساتھ ایسے افراد کو ٹھہرا کر، جن کے ساتھ وہ رہنا نہیں چاہتی، (اس طرح کے حربوں سے) اسے تکلیف پہنچا کر گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا جائے، قرآن کی رو سے منع ہے''۔

شریعت کی رو سے شوہر پر اپنی حیثیت کے مطابق بیوی کو جائے رہائش دینا لازم ہے، اگر وہ اتنی مالی استطاعت رکھتا ہے کہ اسے علیحدہ مکان میں رکھ سکے تو ایسا ہی کرے۔ اور اگر اس کی مالی حیثیت بیوی کو علیحدہ مکان دینے کی متحمل نہیں ہے تو پھر بھی بیوی کا یہ حق ہے کہ مشترکہ فیملی مکان میں اس کے لئے علیحدہ کمرہ یا حصہ مختص ہونا چاہیے، جس میں دوسروں کا عمل دخل نہ ہو اور اس علیحدہ حصے یا کمرے کے ساتھ باورچی خانہ، بیت الخلاء اور لازمی ضروریات کا اہتمام بھی ہو اور ایسی سہولت ہو کہ وہ اپنے علیحدہ حصے یا کمرے کو بند کر سکے۔

مذکورہ سوال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُس شخص نے دوسرا نکاح محض عورت کے مال کے سبب کیا ہے، کسی عورت سے اُس کے مال ودولت کی خاطر نکاح کرنا ناپسندیدہ ہے اور حدیث مبارک میں اس کی ممانعت وارد ہوئی ہے

عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لَا تَزَوَّجُوا النِّسَاءَ لِحُسْنِهِنَّ۔ فَعَسٰى حُسْنُهُنَّ أَنْ يُرْدِيَهُنَّ، وَلَا تَزَوَّجُوهُنَّ لِأَمْوَالِهِنَّ فَعَسٰى أَمْوَالُهُنَّ أَنْ تُطْغِيَهُنَّ وَلٰكِنْ تَزَوَّجُوهُنَّ عَلَى الدِّينِ۔

ترجمہ: ''عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورتوں سے اُن کے حسن کے سبب نکاح نہ کرو، ممکن ہے اُن کا حسن اُنہیں پستی میں گرادے۔ اور نہ ہی عورتوں سے اُن کے مال کے سبب نکاح کرو، ممکن ہے کہ ان کا مال انہیں سرکشی پر آمادہ کرے، عورتوں سے اُن کے دین کے سبب نکاح کرو''۔ (سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 1859)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مَنْ تَزَوَّجَ اِمْرَأَةً لِعِزِّهَا لَمْ يَزِدْهُ اللهُ اِلَّا ذُلًّا وَمَنْ تَزَوَّجَهَا لِمَالِهَا لَمْ يَزِدْهُ اللهُ اِلَّا فَقْرًا

ترجمہ: ''جو شخص کسی عورت سے اُس کی عزت (Social Status) کے سبب نکاح کرے گا تو اللہ تعالیٰ اُس کی ذلت میں اضافہ فرمادے گا۔ اور جو شخص کسی عورت سے اُس کے مال کے سبب نکاح کرے گا تو اللہ تعالیٰ اُس کے فقر و تنگ دستی میں اضافہ فرمادے گا''۔
(المعجم الاوسط للطبرانی، رقم الحدیث: 2363)

مرد کے دوسرا نکاح کرنے میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے بشرطیکہ وہ دونوں بیویوں کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے، دونوں کے درمیان عدل قائم کرے، یعنی دونوں کو ایک معیار کی رہائش، ایک ہی معیار کی خوراک اور مصارف زندگی فراہم کرے اور دونوں میں ایام کی تقسیم بھی برابر برابر کرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً، ترجمہ: ''یعنی اگر تمہیں خدشہ ہو کہ ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان تم عدل قائم نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو''۔ (النساء: 3)

اس آیت میں یہ گنجائش ہے کہ جو شخص مالی اور جسمانی طور پر ایک سے زائد بیویاں رکھ سکتا ہے اور ان بیویوں کے درمیان عدل بھی قائم کرتا ہے، تو وہ ایک سے زیادہ نکاح کر سکتا ہے، اور اگر وہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا، تو پھر اسے چاہئے کہ صرف ایک بیوی پر اکتفا کرے۔ شرعاً قیامِ عدل کی شرط کا لحاظ کرتے ہوئے ایک سے زائد نکاح کی اجازت ہے، بشرطیکہ تمام بیویوں کے درمیان ایام کی تقسیم برابر برابر کرے اور رہائش ،لباس اور طعام (یعنی نان نفقے) کا معیار بھی یکساں رکھے۔

احادیث مبارکہ میں ہے:

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ، عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ مَنْ كَانَتْ لَهُ اِمْرَاَتَانِ فَمَالَ اِلٰى اِحْدَاهُمَا جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَشِقُّهٗ مَائِلٌ

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ اُن میں (عدل قائم نہ کرتا ہو بلکہ) صرف ایک کی طرف میلان رکھتا ہو تو قیامت کے دن اِس طرح حاضر ہوگا کہ اُس کا آدھا دھڑ مائل (جھکا ہوا) ہوگا''۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث:2126)

(۲) اِذَا كَانَ عِنْدَ الرَّجُلِ اِمْرَاَتَانِ فَلَمْ یَعْدِلْ بَیْنَهُمَا جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَشِقُّهٗ سَاقِطٌ۔

ترجمہ: ''جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ اُن کے درمیان عدل نہیں کرتا تو قیامت کے دن اِس طرح حاضر ہوگا کہ اُس کا آدھا دھڑ ساقط (بے کار) ہوگا''۔

(سنن ترمذی، رقم الحدیث:1144، ابوداؤد:2132، ابن ماجہ:1969، مسند احمد:25165)

مہر عورت کا شرعی حق ہے جسے وصول کرنے کا اسے مکمل اختیار ہے، مہر کسی بھی قسم کا ہو، ہر صورت میں اُس کی ادائیگی لازم ہے۔

آپ کے بیان کے مطابق آپ کے شوہر نے دس لاکھ روپے اور پچیس تولے سونا مہر عند الطلب مقرر کیا تھا، تو آپ کے مطالبہ پر شوہر کے ذمے اس مہر کا ادا کرنا لازم ہے۔ شریعت کی رُو سے شوہر پر لازم ہے کہ دونوں بیویوں کو ایک معیار کا نان نفقہ (یعنی) یکساں

معیار کی رہائش گاہ اور مصارف زندگی) فراہم کرے اور دونوں کے درمیان ایام کی تقسیم بھی برابر کرے۔ سوال میں جو حقائق بیان کیے گئے ہیں، اگر درست ہیں تو آپ کے ساتھ شوہر کا برتاؤ عادلانہ نہیں ہے، یہ احکامِ شریعت کی صریح خلاف ورزی ہے اور ان کو اس وعید سے ڈرتے رہنا چاہیے جو رسول اللہ ﷺ نے احادیث میں بیان فرمائی ہے۔

آپ کے پاس جو اپنا موروثی اور سابق شوہر کے ترکے سے مال ہے، اس پر آپ کے موجودہ شوہر کا کوئی حق نہیں ہے، آپ کی پہلے شوہر سے اولاد کا نان نفقہ اور کفالت ونگہداشت دوسرے شوہر کے ذمے نہیں ہے، البتہ وہ اپنے باپ کے ترکے سے اپنے حصے کے حق دار ہیں اور اسی مال سے ان پر خرچ کیا جائے۔

آپ کی پہلے شوہر سے جو اولاد ہے، اس کو آپ کا موجودہ شوہر اپنے ساتھ رکھنے سے انکار کرسکتا ہے، لیکن بیوی کو اپنی اولاد سے ملنے جلنے اور حسن سلوک سے منع کرنا قطعِ رحمی ہے اور قاطع رحم کے لئے حدیث پاک میں شدید وعید آئی ہے۔ اس کا ایک متوازن حل یہ ہے کہ آپ کا موجودہ شوہر آپ کو ایک ایسا مکان دلائے جس کے دو حصے ہوں، ایک حصہ جس میں آپ میاں بیوی رہیں، اتنے حصے کا کرایہ اور آپ کا خرچہ آپ کا موجودہ شوہر ادا کرے اور دوسرے حصہ کا کرایہ اور بچوں کا خرچہ آپ اپنے مال اور پہلے شوہر کے ترکے سے پورا کریں، یہ شوہر کی طرف سے تبرُّع، فضل، احسان اور حسنِ سلوک ہوگا، جس پر اسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اجرِ کامل کی امید رکھنی چاہیے۔

برادری سے باہر نکاح کا حکم

سوال:115

میرا تعلق دھوبی برادری سے ہے، ہماری برادری میں شادی کی غیر ضروری رسومات بہت ہیں، جس کی وجہ سے میں اپنی بیٹی کی شادی غیر برادری میں کررہا ہوں۔ جہاں میں نے اپنی بیٹی کی شادی طے کی ہے وہ اہلسنت وجماعت سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن میرے کچھ قریبی رشتے دار اس بات سے ناراض ہیں، اُن کا کہنا ہے کہ شادی برادری سے باہر نہ کی

جائے اور اگر ہوئی تو ہم اس میں شرکت نہیں کریں گے۔مہربانی فرما کر اس مسئلے کو حل فرمائیں۔(محمد بلال قادری، سرجانی ٹاؤن، کراچی)

جواب:

قرآن کریم نے مسلمان مرد وعورت کے درمیان نکاح کو مطلقاً جائز رکھا ہے۔لیکن شریعت نے زوجین کے درمیان خوشگوار ازدواجی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے کفو (Equal Status) کا اعتبار کیا ہے، تاکہ دونوں کا رہن سہن، عادات واطوار یکساں ہوں۔شرعاً کفو کا معیار مرد کی جانب سے معتبر ہوتا ہے، یعنی دونوں خاندان عزت، شرافت، دینداری، مالداری اور صنعت وحرفت میں برابر ہوں یا عورت کم درجہ کی ہولیکن اگر والد راضی ہوتو بالغہ لڑکی غیر کفو میں بھی نکاح کرسکتی ہے۔رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے :

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِذَا خَطَبَ اِلَیْکُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِیْنَهُ وَخُلُقَهُ فَزَوِّجُوْهُ، اِلَّا تَفْعَلُوْا تَکُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ عَرِیْضٌ۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب ایسا شخص نکاح کا پیغام بھیجے، جس کے اخلاق اور دین کو تم پسند کرتے ہو، تو نکاح کردو، اگر نہ کروگے تو زمین میں فتنہ وفسادِ عظیم ہوگا''۔

(سُنن ترمذی، رقم الحدیث:1086، سنن ابن ماجہ:1967)

برادری سے باہر نکاح کرنا نہ تو کوئی عیب ہے اور نہ ہی نکاح کے لئے مانع ہے۔

مفتی وقار الدین قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

برادری کا ایسی پابندی لگانا کہ اپنی برادری سے باہر لڑکی کی شادی نہیں کی جائے گی، غلط ہے۔اپنی برادری کی برابر حیثیت والی برادری یا اس سے اعلیٰ برادری میں شادی کرنے پر تو کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی، کم درجہ کے لئے پابندی لگائی جاسکتی ہے۔مگر جب لڑکی کے والدین راضی ہوں تو برادری اس تیسری صورت میں بھی اُن پر کوئی پابندی نہیں لگاسکتی، جبکہ اس پابندی سے خراب اثر پڑتا ہو کہ لڑکیاں بغیر شادی عمر گذار دیں، تو پابندی لگانا گویا

فتنوں کا دروازہ کھولنا ہے۔ جو ماں باپ اپنی لڑکی کی شادی غیر برادری میں کر دیں، اُن سے تعلقات اس طرح منقطع کرنا کہ شادی بیاہ اور میت میں بھی شریک ہونے کو ممنوع قرار دے دیا جائے، حرام ہے۔ کسی جائز کام پر اس قسم کی پابندی لگانے والے سخت گناہ گار ہیں، اُنہیں توبہ کرنی چاہیے اور حکمِ شریعت کے خلاف پابندی کو فوراً ختم کر دینا چاہیے''۔
(وقار الفتاویٰ، جلد سوم، ص:21)

آپ کی برادری والوں کا یہ کہنا کہ ''اگر برادری سے باہر شادی ہوئی تو ہم اس میں شرکت نہیں کریں گے''، قطع رحمی ہے، جو حرام ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (1) لَایَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ۔ ترجمہ: ''رشتے اور قرابت کے تعلق کو توڑنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا''۔ (صحیح بخاری، رقم:5984، صحیح مسلم، رقم:2556، سنن ترمذی، رقم:1916)

(2) الرَّحِمُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ تَقُوْلُ مَنْ وَصَلَنِیْ وَصَلَهُ اللّٰهُ وَمَنْ قَطَعَنِیْ قَطَعَهُ اللّٰهُ
یعنی ''رحم عرشِ الٰہی کے ساتھ معلق ہے اور (زبان حال سے) کہتا ہے کہ جو مجھے ملائے، اللہ تعالیٰ اسے اپنے رحم وکرم سے ملائے رکھے اور جو مجھے توڑ دے، اس کا رشتہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے ٹوٹ جائے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث:5988)''۔

شرعاً کفو کا معیار مرد کی جانب سے معتبر ہوتا ہے

سوال:116

آزاد کشمیر میں سُدھن نامی قوم ہے، جسے یہاں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اُس قوم کے ایک لڑکے نے موچی قوم کی لڑکی سے شادی کی ہے۔ اِس رشتے کی وجہ سے سُدھن برادری لڑکے کا بائیکاٹ کر رہی ہے۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ:

(1) آیا غیر کفو میں (یعنی برادری سے باہر کم تر خاندان میں) شرعاً یہ نکاح درست ہے؟۔
(2) اس رشتے کی وجہ سے اس لڑکے کا بائیکاٹ، علاقہ بدری یا جانی مالی نقصان پہنچانا درست ہے؟
(3) جو لوگ دباؤ ڈالنے کی تحریک میں شامل ہیں، ان کا شرعی حکم کیا ہے؟۔
(گل محمد، محمد جان، نیریاں شریف، آزاد کشمیر)

جواب :

اگر سُدھن قوم کے لڑکے نے اپنی مرضی سے موچی قوم کی لڑکی سے شادی کر لی ہے تو شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ ہمارے فقہاء کرام نے اس امر کو مستحسن قرار دیا ہے کہ لڑکا اپنے سے کم تر حیثیت (Status) کی لڑکی سے شادی کرے تاکہ شوہر کا احترام اور عظمت اس کے دل میں قائم رہے۔ شرعاً کفو کا معیار مرد کی جانب سے معتبر ہوتا ہے، جب لڑکی ولی کی اجازت کے بغیر غیر کفو میں یعنی اپنے خاندان سے کم تر حیثیت (Status) کے لڑکے سے نکاح کرے تو مفتیٰ بہ قول کے مطابق یہ نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ لڑکے کی برادری کے لوگوں کا طرزِ عمل درست نہیں ہے اور جو لوگ اس طرح کے بائیکاٹ، علاقہ بدری یا کسی طرح کا جانی و مالی نقصان پہنچانے کا ارادہ کر رہے ہیں، وہ غلطی پر ہیں۔ اُنہیں اپنی اس خلاف شرع حرکت سے رجوع کرنا چاہئے اور توبہ کرنی چاہئے۔ حرفت کی بنا پر کسی کو حقیر نہیں جاننا چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی لئے اپنے کپڑے سی کر اور اپنے جوتے کی مرمت فرما کر ان حرفتوں اور پیشوں سے وابستہ لوگوں کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے، حدیث پاک میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے تکبر کی مذمت بیان فرمائی، تو ایک صحابی نے عرض کیا:

اِنَّ الرَّجُلَ یُحِبُّ اَنْ یَکُوْنَ ثَوْبُهُ حَسَنًا وَنَعْلُهُ حَسَنَةً۔ قَالَ اِنَّ اللهَ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الْجَمَالَ، اَلْکِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ۔

ترجمہ: ''ایک شخص چاہتا ہے کہ اس کا لباس اچھا ہو، اس کے جوتے اچھے ہوں (کیا یہ بھی تکبر ہے؟)، آپ ﷺ نے فرمایا: تکبر (اپنی انانیت کی وجہ سے) حق کا انکار کرنا اور لوگوں کو اپنے مقابلے میں حقیر جاننے کا نام ہے''۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 91)

آئمۂ اہل بیت نے غیر عرب خواتین اور باندیوں سے بھی نکاح فرمایا ہے۔

رضاعت کا رشتہ صرف ایک طرف سے متعدّی ہوتا ہے

سوال: 117

ہمارے خاندان میں ایک خاتون نے اپنے دیور کے بچے کو (جو کہ بیمار تھا اور بعد میں

انتقال کر گیا) دودھ پلایا تھا۔ اب اُسی دودھ پلانے والی خاتون کے بیٹے کے لئے اُس بچے کی بہن (جو بعد میں پیدا ہوئی) کا رشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ کیا از روئے شرع یہ رشتہ درست ہے؟ (محمد نواز، پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس۔ کراچی)

جواب:

رضاعت (دودھ شریک) رشتہ دونوں طرف سے متعدی نہیں ہوتا بلکہ ایک جانب سے متعدی ہوتا ہے، یعنی جس بچی یا بچے نے کسی عورت کا دودھ مدتِ رضاعت (ڈھائی سال کی عمر تک) پیا ہے، اس دودھ پینے والے بچے پر رضاعی ماں باپ کی ساری اولاد، خواہ وہ دودھ پینے سے پہلے کی ہو یا بعد کی، اس کے موجودہ شوہر سے یا دوسرے شوہر سے، وہ سب اس دودھ پینے والے کے لئے رضاعی بہن بھائی ہو گئے اور ان میں سے کسی کی شادی اس دودھ پینے والے سے نہیں ہو سکتی۔ جبکہ رضاعی ماں باپ کی اولاد پر صرف یہ بچہ یا بچی حرام ہے، جس نے دودھ پیا ہے، اس کے باقی بہن بھائی حرام نہیں ہیں (بشرطیکہ حرمت کا کوئی اور سبب نہ ہو)۔ اسی طرح دودھ پینے والے بچے کے دوسرے بہن بھائی جنہوں نے اس عورت کا دودھ نہیں پیا، ان کے ساتھ اس خاتون کی اولاد کا رضاعت کا کوئی رشتہ نہیں ہے، لہٰذا ان کے ساتھ بھی اس خاتون کی اولاد کا نکاح جائز ہے۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں: (وتحل أخت أخيه رضاعًا) يصح اتصاله بالمضاف كأن يكون له أخ نسبي له أخت رضاعية وبالمضاف اليه كان يكون لأخيه رضاعًا أخت نسبًا وبهما، وهو ظاهر۔

ترجمہ: ''حقیقی بھائی کی رضاعی بہن سے نکاح جائز ہے، رضاعت کا اتصال مضاف سے صحیح ہے، جس طرح اس کے نسبی بھائی کی رضاعی بہن ہو اور یہ بھی صحیح ہے کہ رضاعت کا اتصال مضاف الیہ سے ہو جس طرح کہ اُس کے رضاعی بھائی کی نسبی بہن ہو اور مضاف اور مضاف الیہ دونوں سے بھی متصل ہو سکتا ہے اور وہ ظاہر ہے کہ رضاعی بھائی کی رضاعی بہن ہو''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار: جلد: 4، ص: 301، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ حقیقی بھائی کی رضاعی بہن یا رضاعی بھائی کی حقیقی بہن یا رضاعی بھائی کی رضاعی بہن سے نکاح جائز ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ ''زید بکر کا چچا زاد بھائی ہے اور رضاعی بھی۔ زید کا صرف ایک حقیقی چھوٹا بھائی ہے اور بکر کا ایک چھوٹا بھائی اور ایک بہن، جو حقیقی ہیں اور بکر کی بہن دونوں بھائیوں سے چھوٹی ہے، تو زید کے چھوٹے بھائی کا نکاح بکر کی چھوٹی بہن سے جائز ہے یا نہیں؟، چونکہ زید اور بکر آپس میں رضاعی بھائی ہیں۔ آپ نے جواب میں لکھا: بکر نے اگر زید کی ماں کا دودھ پیا ہے تو زید اور اس کا بھائی بکر کے بھائی ہوئے نہ کہ بکر کی بہن کے۔ اور اگر زید نے بکر کی ماں کا دودھ پیا ہے تو زید بکر کی بہن کا بھائی ہوا نہ کہ زید کا بھائی۔ بہر حال زید کے بھائی اور بکر کی بہن میں نکاح جائز ہے لقولھم تحل اخت اخیہ رضاعا (فقہاء کے قول کے مطابق بھائی کی رضاعی بہن حلال ہے)''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 11، ص 279، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

طلاق کے مسائل

مرتد کا علیحدگی کے بعد بیوی کو عدت کے اندر طلاق دینا

سوال:118

زید کے والد نے اُس کی والدہ کو تین طلاقیں دیں اور اتنی آواز سے دیں کہ اوپر رہنے والے کرائے داروں نے بھی سنا۔ زید کا والد کسی اور کمرے میں تھا اور والدہ دوسرے کمرے میں تھیں۔ اب وہ شخص یہ عذر پیش کرتا ہے کہ وہ بہت ساری بیماریوں میں مبتلا ہے، رات بیوی سے جھگڑا ہوا جو محلہ والوں کی مصالحت سے ختم ہوا، صبح جب اُس کی آنکھ کھلی، تو وہ کہتا ہے میں نیند میں تھا اور میرے کان میں میری بیوی اور بیٹے کی گفتگو کی آواز آئی، میری بیوی بیٹے کو میرے خلاف بھڑکا رہی تھی، یہ سن کر مجھے غصہ آیا اور میں نے کہا ''میں نے تجھے طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی''۔ ماضی میں مذکورہ شخص سے صریح کفریات ثابت ہیں، اِن کفریات میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کو معاذ اللہ گالیاں تک بکی ہیں۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ مذکورہ کفریہ باتوں کے بعد حالتِ کفر میں دی گئی تین طلاقیں نافذ ہیں یا نہیں؟، اور تجدیدِ ایمان کے بعد تجدیدِ نکاح کافی ہے؟، (جواد، گوہر آباد، F.B ایریا، کراچی)

جواب:

ایسا شخص مرتد ہے، جو حالتِ اسلام میں کسی ایسے امر کا انکار کرے جو ضروریاتِ دین میں سے ہے، زبان سے ایسا کلمۂ کفر بکے، جس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو، یا کوئی ایسا فعل انجام دے، جو کفر کی واضح نشانی ہو۔ مرتد کا نکاح بالاتفاق باطل ہے، جیسا کہ علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ماهو باطل بالاتفاق نحو النكاح فلا يجوز له أن يتزوج امرأة مسلمة ولا مرتدة ولا ذمية لا حرة ولا مملوكة

ترجمہ: ''مرتد کے حق میں جو چیزیں بالاتفاق باطل ہیں، اُن میں نکاح بھی باطل ہے کہ وہ کسی عورت سے نکاح نہیں کرسکتا، نہ مسلمہ سے، نہ مرتدہ سے، نہ کافرہ سے، نہ آزاد عورت سے، نہ کنیز سے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص:255، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

شوہر کے مرتد ہونے سے اس کا نکاح باطل ہوجاتا ہے اوران کے درمیان علیحدگی کر دینی چاہیے ،البتہ مرتد کے بعض تصرُّفات مؤثر ہوتے ہیں۔پس اگر وہ عدت کے دوران اپنی بیوی کو طلاق دیدے تو (اس کے نکاح سے نکلنے کے باوجود) وہ طلاق واقع ہوجائے گی، کیونکہ دونوں کے درمیان علیحدگی طلاق کے مؤثر ہونے میں مانع نہیں ہوتی۔ اِرتداد کے بعد مرتد کے جن تصرُّفات کو نافذ مانا جاتا ہے،طلاق بھی اُن میں شامل ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

وَاعلم اَنَّ تَصَرُّفَاتِ الْمُرْتَدِّ عَلیٰ اربعةِ اَقسَامٍ ،فَيَنفُذُ مِنهُ اِتفَاقاً مَالَايَعْتَمِدُ تمامَ ولايةٍ، وَهِیَ خَمسٌ الاستيلاد، والطلاق، وقبول الهبة، وتسليم الشفعة

ترجمہ:''جاننا چاہیے کہ مرتد کے تصرُّفات چار اقسام پر ہیں ،پس اُس کا ہر ایسا تصرُّف بالاتفاق نافذ ہے،جس کا مدار کمالِ ولایت (کامل اختیار) پر نہیں ہوتا۔اور وہ پانچ ہیں،اُن میں سے: (ایک) استیلاد ہے(یعنی بچے کا نسب مرتد سے ثابت ہوگا اور وہ اپنے والد کا وارث ہوگا) اور (دوسرا) طلاق ہے اور (تیسرا) ھبہ کا قبول کرنا ہے(یعنی مرتد ھبہ کو قبول کرسکتا ہے) اور (چوتھا) فریقِ مخالف کی طرف سے شفعہ کا دعویٰ تسلیم کر کے اپنے حق سے دستبردار ہوجانا ہے۔اِس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

واورد انه كيف يتصور طلاقه وقد بانت بِرِدَّتِه،وَاُجِيبَ بِأنَّهُ لَايَلْزَمُ مِن وقوعِ الْبَيْنُونَةِ امتناعُ الطلاق وقد سلف انه المبانة يلحقها الصريح فی العدة۔

ترجمہ:''یہاں ایک اشکال وارد ہوتا ہے کہ مرتد کی زوجہ اُس کے اِرتداد کے سبب بائن (نکاح سے خارج) ہوگئی، پھر اس پر طلاق کیسے واقع ہوگی؟۔ہم اُس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ بائن (یعنی نکاح سے خارج) ہونے سے لازم نہیں آتا کہ اُس پر طلاق واقع نہ ہو حالانکہ (کتاب الطلاق میں) میں یہ مسئلہ گزر چکا ہے کہ بائنہ عورت کو عدّت میں صریح طلاق لاحق ہوسکتی ہے،(ردالمحتار علی الدرالمختار،جلد 6،ص:301)''۔

اگر آپ کا دعویٰ درست ہے کہ اس شخص نے اللہ عزّوجلّ اور رسولِ مکرم ﷺ کی شان

میں گالیاں بکی ہیں تو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی اہانت کرنے والا مرتد ہو جاتا ہے۔
پس اگر اس شخص نے کفریہ کلمات کہنے کے بعد تین حیض گزرنے سے پہلے طلاق کے الفاظ کہے ہیں تو اس کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہو چکی ہیں اور دونوں ایک دوسرے پر حرام ہو چکے ہیں۔ اس صورت میں تجدیدِ ایمان کے ساتھ تجدیدِ نکاح کافی نہ ہوگا، بلکہ تحلیلِ شرعی کے بغیر رجعت قطعاً ممکن نہیں اور اگر کفریہ کلمات کہنے کے بعد تین حیض گزر چکے تھے تو تجدیدِ ایمان کے بعد براہِ راست اپنی اس سابق بیوی سے تجدیدِ نکاح کر سکتا ہے، تحلیلِ شرعی کی ضرورت نہیں، علامہ ابن عابدین شامی سابقہ عبارت کے لفظ ''والطلاق'' کی شرح میں لکھتے ہیں: والطلاق ای ما دامت فی العدۃ، ترجمہ: ''جب تک عورت عدت میں ہے، مرتد شوہر کی طلاق نافذ ہوگی، (ردالمحتار، جلد 6، ص: 301)۔

اگر آپ کا بیان درست ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو تین طلاقیں دینے کا اقرار کر رہا ہے تو اقرار کی بنا پر یہ طلاقیں مؤثر ہیں اور نافذ ہوں گی۔

کورٹ میرج اور طلاق

سوال:119

ایک لڑکے اشتیاق علی نے ایک لڑکی سے کورٹ میرج کی۔ یہ بات تقریباً دو ماہ تک گھر والوں سے چھپا کر رکھی۔ گھر والوں کو معلوم ہوا تو محلہ میں موجود جسٹس آف پیس سے رابطہ کیا اور ساری صورتحال بتائی۔ اِس دو ماہ کے دوران لڑکی متعدد بار لڑکے کے ساتھ اُس کے گھر پر رہی۔ لڑکا اور لڑکی اور اُس کے گھر والوں کو جسٹس آف پیس نے طلب کیا۔ لڑکے کے والد نے لڑکے پر دباؤ ڈالا کہ اِس لڑکی کو طلاق دے دو۔ لڑکے نے والد کے کہنے اور دوستوں اور گھر والوں کے مشورے سے تین دن کے بعد جسٹس آف پیس کے سامنے چار گواہوں کی موجودگی میں لڑکی کو زبانی اور تحریری تین طلاقیں دے دیں اور یہ بھی لکھ کر دیا کہ آئندہ میرا اِس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ لیکن اِس دوران موبائل فون پر دونوں کا رابطہ رہا اور لڑکی لڑکے کے ساتھ چلی گئی اور دونوں ساتھ رہنے لگے۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا ان

دونوں کے درمیان رشتۂ ازدواج باقی ہے یا طلاق واقع ہوگئی؟ کیا والد یا دیگر افراد کا لڑکے کو طلاق کے لئے آمادہ کرنا جبر کہلائے گا؟ (سرفراز، اعظم بستی محمود آباد، کراچی)۔

جواب:

''کورٹ میرج'' سے اگر مراد یہ ہے کہ باقاعدہ دو گواہوں کی موجودگی میں آزادانہ ایجاب وقبول کے ذریعے ان دونوں کا نکاح ہوا تھا تو وہ لڑکا اگر اس لڑکی کا کفو (ہم پلہ) ہے، تو وہ نکاح شرعاً وقانوناً مؤثر اور منعقد ہے۔ آپ کے بیان کے مطابق شوہر نے کئی افراد کی موجودگی میں اپنی بیوی کو زبانی اور تحریری طور پر تین طلاقیں دیں۔ پس وہ تین طلاقیں واقع ہو چکی ہیں اور چونکہ نکاح کے بعد خلوتِ صحیحہ بھی پائی گئی، لہٰذا تحلیلِ شرعی کے بغیر رجعت کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ ؕ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَاۤ اَنۡ يَّتَرَاجَعَاۤ

ترجمہ: ''پھر اگر اس (شوہر) نے اپنی بیوی کو (تیسری) طلاق دے دی تو اس (تیسری طلاق) کے بعد وہ عورت اس (سابق شوہر) کے لئے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ (عورت عدت گزرنے کے بعد) کسی اور شوہر سے نکاح کرے، پھر اگر وہ (دوسرا خاوند) اسے (اپنی مرضی سے) طلاق دے دے، تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ (عدت کے بعد نکاح کرکے) آپس میں رجوع کرلیں، (البقرۃ:230)''۔

اصولی طور پر فقہ حنفی میں ''طلاقِ مکرَہ'' (یعنی جس سے جبراً طلاق دلائی گئی ہو) معتبر ہے۔ البتہ اگر ''اِکراہِ تام'' یا ''اِکراہ مُلجی'' ہو، یعنی ایسی ضربِ شدید جس میں جان یا عضو کے تلف ہونے کا حقیقی خطرہ ہو، جیسے آج کل بندوق کی نوک (Gun Point) پر دھمکی دی جاتی ہے، اور بظاہر ایسا لگتا ہے کہ وہ اس دھمکی پر عمل کرلے گا، تو اسے ''اکراہ مُلجی'' یا ''اکراہِ تام'' کہتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہمارے فقہائے کرام نے کہا ہے کہ اگر جبر کرکے تحریری طلاق لی جائے تو وہ مؤثر نہیں ہوگی، کیونکہ تحریر ضرورت کے وقت کلام کے قائم مقام ہوتی ہے، لیکن اگر جبر کرکے زبانی طلاق دلا دی جائے تو وہ مؤثر ہو جائے گی۔ مذکورہ

صورت میں اکراہِ مُلجی یعنی اکراہِ تام نہیں ہے، کیونکہ جسٹس آف پیس کی عدالت میں کئی لوگوں کے سامنے یہ طلاق دی گئی ہے اور ایسے ماحول میں اس طرح کے جبر کا امکان نظر نہیں آتا، والدین اور رشتے داروں کے اخلاقی دباؤ سے دی گئی طلاق مؤثر ہوگی کیونکہ یہ شرعی جبر و اکراہ نہیں ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال ہوا: ''ایک شخص نے کسی کے جبر و ظلم سے محض ناچار و مجبور ہو کر اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور طلاق نامہ لکھ دیا تو اس صورت میں طلاق پڑے گی یا نہیں؟۔ آپ نے جواب میں لکھا کہ ''طلاق بخوشی دی جائے خواہ بجبر، واقع ہو جائے گی۔ نکاح شیشہ ہے اور طلاق سنگ، شیشہ پر پتھر خوشی سے پھینکے یا جبر سے یا خود ہاتھ سے چھٹ پڑے شیشہ ہر طرح ٹوٹ جائے گا، مگر یہ زبان سے الفاظ کہنے میں ہے۔ اگر کسی کے جبر و اکراہ سے عورت کو خطرے میں طلاق لکھی یا طلاق نامہ لکھ دیا اور زبان سے الفاظِ طلاق نہ کہے تو طلاق نہ پڑے گی۔ تنویر الابصار میں ہے:

ویقع طلاق کل زوج بالغ عاقل ولو مکرھا او مُخطئا وفی ردالمحتار عن البحر ان المراد الاکراہ علی التلفظ بالطلاق، فلو أُکرہ علی أن یکتب طلاق امرأتہ فکتب لا تطلق، لأن الکتابۃ أقیمت مقام العبارۃ باعتبار الحاجۃ ولا حاجۃ ھنا۔

ترجمہ: ''ہر عاقل بالغ خاوند کی طلاق نافذ ہو جائے گی اگرچہ اسے مجبور کیا گیا ہو یا غلطی سے طلاق دے دی، اور ردالمحتار میں ''البحر الرائق'' سے منقول ہے کہ ''جبر سے مراد یہ ہے کہ لفظ طلاق کہنے پر مجبور کیا گیا ہو۔ اور اگر اسے اپنی بیوی کو تحریری طلاق لکھنے پر مجبور کیا گیا اور اس نے مجبور ہو کر لکھ دی تو طلاق واقع نہ ہوگی، کیونکہ کتابت کو تلفظ کے قائم مقام محض حاجت کی بنا پر کیا گیا ہے اور یہاں خاوند کو حاجت نہیں ہے''۔ مگر یہ سب اس صورت میں ہے جبکہ اکراہ شرعی ہو کہ اسے ضرر رسانی کا اندیشہ ہو اور وہ ایذا پر قادر ہو، صرف اس قدر کہ اس مُکرِہ (جبر کرنے والے) نے اپنے سخت اصرار سے مجبور کر دیا اور اس کے لحاظ پاس سے اسے لکھتے بنی، اکراہ کے لئے کافی نہیں، یوں لکھے گا تو طلاق ہو جائے گی، کما لا یخفی (جیسا

کہ ظاہر ہے)، (فتاویٰ رضویہ جلد:12،ص:385،مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔

صورتِ مسئولہ میں کسی قسم کے اکراہ یا جبر کے کوئی شواہد نہیں ہیں، کیونکہ ''جسٹس آف پیس'' یا حکومت کی منظور کردہ مصالحتی کمیٹی کے سامنے گواہوں کی موجودگی میں کھلی مجلس میں زبانی وتحریری طلاق دی ہے، لہٰذا یہ طلاق مؤثر ہے۔جس وقت شوہر نے زبانی الفاظِ طلاق کہے، طلاق اسی وقت سے مؤثر ہوگئی اور عدت بھی شروع ہوگئی۔چونکہ طلاق مغلّظہ ہے، لہٰذا زوجین کا عدت گزرنے کے بعد تحلیل شرعی کے بغیر آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا۔اس طلاقِ مغلظہ کے بعد ان کا آپس میں میاں بیوی کی حیثیت سے رہنا حرام ہے، زنا کے زمرے میں آئے گا، انہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہئے۔اور اس محلے یا بستی اور برادری کے لوگوں کو انہیں اس پر متوجہ کرنا چاہئے، اگر وہ اس کے باوجود باز نہ آئیں تو ان کا سماجی مقاطعہ (Social Boycott) کرنا چاہئے۔

طلاق کو شرط کے ساتھ معلق کرنا

سوال:120

ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا: ''اگر میرے والد نے یہ مکان میرے نام نہ کیا تو تجھے طلاق ہے۔ان کے والد کے پاس جو مکان تھا وہ پگڑی کا تھا اور وہ والد کی ملکیت میں نہیں ہے۔اب اگر والد وہ مکان اپنے بیٹے کے نام نہیں کرتا تو کیا اس کی بہو پر طلاق واقع ہوجائے گی یا نہیں؟، (ش،م کراچی)۔

جواب:

ازدواجی تعلقات قائم ہونے کے بعد میاں بیوی کو چاہئے کہ حسنِ معاشرت کے ساتھ زندگی گزاریں اور عقدِ نکاح کو حتی الوسع قائم رکھنے کی کوشش کریں۔باہمی اختلافات کی صورت میں فریقین کے بزرگ اور سرپرستوں پر ذمہ داری عائد کردی گئی ہے کہ وہ میاں بیوی کے اختلافات ختم کرانے میں کردار ادا کریں، اگر ساری اصلاحی تدابیر ناکام ہوجائیں تو انتہائی ناگزیر حالات میں شوہر کو نکاح ختم کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔محض چھوٹی

باتوں پر طلاق دینا شرعاً انتہائی ناپسندیدہ اور گناہ کا سبب ہے۔ صورتِ مسئولہ میں شوہر نے طلاق کو اس امر کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ اس کے والد مکان کی ملکیت اُس کے نام منتقل کردیں اور شرط کے مؤثر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ مِلک یا سببِ مِلک کی طرف منسوب ہو، یعنی یا تو قسم کھاتے وقت مکان اس کے والد کی ملکیت میں ہوتا یا طلاق کی اضافت سببِ مِلک کی طرف ہوتی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص نے کسی اجنبی عورت سے کہا کہ تجھے طلاق ہے اور بعد میں اس نے کسی وقت اس کے ساتھ نکاح کرلیا تو طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ جس وقت اس کی طرف طلاق کی نسبت کی گئی تھی، وہ اُس وقت اس کے نکاح میں نہیں تھی، لہٰذا وہ محلِ طلاق نہیں تھی اور وہ طلاق لغو قرار پائی۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص کسی اجنبی عورت سے کہے کہ میں جب بھی تجھ سے نکاح کروں تو تجھے طلاق ہے، تو جب بھی وہ اُس عورت کے ساتھ نکاح کرے گا، اسے طلاق واقع ہوجائے گی کیونکہ یہاں پر نسبت سببِ مِلک کی طرف ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَلَا تَصِحُّ اِضَافَةُ الطَّلَاقِ اِلَّا اَنْ یَّکُوْنَ الْحَالِفُ مَالِکًا اَوْ یُضِیْفُ اِلٰی مِلْکٍ

ترجمہ: ''اور نسبت طلاق اس صورت میں درست ہوسکتی ہے کہ یا تو قسم کھانے والا مالک ہو یا شوہر طلاق کو مِلک کی طرف منسوب کرے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:420)''۔

صورتِ مسئولہ میں طلاق کی نسبت نہ تو مِلک کی طرف ہے اور نہ ہی سببِ مِلک کی طرف، لہٰذا طلاق واقع نہیں ہوگی، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

رَجُلٌ قَالَ: اِنْ تَزَوَّجْتُ امْرَأَةً مِنْ بَنَاتِ فُلَانٍ، فَهِيَ طَالِقٌ، وَلَيْسَ لِفُلَانٍ بِنْتٌ ثُمَّ وُلِدَتْ لَهٗ بِنْتٌ فَتَزَوَّجَهَا الْحَالِفُ قَالُوْا لَا یَحْنَثُ فِیْ یَمِیْنِهٖ وَیَشْتَرِطُ قِیَامُ الْبِنْتِ وَقْتَ الْیَمِیْنِ،

ترجمہ: ''کسی شخص نے کہا: اگر میں فلاں شخص کی بیٹیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کروں، تو اس کو طلاق ہے اور اُس وقت اُس شخص کی کوئی بیٹی نہیں تھی، پھر (بعدازاں) اُس کے ہاں

کوئی بیٹی پیدا ہوئی اور حلف اٹھانے والے نے اس کے ساتھ نکاح کر لیا تو فقہاء فرماتے ہیں کہ وہ شخص حانث نہیں ہوگا (یعنی اس لڑکی پر طلاق واقع نہیں ہوگی)، حانث ہونے (یعنی قسم ٹوٹنے) کے لئے حلف اٹھاتے وقت لڑکی کا موجود ہونا ضروری ہے"۔
(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:426)

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر والد وہ مکان بیٹے کے نام نہیں کرتا تو طلاق نہیں ہوگی، کیونکہ اُس وقت وہ مکان والد کی ملکیت میں نہیں تھا۔

میں نے تمہیں چھوڑ دیا، طلاقِ صریح ہے

سوال:121

میری شادی کو 7 سال ہو چکے ہیں۔ ایک 5 سالہ بیٹی ہے، میرے شوہر ذمہ داریوں کو نہیں نبھاتے، نہ ہی کام کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی خرچہ دیتے ہیں۔ اکثر گھر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور بالکل لاتعلق رہتے ہیں۔ ان باتوں کے سبب اکثر ہمارے درمیان جھگڑا رہتا ہے، اس لڑائی کے دوران کئی مرتبہ انہوں نے مجھے گھر چھوڑنے کو کہا اور میرے منع کرنے پر مجھے چھوڑنے کی دھمکی بھی دی اور کہا کہ "میں نے تمہیں چھوڑ دیا ہے"، چھ سات مرتبہ یہ جملہ کہہ چکے ہیں۔ ایک ہفتہ قبل انہوں نے مجھے دو مرتبہ کہا: "میں نے تمہیں طلاق دی، میں نے تمہیں طلاق دی"۔ ان تمام باتوں کے بعد میرا نکاح برقرار ہے یا نہیں؟۔
(افشین، لیاقت آباد، کراچی)

جواب:

علماء کرام کی تصریحات کے مطابق "میں نے تمہیں چھوڑ دیا" طلاقِ صریح میں شمار ہوتا ہے اور اس میں نیت کی کوئی ضرورت نہیں، تین مرتبہ کہے جانے سے طلاقِ مغلظہ واقع ہو جائے گی، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز تحریر فرماتے ہیں: "عورت کو چھوڑ دیا" عرفاً طلاق میں صریح ہے اور پھر انہوں نے فتاویٰ عالمگیری کے حوالے سے فارسی کے کئی اور ہم معنی کلمات کا حوالہ دیا ہے:

لوقال الرجل لأمرأته ترا چنگ باز داشتم او بهشتم اویله کہ دم ترا او پاے کشادہ کہ دم ترا فهذا کله تفسیر قوله طلقتك عرفاحتی یکون رجعیاً ویقع بدون النیة۔

ترجمہ: ''اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو کہے ''میں نے تیرا چنگل باز رکھا، تجھے چھوڑا، تجھے جدا کر دیا ہے یا تیرے پاؤں کھول دیئے ہیں، تو یہ تمام الفاظ عرفاً ''تجھے طلاق دی'' کے ہم معنی ہیں، اس لئے ان سے رجعی طلاق ہوگی اور بغیر نیت طلاق ہوگی، (فتاویٰ رضویہ، جلد 12، ص: 583)

اگر آپ کا بیان درست ہے اور آپ کے شوہر نے آپ کو تین مرتبہ (مختلف مجالس میں) یہ کلمہ کہا ہے کہ ''میں نے تمہیں چھوڑ دیا''، تو تیسری بار کہنے کے بعد آپ پر تین طلاقیں واقع ہو چکی ہیں، بشرطیکہ پہلی طلاق کے بعد دوسری اور تیسری طلاق عدت کے اندر دی گئی ہو تو تین طلاقیں نافذ ہو گئیں اور آپ دونوں کے درمیان تحلیلِ شرعی کے بغیر رجوع کی گنجائش نہیں ہے۔

جبری طلاق کا حکم

سوال: 122

مسمّٰی ''الف'' نے مسماۃ ''ب'' کے ساتھ اپنے والدین کی رضامندی کے بغیر برضا ورغبت باقاعدہ گواہوں کی موجودگی میں ایک عالم کے پاس جا کر نکاح کیا اور اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے، کوئی ازدواجی تعلق استوار نہیں کیا۔ دونوں کے والدین کو معلوم ہوا تو بہت ناراض ہوئے۔ مسماۃ ''ب'' کو کسی دور دراز مقام پر لے جا کر گن پوائنٹ پر یہ کہلوانے پر مجبور کیا کہ وہ ''الف'' سے خلع چاہتی ہے۔ مسمّٰی ''الف'' کو حکمتِ عملی کے ذریعے لڑکی کے رشتے داروں نے یرغمال بنالیا اور گن پوائنٹ پر کہا کہ ''جان چاہیے تو اس کاغذ پر دستخط کرو، ہم تجھ سے طلاق لینا چاہتے ہیں''۔ مسمّٰی ''الف'' نے جان بچانے کے لئے زبان سے کہے بغیر سادہ کاغذ پر دستخط کر دیئے اور اس طرح جان بچا کر نکل آیا۔ بعد میں اُس سادہ کاغذ پر طلاق لکھی گئی یا نہیں اِس کا قطعاً کوئی علم نہیں۔ کیا زبانی طلاق دیئے بغیر محض سادہ کاغذ پر دستخط کر دینے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے؟۔ (محمد عالم، ساکنہ استور، گلگت بلتستان)

جواب:

اگر باقاعدہ دو گواہوں کی موجودگی میں آزادانہ ایجاب وقبول کے ذریعے نکاح ہوا تھا، تو وہ نکاح شرعاً وقانوناً مؤثر اور منعقد ہے۔ تاہم اگر لڑکا لڑکی کا کفو نہیں ہے تو اس بارے میں فقہ حنفی کی رُو سے ایک موقف یہ ہے کہ نکاح اصلاً منعقد ہی نہیں ہوتا ہے، یہی مفتیٰ بہ ہے۔ چنانچہ درمختار، جلد: 4، ص: 116 (باب الولی) میں ہے: (ویفتی) فی غیر الکفو (بعدم جوازہ اصلا) وھو المختار للفتویٰ (لفساد الزمان)،

اور دوسرا موقف یہ ہے کہ ولی عدالت کے ذریعے نکاح فسخ کراسکتا ہے، لیکن آج کل کی شہری زندگی میں ''کفو'' کا معیار کن امور کو قرار دیا جائے، قابلِ توجہ امر ہے۔ ہمارے فقہاءِ کرام نے کفات میں چھ چیزوں کا اعتبار کیا ہے: اسلام، نسب، پیشہ، حریت، دیانت، مال۔ دونوں کے لئے بہتر یہ ہوتا کہ والدین کی رضامندی سے نکاح کرتے تو دونوں کے لئے باعثِ سعادت ہوتا اور اجرِ آخرت کے مستحق ہوتے۔ اگر آپ کا بیان درست ہے کہ شوہر نے اپنی بیوی کو زبانی طلاق نہیں دی، محض جبر کے تحت سادہ کاغذ پر دستخط کئے ہیں تو یہ طلاق واقع نہیں ہوئی، کیونکہ کاغذ کوئی تحریر نہیں تھی اور اگر طلاق نامہ تحریری بھی ہوتا تو جبر سے لئے گئے دستخط معتبر نہیں ہیں۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وَفِی ''البَحر'' اَنَّ المُرَادَ الِاکرَاہُ عَلَی التَّلَفُّظِ بِالطَّلَاقِ، فَلَو اُکْرِہَ عَلٰی اَنْ یَکْتُبَ طَلَاقَ اِمْرَاَتِہٖ فَکَتَبَ لَا تُطَلَّقُ، لِاَنَّ الْکِتَابَةَ اُقِیمَتْ مَقَامَ العِبَارَةِ بِاعْتِبَارِ الْحَاجَةِ وَلَا حَاجَةَ هُنَا۔

ترجمہ: ''البحر الرائق'' میں ہے کہ جبر سے مراد یہ ہے کہ لفظ طلاق کہنے پر مجبور کیا گیا ہو۔ اور اگر کسی شخص کو مجبور کیا گیا ہو کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق لکھ کر دے اور اس نے جبر کے تحت طلاق لکھ دی تو طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ کتابت کو محض حاجت کی بنا پر تلفظ کے قائم مقام کیا گیا ہے اور یہاں کوئی حاجت نہیں ہے (کیونکہ خاوند طلاق نہیں دینا چاہتا)''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 4، ص: 324، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

لیکن جس اِکراہ کی بنا پر تحریری طلاق مؤثر نہیں ہوتی، وہ ''اکراہِ تامّ'' یا ''اکراہِ مُلجی'' ہے اور اس کی تعریف یہ ہے: تَامٌ وَهُوَ الْمُلْجِیءُ بِتَلَفِ نَفْسٍ أَوْ عُضْوٍ أَوْ ضَرْبٍ مُبَرِّحٍ
ترجمہ: ''احناف کے نزدیک ''اکراہِ تامّ'' یا ''اکراہِ مُلجی'' سے مراد ایسا اکراہ (Forcibility) ہے کہ جس میں کسی کی جان تلف ہونے یا عضو کے تلف ہونے کا حقیقی خطرہ یا واضح ضرب ہو، (ردالمحتار، جلد 9، ص: 154، داراحیاء التراث العربی، بیروت)''۔
یعنی محض زبانی دھمکی سے تحریری طلاق غیر مؤثر نہیں ہوتی جبکہ دھمکی دینے والا خدانخواستہ باقاعدہ نقصان پہنچانے پر قادر نہ ہو۔ جسے آج کل ''گن پوائنٹ'' پر کوئی کام لینا کہتے ہیں۔

طلاقِ صریح، طلاقِ بائن کو لاحق ہو جاتی ہے

سوال: 123

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ زید نے اپنی بیوی کو ''انت حرام'' کے الفاظ سے طلاقِ بائن دی۔ پھر اس کے بعد تین مرتبہ ''انت طالق'' اِس نیت سے کہا کہ بائن کے بعد صریح طلاق واقع نہیں ہوتی اور وہ اِس کے ذریعے اپنی بیوی اور اس کے والدین کو ڈرانا چاہتا ہے تھا، کیونکہ وہ لوگ اکثر جھگڑتے رہتے ہیں۔ پھر زید کے والدین نے حلالہ کے بغیر اُس کی بیوی سے اُس کا دوبارہ نکاح کر دیا۔ آیا مذکورہ الفاظ سے طلاقِ بائن ہوئی یا طلاقِ مغلظہ؟ حالانکہ طلاقِ بائنہ سے فوراً نکاح ختم ہو جاتا ہے اور عدت تو صرف استبراءِ رحم کے لئے ہوتی ہے، تو پھر وہ طلاق کا محل کیسے بنی؟ بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ عدت کے اندر صریح بائن کو لاحق ہو جاتی ہے۔
(محمد راشد، بستی جیون والا تحصیل و ضلع مظفر گڑھ، پنجاب)

جواب:

لفظ ''انتِ حرامٌ'' سے طلاقِ بائن واقع ہوگی، علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں: خَلِیَّةٌ بَرِیَّةٌ حَرَامٌ بَائِنٌ، ترجمہ: ''خَلِیَّةٌ (تو اکیلی ہے)، بَرِیَّةٌ (تو بری ہے)، حَرَامٌ (تو حرام ہے)، سب طلاقِ بائن کے الفاظ ہیں۔۔۔۔۔ علامہ ابن عابدین شامی لفظِ ''حرام''

کے ذیل میں لکھتے ہیں: مِن حرُم الشَّيئُ بِالضم حرَاماً أُمتُنِعَ، أُرِيدُ بِها هنا الوصف، معناه الممنوع، فيحمل على ما سبق، وسيأتي وقوع البائن به بلا نية في زماننا للتعارف، لا فرق في ذلك بين محرَّمةٍ وحرَّمتُكِ، سواء قال علَيَّ أو لا،

ترجمہ: ''یہ کلمہ ''حرُم الشئ حراماً'' سے ماخوذ ہے، یعنی اس سے روک دیا گیا، یہاں اس کا وصف مراد ہے، یعنی اس کا معنی ہے: ایسی چیز کہ جس سے روک دیا گیا ہو، یہ پہلے کلمات پر محمول ہوگا، عنقریب اس امر کا بیان ہوگا کہ ہمارے زمانے کے عرف کے اعتبار سے اس کلمے سے نیت کے بغیر طلاقِ بائن واقع ہوجاتی ہے اور اس حوالے سے مُحَرَّمَۃٌ اور حَرَّمْتُكِ میں کوئی فرق نہیں ہے اور اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ عَلَيَّ (مجھ پر) کہا جائے یا نہ (صرف حَرَّمْتُكِ کہا ہو یا حَرَّمْتُكِ عَلَيَّ کہا ہو، (ترجمہ: ''میں نے تجھے حرام کیا یا میں نے تجھے اپنے اوپر حرام کیا)، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 4، ص:396)''۔

صورتِ مسئولہ میں زید نے طلاقِ بائن کے بعد تین صریح طلاقیں دیں جو بائن کو لاحق ہوگئیں اور صریح بائن کے ساتھ لاحق ہونے سے بائن ہوجاتی ہے۔ آپ کا یہ خیال درست نہیں کہ بائن کو صریح لاحق نہیں ہوتی۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

الصریح یلحق الصریح ویلحق البائن بشرط العدۃ،

ترجمہ: ''عدت کے اندر دی گئی صریح طلاق (پہلے سے دی گئی) صریح طلاق کو لاحق ہوجاتی ہے اور (اسی طرح) طلاقِ صریح (عدت کے اندر) بائن کو بھی لاحق ہوجاتی ہے''۔

''ویلحق البائن'' کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

کما لو قال لها انت بائن أو خالعها على مال ثم قال انت طالق أو هذه طالق۔ ''بحر'' عن ''البزازية''، ثم قال واذا لحق الصريح البائن كان بائناً، لأن البينونة السابقة عليه تمنع الرجعة كما في ''الخلاصة''۔

ترجمہ: ''جیسے کسی شخص نے اپنی بیوی سے کہا: تجھے طلاقِ بائن ہے یا اس نے مال کے عوض طلاق دی (خلع کیا)، پھر کہا: انتِ طالقٌ یا هذهٖ طالقٌ (تجھے طلاق ہے یا اسے طلاق ہے)،

یہ مسئلہ ''البحر الرائق'' میں ''بزازیہ'' کے حوالے سے منقول ہے۔ پھر کہا: جب طلاقِ صریح، طلاقِ بائن کولاحق ہوتو وہ بھی بائن ہوجاتی ہے، کیونکہ پہلی بائنہ کے بعد رجوع ممنوع ہوجاتا ہے، جیسا کہ ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 4، ص:405)''۔

آپ کا یہ کہنا کہ عدت کا تعلق استبراءِ رحم (عورت کے رحم کا حمل سے پاک ہونا) سے ہے نہ کہ عدت سے، آپ کی یہ سوچ درست نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَ اَحْصُوا الْعِدَّةَ (الطلاق:1)

ترجمہ: اے نبی ﷺ! (ایمان والوں سے فرما دیجئے)، جب تم (اپنی) عورتوں کو طلاق دو، تو ان کی عدت کے وقت (سے پہلے طہر میں) انہیں طلاق دو اور عدت کا شمار رکھو''۔

پس عدت اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، استبراءِ رحم اس کے مقاصد میں سے ایک ہے، ورنہ انتہائی عمر رسیدہ خاتون، جس کے حاملہ ہونے کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہوتا، اس کو بھی عدت گزارنے کا حکم ہے۔

دارالاسلام میں احکامِ شرعیہ سے جہالت کوئی عذر نہیں ہے اور جدید دنیا کا فلسفۂ قانون بھی یہی ہے کہ ''قانون سے ناواقفی کا عذر قابلِ قبول نہیں ہے''۔ طلاق مغلظہ کے بعد جو عقدِ ثانی کیا گیا ہے وہ باطل ہے، کالعدم ہے، زوجین کے درمیان فوراً تفریق کردی جائے۔ کیونکہ طلاقِ ثلاثہ کے بعد بغیر تحلیل شرعی کے تجدیدِ نکاح نہیں ہوسکتا۔ البتہ اس عرصے میں کوئی اولاد ہوئی ہوتو اسے صحیح النسب مانا جائے گا۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ولو طلقها ثلاثًا، ثم تزوجها قبل أن تنكح زوجًا غيره، فجاءت منه بولد ولايعلمان بفساد النكاح، فالنسب ثابت وان كان يعلمان بفساد النكاح يثبت النسب أيضا عند أبي حنيفة رحمة الله تعالى كذا في التاتارخانيه۔

ترجمہ: ''اگر شوہر نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں، پھر تحلیلِ شرعی سے پہلے اس سے عقدِ ثانی کرلیا اور اس کے نتیجے میں اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا اور انہیں اِس نکاح کے فاسد

ہونے کا علم نہیں تھا تو اِس بچے کا نسب اپنے ماں باپ سے ثابت ہے۔ اور اگر ان کو نکاح کے فاسد ہونے کا علم تھا، تو بھی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ بچہ ثابت النسب ہے، ''فتاویٰ تاتارخانیہ'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:540)''۔

طلاق واقع ہوگئی

سوال:124

میری بیٹی فہمیدہ ناز کی شادی دو سال پہلے مسعود حسین سے ہوئی۔ شادی کے بعد اُس نے میری بیٹی کو تنگ کرنا شروع کردیا۔ کبھی جہیز کا بہانہ بنا کر اور کبھی کسی دوسری وجہ سے تنگ کرتا رہا۔ بالآخر میری بیٹی میرے گھر آگئی اور چھ ماہ تک اُس نے کوئی خبر نہیں لی۔ اس دوران ہمارے کئی رشتہ داروں سے اُس نے کہا: ''وہ میری طرف سے آزاد ہے، اب وہ اپنے والدین کے گھر رہے، مجھے اُس کی کوئی ضرورت نہیں''۔ مورخہ 16 فروری 2007ء کو ایک طلاق نامہ بھی اُس نے ہمیں بھیجا، جس میں لکھا تھا: ''دونوں نے باہمی رضامندی سے ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کیا چنانچہ پہلے فریق نے دوسرے فریق کو طلاق دی دوسری پارٹی نے اسے قبول کیا''۔ آپ سے معلوم کرنا ہے کہ کیا اس صورت میں طلاق واقع ہوگئی ہے؟، (محمد صابر، یونائیٹڈ مینشن، نشتر روڈ، کراچی)۔

جواب:

شوہر کا یہ قول کہ ''وہ میری طرف سے آزاد ہے''، طلاقِ کنایہ کے الفاظ ہیں اور اِن الفاظ سے طلاق کا واقع ہونا شوہر کی نیت پر موقوف ہے۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَلَوْقَالَ اَعْتَقْتُكِ طُلِّقَتْ بِالنِّيَةِ

ترجمہ: ''اور اگر (شوہر نے اپنی بیوی سے) کہا: ''میں نے تجھے آزاد کیا'' تو اگر اس نے یہ کلمات طلاق کی نیت سے کہے تو طلاق واقع ہوجائے گی''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:374)

لیکن شوہر کے یہ الفاظ کہ'' اب وہ اپنے والدین کے گھر رہے مجھے اُس کی کوئی

ضرورت نہیں'' اُس کی نیتِ طلاق کو ظاہر کرتے ہیں۔ پھر ایک طلاق (صریح) بذریعۂ تحریر دی، مجموعی طور پر دو طلاقیں بائن ہوگئیں۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

فان الصریح یلحق البائن والرجعی اذا جامعہ البائن یمعہ بائنا لامتناع الرجعۃ۔

ترجمہ: ''طلاقِ صریح، بائن اور رجعی (دونوں کو) لاحق ہوجاتی ہے اور جب صریح بائن کے ساتھ جمع ہوجائے تو وہ اسے بھی بائن بنادیتی ہے کیونکہ یہاں رجوع نہیں ہوسکتا ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 12، ص: 611، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

صورتِ مسئولہ میں دو بائن طلاقیں واقع ہوچکی ہیں، شوہر کو عدت کے اندر بھی یک طرفہ طور پر رجوع کا حق نہیں تھا۔ اب چونکہ عدّت گزر چکی ہے، اس لئے عورت آزاد ہے، جہاں چاہے اپنی مرضی سے نکاح کرسکتی ہے۔ اور اگر شوہر نے حق مہر ادا نہیں کیا تھا تو اس کی ادائیگی بھی اُس پر واجب ہے۔ تاہم اب بھی وہ دونوں باہمی رضامندی سے آپس میں نکاح کرسکتے ہیں، کیونکہ طلاقِ بائن کی صورت میں عدت کے دوران اور عدت کے بعد بھی شوہر رجوع کرسکتا ہے بشرطیکہ بیوی بھی راضی ہو۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: اذا کان الطلاق بائنا دون الثلاث فلہ ان یتزوجھا فی العدت وبعد انقضائھا، (عالمگیری، جلد: 01، ص: 472)۔ ترجمہ: ''اور طلاق بائن تین سے کم ہوں (یعنی ایک یا دو ہوں) تو شوہر عدت کے اندر یا عدت گزرنے کے بعد (بیوی کے رضامندی سے) نکاح کرسکتا ہے''۔

اس کے لئے نیا مہر مقرر کرنا ہوگا۔ لیکن اس عقدِ ثانی کی صورت میں پہلے شوہر کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا اور اگر خدانخواستہ اس نے مستقبل میں ایک طلاق بھی دیدی تو سابق دو طلاقوں کے ساتھ جمع ہوکر یہ تین ہوجائیں گی اور پھر تحلیلِ شرعی کے بغیر دونوں میں رجوع نہیں ہوسکے گا۔

متفرق مواقع پر دی گئی طلاقیں مؤثر رہتی ہیں

سوال:125

میں اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ میں رہتی ہوں، میرے دو بیٹے ہیں۔ایک کی عمر 7 سال اور دوسرے کی عمر 2 سال ہے۔میرے شوہر اور میں دونوں وہاں جاب کرتے ہیں۔ مجھے میرے شوہر جنید باوزیر نے آج سے دو سال قبل تین مرتبہ کہا: ''میں تجھے طلاق دیتا ہوں''۔ہم بازار میں تھے، دو مرتبہ میں نے بالکل قریب سے طلاق کے الفاظ سنے اور اس دوران میں تھوڑا آگے چلی گئی تاکہ تیسری مرتبہ نہ سنوں، لیکن تیسری مرتبہ کے الفاظ بھی مجھے سنائی دیئے۔ پھر اس بات کے ڈیڑھ سال بعد دو دفعہ کہا: ''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں''۔ پھر چند ماہ بعد دو دفعہ کہا: ''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں''۔پھر ابھی رمضان سے قبل دو دفعہ کہا: ''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں''۔معلوم یہ کرنا ہے کہ کتنی طلاق واقع ہوئیں اور ہمارے درمیان نکاح برقرار ہے یا نہیں؟ حنفی مسلک کے علاوہ دیگر آئمہ امام مالک، امام احمد بن حنبل اور بالخصوص امام شافعی کے نزدیک ان طلاقوں کا کیا حکم ہے؟ اُن کے نزدیک بھی طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟، (عائشہ، Willow ،6153 Knoll Way Dr 102 Brook il 60527)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں آپ کے تحریری بیان کے مطابق مختلف اوقات میں دی جانے والی ان طلاقوں کی مجموعی تعداد نو ہے۔شرعاً آپ کے شوہر نے آپ کو پہلی مرتبہ جو تین طلاقیں دی تھیں، اُن تین طلاقوں کے بعد آپ دونوں ایک دوسرے پر حرام ہو چکے ہیں اور آپ دونوں کے درمیان رشتۂ ازدواج باقی نہیں رہا، نہ ہی تحلیلِ شرعی کے بغیر رجعت کی کوئی گنجائش ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يَّتَرَاجَعَاۤ

ترجمہ: ''پھر اگر (وہ شوہر) اسے (تیسری) طلاق دیدے تو وہ (عورت) اس (تیسری طلاق) کے بعد اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ (عورت) اس کے علاوہ کسی اور مرد سے نکاح کرلے۔ پھر اگر وہ (دوسرا خاوند) اسے طلاق دے دے، تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ (عدت کے بعد نکاح کرکے) آپس میں رجوع کرلیں، (البقرۃ:230)''۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: وذهب جمهور الصحابة والتابعين ومن بعدهم من ائمة المسلمين الى انه يقع ثلاث۔

ترجمہ: ''جمہورِ صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے آئمہ دین کی متفقہ رائے ہے کہ (ایک وقت میں) دی گئی تین طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں''۔ (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد چہارم، ص:320)

علامہ کمال الدین ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

طلاق البدعة ان يطلقها ثلاثا بكلمة واحدة او ثلاثا فى طهر واحد، فاذا فعل ذلك وقع الطلاق وكان عاصيا

ترجمہ: ''اور طلاق بدعی یہ ہے کہ (شوہر اپنی بیوی کو) ایک ہی کلمے کے ساتھ یا تین کلمات کے ساتھ ایک ہی طہر میں تین طلاقیں دے، تو اس طریقے سے یہ تینوں طلاقیں واقع ہوجائیں گی اور ایسا کرنے والا گنہگار ہوگا، (فتح القدیر، جلد سوم، ص449)''۔

علامہ یحیٰ بن شرف نووی شافعی لکھتے ہیں:

وقد اختلف العلماء فيمن قال لامرأته انت طالق ثلثا فقال الشافعى ومالك وابوحنيفة احمد وجماهير العلماء من السلف والخلف يقع الثلاث،

ترجمہ: ''ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا: تجھے تین طلاق (یا تجھے تین طلاقیں دیتا ہوں)، تو اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، امام شافعی، امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ اجمعین اور جمہور علماءِ سلَف وخلَف کے نزدیک تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی، (شرح صحیح مسلم للنووی جلد 1 ص 478)''۔ ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

وتنفذ الطلقات الثلاث بالاتفاق، سواء طلق الرجلُ المرأةَ واحدةً بعد واحدةٍ، ام

جمیع الثلاث فی کلمۃ واحدۃ بان قال انتِ طالقٌ ثلاثاً عند الجمہور خلافاً الظاھریۃ

ترجمہ: ''اور جمہورِ آئمہؒ کے نزدیک تین طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں، خواہ کسی شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں یکے بعد دیگرے دی ہوں یا ایک ہی کلمے کے ساتھ دی ہوں، جیسے شوہر اپنی بیوی کو یہ کہے کہ تجھے تین طلاقیں ہیں، اس مسئلے میں (چاروں آئمہ متفق ہیں) صرف غیر مقلدین کا اختلاف ہے، (الفقہ الاسلامی وادلّتہٗ، جلد: 9، ص: 6906)''۔

اگر آپ کا بیان درست ہے تو پہلی ہی مرتبہ آپ کو تین طلاقیں واقع ہوچکی ہیں، اس کے بعد آپ دونوں کا میاں بیوی کے طور پر رہنا شرعاً حرام ہے اور اس پر آپ دونوں کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں صدقِ دل سے توبہ کرنی چاہئے اور فوراً علیحدگی اختیار کرنی چاہئے، تاہم اس دوران اگر آپ کی کوئی اولاد ہوئی ہو تو اس کا نسب آپ دونوں سے ثابت ہوگا اور وہ اپنے ماں باپ کے وارث بھی ہوں گے۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً آپ کے شوہر نے جو طلاقیں دی ہیں، وہ لغو ہیں کیونکہ تین طلاقوں کے بعد منکوحہ محلِ طلاق نہیں رہتی۔

تحریری طور پر تین طلاق کا حکم

سوال: 126

میں نے مورخہ 18 اپریل 2009ء کو اپنی زوجہ کو تین طلاقیں تحریری دے دی ہیں، یہ طلاق نامہ بذریعہ وکیل تیار کیا گیا اور میں نے دو گواہوں کی موجودگی میں اس پر دستخط کئے اور کوریئر سروس (TCS) کے ذریعے اپنی زوجہ کے گھر بھجوا دیا، انہوں نے وصول بھی کرلیا۔ اب یہ معاملہ رجسٹریشن کیلئے یونین کونسل میں ہے۔ وہاں میری زوجہ کے گھر والے اور مصالحتی کمیٹی کے اراکین زور دے رہے ہیں کہ میں اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرلوں اور عدت میں رجوع کرلوں، اُن کے بقول شرعاً رجوع کی گنجائش ہے۔ مجھے معلوم یہ کرنا ہے کہ اس وقت میری طلاق کی کیا حیثیت ہے؟ طلاق نامہ کی نقل منسلک ہے۔

(انور رشید لودھی، گلستانِ جوہر، بلاک 15، کراچی)

جواب:

صورت مسئولہ میں منسلکہ طلاق نامے کی رُو سے تین طلاقیں واقع ہو چکی ہیں اور میاں بیوی دونوں ایک دوسرے پر حرام ہو چکے ہیں، دونوں کے درمیان رشتۂ ازدواج باقی نہیں رہا اور تحلیلِ شرعی کے بغیر رجوع کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ

ترجمہ: ''پھر اگر (وہ شوہر) اسے (تیسری) طلاق دے دے تو وہ (عورت) اس (تیسری طلاق) کے بعد اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ (عورت) اس کے علاوہ کسی اور مرد سے نکاح کرلے۔ پھر اگر وہ (دوسرا خاوند) اسے طلاق دے دے تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ (عدت کے بعد نکاح کر کے) آپس میں رجوع کرلیں، (البقرۃ:230)''۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: وذھب جمھور الصحابة والتابعین ومن بعدھم من ائمة المسلمین الی انه یقع ثلاث۔

ترجمہ: ''جمہور صحابہ، تابعین اور وہ مسلمہ آئمۂ دین جو ان کے بعد ہیں، ان سب حضرات کا متفقہ مذہب ہے کہ (اگر شوہر ایک ہی مجلس میں ایک کلمے کے ساتھ یا الگ الگ تین کلمات کے ساتھ اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدے تو وہ) تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد چہارم، ص:320، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ کمال الدین ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: طلاق البدعة ان یطلقھا ثلاثا بکلمة واحدۃ او ثلاثا فی طھر واحد، فاذا فعل ذلك وقع الطلاق وکان عاصیاً

ترجمہ: ''اور طلاق بدعی یہ ہے (کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو) تین طلاقیں دے، (خواہ) ایک کلمے کے ساتھ (مثلاً میں نے تم کو تین طلاقیں دیں)، یا ایک ہی طہر میں (ایک ہی وقت میں یا وقفے وقفے سے) تین طلاقیں دے (مثلاً میں نے تم کو طلاق دی، میں نے تم کو طلاق دی، میں نے تم کو طلاق دی)، تو ان دونوں صورتوں میں تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں اور

ایسا کرنے والا گنہگار ہوگا، (فتح القدیر، جلد سوم، ص 449)"۔

مصالحتی کونسل اور آپ کی زوجہ کے گھر والوں کا کہنا درست نہیں ہے، شریعت میں ردّ و بدل کا کسی کو اختیار نہیں، نہ ہی کوئی یونین کونسل کسی شرعی حکم کو تبدیل کر سکتی ہے۔

الفاظ بدل کر طلاق دینا

سوال: 127

میری شادی کو تقریباً چار ماہ ہوئے ہیں۔ 14 مئی 2009ء کی رات میں اپنی بیوی کو فون پر سمجھا رہا تھا اور وہ مستقل بدتمیزی کر رہی تھی۔ میں نے اسے ڈرانے دھمکانے اور سدھارنے کی نیت سے یہ الفاظ کہے: "میں تجھے تلاف دیتا ہوں، میں تجھے تلاف دیتا ہوں، میں تجھے تلاف دیتا ہوں"، یہ الفاظ میں نے اتنی تیزی میں کہے کہ وہ سمجھ نہ سکی کہ میں نے کیا کہا ہے اور لائن ڈراپ کر دی، اور پھر اس کا یقین دلانے کے لئے میں نے اس کے والد کو فون کیا اور اُن سے کہا کہ: "میں نے آپ کی بیٹی کو طلاق دے دی ہے"۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا کوئی طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟، (محمد فرحان، نارتھ کراچی)۔

جواب:

فقہاءِ کرام کی بیان کردہ تصریحات کے مطابق الفاظِ طلاق میں اگر تحریف بھی کی گئی ہو تو بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے، علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(ویقع بها) ای بھذہ الالفاظ وما بمعناها من الصریح، ویدخل نحو طلاغ، وتلاغ وطلاك وتلاك أو ط ل ق۔ أو طلاق باش بلا فرق بین عالم وجاهل، وان تعمدته تخویفا لم یصدق قضاء، الا اذا اشهد علیه قبله، به یفتی،

ترجمہ: "اور ایسے الفاظ جو صریح کے ہم معنی ہوں، اُن سے طلاقِ رجعی واقع ہو جاتی ہے، اور طلاقِ صریح میں (تحریف شدہ الفاظ بھی) داخل ہیں، جیسے: طلاغ، تلاغ (یعنی ط کی جگہ ت اور ق کی جگہ غ) اور لفظِ طلاک (یعنی ق کی جگہ ک) اور تلاک (یعنی ط کی جگہ ت اور ق کی جگہ ک) یا (طلاق کے بجائے حروف تہجی کو الگ الگ بول کر کہا) ط ل ق یا "طلاق

باش (طلاق ہوجائے)'' کہا۔ لفظِ طلاق غلط بولنے میں عالم اور جاہل کا حکم ایک ہے (یعنی ان کلمات سے طلاق واقع ہوجائے گی کہ یہ صریح میں داخل ہیں)، اگر شوہر نے کہا: کہ میں نے طلاق کے یہ کلمات قصداً بولے ہیں (مگر طلاق کی نیت سے نہیں بلکہ) بیوی کو ڈرانے کے لئے کہے ہیں تو قضاءً اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی (کیونکہ شریعت کے احکام کا اطلاق ظاہر پر ہوتا ہے)، مگر صرف اُس صورت میں شوہر کے اِس دعوے (کہ اس نے طلاق کے ارادے سے یہ کلمات نہیں بولے) کی تصدیق کی جائے گی جبکہ شوہر نے بیوی کو طلاق کے کلمات بولنے سے پہلے گواہ بنا لئے ہوں کہ میں (ارادتاً نہیں بلکہ بیوی کو ڈرانے کے لئے) طلاق کے کلمات استعمال کروں گا، اسی قول پر فتویٰ ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 4، ص: 338 تا 340)

صورتِ مسئولہ میں آپ کے کہے ہوئے الفاظِ طلاق علامہ علاؤ الدین حصکفی رحمہ اللہ کے بیان کردہ چند الفاظ میں ''تلاغ'' کے مشابہ ہیں، جو حکم لفظِ تلاغ کا بیان کیا گیا وہی اِس پر بھی لاگو ہوگا، یعنی آپ کی بیوی کو تین طلاقیں واقع ہوگئیں اور تحلیلِ شرعی کے بغیر رجوع کی گنجائش نہیں۔

''میری طرف سے بھی سمجھو چھٹی''، سے طلاق واقع نہیں ہوگی

سوال:128

ہم دونوں میاں بیوی میں کافی دنوں سے ناچاقی چل رہی تھی، جس کی بنا پر میری بیوی نے اپنے گھر والوں کو بلایا، میں بیٹھا تھا کہ انہوں نے آکر مجھے مارا۔ پھر فیصلے میں ایک صاحب نے میری بیوی سے پوچھا کہ آپ اپنے شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہیں یا نہیں؟ تو جواب ملا ''نہیں''۔ پھر مجھ سے پوچھا کہ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو میں نے بھی جواب دیا ''میری طرف سے بھی سمجھو چھٹی''۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ ان الفاظ سے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟، (عبدالوحید، ملیر کراچی)۔

جواب:

لفظِ ''چھٹی'' حالتِ غضب میں طلاقِ بائن شمار ہوتا ہے۔ امام احمد رضا قادری قدس سرّہ العزیز سے سوال ہوا: ''ایک شخص نے اپنی عورت کو دو مرتبہ کہا: ''میں نے اسے چھٹی دی''، آپ نے جواب میں لکھا:

''سائل نے اظہار کیا کہ اس شخص نے حالتِ غضب میں اپنی زوجہ کی نسبت دوبارہ یہ لفظ کہے کہ ''میں نے اسے چھٹی دی''، اس کہنے سے عورت پر ایک طلاق بائن پڑ گئی، وہ نکاح سے نکل گئی، جب مرد وعورت دونوں راضی ہیں، نئے سرے سے پھر نکاح کرلیں''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد: 12، ص: 584، مطبوعہ: رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اعلیٰ حضرت کے فتوے کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شوہر اپنی بیوی کو غضب کی حالت میں یہ کہے: ''میں نے اسے چھٹی دی''، اس سے طلاق واقع ہوجاتی ہے، کیونکہ یہ انشاءِ طلاق کے کلمات ہیں اور حالتِ غضب قرینۂ طلاق ہے۔ لیکن صورتِ مسئولہ میں طلاق واقع نہیں ہوئی، کیونکہ شوہر کے الفاظ یہ ہیں: ''میری طرف سے بھی سمجھو چھٹی''، ان الفاظ سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔

فتاویٰ امام قاضی خان میں ہے: امرأة قالت لزوجها مرا طلاق ده ۔۔۔ ولو قال الزوج داده انکار، او قال کرده آنکار لایقع الطلاق وان نویٰ، کانه قال بالعربیة احسبی انكِ طالقٌ، وان قال ذالك، لایقع وان نویٰ

ترجمہ: ''بیوی نے اپنے شوہر سے کہا: ''مجھے طلاق دے دو''،۔۔۔۔ (یہاں کئی کلمات ذکر کرنے کے بعد امام قاضی خان لکھتے ہیں:) شوہر نے جواب میں کہا: ''تو دی ہوئی یا کی ہوئی خیال کرلے''، تو اگرچہ شوہر نے طلاق کی نیت سے یہ کلمات کہے ہوں، (تب بھی ان الفاظ سے) طلاق واقع نہیں ہوگی، یہ کلمات ایسے ہی ہیں، جیسے کوئی شوہر عربی میں اپنی بیوی سے کہے: ''سمجھو کہ تجھے طلاق ہے (یا یہ کہ تم طلاق سمجھو)''، تو اگر شوہر نے طلاق کی نیت سے بھی یہ کلمات کہے ہوں، تب بھی طلاق واقع نہیں ہوگی، (اس لئے کہ طلاق

انشاءات میں سے ہے اور یہ انشاء نہیں ہے، کیونکہ انشاء کا مطلب ہے کہ قصد ویقین کے ساتھ کوئی بات نافذ کرنا)''۔
(فتاویٰ قاضی خان، بر حاشیہ عالمگیری، جلد: 1، ص: 457، مطبوعہ: لکھنو)

تعلیم کے لئے طلاق کے الفاظ استعمال کرنا

سوال:129

زید مسجد کا امام ہے۔ اس نے عمرو کو طلاق کے مسائل سمجھاتے ہوئے کہا: ''اے عمرو! مسئلہ طلاق کی تفصیل اس طرح سمجھو کہ مثال کے طور پر میں اپنی بیوی کو کہوں کہ تجھے ایک طلاق ہے تو ایک طلاق ہوگی اور میں رجوع کرسکتا ہوں۔ اور اگر میں اس طرح کہوں کہ تجھے دو طلاقیں ہیں تو دو طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔ اب بھی میں بغیر تجدید نکاح رجوع کرسکتا ہوں۔ اور اگر میں اپنی بیوی سے کہوں کہ تجھے تین طلاقیں ہیں تو اب میری بیوی مجھ سے جدا ہوجائے گی اور حلالے کے بغیر میں اس سے نکاح نہیں کرسکتا''۔ وضاحت طلب امر یہ ہے کہ اس گفتگو کی وجہ سے زید کی بیوی کو طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ (ریاض محمود، میانوالی)

جواب:

جی نہیں! مثال دے کر طلاق کا مسئلہ سمجھانے سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ سوال میں واضح ہے کہ امام صاحب نے تعلیم وتعلم کے لئے یہ اندازِ بیان اختیار کرتے ہوئے کہا: ''اے عمرو! مسئلہ طلاق کی تفصیل اس طرح سمجھو کہ مثال کے طور پر میں اپنی بیوی کو کہوں کہ تجھے ایک طلاق ہے تو ایک طلاق ہوگی اور میں رجوع کرسکتا ہوں اور اگر میں اس طرح کہوں کہ تجھے دو طلاقیں ہیں تو دو طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔ اب بھی میں بغیر تجدید نکاح رجوع کرسکتا ہوں اور اگر میں اپنی بیوی سے کہوں کہ تجھے تین طلاقیں ہیں تو اب میری بیوی مجھ سے جدا ہوجائے گی اور حلالے کے بغیر میں اس سے نکاح نہیں کرسکتا''۔ اس سے زید کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ یہاں ارادۂ طلاق نہ ہونے کا قرینہ موجود ہے۔

کیونکہ یہ فقہی مسئلے کی تفہیم کا موقع ہے اور مسئلے کی تفہیم کے موقع پر سائل کو سمجھانے کے لئے مثالیں دی جاتی ہیں۔ یہ اُس سے بالکل مختلف صورت ہے کہ طلاق صریح کا کلمہ جب کوئی شوہر اپنی بیوی کو کہے، لیکن امام یا معلم کو تفہیمِ دین کے لئے ذاتی مثال دینے کے بجائے فرضی مثال دینی چاہئے تاکہ اشتباہ پیدا نہ ہو۔

یہ فسخِ نکاح شرعاً مؤثر نہیں

سوال:130

میرا نکاح 2003ء میں میرے پھوپھی زاد محمد آصف سے ہوا، رخصتی نہیں ہوئی۔ رخصتی سے قبل کئی ایسی گھریلو ناچاقیاں پیدا ہوگئیں، جن کی وجوہات میں اُس کی طرف سے کچھ ایسے غیر اخلاقی مطالبات بھی تھے، جن کا پورا کرنا میرے لئے معیوب اور ناممکن تھا۔ تو ان وجوہات کی بنا پر میں نے اور میرے والدین نے رخصتی سے انکار کر دیا اور اُس سے طلاق کا مطالبہ کیا۔ لیکن جب وہ کسی طرح نہیں مانا تو عدالت سے رجوع کرنا پڑا۔ اس کے نتیجے میں 02، اکتوبر 2007ء کو عدالت نے مجھے اور آصف کو بلایا اور صلح کی تمام تدابیر اختیار کیں، جب کسی بھی طرح ہمارے درمیان صلح نہیں ہوئی تو عدالت نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے ان الفاظ میں خلع کی ڈگری جاری کرنے کا حکم دیا: ''جاؤ بی بی آپ کو کورٹ سے خلع ہے''۔ لیکن میرے سابق شوہر اس خلع کو نہیں مانتے۔ انہوں ایک فتویٰ ہمارے پاس بھیجا ہے کہ یہ خلع نہیں ہوا، جبکہ میں اس کے حق میں نہیں ہوں، کیونکہ شرح صحیح مسلم جلد 3، صفحات: 1118 تا 1121 پر جو تفصیل دی گئی ہے، اس کے مطابق عدالت کا خلع شرعی طور پر میرے حق میں نافذ ہوتا ہے۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ شرح صحیح مسلم کے یہ دلائل صحیح نہیں تو حوالہ کے ساتھ مدلّل طریقے سے ان کا جواب دیں۔

نیز کیا ایسی صورت میں اسلام کسی عورت پر جبر و زیادتی کی اجازت دیتا ہے۔ اور اس کے پاس اس کا کوئی حل موجود نہیں ہے؟۔ اس سلسلے میں آپ سے شرعی رہنمائی درکار ہے، اس لئے کہ میں ایسے شخص کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے حق میں نہیں، (ایک خاتون، نارتھ کراچی)۔

جواب:

سوال کے مندرجات کے مطابق فسخِ نکاح کا کوئی جواز ہمارے سامنے نہیں ہے، بس ایک مبہم سا بیان ہے۔ شوہر نے رخصتی سے پہلے کیا غیر اخلاقی مطالبہ کیا، یہ واضح نہیں ہے۔ اگر شوہر بیوی سے کوئی غیر اخلاقی یا غیر شرعی مطالبہ کرے تو بیوی پر ایسے امور میں شوہر کی اطاعت لازم نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

لَا طَاعَةَ فِي مَعْصِيَةِ اللهِ، إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ

ترجمہ: ''یعنی کسی ایسے امر میں مخلوق کی اطاعت لازم نہیں ہے (خواہ اس کا مرتبہ کتنا ہی بڑا ہو) جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو، اطاعت تو فقط نیک کاموں میں لازم ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 1840)''۔

ہماری رائے میں یہ فسخِ نکاح درست نہیں ہے، لہٰذا نکاح قائم ہے۔ اس کے باوجود اگر آپ اپنے شوہر کے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں تو مہر معافی کے بدلے میں باہمی رضامندی سے خلع لے لیں یا کوئی اور مناسب تدبیر اختیار کریں۔ علامہ غلام رسول سعیدی صاحب نے اس مسئلے پر تفصیلی بحث فرمائی ہے۔

نشے میں طلاق کا حکم

سوال: 131

ایک عورت نے میرے داماد جمیل عثمان کو مشروب میں نشہ آور دوا پلائی، جس سے وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو گیا اور ایک خط اُس نے جمیل عثمان کی طرف سے جمیل عثمان کی بیوی کے نام تیار کیا، جس میں تین مرتبہ لکھا تھا: ''میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں''۔ نشہ آور دوا کے زیرِ اثر اُس عورت نے جمیل عثمان سے دستخط کروا لیے۔ دستخط کرتے وقت جمیل عثمان کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس خط پر دستخط کر رہا ہے کیونکہ اُس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی۔ اُس عورت نے وہ خط جمیل عثمان کی بیوی کو پہنچا دیا۔ جمیل عثمان نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر حلفیہ بیان دیا کہ تمام حالات اسی طرح رونما ہوئے ہیں۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا طلاق

واقع ہوئی یا نہیں؟۔(سید محمد قاسم،دبئی)۔

جواب:

اس استفتاء کے ساتھ سید جمیل عثمان کا انگریزی میں تحریر کردہ ایک حلف نامہ بھی منسلک ہے،جس میں انہوں نے بیان دیا ہے کہ اُنہیں دھوکے سے کافی میں نشہ آور چیز ملا کر پلائی گئی تھی،اِس سے اُن پر نشہ طاری ہوگیا،وہ مدہوش ہوگئے اور حالتِ مدہوشی میں ایک ایسی تحریر پر اُن سے دستخط لئے گئے،جس میں اُن کی طرف سے اُن کی بیوی کو تین طلاقیں تحریر تھیں۔اگر وہ اِس حلف نامے میں سچے ہیں تو یہ طلاق واقع نہیں ہوئی۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ولا یقع طلاق الصبی وان کان یعقل والمجنون والنائم والمبرسم والمغمی علیہ والمدھوش ھکذا فی فتح القدیر۔

ترجمہ:''اور بچے(نابالغ)کی طلاق واقع نہیں ہوگی اگرچہ وہ عقل رکھتا ہو اور(اسی طرح)مجنوں،سوئے ہوئے شخص،برسام(ذات الجنب)کے مریض،مُغمیٰ علیہ(یعنی بیمار جس پر بے ہوشی طاری ہو)اور مدہوش(اِن سب)کی طلاق واقع نہیں ہوگی،فتح القدیر میں اسی طرح ہے،(فتاویٰ عالمگیری جلد:1،ص:353 مطبوعہ:مکتبہ رشیدیہ،کوئٹہ)''۔

یہ حکم قضاءً ہے،یعنی ایسی صورتِ حال میں قضاءً طلاق نہ ہونے کا حکم لگایا جائے گا اور نکاح قائم رہے گا،جبکہ عنداللہ اُخروی احکام کا مدار حقیقتِ حال پر ہوگا۔یعنی فی الواقع اگر اُسے دھوکے سے نشہ پلایا گیا تھا اور پینے سے پہلے مشروب کے نشہ آور ہونے کے بارے میں اُسے کچھ معلوم نہ تھا تو طلاق واقع نہ ہوگی،دنیا اور آخرت دونوں میں وہ بری الذمہ ہوگا۔لیکن اگر اُسے معلوم تھا کہ یہ مشروب نشہ آور ہے یا ایسا معمول تھا کہ وہ عورت اُسے نشہ آور مشروب پلایا کرتی تھی اور یہ اپنی مرضی سے پیتے تھے اور درپیش صورتِ حال میں بھی ایسا ہی ہوا تھا اور یہ جھوٹی قسم کھا رہا ہے،تو دنیوی احکام کے اعتبار سے نکاح کے قائم رہنے اور طلاق کے واقع نہ ہونے کا حکم لگائے جانے کے باوجود آخرت میں وہ مسئول ہوگا اور اُس کی بقیہ ازدواجی زندگی حرام میں گزرے گی،کیونکہ یہاں اُس کے حلفیہ بیان کے علاوہ

حقیقتِ حال جاننے کا اور کوئی پیمانہ نہیں ہے۔اس کے برعکس جو اپنی مرضی سے نشہ کرے یا اسے معلوم تھا کہ اس مشروب میں نشہ آور چیز ہے اور پھر مدہوش ہو جائے اور ایسی حالت میں اپنی بیوی کو زبانی یا تحریری طلاق دیدے تو طلاق واقع ہو جائے گی، کیونکہ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ حرام کا دانستہ ارتکاب کرے اور اس پر رعایت کا بھی حق دار ہو جائے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: أو سکران ولو بنبیذ أو حشیش أو أفیون أو بنج زجراً به یفتی، تصحیح القدوری

ترجمہ: ''اور ہر نشہ کرنے والے کی (طلاق واقع ہو جاتی ہے)، خواہ اس نے شراب پی ہو یا حشیش یا افیون یا بھنگ پی ہو اسی پر فتوئی ہے اور قدوری نے بھی اس کی تصحیح کی ہے''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 4 ص:328 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وطلاق السکران واقع اذا سکر من الخمر أو النبیذ وھو مذھب اصحابنا رحمھما اللہ تعالیٰ کذافی المحیط۔

ترجمہ: ''اور نشہ کرنے والے کی طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے خواہ وہ نشہ شراب سے آیا ہو یا نبیذ سے، (فتاویٰ عالمگیری جلد اول ص:353 مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

عدت کے مسائل

عدت کب سے ہوگی؟

سوال:132

نکاح کے بعد بیوی نے شوہر کے ساتھ خلوت میں کچھ وقت گزارا، مباشرت نہیں ہوئی۔ اگر اس کے بعد وہ بیوی عدالت کے ذریعے فسخِ نکاح کرائے تو کیا عدت لازم ہے، اگر لازم ہے تو کب سے؟۔ فقہ حنفی کے مطابق قرآن وسنّت کی روشنی میں فتویٰ جاری فرما کر عنداللہ ماجور اور عندالناس مشکور ہوں، (ملک محمد بوستان قادری، کراچی)۔

جواب:

زوجین کے درمیان ایسی خَلوت (Privacy) کہ مباشرت میں کوئی طبعی یا شرعی (مثلاً زوجین کا روزے کی حالت میں ہونا یا ان میں سے کسی ایک کا روزے دار ہونا) رکاوٹ حائل نہ ہو، اسے فقہی اصطلاح میں "خَلوتِ صحیحہ" کہا جاتا ہے۔ نکاح کے بعد اگر زوجین میں "خلوتِ صحیحہ" ہوجائے، خواہ مباشرت کی ہو یا نہ کی ہو، تو اسے مباشرت کے قائم مقام سمجھا جاتا ہے اور اس کے بعد اگر شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو بیوی پر عدت گزارنا لازم ہے۔ عدت کا شمار طلاق کے وقت سے ہوتا ہے۔ باہمی رضامندی سے خلع یا عدالتی فسخِ نکاح طلاقِ بائن کے حکم میں ہوتا ہے اور طلاقِ بائن کی صورت میں بھی بہرحال عدت لازم ہے لیکن عدت کے اندر بھی زوجین باہمی رضامندی سے عقدِ ثانی کر سکتے ہیں، جس کے لئے نیا مہر مقرر کرنا ہوگا۔ بیوی پہلے مہر کی حقدار ہوجاتی ہے۔ عدالتی "فسخِ نکاح" شرعاً اسی وقت مؤثر ہے کہ قاضی شریعت کا عالم اور عامل ہو اور "تنسیخِ نکاح" میں حدودِ شرعیہ کی مکمل پاس داری کی ہو۔

ناشزہ (نافرمان) عورت نفقہ کی حق دار نہیں

سوال:133

میری شادی سوا مہینہ قبل ہوئی۔ ولیمہ کے بعد میری بیوی نے مجھے کہا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی مجھے طلاق دے دو۔ شادی کے کچھ دن بعد ہی اپنے والدین کے گھر جا کر

بیٹھ گئی، ہم منا کر لائے، پھر دوبارہ اپنے بھائی کے ساتھ چلی گئی۔ ہم نے مصالحت کی کوشش کی لیکن اُس کا مطالبہ تھا کہ مجھے طلاق چاہیے، میں زہر کھالوں گی لیکن وہاں نہیں جاؤں گی۔ تمام معاملات یو۔سی ناظم کے سامنے ہوئے، تین طلاقیں تحریری دے دی گئیں۔ مہر اور اُس کا سامان میں نے ادا کر دیا، لیکن کیا عدّت کا خرچ بھی میرے ذمہ ہے؟۔

(دانش عبدالقیوم، عزیز آباد، کراچی)

جواب:

اگر عورت شوہر کی طرف سے کسی ایذا رسانی کے بغیر اس کے ساتھ رہنے پر راضی نہ ہو اور شوہر کے حقوق کا خیال نہ رکھے تو ایسی عورت فقہی اصطلاح میں ''ناشزہ'' یعنی نافرمان کہلاتی ہے اور ایسی عورت کا نان نفقہ، رہائش، علاج معالجہ وغیرہ شوہر کے ذمے لازم نہیں ہے جب تک کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہ ہو جائے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: وان نشزت فلا نفقة لها حتیٰ تعود الی منزله

ترجمہ: ''اگر عورت نافرمان ہو (کر شوہر کے گھر سے نکل) جائے تو جب تک وہ واپس (شوہر کے) گھر لوٹ کر نہ آ جائے، اس کا نان نفقہ شوہر کے ذمے نہیں ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 545، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: انوار میں ہے: لا نفقة للناشزة وان قدر علی ردها الی الطاعة قهرا ولو هربت منه او خرجت بلا اذنه من بيته فناشزة

ترجمہ: ''نافرمان بیوی کے لئے نفقہ کا استحقاق نہیں ہے۔ اگر بیوی شوہر کا گھر چھوڑ کر بھاگ گئی ہو یا اُس کی اجازت کے بغیر گھر سے نکل گئی ہو تو وہ نافرمان ہی قرار پائے گی، خواہ وہ جبراً اُسے واپس لانے پر قدرت رکھتا ہو، (فتاویٰ رضویہ، جلد 12، ص: 473)''۔

پس اگر آپ کا بیان درست ہے اور آپ کی بیوی شادی کے بعد آپ کا گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی اور واپس نہ آئی یہاں تک کہ طلاق پر معاملہ ختم ہوا۔ آپ کا اس کو مہر ادا کرنا اور اُس کا سامان واپس کرنا درست ہے، نان نفقہ کی ادائیگی آپ پر لازم نہیں ہے، البتہ اگر اللہ تعالیٰ

نے آپ کو توفیق دی ہے اور آپ تبرُّعاً (مہربانی اور حسنِ سلوک کے طور پر) دینا چاہتے ہیں تو آپ کا یہ طرزِ عمل رسول اللہ ﷺ کے اس ارشادِ مبارک کے عین مطابق ہوگا: ''وَاَحسِن اِلٰی مَنْ اَسَآءَ اِلَیْکَ یعنی جو تجھ سے بدسلوکی کرے، تم اس کے ساتھ بھی حسنِ سلوک سے پیش آؤ''۔ اس کا اجر اللہ تعالیٰ عطا فرمائے گا، لیکن قانونی اور شرعی طور پر وہ زمانۂ عدت کے لئے کسی قسم کے نفقے کی حقدار نہیں ہے۔

طلاق کے بعد بیوی کو رہائش کا حق

سوال:134

میری عمر 65 سال اور میری سابقہ اہلیہ کی عمر 55 سال ہے۔ ہمارے بہو، بیٹے اور پوتے پوتیاں بھی ہیں۔ چند ماہ پہلے کسی معمولی بات پر ہمارے درمیان اختلاف ہوا اور نوبت طلاق تک پہنچی، میں نے تین طلاقیں دے دیں۔ عدت کا دورانیہ بھی میرے گھر میں ہی بالکل لاتعلق ہوکر گزارا۔ اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ عمر کے اِس حصے میں وہ کہیں اور جا کر رہ نہیں سکتیں اور میرے لئے بھی ممکن نہیں ہے، تو کیا وہ اِسی گھر میں اپنے جوان بچوں کے ساتھ علیحدہ رہ سکتی ہیں؟۔ (ایک سائل، فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب:

بہتر تو یہ ہے کہ اگر وہ یا ان کی اولاد مالی استطاعت رکھتے ہیں، تو وہ اپنی اولاد کے ساتھ الگ مکان میں رہیں۔ صحیح بخاری، رقم الحدیث: 7170 کے تحت امام بخاری لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''اور قاسم نے کہا: حاکم کو چاہئے کہ عدالت میں شہادت کے بغیر محض اپنے علم پر فیصلہ نہ کرے، حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا علم (کسی بھی مسئلے میں) دوسرے کی شہادت سے زیادہ یقینی ہے، (لیکن محض اپنے علم کی بنیاد پر فیصلہ کرنے سے) قاضی اپنے آپ کو مسلمانوں کی تہمت کا نشانہ بنائے گا اور انہیں طرح طرح کی بدگمانیوں میں مبتلا کرے گا (یعنی کوئی بدگمانی کرسکتا ہے کہ بغیر شہادت کے کسی کے حق میں فیصلہ کر کے قاضی نے جانب داری کی ہے)''۔ اس کے بعد امام بخاری نے مندرجہ ذیل حدیث نقل فرمائی:

عَنْ عَلِیِّ بْنِ حُسَیْنٍ أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ أَتَتْهُ صَفِیَّةُ بنتُ حُیَیٍّ فَلَمَّا رَجَعَتْ اِنْطَلَقَ مَعَهَا فَمَرَّ بِهِ رَجُلَانِ مِنَ الْاَنْصَارِ، فَدَعَاهُمَا فقال انما هی ''صَفِیَّةُ، قَالَا سُبْحَانَ اللہ، قال اِنَّ الشَّیْطَانَ یَجْرِیْ مِنِ ابْنِ آدَمَ مَجْرَی الدَّمِ،

ترجمہ: ''علی بن حسین (امام زین العابدین) بیان کرتے ہیں: نبی کریم ﷺ کے پاس (آپ کی زوجہ) صَفِیَّةُ بنتُ حُیَیّ حاضر ہوئیں، پھر جب وہ واپس لوٹنے لگیں تو آپ ﷺ بھی ان کے ساتھ چل پڑے، وہاں سے انصار کے دو شخص گزرے، آپ ﷺ نے ان دونوں کو بلایا اور فرمایا: ''یہ (میری بیوی) صَفِیَّہ ہے''، ان دونوں نے عرض کیا: ''سبحان اللہ''، آپ ﷺ نے فرمایا: شیطان انسان کے وجود میں اسی طرح سرایت کئے ہوئے ہے، جیسے خون انسان (کی نس نس) میں رواں دواں ہے، (صحیح بخاری، رقم: 7171)''۔

امام بخاری لکھتے ہیں کہ اس حدیث کو امام علی بن حسین رضی اللہ عنہ نے امّ المؤمنین حضرت صَفِیَّہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔یہی حدیث باب الاعتکاف میں رقم: 2038 کے تحت قدرِ تفصیل کے ساتھ مذکور ہے، وہاں حدیث کے کلمات یہ ہیں: عن علی بن حسین رضی اللہ عنهما انّ صَفِیَّةَ زوج النبی ﷺ اخبرته، کان النبی ﷺ فی المسجدِ وعندہ ازواجُهُ، فَرُحْنَ، فقال لِصَفِیَّةَ بنتِ حُیَیّ، لاتعجلی حتّٰی أَنْ أَصرِفَ معكَ وكانَ بیتُها فی دارِ اسامةَ، فخرجَ النبیُّ ﷺ معها، فَلَقِیَهُ رَجُلانِ من الانصارِ، فنظرَا الی النبی ﷺ، ثم أجازا، وقالَ لهما النبی ﷺ تَعَالَیا، اِنها صَفِیَّةُ بِنْتُ حُیَیّ قالا: سبحان اللہ یارسول اللہ! قال: اِنَّ الشیطانَ یَجْرِیْ مِنِ الانسانِ مَجْرَی الدَّمِ، وانّی خَشِیْتُ أنْ یُلْقِیَ فِی اَنْفُسِکُمَا شیئًا،

ترجمہ: ''علی بن حسین رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: نبی کریم ﷺ کی زوجہ حضرت صَفِیَّہ بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ مسجد میں (معتکف) تھے اور آپ ﷺ کے پاس آپ کی ازواجِ مطہرات (ملاقات کے لئے) حاضر تھیں، پھر وہ چل پڑیں، تو آپ ﷺ نے صفیہ بنتِ حیی سے کہا: تم جلدی نہ کرو، میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا، اور ان کا گھر

دارِ اسامہ میں تھا، تو نبی کریم ﷺ ان کے ساتھ نکلے، (راستے میں) انصار کے دو اشخاص سے آپ کی ملاقات ہوئی، ان دونوں نے نبی ﷺ کی طرف دیکھا اور آگے چلے گئے، تو نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا: اِدھر آؤ، یہ (میری بیوی) صَفِیّہ بنتِ حُیَیّ ہیں، ان دونوں نے عرض کیا: سبحان اللہ یارسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا: شیطان اسی طرح انسان کے وجود میں سرایت کئے ہوئے ہے، جیسے خون (نَس نَس میں) دوڑ رہا ہے، (میں نے یہ وضاحت اس لئے کی کہ) مجھے اندیشہ ہوا کہیں تمہارے دل میں کوئی برا خیال نہ آجائے"۔

ایک روایت میں ہے: من سَلَكَ مسالِكَ الظّنّ اُتُّهِمَ، رواہ الخرائطی فی مکارمِ الاخلاقِ مرفوعًا بلفظِ مَنْ اَقَامَ نَفْسَهٗ مَقَامَ التُّهَمِ، فَلَا يَلُوْمَنَّ مَنْ اَسَاءَ الظَّنَّ بِهٖ

ترجمہ: "جو بدگمانی کی راہوں پر چلے گا، وہ (لوگوں کی) تہمت کا نشانہ بنے گا، خرائطی نے "مکارم الاخلاق" میں ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا ہے: جو اپنے آپ کو تہمت کی جگہ ٹھہرائے گا تو جو لوگ اس کے بارے میں بدگمانی کریں، وہ انہیں ملامت نہ کرے (بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرے کہ اس نے انہیں اس بدگمانی کا موقع فراہم کیا)۔

علامہ اسماعیل بن محمد العجلوانی الجراحی نے مندرجہ بالا روایت کا حوالہ دے کر یہ لکھا ہے کہ: "اگرچہ "اِتَّقُوْا مَوَاضِعَ التُّهْمَةِ، (یعنی تہمت کی جگہوں سے بچو!)"، کی روایت لفظاً ثابت نہیں ہے، لیکن مندرجہ بالا روایت کی بنا پر معنًی ثابت ہے"۔

(کشف الخفاء ومُزیل الالباس، جُزء اوّل، ص: 44، مطبوعہ: مکتبۃ الغزالی، دمشق)

رسول اللہ ﷺ معصوم تھے اور تقوے کے بلند ترین مقام پر فائز تھے اور کوئی آپ کے بارے میں اَخلاق سے گری ہوئی بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا، لیکن اس کے باوجود آپ نے ان دو انصاری اشخاص کو، جو آپ کے پاس سے گزرے، بتایا کہ میرے ساتھ جو خاتون ہیں، یہ کوئی اجنبیہ نہیں ہیں بلکہ میری بیوی صَفِیّہ ہیں تاکہ کسی قسم کی بدگمانی کا کوئی امکان نہ رہے۔ تو عام مسلمان کو اس بارے میں بہت زیادہ احتیاط کرنی چاہئے، کیونکہ عزت اور نیک نامی اگر ایک مرتبہ مشتبہ ہو جائے تو دوبارہ اعتماد کو قائم کرنا کافی دشوار

ہوتا ہے۔

لیکن اگر آپ کی بیوی یا آپ کی اولاد کی اتنی مالی استطاعت نہیں ہے کہ آپ کے بچے اپنی ماں کے لئے الگ مکان کا انتظام کر سکیں۔ اور آپ کا مکان اتنا وسیع ہے کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ شرعی ستر وحجاب کی پابندی کو قائم رکھتے ہوئے کسی الگ حصے میں رہ سکتی ہیں، جہاں آپ سے میل جول اور آپ کے سامنے بے حجاب آنے کے مواقع نہ ہوں، تو آپ اس مکان میں انہیں رہائش دے سکتے ہیں۔ لیکن آپ دونوں ایک دوسرے کے لئے بہرحال اجنبی رہیں گے اور آپ دونوں کو شرعی حدود کی پابندی کرنا ہوگی۔ تاہم اولاد پر آپ دونوں کا احترام یکساں طور پر لازم ہے اور ضرورت کے مطابق دونوں کی کفالت بھی لازم ہے۔

خرید وفروخت کے مسائل

عقدِ مضاربت میں نفع کی مقدار مقرر کرنا فساد کا باعث ہے

سوال:135

زید نامی شخص خالد کو ایک لاکھ روپے کاروبار کے لئے دیتا ہے اور ساتھ ہی یہ کہتا ہے کہ تم مجھے ہر ماہ دس ہزار روپے منافع دوگے یا خالد نے زید کو کہا ہو کہ میں آپ کو ہر ماہ دس ہزار روپے نفع دوں گا۔کیا شرعاً یہ جائز ہے؟،عدمِ جواز کی صورت میں اس کی تصحیح کی کیا صورت ہوگی؟،(حافظ عبدالماجد،کراچی)۔

جواب:

آپ نے جو صورت بیان کی ہے،وہ صریح ربٰو ہے،کیونکہ اس میں ایک لاکھ روپے پر دس ہزار روپے ماہانہ منافع پہلے سے طے شدہ ہے اور اسی کو سود کہتے ہیں۔ایک رقم پر ماہانہ مقررہ منافع مشروط (Conditional) ہو یا معہود (Understood)،ہر صورت میں سود ہے اور حرام ہے۔

اس کے متبادل جو جائز صورت ہے،وہ مضاربت ہے۔دو افراد کے درمیان ایسا عقد (Contract)،جس میں ایک فریق کا سرمایہ ہو اور دوسرے کی محنت،مضاربت کہلاتا ہے۔جس فریق کا سرمایہ ہو،اسے ''ربُّ المال (Capital Provider)'' اور جس کی محنت ہو،اُسے ''مُضارِب (Working Partner)'' اور سرمائے کو ''رأسُ المال (Capital)'' کہتے ہیں۔

''مجلۃ الاحکام العدلیہ'' میں ہے:''یہ شراکت کی ایک قسم ہے،اس شرط پر کہ ایک فریق کا رأسُ المال (سرمایہ) ہو اور دوسرے فریق کی محنت اور جدوجہد شامل ہو،رأسُ المال (سرمایہ) فراہم کرنے والے فریق کو ''ربُّ المال'' اور عامل کو ''مُضارِب'' کہتے ہیں،یہ عقد ''مضاربت'' کہلاتا ہے،(مادّہ:1407)''۔

علامہ علاؤالدین حصکفی مضاربت کی شرائط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(وکون الربح بینھما شائعاً) فلو عُیّن قدراً فسدت (وکون نصیب کل منھما

معلومًا) عند العقد۔ ترجمہ: ’’فریقین کے درمیان نفع کا تناسب معلوم ہو، اگر ’’رب المال‘‘ کے لئے منافع کی کوئی رقم مقرر کر لی جائے تو عقدِ مضاربت فاسد ہو جائے گا، (اس کے جواز کی صورت یہی ہے کہ) کاروبار کے منافع میں سے عقد کے وقت فریقین میں سے ہر ایک کا حصہ معلوم ہو (یعنی دونوں کو نصف نصف ملے یا ایک کو ساٹھ فیصد اور دوسرے کو چالیس فیصد یا جو بھی تناسب (Ratio) ان دونوں کے درمیان طے پائے)‘‘۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 8، ص:376، مطبوعہ: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

اگر خدانخواستہ کاروبار میں کوئی نقصان ہو جائے تو اس کا سارا بار ربُّ المال (یعنی سرمایہ فراہم کرنے والے) پر آئے گا اور مضارِب پر کوئی مالی بار نہیں آئے گا۔ اس کا نقصان فقط یہ ہے کہ اس کی محنت کا اسے صلہ نہیں ملے گا، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

رَجُلٌ دفعَ اِلٰی آخَرَ أَمتِعَۃً وقال بِعهاوَاشْتَرِ هَاوَمَا رَبِحتُ فَبَیْنَنَانِصْفَیْنِ فَخَسِرَ فَلاَ خُسْرَانَ عَلَی العَامِلِ۔

ترجمہ: ’’ایک شخص (رَبُّ المال) نے دوسرے شخص (مُضارِب) کو کچھ سامان دیا اور کہا: اس سے خرید و فروخت (یعنی کاروبار) کرو اور جو نفع آئے، وہ ہمارے درمیان نصف نصف تقسیم ہو گا اور اسے (کاروبار میں) نقصان ہو گیا، تو عامل (یعنی مُضارِب) کے ذمے نقصان میں سے کچھ نہیں آئے گا (بس اسے صرف محنت کا اجر نہیں ملے گا)، (ردالمحتار، جلد:8، ص:374)‘‘۔

نفلی خیراتی ٹرسٹ کی رقم کی شرعی سرمایہ کاری

سوال:136

عبداللہ کی کمپنی نے یہ طے کیا کہ جو بھی سال کے آخر میں کمپنی کو منافع ہو گا، اس کا کچھ حصہ اللہ کی راہ میں دیا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے ایک عبداللہ ٹرسٹ کا قیام عمل میں لایا گیا تا کہ فلاحی کاموں کے لئے اس منافع کی رقم کو اس ٹرسٹ کے ذریعے استعمال کیا جا سکے۔ حسب قرارداد کمپنی نے اس سال منافع کی رقم میں سے 20 لاکھ روپے اس ٹرسٹ

کے اکاؤنٹ میں منتقل کردیئے ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ:

کمپنی کے پارٹنر کا ارادہ ہے کہ جو رقم ٹرسٹ کے اکاؤنٹ میں ہے، اُس کو کسی بینک میں ڈال دیا جائے اور اُس سے جو منافع مثال کے طور پر 20 لاکھ روپے کی رقم پر سالانہ =/3,40,000 (تین لاکھ چالیس ہزار روپے) کی رقم منافع کے طور پر ملے گی، اُس کو فلاحی کاموں (غرباء کی مدد وغیرہ) میں استعمال کیا جائے۔اس طرح ہر سال 20 لاکھ کی رقم پر جو منافع بینک دے گا، اُسے فلاحی کاموں میں استعمال کیا جاتا رہے گا۔یا جو رقم 20 لاکھ ٹرسٹ کے اکاؤنٹ میں موجود ہے، وہی خرچ کی جائے، بینک کا منافع نہ لیا جائے تو کچھ ہی عرصے میں تمام رقم ختم ہوجائے گی اور مستقبل میں غرباء کی مدد نہیں کی جاسکے گی۔اس مسئلے پر آپ کی ماہرانہ رائے درکار ہے، (جاوید احمد غوری، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

بظاہر آپ کی کمپنی نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت میں سے ایک نفلی تصدُّق کی نیت کی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اُس کی عطا کردہ مالی نعمت کا بہترین تشکُّر ہے، بلکہ حقیقی اور عملی تشکُّر ہے۔آپ اس سعادت پر مبارک باد کے مستحق ہیں اور خود آپ حضرات کو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ اِس توفیق پر اُس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔کاش کہ ہمارے تمام اہلِ صنعت وتجارت اور اہلِ ثروت یہی روش اختیار کریں۔نیک مقاصد کے لئے ٹرسٹ کا قیام بھی ایک اچھی پیش رفت ہے۔ٹرسٹ میں جمع شدہ اِس رقم کو آپ براہِ راست بھی ضرورت مند افراد پر خرچ کرسکتے ہیں، اور قرآن مجید نے اس عملِ خیر کو ذاتِ باری تعالیٰ سے ''تجارت'' سے تعبیر کیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ: ''اے مومنو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتادوں جو تمہیں (آخرت کے) دردناک

عذاب سے نجات دے، (وہ اس طرح کہ) تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (مکرم ﷺ) پر (کامل) ایمان رکھو اور اپنے اَموال اور جانوں سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتے رہو، یہ تمہارے لئے خیر (کاراستہ) ہے، اگر تم علم رکھتے ہو، (الصّف:11)"۔

اگر آپ نے اس پوری رقم یا اس کے کچھ حصے کو انوسٹ (Invest) کرنا ہے تو اسلامی بینک کے ساتھ کریں تاکہ خالص ربا سے بچ سکیں، کیونکہ حرام قطعی کو حصول اجر کا باعث سمجھنا بھی حرام ہے۔ آپ اس رقم کو کسی پرائیویٹ نفع بخش کاروبار میں بھی لگا سکتے ہیں بشرطیکہ وہ لوگ قابلِ اعتماد ہوں اور آپ کے اپنے کاروبار میں اس کی گنجائش ہو تو اُس میں بھی لگا سکتے ہیں۔ لیکن اس رقم میں صرف اضافہ ہی مقصود نہ ہو بلکہ مستحقین پر خرچ کا سلسلہ بھی جاری رہے۔ اسلامی بینک سے جو آپ کو منافع ملے گا، وہ جائز ہوگا اور اسے آپ ناداروں پر خرچ کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حق اور خیر کی جانب ہم سب کی رہنمائی فرمائے اور قبولِ حق کی توفیق عطا فرمائے۔

اسلامی بینک کا منافع حلال ہے

سوال: 137

میں ایک تعمیراتی ادارے کا سربراہ ہوں اور مختلف بینکوں میں میرے کاروباری اکاؤنٹ ہیں، جس کے ذریعے اچھی خاصی کاروباری لین دین ہوتی ہے۔ بینک اکاؤنٹ چونکہ کاروبار کے لئے قانونی ضرورت بھی ہے اور اتنی بڑی رقم گھر میں رکھی بھی نہیں جاسکتی اور نہ ہی نقد لین دین کیا جاسکتا ہے۔ میرے تمام بینک اکاؤنٹ کرنٹ ہیں یعنی نفع نقصان سے مُبرا غیر سودی اکاؤنٹ۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ:

(1) بینک میری رقم کو اپنے کاروبار میں استعمال کر کے بھرپور طریقے سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اس نیت سے سودی اکاؤنٹ کھلوالوں کہ جو سود نفع کی شکل میں مجھے ملے، میں وہ رقم ضرورت مندوں میں تقسیم کر دوں یا کسی کے قرض کی ادائیگی یا کسی مصیبت زدہ کی ضرورت پر خرچ کروں۔ اس طرح بینک کی سودی آمدنی کسی مصیبت زدہ

کے کام آسکتی ہے؟، میری یہ سوچ شریعتِ محمدی کے تحت صحیح ہے یا نہیں؟۔
(2) آج کل اسلامی بینکنگ ہورہی ہے، کیا یہ بینکنگ صحیح اسلامی بینکنگ ہے؟۔
(3) اگر میں اس اسلامی بینک میں نفع نقصان میں شراکت کا اکاؤنٹ کھلواؤں تو یہ صحیح ہے یا نہیں اور یہ نفع کی رقم ذاتی استعمال میں بھی لے سکتا ہوں یا نہیں؟۔
(سارا بلڈرز، ناظم آباد، کراچی)

جواب:
ہمارے یہاں عام بینکوں میں تمام کاروبار سودی بنیادوں پر ہوتا ہے اور کھاتے داروں کو اُسی سودکی آمدنی سے نفع کی رقم دی جاتی ہے۔ سودکی اُس رقم کا استعمال جس طرح اپنی ذات کے لئے استعمال کرنا حرام ہے، اِسی طرح اُس رقم کو حصولِ اجر کا باعث سمجھ کر مستحقین پر خرچ کرنا بھی حرام ہے، کیونکہ حرام قطعی کا ارتکاب حرام ہے اور حرام جانتے ہوئے ثواب کی نیت سے صدقہ کرنا کفر ہے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:
ولو تصدق علی فقیر بشئی من مال الحرام یرجو الثواب یکفر
ترجمہ: ''اگر مالِ حرام میں سے کوئی شے کسی فقیر پر ثواب کی نیت سے صدقہ کی تو وہ کافر ہوجائے گا، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:272، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔
امام احمد رضا قادری قدس سرّہ العزیز لکھتے ہیں: سود کے روپیہ سے جو کارِ نیک کیا جائے اُس میں استحقاقِ ثواب نہیں، حدیث شریف میں ہے: جو مال حرام لے کر حج کو جاتا ہے۔ لبّیک کہتا ہے، ہاتفِ غیب اسے جواب دیتا ہے:
لَا لَبَّیْکَ وَلَا سَعْدَیْکَ وَحَجُّکَ مَرْدُوْدٌ عَلَیْکَ حَتّٰی تَرُدَّ مَافِیْ یَدَیْکَ۔
ترجمہ: ''نہ بارگاہِ الٰہی میں تیری حاضری قبول ہے اور نہ ہی تیرا نذرانہ بندگی قبول ہے۔ اور تیرا حج تجھے واپس لوٹایا جاتا ہے (یعنی یہ مقبول نہیں ہے) تاوقتیکہ تو یہ مالِ حرام جو تیرے قبضے میں ہے، تو (اُسے ان لوگوں کو) لوٹا دے (جو اس کے حق دار ہیں)۔ حدیث پاک میں ہے، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: اِنَّ اللّٰہَ طَیِّبٌ لَا یَقْبَلُ اِلَّا الطَّیِّبَ

ترجمہ: ''بے شک اللہ عزّوجل پاک ہے، وہ صرف پاک چیز ہی کو قبول فرماتا ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 23، ص: 541، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اگر آپ نے اس پوری رقم یا اس کے کچھ حصے کو انوسٹ (Invest) کرنا ہے تو اسلامی بینک میں مضاربت پر نفع نقصان کا اکاؤنٹ کھولیں تاکہ خالص ربا (سود) سے بچ سکیں، اسلامی بینک سے حاصل ہونے والے منافع کو آپ اپنے ذاتی استعمال میں بھی لے سکتے ہیں اور اِس سے مستحقین کی مدد بھی کر سکتے ہیں اور ضرورت مندوں کو غیر سودی قرض دینے کا ایک فنڈ بھی قائم کر سکتے ہیں۔

سود سے حاصل کردہ رقم کی خیرات پر اجرِ آخرت کی نیت کا حکم

سوال:138

ایک شخص نے بینک میں رقم رکھوائی اور اس پر اس کو بینک نے منافع (سود) دیا۔ اب وہ شخص اس رقم کو کسی کی مدد کے لئے دینا چاہتا ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ منافع کی رقم لینے پر جو گناہ سود لینے والے کو ملا، کیا جس کی مدد کے لئے وہ رقم دے گا آیا اُس کو بھی اِس کا گناہ ملے گا؟، (محمد شریف خان K.B.R بفرزون، کراچی)۔

جواب:

سود کی رقم لینا اور اپنی ذات پر استعمال کرنا حرام ہے۔ اِسی طرح اُس رقم کو حصولِ اجر کا باعث سمجھ کر مستحقین پر خرچ کرنا بھی حرام ہے، کیونکہ حرام قطعی کو حصولِ اجر کا باعث سمجھنا بھی حرام ہے یعنی کفر ہے۔ تقویٰ تو یہی ہے کہ سود کی رقم نہ لی جائے تاکہ بندہ اس کی جوابدہی سے بچا رہے، سود حرام ہے اور حرام مال کا حکم یہ ہے کہ وہ معنیً خبیث ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَ لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾

ترجمہ: ''اے مومنو! اپنی کمائی ہوئی پاکیزہ چیزوں میں سے اور اُن چیزوں میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کیں، (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو، اور (خبردار!) ناقص (اور ناپاک) چیزوں کو (اللہ کی راہ میں) دینے کا ارادہ نہ کرو کہ تم اس سے خرچ کرتے ہو، حالانکہ تم خود اسے (کبھی) نہ لو، سوائے اس کے کہ تم اس میں چشم پوشی کرو، اور جان لو کہ اللہ (ہر چیز سے) بے نیاز ہے، (اس کی) بہت حمد بیان کی گئی ہے، (البقرہ: 267)''۔

لیکن اگر کسی مستحق شخص کو ثواب کی نیت کے بغیر وہ رقم دے دی جائے تو لینے والا گناہ گار نہیں ہوگا۔ امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ'' آیا سودی مال کو خیرات کے طور پر مستحقین کا لینا جائز ہے یا نہیں؟''، انہوں نے جواب میں لکھا: ''فقیر کو اُس کا خیرات میں لینا تو بدرجۂ اولیٰ جائز ہے کہ یہ تو عین حکمِ شرع ہے جبکہ مالک کا پتا نہ رہا ہو اور ویسے بھی مالِ ربا میں بعد قبضہ عدمِ ملک نہیں صرف خُبثِ ملک ہے''، و فی الرد المحتار عن البحر الرائق عن القنیۃ عن الامام البزدوی ان من جملۃ صور البیع الفاسد جملۃ العقود الربویۃ یملک العوض فیھا بالقبض

ترجمہ: ''علامہ ابن عابدین شامی نے البحر الرائق کے حوالے سے لکھا ہے کہ القنیۃ نے امام بزدوی کی روایت نقل کی ہے کہ بیع فاسد کی منجملہ صورتوں میں سودی معاملات بھی شامل ہیں، ان سب میں قبضہ کرنے پر بدلے میں لئے ہوئے مال کا مالک بن جاتا ہے''۔

(ردالمحتار، باب الربا، جلد 7، ص: 302، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

اور زیرِ ملکیت مال کا خبیث ہونا (فقیر کے لئے) بطور صدقہ لینے میں مانع نہیں ہے۔

فی الھندیۃ عن الحاوی عن الامام ابی بکر قیل لہ ان فقیرا یأخذ جائزۃ السلطان مع علمہ ان السلطان یأخذھا غصبا أیحل لہ قال ان خلط ذلک بدراھم اخری فانہ لاباس بہ الی آخرہ، ترجمہ: ''چنانچہ عالمگیری میں ہے کہ الحاوی میں امام ابوبکر سے منقول ہے کہ ان سے کہا گیا کہ فقیر یہ جاننے کے باوجود کہ بادشاہ لوگوں کا مال غصب کر کے لیتا ہے، اُس سے عطیہ لیتا ہے، تو کیا یہ اس کے لئے حلال ہوگا؟ ارشاد فرمایا: اگر وہ

دوسرے مال کے ساتھ مخلوط ہوجاتا ہے تو پھر اس کے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے (عبارت مکمل)''۔(فتاویٰ رضویہ، جلد 23، ص: 541، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

پراویڈنٹ فنڈ پر سود

میں پاکستان سٹیل ملز میں مستقل ملازم ہوں۔سروس کے دوران ادارہ پراویڈنٹ فنڈ کی سہولت فراہم کرتا ہے۔اس کے لئے ایک فارم پر کرنا ہوتا ہے، جس میں درج ہوتا ہے کہ ملازم پراویڈنٹ فنڈ کی سہولت غیر سودی یا سودی بنیاد پر لے گا۔یہ فنڈ ماہانہ بنیاد پر ہر ملازم کی تنخواہ کا 10٪ حصہ کاٹ کر جمع کی جاتی ہے۔ابتدائی تین سال تک ملازم اس رقم میں سے کچھ نہیں لے سکتا اور تین سال بعد 80٪ تک قرض حاصل کیا جاسکتا ہے جو 12 یا 24 اقساط میں واپس کرنا ہوتا ہے۔اگر سودی طریقہ اختیار کیا ہو تو سالانہ 4 یا 8 فیصد سود اصل رقم کے ساتھ دینا پڑتا ہے اور اگر غیر سودی طریقہ اختیار کیا ہو تو صرف اصل رقم واپس لوٹانا ہوتی ہے۔

اب چند سوالات کے جواب مطلوب ہیں: (جاوید ارشد، گلشنِ حدید، کراچی)

سوال: 139

کیا اپنی ہی جمع رقم سے قرض لینے پر سود دینا جائز ہے؟۔

جواب:

سود لینا یا دینا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے، خواہ وہ اپنی ہی جمع شدہ رقم پر ادا کیا جارہا ہو یا کسی دوسرے شخص سے لئے گئے قرض پر ادا کیا جارہا ہو، دونوں صورتوں میں حکم یکساں ہے۔اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ نے سود کو مطلقاً حرام فرمایا ہے۔

پراویڈنٹ فنڈ میں ادارے کی جانب سے اضافی رقم سود نہیں

سوال: 140

ادارہ پراویڈنٹ فنڈ میں جتنی رقم ملازم کی تنخواہ سے وضع کرتا ہے، اتنی ہی رقم وہ اپنی طرف سے اس اکاؤنٹ میں جمع کرتا ہے۔یہ سہولت سودی اور غیر سودی دونوں اسکیموں کے لئے ہے۔کیا یہ اضافی رقم جو ادارہ ملازم کو اپنی جانب سے دیتا ہے، جائز ہے؟۔

جواب:

جن اداروں میں یہ اصول ہے کہ ملازم کی تنخواہ سے پراویڈنٹ فنڈ کی مد میں ماہانہ جتنی رقم کاٹی جاتی ہے، اتنی ہی رقم وہ ادارہ اپنی طرف سے تبرّعاً یعنی فضل واحسان کے طور پر اس فنڈ میں جمع کرے گا، جیسا کہ آپ نے سوال میں بیان کیا ہے، تو یہ رقم اُس ادارے کی طرف سے ملازم کے ساتھ تبرّع اور فضل واحسان ہے اور یہ ملازم کے لئے جائز ہے، اگر شرائطِ ملازمت کا حصہ ہے، تب بھی درست ہے۔

سوال:141

اگر ملازم پراویڈنٹ فنڈ کی سودی اسکیم لیتا ہے تو ملازم کی سالانہ جمع شدہ رقم پر ہر سال ادارہ سود ادا کرتا ہے اور ہر سال یہ رقم بڑھتی رہتی ہے۔ کیا اِس سودی اسکیم کے تحت ادارے سے تمام رقم لینا جائز ہے؟۔

جواب:

سودی اسکیم کے متعلق ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ سود مطلقاً حرام ہے، خواہ کسی بھی اسکیم کے ذریعے ہو۔ ملازم کی طرف سے سود پر مبنی عقد کو ترجیحی طور پر اختیار کرنے کا اقرار یا معاہدہ اپنی اصل کے اعتبار سے ہی ناجائز ہے اور بعد میں اس پر ملنے والا سودی اضافہ بھی ناجائز اور باطل ہے۔ اور اِس گناہ میں وہ ادارہ بھی شامل ہوگا۔ بعض اسلامی بنکوں نے کارپوریشنوں، کمپنیوں، محکموں اور اداروں کے لئے ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ کی جمع شدہ رقوم کی مضاربت کے شرعی اصول پر مبنی اسکیمیں بنائی ہیں، مثلاً داؤد اسلامک بینک لمیٹڈ نے ''خوش حال'' کے نام سے ایک اسکیم بنائی ہے اور اس کے لئے باقاعدہ ایک ٹرسٹ قائم کیا ہے، کارپوریشنوں، کمپنیوں، محکموں اور اداروں کی ملازمین کی انجمنیں یا یونینیں (CBA) اپنے اداروں کے سربراہان کو اس پر آمادہ کریں کہ وہ ملازمین کی جی پی فنڈ کی جمع شدہ رقوم کے لئے اسلامی تمویل (Financing) کے طریقے اختیار کریں اور جس ملازم کو اپنے جی پی فنڈ سے رقم نکلوانی ہو، وہ اسے بلاسود دیدی جائے، کیونکہ یہ اُس کا اپنا مال ہے۔

کیا انعامی بانڈز کا انعام سود میں شامل ہے؟

سوال:142

کیا انعامی بانڈ کی رقم جو اسٹیٹ بینک سے انعام نکلنے کی صورت میں ملتی ہے، لینا جائز ہے؟، جبکہ یہ سب کو معلوم ہے کہ اسٹیٹ بینک کا تمام کام دوسرے بینکوں کے ساتھ سودی ہے،(یاسر عالم، سیکٹر 5-D، نیو کراچی)

جواب:

انعامی بانڈز کی خرید وفروخت اور ان پر ملنے والا انعام جائز ہے، بانڈ پر درج قیمت (Face value) پر خرید وفروخت میں تو کسی کا اختلاف نہیں ہے، البتہ اس کی انعامی رقم کے جواز پر علماء کا اختلاف ہے۔ ہمارے علماء اہلسنت و جماعت کے نزدیک یہ انعامی رقم لینا جائز ہے، اس میں حرمت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ اختلاف فقہی دلائل کی بنیاد پر ہے، یہ مسلکی نوعیت کا اصولی یا اعتقادی اختلاف نہیں ہے۔ ہر دور کے نئے پیش آنے والے مسائل ''مجتہد فیہ'' ہوتے ہیں، یعنی جن پر اُس عہد کے اہلِ فتویٰ اور اہلِ علم کو شرعی دلائل کی روشنی میں جواز یا عدمِ جواز کا حکم لگانا ہوتا ہے۔ بعض اوقات علماء کی فقہی آراء اِن کے بارے میں مختلف ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں عام مسلمانوں کو میرا مشورہ یہ ہوتا ہے کہ جن علماء کی فقاہت، اجتہادی اہلیت اور علمی دیانت پر انہیں زیادہ اعتماد ہو، ان کی رائے پر عمل کیا کریں۔ لیکن یہ ترجیح دین داری اور آخرت کی جوابدہی کی بنیاد پر ہونی چاہئے، نہ کہ محض خواہشِ نفس کی اِتباع کی جائے۔ ان بانڈز کا اجراء حکومتِ پاکستان کرتی ہے، بینک نہیں کرتے۔ وہ صرف ان کی خرید وفرخت کے لئے ایجنٹ کا کام کرتے ہیں۔ اِن میں کوئی سودی معاہدہ بھی شامل نہیں ہے، نہ مشروط (Conditional) اور نہ ہی معہود (Understood)۔ یہ اختلاف ربا کی حرمت میں نہیں ہے، بلکہ اس امر میں ہے کہ انعامی بانڈز پر دیا جانا والا انعام سود ہے یا نہیں؟ جن علماء نے اسے حرام قرار دیا، انہوں نے اسے سود اور قمار (Gambling) کہا ہے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ فتویٰ دلائل کی

بنیاد پر درست نہیں ہے۔اس مسئلے پر تفہیم المسائل کی جلد: چہارم میں ہم لکھ چکے ہیں اور اگر کسی کو مزید تفصیلی دلائل سے آگہی مطلوب ہو تو علامہ غلام رسول سعیدی کی شرح صحیح مسلم جلد 4،ص: 111 تا 126 ، علامہ مفتی وقار الدین رحمہ اللہ تعالیٰ کا وقار الفتاویٰ، جلد اول، ص: 226 تا 232 اور مفتی محمد رفیق حسنی صاحب کی کتاب رفیق الفقہاء کا مطالعہ فرمائیں۔

ایک رفاہی ادارے کا کسی دوسرے رفاہی ادارے کو منفعت کے عوض قرض دینا

سوال:143

ایک رفاہی ادارہ جو صحت کے شعبے میں کام کر رہا ہے، اس کے پاس کچھ رقم اس کی اپنی ضروریات سے زائد جمع ہے، جس کے بغیر یہ ادارہ چند سالوں تک اپنی خدمات انجام دے سکتا ہے۔کیا یہ زائد رقم جو زکوٰۃ، صدقات اور عطیات سے حاصل ہوئی ہے، کسی ایسے فلاحی ادارے کو، جو صحت کے شعبے میں کام کرتا ہے، مندرجہ ذیل شرائط پر دے سکتا ہے:
(۱) یہ رقم سمجھوتے کے تحت مقررہ مدت میں قابلِ واپسی ہوگی۔(۲) رقم کی ادائیگی اور واپسی کے درمیانی مدت میں رقم لینے والا ادارہ، رقم دینے والے ادارے کو صحت کے شعبہ میں کچھ خدمات مفت فراہم کرے گا، لیکن رقم دینے والا ادارہ اپنے مریضوں سے مذکورہ خدمات کے عوض قیمت وصول کرے گا، کیا ایسا کرنا جائز ہوگا؟۔(ہارون جونانی، عزیز آباد، کراچی)

جواب:

کوئی بھی رفاہی ادارہ یا انجمن جو عوام سے زکوٰۃ، صدقات اور عطیات وصول کرتا ہے، اس پر ایک ذمہ داری تو یہ عائد ہوتی ہے کہ صدقاتِ واجبہ (زکوٰۃ، فطرہ، نذر و کفارات وغیرہ کی رقوم) کا کھاتہ الگ رکھے۔اور اُن رقوم کو ان مصارف پر صرف کرے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مقرر فرمائے ہیں۔عام عطیات اور نفلی صدقات و خیرات میں توسُّع (گنجائش) ہے۔اگر آپ کے ادارے کے قواعد و ضوابط (By Laws) آپ کو اختیار دیتے ہیں کہ آپ دوسرے اداروں کو قرض دے سکتے ہیں تو آپ ایسا کر سکتے ہیں، مگر آپ کو عطیات دینے والوں کو بھی اس کا علم ہونا چاہئے اور ان کی یہ اجازت آپ کو حاصل ہو کہ

آپ ان کے دیئے ہوئے عطیات میں ایسا تصرف کر سکتے ہیں۔لیکن آپ اس قرض پر منفعت نہیں حاصل کر سکتے کہ آپ اپنے مریضوں سے تو فیس چارج کریں اور مقروض ادارہ آپ کے اُنہی مریضوں کو کسی قسم کے چارج کے بغیر علاج کی سہولت فراہم کرے۔قرض پر ایسی منفعت جو معاہدے میں طے شدہ ہو یا معروف ہو شرعاً ربا (سود) کے زمرے میں آتی ہے اور حرام ہے۔آپ کے معاونین نے تو اجر کمانے کے لئے آپ کو زکوٰۃ، صدقات اور عطیات دیئے تھے نہ کہ اسے کاروبار میں لگانے کیلئے۔رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفِعَةً فَهُوَ رِبًا، ترجمہ:''ہر وہ قرض جو (اصل رقم پر زائد) کسی منفعت کا باعث ہو، تو ایسی منفعت سود ہے، (کنز العمال، رقم الحدیث:15516)''۔

وراثت کے مسائل

شوہر کی وفات کے وقت جو عورت نکاح میں ہے، وارث بنے گی

سوال:144

محمد رفیق ولد گل احمد کا نکاح ثریا بیگم سے 1989ء میں ہوا۔ محمد رفیق محنت مزدوری کے لئے کراچی منتقل ہو گیا، جہاں اس کو کینسر کا مرض لاحق ہوا اور اسی مرض میں 29 دسمبر 2008ء کو اُس کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے بعد اُس کے بھائیوں نے بذریعہ یونین کونسل گڑھی حبیب اللہ ایک طلاق نامہ محمد رفیق کی طرف سے لڑکی والوں کو ارسال کیا، جس پر طلاق کے گواہوں کے کوئی دستخط نہیں ہیں اور جو محمد رفیق کے دستخط ظاہر کئے گئے ہیں وہ بھی جعلی ہیں، کیونکہ ہمیں ان کے دستخط کی پہچان ہے۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا بیوی کو شوہر کے ترکے سے حصہ نہیں ملے گا؟، (نوید احمد، گڑھی حبیب اللہ، مانسہرہ)۔

جواب:

اگر آپ کا بیان درست ہے کہ محمد رفیق ولد گل احمد صاحب نے اپنی بیوی ثریا بیگم کو اپنی زندگی میں طلاق نہیں دی تھی اور وہ اُن کی وفات تک اُن کے نکاح میں رہیں، تو وہ ان کی جائز شرعی وارث ہیں۔ اگر کوئی شخص خدانخواستہ اپنی بیوی کو اپنے مرضِ وفات میں طلاق بائن بھی دیدے اور عدت کے اندر شوہر کا انتقال ہو جائے تو بھی وہ مُطلّقہَ بائنہ اپنے شوہر کی وارث بنے گی، علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں:

وإذَا طَلَّقَ الرَّجُلُ اِمْرَأتَهٗ فِیْ مَرَضِ مَوْتِهٖ طَلَاقاً بَائِناً، فَمَاتَ وَهِیَ فِی الْعِدَّةِ، وَرِثَتْهُ، وَاِنْ مَاتَ بَعْدَ اِنْقِضَاءِ العِدَّةِ، فَلاَ مِیْرَاثَ لَهَا،

ترجمہ: ”اور جب کوئی شخص اپنی بیوی کو مرض موت میں طلاق بائن دیدے اور (مطلّقہ بیوی کی) عدت کے دوران مر جائے تو وہ عورت اپنے شوہر کے ترکے سے حصہ پائے گی۔ اور اگر اُس شخص کا انتقال عدت گزرنے کے بعد ہوا تو عورت کو ترکے سے کچھ بھی نہیں ملے گا، (فتح القدیر، جلد 4، ص:129)“۔

آپ نے متوفّی محمد رفیق کے بھائیوں کی طرف سے جس طلاق نامے کا ذکر کیا ہے

اور جسے آپ کے بیان کے مطابق یونین کونسل میں جمع کیا گیا ہے، وہ صحیح ہے یا جعلی؟، اس امر کا فیصلہ عدالت کا کام ہے۔ آج کل عدالتوں کی معاونت کے لئے تحریر یا دستخط کے ماہرین بھی دستیاب ہوتے ہیں اور عدالتیں اُن سے فنی مدد لیتی ہیں۔ دستخط کے اصلی یا جعلی ہونے کے بارے میں ماہر کی رائے قرائن کی شہادت کا درجہ رکھتی ہے۔ آپ عدالت سے رجوع کریں یا اپنی پنچایت اور برادری میں کسی مقامی مفتی اور عالم کو، جن پر فریقین کا اعتماد ہو، حَکَم مقرر کر کے فیصلہ کرائیں، بشرطیکہ دونوں فریق پیشگی یہ اقرار نامہ لکھ کر دیں کہ وہ اِس فیصلے کو تسلیم کریں گے۔

اگر کوئی شخص حیلے بہانے، مکر و فریب یا جعلی دستاویزات کے ذریعے کسی کی جائیداد ناحق لیتا ہے یا کسی کو وراثت سے محروم کرتا ہے یا کسی کا حق مارتا ہے، تو اس کے لئے حدیث پاک میں شدید وعید آئی ہے۔ چند احادیث ملاحظہ ہوں:

(1) عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِنَّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ اِلَیَّ وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ اَنْ یَّكُوْنَ اَلْحَنَ بِحُجَّتِهٖ مِنْ بَعْضٍ فَاَقْضِیْ لَهٗ عَلٰی نَحْوِ مِمَّا اَسْمَعُ مِنْهُ فمن قَطَعْتُ لَهٗ مِنْ حَقِّ اَخِیْهِ شَیْئًا فَلَا یَاْخُذْهُ، فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَهٗ بِهٖ قِطْعَةً مِّنَ النَّارِ۔

ترجمہ: ''حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میرے پاس مقدمات لے کر آتے ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے موقف کو دوسرے فریق کے مقابلے میں زیادہ دلائل کے ساتھ پیش کرے (یا زیادہ چرب زبان ہو) تو میں اس کے (ظاہری) دلائل کو سن کر (بالفرض) اس کے حق میں فیصلہ کر دوں (جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہو)، تو جس شخص کو میں اس کے بھائی کے حق میں سے کچھ دے دوں تو (اللہ کا خوف کرتے ہوئے) وہ اسے نہ لے، کیونکہ (وہ یہ سمجھے کہ درحقیقت) میں اسے آگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4470)''۔

(2) عَنْ عَمْرِو بْنِ نُفَیْلٍ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ مَنِ اقْتَطَعَ شِبْرًا مِنْ اَرْضٍ ظُلْمًا، طَوَّقَهُ اللهُ اِیَّاهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مِنْ سَبْعِ اَرْضِیْنَ

ترجمہ: ''عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے (کسی دوسرے کی) ایک بالشت زمین بھی ظلماً لی، اللہ تعالیٰ (سزا کے طور پر) قیامت کے دن (اس کے گلے میں) سات زمینوں کو طوق بنا کر ڈالے گا''۔
(صحیح مسلم، رقم الحدیث: 4129)

ان احادیثِ مبارکہ کی رو سے آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں فیصلے حقیقت کی بنیاد پر ہوں گے۔ اور اگر دنیا میں کسی نے کسی حیلے، فریب یا دباؤ یا سفارش کے ذریعے کسی کا حق مار بھی دیا تو اس دنیا کے عارضی فائدے کے بدلے میں آخرت کا نقصان کروڑہا درجے زائد ہوگا۔

مسلمان اور غیر مسلم میں باہمی وراثت کا مسئلہ

سوال:145

میرا کیتھولک عیسائی گھرانے سے تعلق ہے اور میرا نام بابر گل ولد سیموئیل فلپس گل اور والدہ کا نام نسیم گل ہے۔ یہ دونوں اپنی زندگی میں اور مرتے وقت بھی کیتھولک عیسائی تھے۔ ان کی تین اولاد (2 بیٹیاں اور ایک بیٹا) ہیں۔ دونوں بیٹیاں مسلمان ہو چکی ہیں اور میں (بابر گل) اب بھی کیتھولک عیسائی ہوں۔ ایک بیٹی روبی نے 1981ء میں لاہور میں بادشاہی مسجد میں اسلام قبول کیا اور اپنا اسلامی نام بابرہ بی بی رکھ لیا اور ایک مسلمان نذیر احمد بٹ کے ساتھ اسلامی طریقے سے نکاح کر لیا۔

اب جب کہ میرے والدین وفات پا چکے ہیں، تو وہ ان کی وفات کے بعد حصہ دار ہونے کا دعویٰ کر رہی ہے، چونکہ پیسے اور گھر عیسائی ماں باپ اور عیسائی گھرانے کا ہے۔ کیا مسلمان ہونے کے بعد اُس عورت کا عیسائی وراثت میں حصہ بنتا ہے؟ (بابر گل، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور)

جواب:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا يَرِثُ الْكَافِرُ

اَلْمُسْلِمَ۔

ترجمہ: ''حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے اور نہ ہی کافر مسلمان کا وارث ہوتا ہے''۔

(صحیح مسلم:4031، سنن ابی داؤد رقم الحدیث:2901)

اس حدیث کے تحت علامہ نووی لکھتے ہیں:

أجمع المسلمون علی أن الکافر لایرث المسلم و أما المسلم فلا یرث الکافر ایضاً عند جماھیر العلماء من الصحابۃ والتابعین و من بعدھم۔

ترجمہ: ''مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا۔ اور صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے جمہور فقہاء کے نزدیک مسلمان بھی کافر کا وارث نہیں ہوتا''۔

(شرح مسلم للنووی، جلد رابع، جز:11، ص:52، مطبوعہ: مکتبۃ الغزالی، دمشق)

میراث سے محروم کرنے والے اسباب چار ہیں، ان میں سے ایک سبب دین کا اختلاف ہے، یعنی مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا۔

حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد اور دادا عبداللہ بن عمرو سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لایتوارث أھل ملّتین شتّٰی۔

ترجمہ: ''دو مختلف ملتوں کے افراد ایک دوسرے کے وارث نہیں بنیں گے''۔

(سنن ابی داؤد:2903)

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

واختلاف الدین ایضا یمنع الِارثَ، والمرادُ به الاختلافُ بینَ الاسلامِ والکفرِ، وأمّا اِختلافُ مِلَلِ الکُفّارِ کَالنَّصرَانِیَّۃِ وَالیھودِ وَالمَجوسِیَّۃِ وعَبَدَۃِ الوَثَنِ فَلا یَمنعُ الِارثَ حتّٰی یَجرِیَ التَّوارُثُ بَینَ الیَھودِیِّ والنَّصرانِیِّ وَالمَجوسِیِّ واِختلافُ الدَّارینِ یَمنَعُ الِارثَ، کَذَا فی التَّبیینِ، ولکن ھذا الحکمُ فی حَقِّ أھلِ الکفرِ لافی حقِّ المُسلِمِینَ

ترجمہ: ''اور دین کا اختلاف بھی وراثت (پانے) میں مانع ہے، اور اس سے مراد اسلام اور

کفر کے درمیان اختلاف ہے۔ اور جو اختلاف کفار کی ملّتوں کے درمیان ہو، جیسا کہ نصرانی، یہودی، مجوسی اور بت پرست تو پھر یہ اختلاف وراثت سے مانع نہیں ہوگا (یعنی یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوسکتے ہیں)۔ یہاں تک کہ یہودی اور نصرانی اور مجوسی کے درمیان وراثت جاری ہوگی اور دارین کا مختلف ہونا (دارالاسلام ودارالحرب) وراثت میں مانع ہے، جیسا کہ ''تبیین'' میں بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ حکم اہل کفر کے حق میں ہے، مسلمانوں کے حق میں نہیں ہے، (عالمگیری جلد 6 ص: 454 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں: (واختلافُ الدینِ) إسلاماً وکفراً

ترجمہ: ''(اور دین کا مختلف ہونا) وراثت میں مانع ہے، (یعنی) مسلمان اور کافر ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوسکتے ۔۔۔ اس کی تشریح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قَیَّدَ بِہٖ لِاَنَّ الْکُفَّارَ یَتَوَارَثُوْنَ فِیْمَا بَیْنَھُم، وَاِنِ اخْتَلَفَتْ مِلَلُھُمْ عِنْدَنَا، لِاَنَّ الکفرَ کُلَّہٗ مِلَّۃٌ واحدۃٌ۔

ترجمہ: ''یہ قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ ہمارے نزدیک کفار ایک دوسرے کے وارث ہوسکتے ہیں، اگرچہ ان کے دین آپس میں مختلف ہوں، کیونکہ (مسلمانوں کے مقابلے میں) تمام کفر ایک ملّت ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد 10 ص: 418)''۔

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

اِختلافُ الدّینِ بینَ المُورِثِ والوَارِثِ بِالاسلامِ وغیرِہٖ مانعٌ من الِارثِ باِتفاقِ المذاھِبِ الاَربعۃِ، فَلَا یَرِثُ المسلمُ کافراً، وَلَاالْکافرُ مسلماً، سواءٌ بِسببِ القَرابۃِ أَو الزَّوجِیَّۃِ، لقولہ ﷺ لایرِثُ الْمُسْلِمُ الکافرَ، وَلَاالکافرُ المسلمَ۔ وقولہ لایَتوارثُ اھلُ ملّتین شتّٰی

ترجمہ: ''اسلام اور غیر اسلام (کفر) کے اعتبار سے وارث اور مورِث (جو وراثت چھوڑ کر مرے) کے درمیان مذہب کا اختلاف چاروں مذاہب کے نزدیک متفقہ طور پر وراثت میں مانع ہے۔ پس نہ مسلمان کافر کا وارث ہوسکتا ہے اور نہ ہی کافر مسلمان کا وارث ہوسکتا

ہے، (اور یہ اصول) سبب قرابت یا سبب زوجیت دونوں کے لئے برابر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے، نہ کافر مسلمان کا وارث ہوتا ہے، اور آپ ﷺ کا دوسرا قول یہ ہے کہ دو مختلف ملتوں کے افراد ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے، (الفقہ الاسلامی وادلتہ، جلد 8، ص:263)''۔

ہاں البتہ اگر بھائی اپنی بہنوں پر مہربانی کر کے رضا کارانہ طور پر اپنی خوشی سے انہیں کچھ دیدے تو یہ ایک اچھی انسانی قدر ہے اور انسانی ہمدردی کی راہ میں مسیحیت بھی رکاوٹ نہیں ہے۔ اسے اسلامی اخلاقیات میں تبرُّع اور فضل واحسان کہا جاتا ہے، یعنی کسی کے شرعی اور قانونی استحقاق کے بغیر اسے کچھ دیدینا یا کسی کو اس کے حق سے زیادہ دیدینا۔

ترکے کی تقسیم اور صدقاتِ جاریہ

سوال:146

زید نے 400 مربع گز کا ایک پلاٹ اپنی بیوی کے نام منتقل کر کے اسے مالک بنادیا تھا، اب بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ورثاء میں شوہر کے علاوہ پانچ بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ شرعی اعتبار سے اس کی تقسیم کس طرح ہوگی؟ نیز زید (شوہر) اپنے حصہ کی رقم کا مناسب حصہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے مطابق خرچ کرنا چاہتا ہے، ان مدات کی ترجیحات بھی بیان کردیجیے، (منور احمد، کراچی)۔

جواب:

شریعت کی رو سے کوئی شخص وفات کے بعد جو ترکہ چھوڑ جاتا ہے، اس میں سے تقسیم وراثت سے پہلے بالترتیب مندرجہ ذیل مصارف وضع کیے جاتے ہیں:

(1) مصارف تکفین وتدفین (2) اس کے ذمے اگر کسی کا قرض ہے تو اس کی ادائیگی

(3) اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو ادائے قرض کے بعد جو ترکہ بچے گا، اس کی زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مقدار تک وصیت پر عمل درآمد ہوگا، بشرطیکہ یہ وصیت کسی وارث کے حق میں نہ ہو۔ یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، انہیں منہا (Deduct) کرنے

کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہوتا ہے۔ وفات یافتہ خاتون کا ترکہ 44 حصوں میں تقسیم ہوگا: شوہر کو 11 حصے، 5 بیٹوں کو 30 حصے (فی کس 6 حصے)، ایک بیٹی کو 3 حصے ملیں گے۔ اگر آپ یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ زید اپنی زندگی میں کچھ رقم بہ طورِ صدقۂ جاریہ خرچ کرنا چاہتا ہے، جو اسکے حق میں ایصالِ ثواب کا ذریعہ بن سکے تو رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق ایصالِ ثواب میں "صدقاتِ جاریہ" کو ترجیح دینی چاہئے۔ یعنی مصارفِ ثواب کی ایسی صورتیں اختیار کی جائیں، جن کا فیضان اور اجر وثواب تادیر جاری وساری رہے۔ اس شخص کے نامۂ اعمال میں خیر کے کھاتے کھلے رہیں اور اجر وثواب میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ اِنْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهٗ اِلَّا مِنْ ثَلَاثَةِ اَشْیَاءَ مِنْ صَدَقَةٍ جَارِیَةٍ اَوْ عِلْمٍ یُنْتَفَعُ بِهٖ اَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ یَدْعُوْلَهٗ

ترجمہ: "جب انسان وفات پا جاتا ہے تو اس کے اعمالِ خیر کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، سوائے تین چیزوں کے (کہ جن کے اجر وفیضان کا سلسلہ انسان کی وفات کے بعد بھی جاری رہتا ہے)، صدقۂ جاریہ یا علم نافع (جس کا فیضان ان کے تلامذہ کے ذریعے بدستور جاری رہتا ہے) یا نیک اولاد جو اس کیلئے دعائے مغفرت کرتی رہے"۔ (سنن ابوداؤد: 2872)

"صدقاتِ جاریہ" کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں: مثلاً مسجد کی تعمیر، دینی مدارس کی تعمیر، علماء وحفاظِ قرآن کی تعلیم وتربیت وکفالت، پانی کا کنواں کھود کر وقف کر دینا، خیراتی اسپتال بنانا، دعوتی وتبلیغی دینی لٹریچر وغیرہ شائع کرنا۔ صدقۂ جاریہ کی ایک پسندیدہ صورت ضرورت مند لوگوں کے لئے پانی کا انتظام بھی ہے۔ ضرورت مند لوگوں کو پانی فراہم کرنا اور کھانا کھلانا بھی صدقۂ جاریہ ہے، جو اجرِ کثیر کا باعث ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ اَیُّمَا مُسْلِمٍ کَسَا مُسْلِمًا ثَوْبًا عَلٰی عُرْیٍ کَسَاهُ اللّٰهُ مِنْ خُضْرِ الْجَنَّةِ وَاَیُّمَا مُسْلِمٍ اَطْعَمَ مُسْلِمًا عَلٰی جُوْعٍ اَطْعَمَهُ اللّٰهُ مِنْ ثِمَارِ الْجَنَّةِ

وَاَیُّمَا مُسْلِمٍ سَقٰی مُسْلِمًا عَلٰی ظَمَأٍ سَقَاہُ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ مِنَ الرَّحِیْقِ الْمَخْتُوْمِ،

ترجمہ: ''جو مسلمان اپنے مسلمان بھائی کو بے لباسی کے وقت لباس پہنائے گا، تو (اس کے اجر میں) اللہ تعالیٰ اسے جنت کا سبز لباس پہنائے گا اور جو مسلمان کسی مسلمان کو بھوک کے عالم میں کھانا کھلائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کے پھلوں میں سے کھلائے گا اور جو مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی کو (شدید) پیاس کے عالم میں پانی پلائے گا، تو (اس کے اجر کے طور پر) اللہ تعالیٰ اسے (جنت کی) مہر بند (Seal pack) شراب طہور پلائے گا''۔

(سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: 1679)

سرکاری ملازم کی بیوہ بچوں کا عطیہ اور ورثاء کا استحقاق

سوال: 147

میری ایک بیوی، چار جوان بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ بڑا بیٹا محمد افضل 14 سال سے دیر اسکاؤٹ ملیشیا فورس میں ملازم تھا۔ دورانِ ملازمت حادثے میں شہید ہو گیا، حکومت کی طرف سے اس کی بیوہ خاتون بیگم کے نام چھ لاکھ روپے جمع کرائے گئے اور ماہانہ 3,500/ روپے پنشن مقرر کی گئی۔ گورنمنٹ نے 2,27000/ روپے کی زمین اس کی بیوہ اور بچوں (بلال، جنید اور فاطمہ) کے نام خرید کر اس پر اپنے خرچ سے ان کے لئے مکان بنوا دیا۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ کی طرف سے میرے بیٹے کی بیوہ اور بچوں کے نام کچھ رقم بھی آتی رہی، جسے میں اُنہیں بتائے بغیر استعمال کرتا رہا، ہم سب اکٹھے رہتے ہیں۔ میرے باقی تینوں بیٹے بھی برسرِ روزگار ہیں۔ کیا حکومت کی طرف سے میرے مرحوم بیٹے کی بیوہ اور بچوں کو دی گئی رقم اور مکان پر ترکے کا اطلاق ہوتا ہے؟، کیا ہم اس رقم میں سے حصہ لینے اور خرچ کرنے کے حق دار ہیں؟، (محمد زمان، اوگی)۔

جواب:

میری رائے میں یہ سب حکومت کی طرف سے مرحوم کی بیوہ اور بچوں کے لئے تبرُّع اور فضل و احسان ہیں، یہ مرحوم کا ترکہ نہیں کہ اسے شرعی ورثاء میں اصولِ شرع کے مطابق

تقسیم کیا جائے۔ آپ (یعنی مرحوم کے والد) کا اس مال میں تصرُّف ناجائز ہے۔ بچے اگر نابالغ ہیں اور قضائے الٰہی سے یتیم ہوگئے ہیں تو ولی کا ان کے مال میں باطل طریقے سے تصرُّف اور حیلے وتدبیر سے اُسے ہتھیا لینا ازروئے قرآن نہایت قبیح فعل اور ظلم ہے، اس پر قرآن میں بڑی وعید آئی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱) اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا

ترجمہ: ''جو لوگ ظالمانہ طریقے سے یتیموں کا مال کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹوں میں آگ جھونک رہے ہیں، (النساء: 10)''۔

(۲) وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِیْرًا ۝

ترجمہ: ''اور ان (یتیموں) کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ، یہ بہت بڑا گناہ ہے (النساء: 2)''۔ اگر کوئی شخص کسی یتیم کا ولی ہے، خواہ وہ دادا ہو، چچا ہو یا بڑا بھائی، اس کے بارے میں قرآن مجید میں واضح ہدایت ہے:

(۳) وَلَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ یَّكْبَرُوْا وَمَنْ كَانَ غَنِیًّا فَلْیَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِیْرًا فَلْیَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ

ترجمہ: ''اور ان کے مال کو فضول خرچ کر کے ان کے بڑے ہونے کے خوف سے جلدی جلدی نہ کھاؤ، اور (یتیم کا) جو (ولی) مالدار ہو، وہ (ان کا مال کھانے سے) بچتا رہے اور جو حاجت مند ہو، وہ دستور کے مطابق کھالے، (النساء: 6)''۔

آپ کے مرحوم بیٹے کے بیوی بچوں کے نام وقتاً فوقتاً حکومت کی طرف سے جو رقم آتی رہی اور آپ اُنہیں بتائے بغیر استعمال کرتے رہے، اس رقم کو آپ کیلئے ان کی جائز ضروریات پر صرف کرنا تو درست تھا، لیکن اپنے خاندان کے باقی افراد پر صرف کرنا درست نہیں تھا۔ آپ کی حیثیت ولی اور امین کی ہے، آپ کی ذمہ داری ہے کہ دوسروں پر خرچ کی گئی رقم واپس اُن بچوں کے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں۔ حدیث پاک میں ہے:

(۱) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ اَنَّ رَجُلًا قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! اِنَّ لِیْ مَالًا وَّوَلَدًا،

وَاِنَّ اَبِی یُرِیْدُ اَنْ یَجْتَاحَ مَالِی، فَقَالَ اَنْتَ وَمَالُكَ لِاَبِیْكَ۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! میرے پاس (کچھ) مال ہے اور میری اولاد بھی ہے، اور میرے والد چاہتے ہیں کہ وہ میرا مال لے لیں، آپ ﷺ نے فرمایا: تم اور تمہارا مال (دونوں) تمہارے والد کے ہیں۔

(۲) اِنَّ اَوْلَادَكُمْ مِنْ اَطْیَبِ كَسْبِكُمْ فَكُلُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ۔

ترجمہ: ''بے شک تمہاری اولاد تمہاری پاکیزہ کمائی میں سے ہے، پس اپنی اولاد کی کمائی سے کھاؤ، (یعنی تمہیں اپنی اولاد کے مال میں سے کھانے کی اجازت ہے)''۔
(سُنن ابن ماجہ: 92-2291)

(۳) اِنَّ رَجُلًا اَتَی النَّبِیَّ ﷺ، فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللهِ! اِنَّ لِی مَالًا وَوَلَدًا، وَاِنَّ وَالِدِیْ یَجْتَاحُ مَالِی، قَالَ اَنْتَ وَمَالُكَ لِوَالِدِكَ، اِنَّ اَوْلَادَكُمْ مِنْ اَطْیَبِ كَسْبِكُمْ، فَكُلُوْا مِنْ كَسْبِ اَوْلَادِكُمْ،

ترجمہ: ''ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی یارسول اللہ! میرے پاس (کچھ) مال ہے اور میری اولاد بھی ہے اور میرے والد میرے مال کو سرے سے ختم کرنا چاہتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: تم اور تمہارا مال تمہارے والد کے لئے ہے، بے شک تمہاری اولاد تمہاری بہترین کمائی میں سے ہے، تم اپنی اولاد کی کمائی میں سے کھاؤ، (سُنن ابوداؤد: 3524)

اس حدیث کی شرح میں صاحب عون المعبود لکھتے ہیں:

انتَ ومالكَ لِوالدكَ عَلٰی معنی انَّهٗ اِذا اِحتاجَ الٰی مالكَ، اخذَ منكَ قدْرَ الحاجةِ كمایاخُذُ مِن مالِ نفْسِه

ترجمہ: ''تم اور تمہارا مال تمہارے والد کے لئے ہے۔ یہ اس صورت پر محمول ہے کہ جب باپ تمہارے مال کا محتاج ہو، تو وہ تم سے اپنی حاجت کے مطابق لے، جیسے اپنے مال سے لیتا

ہے، (عون المعبود، جلد 3، ص:312)"۔ صاحبِ بذل المجہود نے اس کی شرح میں لکھا ہے:
وَقَیَّدَہُ الفقھاءُ بالحاجۃِ، اَیْ اِذَا احْتَاجَ اِلیہِ، وَاَمَّا اِذَا لَمْ یَحْتَجْ فَلَا یَجُوْزُ لَہُ الْاَکْلُ اِلَّا بِاذنِہٖ

ترجمہ: "(بعض) فقہاء نے حاجت کی قید لگائی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ (باپ کو اپنے بیٹے کے مال میں اُس کی اجازت کے بغیر تصرُّف کی اجازت صرف) اس صورت میں ہے جب وہ تمہارے مال کا محتاج ہو، تو وہ تمہارے مال میں سے اپنی حاجت کے مطابق لے جس طرح اپنے مال میں سے لیتا ہے، (بذل المجہود، جلد خامس، ص:295)"۔

(۴) عَنْ عَائِشَۃَ، قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِنَّ اَطْیَبَ مَا اَکَلْتُمْ مِنْ کَسْبِکُمْ، وَاِنَّ اَوْلَادَکُمْ مِنْ کَسْبِکُمْ۔

ترجمہ: "حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سب سے پاکیزہ مال جو تم کھاتے ہو، وہ تمہاری اپنی کمائی ہے اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی میں سے ہے"۔ (سُنن ابن ماجہ، رقم الحدیث:2290، سُنن ترمذی، رقم الحدیث:1358)

امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی لکھتے ہیں:
وَالْعَمَلُ عَلٰی ھٰذَا عِنْدَ بَعْضِ اَھْلِ الْعِلْمِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ ﷺ وَغَیْرِھِمْ، قَالُوْا اِنَّ یَدَ الْوَالِدِ مَبْسُوْطَۃٌ فِیْ مَالِ وَلَدِہٖ یَاْخُذُ مَاشَاءَ، وَقَالَ بَعْضُھُمْ لَا یَاْخُذُ مِنْ مَالِہٖ اِلَّا عِنْدَ الْحَاجَۃِ اِلَیْہِ۔

ترجمہ: "حضور ﷺ کے اصحاب میں سے بعض اہلِ علم کا اور ان کے علاوہ دوسرے بعض فقہاء کا اس حدیث پر عمل ہے، وہ فرماتے ہیں کہ باپ کو اپنی اولاد کے مال میں کھلا اختیار حاصل ہے، وہ جس قدر چاہے اُس میں سے لے سکتا ہے، اور ان میں سے بعض نے کہا کہ باپ اپنی اولاد کے مال میں سے اس وقت لے، جب اسے اس کی حاجت ہو"۔
(سُنن ترمذی، رقم الحدیث:1358)

ان احادیث کی رُو سے باپ اپنی زندہ اولاد کے مال میں ان کی اجازت کے بغیر اپنی

جائز ضروریات اور حاجت کے لئے لے سکتا ہے۔اس سے ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ والد اپنی جائز ضروریات کے علاوہ بھی اپنی اولاد کے مال میں تصرُّف کرے۔نیز جب اولاد کا انتقال ہو جائے تو باپ کو اپنی اولاد کے ترکہ میں سے چھٹا حصہ ملے گا۔

یہاں یہ مال آپ کے یتیم پوتے اور پوتیوں کا ہے۔آپ ان کے ولی اور اُن کے مال پر امین ہیں،لہٰذا آپ پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔البتہ اگر آپ کے بیٹے کا جی پی فنڈ حکومت کے پاس تھا،جو اس کی زندگی میں اس کی تنخواہ سے رضا کارانہ یا لازمی طور پر وضع کیا جاتا تھا تو یہ اُس کا ترکہ شمار ہوگا اور والدین سمیت تمام ورثاء کے درمیان شریعت کے قانون کے مطابق تقسیم ہوگا۔اسی طرح مرحوم کی اپنی جمع کی ہوئی رقم اور دوسرا ترکہ بھی،اگر کچھ ہے تو تمام ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

چونکہ آپ کے بیٹے کا انتقال ہو چکا ہے،لہٰذا اس کی اولاد (یعنی آپ کے پوتے، پوتیاں) آپ کے انتقال کے بعد آپ کے وارث نہیں بن سکتے،کیونکہ آپ کی اولاد موجود ہے اور اسلامی قانونِ وراثت کے ''اصولِ حجب'' کی رُو سے قریب کا وارث دور کے وارث کو محروم کر دیتا ہے۔لہٰذا آپ کو چاہئے کہ اپنی جائیداد میں سے ان کے نام کچھ نہ کچھ ''ہبہ'' کر دیں یا اُن کے لئے وصیت کر دیں کہ آپ کے انتقال کے بعد اُنہیں آپ کے ترکے میں سے مناسب حصہ (جو بھی آپ مقرر کریں) دیا جائے۔ترجیحی طور پر ہبہ یا وصیت کی مقدار اتنی ہونی چاہئے جتنی رقم آپ کے وفات یافتہ بیٹے کو آپ کے انتقال کے بعد اُس کے زندہ رہنے کی صورت میں ورثے میں ملتی۔یہ ہبہ یا وصیت ایجابی (لازمی) نہیں ہے بلکہ رضا کارانہ ہوگی اور اس پر آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے یقیناً اجر پائیں گے۔

ذوی الفروض،عصبات اور ذوی الارحام کے درمیان تقسیم ترکہ میں ترتیب

سوال:148

میری والدہ کا انتقال ہو چکا ہے اور میں ان کی ایک ہی بیٹی ہوں۔میرے علاوہ ان کی اور کوئی اولاد نہیں ہے۔میری والدہ کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کا ان سے پہلے انتقال

ہو چکا ہے۔ میری والدہ کے ایک بھائی تھے، ان کا بھی پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی اولاد میں چار بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ والدہ کی بہن بھی انتقال کر چکی ہیں، ان کی اولاد میں چھ بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ میرا ترکے میں سے کتنا حصہ ہوگا؟۔ اگر میرے ماموں زاد اور خالہ زاد سب باقاعدہ تحریری طور پر میرے حق میں دستبردار ہو جائیں تو کیا سب ترکہ مجھے مل سکتا ہے؟، (ص، ف، کراچی)۔

جواب:

تقسیم میں اصحابِ فرائض سے ابتداء کی جائے۔ اصحابِ فرائض وہ ہیں، جن کے حصے قرآن مجید میں مقرر کر دیے گئے ہیں۔ اور اس کی تفصیل سورۃ النسآء کی ابتدائی آیات میں موجود ہے۔ مذکورہ مسئلے میں اصحابِ فرائض میں سے صرف ایک بیٹی یعنی آپ موجود ہیں۔ لہٰذا آپ ترکے میں نصف کی حق دار ہیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۗ

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے درمیان (ترکے کی تقسیم کے بارے میں یہ) حکم دیتا ہے کہ ایک بیٹے کا حصہ دو بیٹیوں کے برابر ہوگا اور اگر (کسی کی اولاد میں) صرف بیٹیاں ہی ہوں (اور دو یا) دو سے زیادہ ہوں تو ان سب کو مجموعی طور پر (قابلِ تقسیم) ترکے کا دو تہائی حصہ ملے گا۔ اور اگر (کسی کی وارث) صرف ایک ہی بیٹی ہے تو اسے (کل ترکے کا) نصف ملے گا، (سورۃ النساء: 11)''۔

ذوی الفروض (قرآن کی رو سے جن وارثوں کے حصے مقرر ہیں) کو ان کا حصہ دینے کے بعد جو ترکہ بچ جائے، وہ میت کے عصبات کو ملے گا، اور اس کی بابت رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِاَھْلِھَا، فَمَا بَقِیَ فَھُوَ لِاَوْلٰی رَجُلٍ ذَکَرٍ

ترجمہ: ''شریعت میں ذوی الفروض کے مقررہ حصے ان کو دے دو، اس کے بعد جو ترکہ باقی بچ جائے وہ قریب ترین مرد وارث (عصبہ) کو ملے گا، (صحیح بخاری: 6735)''۔

صورتِ مسئولہ میں آپ کو اپنی والدہ کے کل قابلِ تقسیم ترکے میں سے نصف ملے گا اور بقیہ نصف ترکہ آپ کی والدہ مرحومہ کے چار بھتیجوں میں مساوی طور پر تقسیم ہوگا۔اور اگر آپ کے وہ چاروں ماموں زاد بھائی (یعنی آپ کی والدہ کے بھتیجے) اپنی آزادانہ مرضی سے آپ کے حق میں اپنے اپنے حصے سے دستبردار ہوجاتے ہیں تو یہ ان کی طرف سے آپ کے لئے تبرُّع اور فضل واحسان ہوگا، اس صورت میں سب ترکہ آپ کو مل سکتا ہے، یہ دراصل ان کی طرف سے آپ کے لئے ھبہ ہوگا۔آپ کی والدہ کی بھتیجیوں اور بھانجوں، بھانجیوں کو کچھ نہیں ملے گا۔

ہبہ میں ملی ہوئی جائیداد پر مالکانہ تصرُّف کا حق

سوال:149

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ زید نے دو شادیاں کیں۔پہلی بیوی سے تین بیٹے ہیں اور دوسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں۔زید نے اپنی زندگی میں ایک دکان اور ایک مکان دوسری بیوی کے نام کر دیا تھا اور کاغذات بھی اُسی کے نام سے بنوائے اور کئی لوگوں کے سامنے اپنے اِس خدشے کا اظہار کیا کہ میرے بعد میری پہلی بیوی اور اس کی اولاد میری دوسری بیوی کا خیال نہیں کریں گے۔بعدازاں زید اور اُس کی پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا اور زید کے تینوں بیٹوں نے سارا مال آپس میں تقسیم کرلیا اور زید کی دوسری بیوی کو کچھ بھی نہیں دیا۔اب مسئلہ یہ معلوم کرنا ہے کہ زید نے جو دکان اور مکان دوسری بیوی کے نام کیا تھا، کیا اسے دوسری بیوی اپنی حیات میں کسی کو ہبہ کرسکتی ہے؟۔(قمر علی، کراچی)۔

جواب:

اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں کسی کو کوئی شے ہبہ (Gift) کردے اور موہوب لہٗ (جسے ہبہ کیا گیا ہے) اُس شے موہوبہ (Gifted Item) پر قبضہ بھی کرلے تو ہبہ تام (مکمل) ہوجاتا ہے اور وہ شے واہب (ہبہ کرنے والے) کی ملکیت سے نکل کر موہوب لہٗ کی ملکیت میں چلی جاتی ہے۔پھر وہ موہوب لہٗ (جسے ہبہ کیا گیا ہے) اُس ہبہ کی ہوئی چیز کا

مالک بن جاتا ہے، اس کے بعد شریعت کی رو سے وہ اس جائیداد پر مالکانہ تصرُّف کرسکتا ہے۔ اگر آپ کا بیان درست ہے کہ زید نے مذکورہ دکان اور مکان اپنی دوسری بیوی کو ہبہ کردیئے تھے اور اُس پر اُس نے قبضہ بھی کرلیا تھا، تو یہ ہبہ مکمل ہوگیا اور وہ خاتون اس مکان اور دکان کی مالک ہے۔ وہ اپنی زندگی میں جسے چاہے ہبہ (Gift) کرسکتی ہے، اُس کے مالکانہ تصرُّف پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اگر زید کی پہلی بیوی بھی اس کی وفات کے وقت حیات تھی تو شریعت کی رو سے زید کے ترکے میں سے دونوں بیویوں کو فی کس 1/16 حصہ (مجموعی طور پر آٹھواں حصہ) ملے گا۔ اور اگر زید کی پہلی بیوی کا انتقال زید سے پہلے ہوگیا تھا تو دوسرے بیوی کو 1/8 حصہ ملے گا۔ زید کے بیٹوں کا اپنی سوتیلی ماں (زید کی دوسری بیوی) کو اپنے باپ کے ترکے سے محروم کرنا درست نہیں ہے، بلکہ یہ ایک طرح سے اُس کے حق کو ظلماً غصب کرنا ہے، اگر کوئی کسی شخص کا حق غصب کرے، اس کے لئے رسول اللہ ﷺ کی وعید ہے: ''مَنِ اقْتَطَعَ شِبْرًا مِنَ الْأَرْضِ ظُلْمًا طَوَّقَهُ اللهُ إِيَّاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرَضِيْنَ''۔

ترجمہ: ''جو شخص کسی شخص کی زمین کا ایک بالشت ٹکڑا ظلماً اور ناحق لے گا، تو اسے سزا کے طور پر قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا، (صحیح مسلم، :4055)''۔

وصیت کی تعریف اور اس کی مقدار

مُوصی کی زندگی میں وصیت نافذ نہیں ہوتی

سوال:150

ایک شخص نے وصیت کی کہ میرا مال میرے بعد فلاں شخص کو دے دیا جائے، تو جس کے حق میں وصیت کی گئی ہو وہ وصیت کرنے والے کی زندگی میں اُس پر قبضہ کرسکتا ہے؟۔

(سید ناصر علی قادری، گلشن اقبال، کراچی)

جواب:

وصیت کرنے والے کو ''مُوصی'' اور جس کے حق میں وصیت کی جائے، اسے ''موصیٰ

لہٗ" کہتے ہیں۔وصیت، مُوصی کی وفات کے بعد نافذ ہوتی ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ مقدار مُوصی کے ترکے کی ایک تہائی حد تک ہوتی ہے۔اگر وصیت کی مقدار وفات یافتہ شخص کے ایک تہائی ترکے سے زیادہ ہے تو ایک تہائی سے زائد مقدار کالعدم ہو جائے گی، سوائے اس کے کہ وصیت کرنے والے کے تمام ورثاء یا کوئی ایک وارث اپنے حصے میں سے رضا کارانہ طور پر دستبردار ہو کر اسے نافذ کرے۔حدیث پاک میں ہے:

عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یَعُوْدُنِیْ عَامَ حَجَّۃِ الْوَدَاعِ مِنْ وَجَعٍ اِشْتَدَّ بِہٖ، فقلتُ اِنِّیْ قَدْ بَلَغَ بِیْ مِنَ الْوَجَعِ وَاَنَا ذُوْ مَالٍ، وَلَا یَرِثُنِیْ اِلَّا اِبْنَۃٌ اَفَاَتَصَدَّقُ بِثُلُثَیْ مَالِیْ؟، قَالَ لَا، فقلتُ بِالشَّطْرِ؟، فقال لَا، ثُمَّ قَال الثُّلُثُ، والثُّلُثُ کَبِیْرٌ اَوْ کَثِیْرٌ، اِنَّكَ ان تَذَرَ وَرَثَتَكَ اَغْنِیَآءَ، خَیْرٌ مِنْ اَنْ تَذَرَھُمْ عَالَۃً یَتَکَفَّفُوْنَ النَّاسَ، وانّكَ لنْ تُنفِقَ نَفَقَۃً تَبْتَغِیْ بِھَا وَجْہَ اللّٰہِ اِلَّا اُجِرتَ بِھَا، حتّٰی مَا تَجْعَلُ فِیْ فِیْ اِمْرَأَتِكَ

ترجمہ:"حضرت سعد بن وقاص بیان کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے سال رسول اللہ ﷺ میرے شدید درد کی وجہ سے میری عیادت کے لئے تشریف لائے، تو میں نے عرض کیا: مجھے شدید درد لاحق ہے اور میں مالدار آدمی ہوں اور میری وارث صرف ایک بیٹی ہے، تو کیا میں اپنا دو تہائی مال صدقہ کر دوں؟، آپ ﷺ نے فرمایا:"نہیں"، تو میں نے عرض کیا: کیا میں اپنا آدھا مال صدقہ کر دوں؟، تو آپ نے فرمایا:"نہیں" پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ایک تہائی مال صدقہ کر دو اور ایک تہائی بڑا ہے یا بہت ہے، اگر تم اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑو، یہ اس سے بہتر ہے کہ تم انہیں تنگ دست چھوڑو کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں اور تم اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جو بھی مال خرچ کرو گے اس پر تمہیں اجر ملے گا، یہاں تک کہ وہ روزی جو تم اپنی بیوی کے منہ ڈالتے ہو (اس پر بھی اجر ملے گا)"۔(صحیح بخاری، رقم الحدیث:1295)

وصیت کا نفاذ مُوصی کی وفات کے بعد ہوتا ہے، مُوصیٰ لہٗ اگر مُوصی کی زندگی میں وصیت کو قبول کر بھی لے تو اس کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہے۔البتہ مُوصی کی وفات کے بعد

اسے قبول کرنے کا حق حاصل رہے گا۔ علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

قبولُ الوصیّۃِ اِنّمَا یکونُ بعدَ الموتِ، فاِنّ قبِلَھا فِی حَالِ حیاۃِ المُوصِی أو رَدّھا، فذٰلِكَ باطلٌ، ولہُ القبولُ بعدَ الموتِ، کذَا فِی السِّراجیّۃِ

ترجمہ: ''وصیت قبول کرنے کا اعتبار مُوصی (وصیت کرنے والے) کی موت کے بعد ہے۔ اگر مُوصیٰ لہٗ (جس کے لئے وصیت کی جائے) نے موصی کی زندگی میں ہی اسے قبول کیا یا رد کیا تو باطل ہے۔ (ہاں!) مُوصیٰ لہٗ (جس کے لئے وصیت کی جائے) کو مُوصی (وصیت کرنے والے) کی موت کے بعد قبول کرنے کا حق ہے، جیسا کہ ''سراجیہ'' میں ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص: 90 تا 92، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)

اگر کسی نے اپنے شرعی وارثوں میں سے کسی ایک کے حق میں وصیت کی ہو تو وہ شریعت میں معتبر نہیں ہے، کیونکہ ایسی وصیت کے ذریعے وہ شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ وارثوں کے حصے کے تناسب (Ratio) کو تبدیل کر دیتا ہے، چنانچہ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ، قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَقُوْلُ اِنَّ اللہَ قَدْ اَعْطٰی کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّہٗ، فَلَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ

ترجمہ: ''ابواُمامہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بیشک اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حصہ (اسلامی قانونی وراثت میں) دے دیا ہے، تو (اب کسی) وارث کے حق میں وصیت کوئی حیثیت نہیں رکھتی، (سنن ابوداؤد: 2862)''۔

زندگی میں وصیت سے رجوع کا حق ہے

سوال: 151

کیا کوئی شخص وصیت نامہ لکھنے یا زبانی وصیت کرنے کے بعد اپنی وصیت سے رجوع کرسکتا ہے؟، (سید ناصر علی قادری، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

وصیت کرنے والا اپنی وصیت سے رجوع کرسکتا ہے، اور اُس کے وصیت سے رجوع

کرنے کی صورت میں وہ وصیت باطل ہو جائے گی، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وَيَصِحُّ لِلْمُوصِي الرَّجُوعُ عَنِ الوَصِيَّةِ، ثُمَّ الرُّجُوعُ قَدْ يَثْبُتُ صَرِيحًا وَقَدْ يَثْبُتُ دَلَالَةً، فَالأَوَّلُ بِأَنْ يَقُولَ رَجَعْتُ أَوْ نَحْوَهُ، وَالثَّانِي بِأَنْ يَفْعَلَ فِعْلًا يَدُلُّ عَلَى الرُّجُوعِ، ثُمَّ كُلُّ فِعْلٍ لَوْ فَعَلَهُ الإِنْسَانُ فِي مِلْكِ الغَيْرِ يَنْقَطِعُ بِهِ حَقُّ المَالِكِ، فَإِذَا فَعَلَهُ المُوصِي كَانَ رُجُوعًا۔۔۔وَكَذَا كُلُّ تَصَرُّفٍ أَوْجَبَ زَوَالَ مِلْكِ المُوصِي فَهُوَ رُجُوعٌ

ترجمہ: ''وصیت کرنے والے کا اپنی وصیت سے رجوع کرنا جائز ہے، یہ رجوع کبھی صراحۃً ہوتا ہے اور کبھی دلالۃً ہوتا ہے۔ صریح کی صورت یہ ہے کہ صاف لفظوں میں کہے: ''میں نے اپنی وصیت سے رجوع کیا، یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ کہے''۔ دوسری صورت یعنی دلالۃً یہ ہے کہ کوئی ایسا عمل کرے جو رجوع کرنے پر دلالت کرتا ہے، (اس کے لئے قاعدۂ کلیہ یہ ہے) کہ ہر ایسا فعل جس کے غیر کے ملک میں عمل میں لانے سے مالک کا حق منقطع ہو جائے، اگر مُوصِی (وصیت کرنے والا) ایسا کام کرے، تو یہ اس کا اپنی وصیت سے رجوع کرنا ہوگا۔ مثلاً اس نے وصیت کی کہ میرے بعد یہ مکان یا دکان یا گاڑی فلاں کی ہوگی اور پھر ان چیزوں کو فروخت کر دیا یا کسی اور کو ہبہ کر دیا۔۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں: اور اسی طرح مُوصِی کا ہر وہ تصرف جس کے ذریعے اُس کی مِلکیت وصیت کی ہوئی چیز سے زائل ہو جائے تو یہ بھی رجوع ہے''۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص: 90 تا 92)

غیر مملوکہ چیز کی وصیت

سوال:152

کیا کسی ایسی چیز کی وصیت بھی کی جاسکتی ہے؟ جو وصیت کرنے والے کی ملکیت میں نہیں ہے، (سید ناصر علی قادری، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

کوئی بھی ایسی شے، جو وصیت کرنے والے کی ملکیت میں نہیں ہے، اُس کے بارے میں وصیت نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے کہ وصیت کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ

وصیت کرنے والا مُوصیٰ بہٖ (وصیت کی جانے والی چیز) کا مالک ہو اور کسی دوسرے کو مالک بنانے کا اہل بھی ہو، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

وشرطها كون الموصي أهلا للتمليك وَالمُوصٰى له أهلاً للتمليك، والموصىٰ به بعد الموصي مالا قابلا للتمليك

ترجمہ: ''(وصیت کی) شرط یہ ہے کہ موصی (وصیت کرنے والا دوسرے کو) مالک بنانے کا اہل ہو اور موصیٰ لہٗ (جس کے لئے وصیت کی جائے) وہ مالک بننے کا اہل ہو اور موصیٰ بہٖ (جس چیز کی وصیت کی جائے) وہ مُوصی کی موت کے بعد قابلِ تملیک مال ہو، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص: 90 تا 92، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

اولاد نہ ہونے کی صورت میں بیوی کے ترکے سے شوہر کو نصف حصہ ملے گا

سوال: 153

ہماری بہن رحمت بی کو گذشتہ سال مئی 2008ء میں ان کے ذاتی فلیٹ میں قتل کر دیا گیا۔ ایک ماہ بعد اُن کے شوہر عبدالروف کا ہارٹ اٹیک کے سبب انتقال ہو گیا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ہماری بہن رحمت بی کی کوئی اولاد نہیں ہے اور ہم دو بھائی اور ایک بہن ہی اُن کے حقیقی وارث ہیں۔ ترکے میں بہن کا ذاتی فلیٹ (جس میں وہ رہائش پذیر تھیں)، سونے کے زیورات اور گھریلو سامان ہے۔ اس کے علاوہ ایک عدد پلاٹ بھی تھا جو ان کے شوہر عبدالروف نے اُنہیں گفٹ کر دیا تھا اور اس وقت بھی وہ پلاٹ رحمت بی کے نام پر ہے اور اُس کے کاغذات بھی انہی کے پاس تھے۔ اس کی تقسیم کا کیا طریقہ ہے؟۔

نوٹ: عبدالروف صاحب ہمارے کارخانے میں ملازمت کرتے تھے اور وہ فلیٹ جس میں رحمت بی رہائش پذیر تھیں اور سونے کے زیورات، جو ان کے استعمال میں تھے، ہم نے بنوا کر اور مکان خرید کر دیا تھا اور ان سب چیزوں کی دیکھ بھال بھی ہم ہی کیا کرتے تھے۔

رحمت بی کے وارث 2 بھائی اور ایک بہن ہیں۔ عبدالروف صاحب کے ورثاء میں 2 بھائی اور 2 بہنیں ہیں۔ ترکے کی تقسیم کس طرح ہوگی؟، (عظیم احمد، کراچی)۔

جواب:

شریعت کی رو سے کسی بھی شخص کی وفات کے بعد جو ترکہ وہ چھوڑ جاتا ہے، اس میں تقسیم وراثت سے پہلے بالترتیب مندرجہ ذیل مصارف وضع کئے جاتے ہیں:
(1) مصارف تکفین وتدفین (2) اس کے ذمہ اگر کسی کا قرض باقی ہے تو اس کو ادا کرنا (3) اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو قرض کی ادائیگی کے بعد جو ترکہ بچ رہے گا، اس کی زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مقدار تک وصیت پر عمل درآمد ہوگا، بشرطیکہ یہ وصیت کسی وارث کے حق میں نہ ہو، یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو وضع کرنے کے بعد، بقیہ ترکہ ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہوتا ہے۔

صورتِ مسئولہ میں چونکہ مرحومہ رحمت بی کے انتقال کے وقت اُن کے شوہر موجود تھے اور مرحومہ کی کوئی اولاد نہیں تھی، لہٰذا کل ترکے کا نصف عبدالرؤف کو ملے گا اور ان کی وفات کے بعد ان کا ترکہ ان کے شرعی وارثوں کو ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ

ترجمہ: ''اور تمہارے لئے (شوہر کے لئے) تمہاری وفات یافتہ بیوی کے چھوڑے ہوئے مال کا نصف ہے، اگر ان کی کوئی اولاد نہ ہو، (النساء:12)''۔

چنانچہ رحمت بی مرحومہ کے ترکے، کے 10 حصے کئے جائیں گے، ان میں سے ان کے شوہر کو پانچ حصے، دو بھائیوں کو چار حصے (فی کس دو، دو حصے) اور ایک بہن کو ایک حصہ ملے گا۔

متوفی عبدالرؤف کو اپنی وفات یافتہ بیوی رحمت بی سے ملنے والا حصہ اور جو کچھ اُن کی ذاتی ملکیت کے طور پر موجود تھا، وہ اُن کا ترکہ کہلائے گا۔ ان کے ترکے کے کل 6 حصے کئے جائیں گے، 2 بھائیوں کو 4 حصے (فی کس دو، دو حصے) اور دو بہنوں کو 2 حصے (فی کس ایک ایک حصہ) ملیں گے۔ مرحومہ رحمت بی کا ذاتی فلیٹ، ان کے شوہر کا ھبہ کیا ہوا پلاٹ، اُن کے زیورات اور نقد رقم یا اور جو بھی مال وفات کے وقت وہ چھوڑ گئی ہیں، یہ سب ان کا ترکہ ہے اور اس کی تقسیم اس تناسب سے ہوگی جو پہلے درج کیا جاچکا ہے۔

عینی اور اخیافی بہن بھائی کے درمیان ترکے کی تقسیم

سوال: 154

ایک شخص کا انتقال ہوا۔ ورثاء میں ایک عینی (حقیقی) بہن، ایک اخیافی (ماں شریک) بھائی اور ایک اخیافی بہن موجود ہے۔ ترکے کی تقسیم کس طرح ہوگی؟،

(یاسر عالم، سیکٹر D-5 نیو کراچی)

جواب:

ترکے کی تقسیم سے پہلے کے امور نمٹانے کے بعد ترکہ حسب ذیل تقسیم ہوگا۔ سراجی میں ہے:

واما للاخوات لاب و اُمٍ فاحوال خمس النصف للواحدۃ

ترجمہ: "میت کی حقیقی بہنوں کی پانچ حالتیں ہیں، ایک بہن (کل ترکے کے) نصف کی حق دار ہے، (ص:21)"۔ اخیافی (ماں شریک) بھائی، بہن کے بارے میں لکھتے ہیں:

واَمّالِاَوْلادِ الاُمِّ، فاحوالٌ ثلاثٌ، السُّدسُ للواحد والثُّلثُ للاثنین فصاعداً، ذکورھم واناثھم فی القسمۃِ الاستحقاقِ سواءٌ

ترجمہ: "ماں کی اولاد (ماں شریک بہن بھائی) کے تین احوال ہیں، اگر ایک ہی ہے تو اسے چھٹا ملے گا، اگر دو یا اس سے زیادہ ہیں تو ان کو مجموعی طور پر ایک تہائی ملے گا۔ ترکے کی تقسیم اور استحقاق میں ماں شریک بہن، بھائی برابر ہیں، (سراجی، ص:13)"۔

صورتِ مسئولہ میں رَد ہوگا اور مسئلہ پانچ سے کیا جائے گا، سراجی باب الرد میں ہے:

او من خمسۃٍ اذاکان فیھا ثلثان او سُدُسٌ او نصفٌ و سُدُسانِ او نصفٌ وثلثٌ

ترجمہ: "اور جب مسئلہ میں ایک فریق کو دو ثلث (2/3) اور ایک کو ایک ثلث (1/3) یا ایک فریق کو نصف اور ایک کو چھٹا حصہ (1/6) یا ایک فریق کو نصف اور ایک کو ایک تہائی (1/3) مل رہا ہو تو مسئلہ پانچ سے ہوگا، (ص:57)"۔ یعنی ترکے کے کل پانچ حصے کیے جائیں گے اور ورثاء کے حصے حسب ذیل ہوں گے۔

زید 5/6

میت

عینی (حقیقی) بہن	اخیافی (ماں شریک) بھائی	اخیافی (ماں شریک) بہن
3	1	1

مالی معاملات میں ابہام نہیں ہونا چاہئے

سوال:155

میرا نام علیم احمد انصاری ہے، میرے فیملی ممبران میں میری زوجہ مشفق جہاں، ایک بیٹا محمود محسن اور ایک بیٹی ساشا انصاری ہیں۔ کافی عرصہ قبل مسماۃ ثمینہ شاہین کو میں طلاق دے چکا ہوں۔ میرے پاس جائیداد میں ایک کروڑ مالیت کی ایک رہائشی ملکیت ہے، جمع شدہ رقم تقریباً چالیس لاکھ روپے، ایک ذاتی استعمال کی گاڑی مالیت چھ لاکھ روپے، گھریلو استعمال کا متفرق سامان مالیت دولاکھ روپے موجود ہیں۔

مجھ پر کسی قسم کا قرض نہیں ہے، جو لوگ میرے مقروض ہیں ان سے قرضے کا تقاضا کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ جو کیش رقم میرے پاس ہے، اس سے میرے کفن دفن اور جو رقم باقی بچ جائے، اس سے کنواں کھدوایا جائے، باقی رقم خیرات کردی جائے۔ بیوی کے مہر کی رقم پچاس ہزار روپے علیحدہ موجود ہے، وہ ادا کردی جائے۔ میں نے اپنے بیٹے محمود محسن انصاری کو دس لاکھ روپے شیئرز کے لئے دیئے تھے، اگر ہو سکے تو وہ میرے نام پر حج کرلیں ورنہ اپنی شادی میں استعمال کرلیں۔ بیوی کے زیورات جو اُن کے استعمال میں ہیں، اُن کے ذاتی ہیں۔ برائے مہربانی ان تمام حالات کی روشنی میں تمام افراد کے حصوں کا تعین فرمائیں، مطلقہ کا حصہ ہے یا نہیں؟۔ (علیم احمد انصاری، گلشن معمار بلاک Z-1 کراچی)۔

جواب:

شریعت کی رو سے تین امور ترکے کی تقسیم پر مقدم ہیں، ان کی تفصیل ہم گذشتہ صفحات میں وراثت کے کئی مسائل کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں، بار بار ان کے اعادے کی

ضرورت نہیں ہے۔ان امور کے بعد ترکہ شرعی وارثوں میں اسلامی قانونِ وراثت کے مطابق تقسیم ہوتا ہے۔

کسی شخص کی زندگی میں اس کا مال بطور ترکہ یا وراثت تقسیم نہیں ہوتا، وہ اپنے مال کا مالک ومختار ہے، جیسا چاہے اپنے مال میں تصرف کرے۔اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے مال کا کچھ حصہ اپنے وارثوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے تو اسے ھبہ کہتے ہیں، اس پر احکامِ وراثت کا اطلاق نہیں ہوتا۔شریعت کی رو سے مستحسن امر یہ ہے کہ اولاد کو اگر ھبہ کرنا ہو تو بیٹوں اور بیٹیوں میں تفریق نہ کرے، بلکہ سب کو مساوی دے۔

آپ اپنے اور اپنی اہلیہ کے لئے جس قدر چاہیں رکھ سکتے ہیں۔مُورِث (وراثت چھوڑ کر وفات پانے والے شخص) کے انتقال کے بعد ترکہ ورثاء کے درمیان اسلامی قانونِ وراثت کے تحت حسبِ تناسب تقسیم کیا جاتا ہے۔اولاد کی موجودگی میں بیوی کو ترکے کا آٹھواں حصہ، اولاد نہ ہونے کی صورت چوتھائی حصہ ملتا ہے۔بیٹے اور بیٹی کو ''لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ'' (ایک لڑکے کے لئے حصہ دولڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء: 11) کے تحت حصے ملیں گے۔

آپ کی مطلقہ بیوی کو آپ کے ترکے میں سے حصہ نہیں ملے گا، ہاں اگر کسی شوہر نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہو، مطلقہ بیوی کی عدت کے دوران قضاءِ الٰہی سے شوہر کا انتقال ہو جائے تو وہ وراثت میں حصہ پائے گی۔آپ نے اپنے ایک بیٹے محمود محسن انصاری کو جو دس لاکھ روپے کے شیئرز لے کر دیئے ہیں، آپ کو اپنی نیت واضح کرنی چاہئے، اگر آپ نے یہ رقم اسے ہبہ کردی ہے تو وہ اس کا مالک ہے۔اس کی مرضی جس طرح چاہے تصرُّف کرے۔لیکن اولاد کو ہبہ کرنے میں مساوی برتاؤ نہ کرنا شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ امر ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اسے ظلم سے تعبیر فرمایا ہے۔ اگر آپ اسے وصیت سمجھتے ہیں تو وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے۔اگر آپ اِسے وصیت کر رہے ہیں کہ وہ اس رقم سے آپ کی طرف سے حجِ بدل کرے تو ان پر اس کی تعمیل لازم ہوگی، بشرطیکہ آپ خود حج

کرنے سے معذور ہوں اور وہ معذوری بھی ایسی ہو کہ جو عمر بھر قائم رہے، ورنہ خود آپ پر
حج کرنا فرض ہوگا۔ آج کل دس لاکھ روپے تک کے پُرتعیُّش حج کے پیکیج بھی موجود ہیں۔
اگر یہ دونوں صورتیں نہ ہوں تو پھر یہ رقم آپ کے ترکے میں شامل ہوگی اور آپ کی وفات
کے وقت جو شرعی وارث موجود ہوں گے، ان کے درمیان اسلامی احکامِ وراثت کے مطابق
تقسیم ہوگی۔ مالی معاملات کو واضح ہونا چاہئے، ابہام نہیں رہنا چاہئے ورنہ بعد میں ورثاء
میں یہ امور نفرت و کدورت اور قطعِ رحمی کا باعث بنتے ہیں۔

ترکے سے ضرورت کے وقت لی گئی رقم کی تقسیم

سوال:156

میرے ایک قریبی عزیز کی اہلیہ کا 1990ء میں انتقال ہوگیا، اُن کے چار بیٹے اور
دو بیٹیاں ہیں۔ مرحومہ کے ترکے میں کچھ زیور ہے، جس میں سے شدید ضرورت کے سبب
شوہر نے دو عدد چوڑیاں مبلغ/7,000 روپے میں بیچ کر رقم استعمال کر لی۔ اب وہ تقسیم کرنا
چاہتے ہیں تو کیا تقسیم میں /7,000 روپے شمار کریں گے یا سونے کے وزن کے حساب
سے موجودہ ریٹ کی تقسیم کی جائے گی؟، نیز تقسیم میں شوہر، چار بیٹوں اور دو بیٹیوں کا حصہ کتنا
ہوگا؟، (محمد شجاع الدین، بلاک 13/D، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

فوت شدہ خاتون کا ترکہ چالیس حصوں میں منقسم ہوگا، ان میں سے اس کے شوہر کو دس
حصے، چار بیٹوں کو چوبیس حصے (فی کس چھ حصے) اور دو بیٹیوں کو چھ حصے (فی کس تین حصے)
ملیں گے۔ شوہر نے اپنی فوت شدہ بیوی کا جو زیور تقسیمِ ترکہ سے پہلے بیچا ہے، وہ اس کے
حصے میں شمار ہوگا۔ اگر ان دو چوڑیوں کا وزن مجموعی ترکے کی چوتھائی کے برابر ہے تو باقی
زیور مرحومہ کی اولاد میں حسبِ حصہ تقسیم کر دیا جائے، اگر وزن کے اعتبار سے کمی و بیشی ہے تو
اسے ایڈجسٹ کر لیا جائے۔

بیوی کے پہلے شوہر سے اولاد دوسرے خاوند کی وارث نہیں بنتی

سوال:157

ہمارے خاندان میں ایک خاتون کی شادی 70 یا 80 کی دہائی میں انڈیا میں ہوئی، دو بچے ہوئے اور اُس کے بعد طلاق ہوگئی۔ بچوں میں لڑکا باپ نے رکھ لیا، لڑکی ماں کو دے دی۔ پھر اُس خاتون کی والدہ اُسے پاکستان لاکر اُس کی دوسری شادی کر کے واپس انڈیا چلی گئیں۔ کراچی میں وہ اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ خوش رہنے لگی، بچی کو بھی بہت پیار دیا اس دوران دوسرے شوہر سے ایک بچی ہوئی۔ پھر اچانک دوسرے شوہر کا ٹریفک حادثے میں انتقال ہوگیا۔ خاتون نے لوگوں کے کپڑے وغیرہ سی کر بڑی محنت سے دونوں بچیوں کی پرورش کی اور شوہر کا مکان وغیرہ اپنے نام ٹرانسفر کروالیا، وہ مکان بیچ کر دوسرا مکان اپنے نام سے خریدا۔ اس خاتون کا کہنا ہے کہ جو مکان میں نے اپنے نام کرایا وہ میری دوسری بیٹی کے حقیقی والد کا ہے، اس لئے میری پہلی بیٹی کا اس میں کوئی حصہ نہیں، آپ سے گذارش ہے کہ اس مسئلہ کا صحیح حل بیان فرمائیں، (محمد شجاع الدین، گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اگر آپ کا بیان درست ہے کہ وہ مکان اس کے مرحوم شوہر کا ترکہ ہے تو اُس کے شرعی وارث اُس کی بیوی اور حقیقی بیٹی ہی ہیں۔ اس خاتون کی پہلے شوہر سے بیٹی اس کے دوسرے شوہر کی وارث نہیں ہے۔ اس شخص کا ترکہ پانچ حصوں میں منقسم ہوگا، ان میں سے ایک حصہ بیوہ کو اور چار حصے اس کی حقیقی بیٹی کو ملیں گے، بشرطیکہ اس وفات یافتہ شخص کے ماں باپ اس سے پہلے وفات پاچکے ہوں۔ البتہ اگر اس خاتون کی وفات اپنی دونوں بیٹیوں سے پہلے ہوجائے تو دونوں اس کی وارث بنیں گی، کیونکہ یہ دونوں کی حقیقی ماں ہے۔

حقیقی بھائی کی موجودگی میں علاتی بھائی ساقط ہوجاتے ہیں

سوال:158

ایک عورت جانیں کا انتقال ہوگیا۔ ورثاء میں ایک حقیقی بھائی اور دو حقیقی بہنیں ہیں، جبکہ

ایک بھائی اور ایک بہن باپ شریک بھی موجود ہیں۔ آیا حقیقی بہن بھائیوں کی موجودگی میں سوتیلے حصہ پائیں گے؟، والدین کا پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ (محمد یوسف، مظفر آباد، آزاد کشمیر)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں اگر سائل کا بیان درست ہے، اور ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں تو تقسیمِ ترکہ سے پہلے کے ضروری امور نمٹانے کے بعد مرحومہ جانیں کا ترکہ 4 حصوں میں تقسیم ہوگا، ''لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ'' (ایک لڑکے کے لئے دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء: 11) کے تحت ایک بھائی کو 2 حصے، دو بہنوں کو 2 حصے (ہر ایک کو ایک حصہ) ملیں گے اور سوتیلے بھائی بہن محروم رہیں گے، سراجی میں ہے:

ویسقط بنو العلّات ایضاً بالاخ لاب و ام و بالاخت لاب و ام اذا صارت عصبة

ترجمہ: ''اور جب ترکے کی تقسیم کے وقت حقیقی بھائی موجود ہو، تو علاتی (باپ شریک) بھائی بہن ساقط ہو جاتے ہیں، اور (علاتی بھائی) حقیقی بہن سے بھی ساقط ہو جاتے ہیں، جب وہ عصبہ بنے، (سراجی، ص: 23)''۔

حلال وحرام کے مسائل

قرآنی آیات پر مشتمل تعویذ کا حکم

سوال:159

قرآنی آیت پر مشتمل تعویذات کا شرعی حکم کیا ہے، کیا انہیں پہن کر بیت الخلا میں جا سکتے ہیں؟، نیز چھوٹے سائز کا قرآن مجید اچھی طرح محفوظ کر کے تعویذ بنا کر بازو یا گلے میں باندھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اسی حالت میں یعنی جبکہ تعویذ بازو پر بندھا ہوا ہو، اپنی بیوی سے ہمبستری کر سکتے ہیں یا باتھ روم میں جا سکتے ہیں؟۔(محمد جاوید طارق، دستگیر، کراچی)

جواب:

تعویذات کو، خواہ وہ قرآنی آیات پر مشتمل ہوں، اگر احتیاط کے ساتھ موم جامہ یا غلاف وغیرہ میں محفوظ کر کے استعمال کیا جارہا ہے تو انہیں پہن کر بیت الخلا میں داخل ہونے میں حرج نہیں ہے، لیکن احتیاط افضل ہے۔اور قرآن مجید کا حجم (سائز) چھوٹا کرنا کہ اس میں تلاوت نہ کی جا سکے، مکروہ ہے، امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ ''بچوں کے گلے میں بچوں کے ماں باپ بچوں کی حفاظت کے لئے چھوٹی حمائل شریف ٹین کے تعویذ میں اور اوپر اُس کے کپڑا چڑھا کر ڈالتے ہیں، غرض بہت احتیاط سے یہ کام ہوتا ہے یا فقط ایک دو آیت۔ بچے پاخانے میں جاتے ہیں، طرح طرح کی بے ادبیاں ظہور میں آتی ہیں، یہ کام شرع میں جائز ہے یا نہیں؟۔

آپ نے اپنے جواب میں ''ابو داؤد، مصنف عبدالرزاق، در مختار، ردالمحتار، تبیین الحقائق'' سے دلائل بطور حوالہ درج فرمائے، ذیل میں اختصار کے ساتھ اس کا خلاصہ بیان کیا جاتا ہے: ''غلاف میں لپٹے ہوئے تعویذ کے ساتھ بیت الخلاء میں داخل ہونا مکروہ نہیں ہے البتہ (اس سے) بچنا افضل ہے، (درمختار)''۔

''ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد وہ چیز ہے جسے آج کل ''ہیکل'' یا ''حمائل'' کہتے ہیں اور وہ آیاتِ قرآنیہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ جب اس کا غلاف الگ ہو، جیسے موم جامہ وغیرہ تو اس کے ساتھ بھی بیت الخلا میں داخل ہونا جائز ہے، نیز جنبی آدمی کا اسے ہاتھ لگانا اور اٹھانا بھی

جائز ہے، (ردالمحتار)''۔ بے ادبی سے احتیاط کی جائے۔ اس موضوع کی تفصیل رسالہ ''الحراف الحسن فی الکتابۃ علی کفن'' میں ہے۔

تعویذ پر قرآن عظیم ومصحف کریم کا قیاس نہیں ہوسکتا:

اوّلاً: قرآن مجید اگرچہ دس غلافوں میں ہو، بیت الخلا میں لے جانا بلاشبہ مسلمانوں کی نگاہ میں قابلِ مذمت اور اُن کے عرف میں بے ادبی ٹھہرے گا اور ادب وتوہین کا مدار عرف پر ہے۔ ایسے تعویذ جو آیات پر مشتمل ہوں، وہ آیات ضرور قرآن عظیم ہیں، مگر وہ تعویذ ہی کہلائیں گی، انہیں قرآن مجید نہیں کہا جاتا، جیسے علم نحو کی کتاب، نحوی کتابوں کی مثالوں میں قرآن کی آیات درج ہوتی ہیں، اُس کے لیے ''علمِ نحو کی کتاب'' ہی کا حکم ہوگا، قرآن عظیم کا نہیں۔ قرآن مجید دارالحرب میں لیجانا منع ہے اور کتاب لے جانے سے کسی نے منع نہ کیا، مُصحف (قرآن مجید) کے پٹھے (گتے) کو بے وضو چھونا حرام ہے، لیکن اُس (تدریسی) کتاب کے ورق کو چھونا جائز ہے۔

ثانیاً: اُس کا ٹین میں رکھ کر بند کردینا یا موم جامے یا کپڑے ہی کے غلاف میں سی دینا یہ خود خلافِ شرع ہے کہ اُس کی تلاوت سے منع کرنے کا باعث ہے، آئمہ سلف تو مصحف شریف کے غلاف میں بند لگانے کو مکروہ جانتے تھے کہ بند باندھنا بظاہر منع کی صورت ہی ہوگا، تو یوں ٹین وغیرہ میں رکھ کر ہمیشہ کے لیے سی دینا کہ حقیقتاً منع ہے، کس درجہ مکروہ اور قبیح ہے؟ تبیین الحقائق میں فرمایا: کان المتقدمون یکرھون شد المصاحف واتخاذ الشد لھا لئلا یکون فی صورۃ المنع فاشبہ الغلق علی باب المسجد

ترجمہ: ''متقدمین (فقہاءِ کرام) قرآن پاک کو (کسی چیز میں) بند کردینے اور اسے بند کرنے کا ایسا کوئی بھی طریقہ اختیار کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے تاکہ (اس کی وجہ سے تلاوت سے) روکنے کی کوئی صورت پیدا نہ ہو، کیونکہ یہ اس امر کے مشابہ ہوگا جیسے مسجد کے دروازے کو (بالکل) بند کردیا جائے (کیونکہ پھر وہاں نماز نہیں پڑھی جاسکے گی)۔

ثالثاً: قرآن عظیم چھوٹی تقطیع پر لکھنا، حمائل (جسے بند کرکے گلے یا بازو میں لٹکایا جائے) بنانا

شرعاً مکروہ وناپسند ہے۔امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص کے پاس قرآن مجید باریک لکھا ہوا دیکھا،تو اسے مکروہ جانا اور اس شخص کو مارا اور فرمایا: اللہ کی کتاب کی تعظیم کرو(ابوعبید نے اسے فضائل قرآن میں روایت کیا)۔

امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ الکریم مصحف کا چھوٹا بنانا مکروہ جانتے تھے،(عبدالرزاق نے اسے اپنی مصنف میں روایت کیا اور ابوعبید نے فضائل میں اس کا مفہوم نقل کیا ہے)۔

اسی طرح ابراہیم نخعی نے اسے مکروہ فرمایا(ابن ابی داؤد نے اسے مصاحف میں بیان کیا)۔

درمختار مع ردالمحتار میں ہے: قرآن پاک کو چھوٹی تقطیع میں لانا(اس کا حجم چھوٹا کرنا) مکروہ ہے۔

تو اس قدر چھوٹا بنانا کہ معاذ اللہ ایک کھلونا اور تماشا ہو، کس طرح مقبول ہوسکتا ہے۔اور وہ جری لوگ یہ نامناسب فعل انہی تعویذوں کی خاطر کرتے ہیں، اگر مسلمان ان کو تعویذ نہ بنائیں، تو کیوں خریدیں اور نہ خریدیں تو وہ کیوں اسے چھاپیں۔تو ان کا تعویذ بنانا اُن کے اِس فعل کا باعث ہے اور اِس کے ترک میں اُس کا انسداد۔تو اس کا تعویذ بنانا ضرور اس بات کا حق دار ہے کہ اسے ترک کیا جائے، اس دلیل کی تفصیل جلیل ہمارے رسالہ''الکشف الشافیا فی حکم فونو جرافیا''میں ہے، واللہ اعلم بالصواب''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 4، ص: 608 تا 610، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

مذکورہ تمام دلائل کی روشنی میں خلاصہ یہ ہے کہ قرآنی آیات پر مشتمل تعویذات پہننا ہو تو اس کے ادب کا خیال رکھا جائے۔اور افضل یہ ہے کہ انہیں اتار کر طبعی حاجات پوری کریں، بیوی سے ہمبستری کے وقت بھی ادب کا تقاضا یہی ہے کہ اُس وقت یہ تعویذات اتار دیئے جائیں۔قرآن مجید کو اتنی باریک کتابت اور سائز میں طبع کرنا کہ پڑھا نہ جاسکے بلکہ محض تعویذ کے طور پر گلے میں باندھا جائے یا بطور حمائل گلے میں لٹکایا جائے، مکروہ ہے، کیونکہ قرآن کی کتابت وطباعت سے اصل مقصود اسے پڑھنا، سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ہے نہ کہ محض تعویذ کے طور پر استعمال کرنا۔

لاؤڈ اسپیکر کی آواز بلاضرورت بلند کرنا

سوال:160

سڑکوں گلیوں وغیرہ کو بند کر کے انتہائی تیز آواز میں رات گئے تک محافلِ نعت ومختلف اجتماعات وغیرہ کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ جبکہ علماء سے سنا ہے کہ اگر قرآن پاک کی تلاوت بھی اتنی آواز سے کی جائے کہ جس سے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہو تو منع ہے۔ تو کیا محافل واجتماعات کے مروجہ طریقے سے لوگوں کو تکلیف نہیں ہوتی اور اگر ہوتی ہے تو کیا مستحب عمل کے لئے شاہراہوں کو بند کر دینا، رات گئے تک انتہائی تیز آواز میں اسپیکرز کا استعمال کرنا جائز ہے؟۔ اسی طرح سڑک پر بیت اللہ شریف اور گنبدِ خضرا کے ماڈل سجائے جاتے ہیں، جس سے دکاندار، ٹریفک اور پیدل چلنے والے بھی متاثر ہوتے ہیں، تو کیا لوگوں کو تکلیف پہنچانا گناہ نہیں ہے اور کیا یہ بہتر نہیں کہ اجتماعات ومحافل مساجد ومدارس یا کسی ہال یا پارک وغیرہ میں منعقد کی جائیں؟۔ واضح اور آسان ترین الفاظ میں جواب ارشاد فرمائیں۔

حافظ محمد عامر، سیکٹر ل-5، نیو کراچی

سید سلیم شاہ عطاری، نارتھ ناظم آباد، بلاک B، کراچی

جواب:

اہلسنت وجماعت کے نزدیک محافلِ قراءت اور محافلِ حمد ونعت کا انعقاد مستحب ومستحسن امر ہے، بشرطیکہ ادب واحترام کو ملحوظ رکھا جائے۔ ان محافل کے لئے سڑکوں اور شاہراہوں کو بند کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ سڑکوں اور شاہراہوں پر سب لوگوں کا حق مساوی ہوتا ہے، جسے فقہ کی اصطلاح میں ''حقِ مرور'' (Right of Passage) کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام نے سڑک اور شارع عام پر نمازِ جنازہ کو، جو کہ فرضِ کفایہ ہے، مکروہ قرار دیا ہے، علامہ نظام الدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

تکرہ فی الشارع وأراضی الناس کذا فی المضمرات

ترجمہ: ''اور شارع عام پر اور لوگوں کی ملکیتی زمین پر (ان کی اجازت ومنظوری کے بغیر) نماز

جنازہ پڑھنا مکروہ ہے، "مضمرات" میں اسی طرح ہے"۔ (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 165)

اس کراہت کا سبب یہ ہے کہ نمازِ جنازہ کے وقت سڑک بند ہو جاتی ہے اور ٹریفک رُک جاتی ہے اور سب کا حق متاثر ہوتا ہے اور بعض اوقات نجاست بھی ہوتی ہے۔ جب فرضِ کفایہ کے لئے سڑک بند کرنے کی ممانعت ہے، حالانکہ اس کے لئے وقت بھی کم درکار ہوتا ہے تو مستحب اور مباح امور کے لئے بطریقِ اولیٰ ممانعت ہوگی۔ پارکوں اور کھلے میدانوں میں متعلقہ ادارے کی اجازت سے ایسی مجالس کے انعقاد میں کوئی حرج نہیں ہے۔ محافلِ میلاد، مجالسِ سیرت اور محافلِ نعت میں لاؤڈ اسپیکر کی آواز کو اتنی بلند رکھنا کہ قرب وجوار کے لوگوں کے لئے باعثِ تکلیف ہو، درست نہیں ہے۔ کیونکہ رات گئے تک ان مجالس کے جاری رہنے سے لوگوں کی نیند میں خلل واقع ہوتا ہے، کچھ لوگ بیمار ہوتے ہیں، کچھ لوگ اپنے مطالعے اور امتحانات کی تیاری میں مشغول ہوتے ہیں، ایسا کرنا ان کو "اذیت" دینے کے زمرے میں آتا ہے اور اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کے ارشاداتِ مبارکہ یہ ہیں:

(۱) لَاضَرَرَ وَلَاضِرَارَ۔

ترجمہ: "(مومن کو چاہئے) نہ خود نقصان اٹھائے اور نہ دوسرے کو نقصان پہنچائے"۔
(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 2340,2341)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

(۲) اِیَّاکُمْ وَالْجُلُوْسَ عَلَى الطُّرُقَاتِ، فقالوا مَالَنَا بُدٌّ، اِنَّمَا هِیَ مَجَالِسُنَا، نَتَحَدَّثُ فِیهَا، قَالَ فَاِذَا أَبَیْتُم اِلَّا الْمَجَالِسَ فَأَعْطُوا حَقَّهَا، قَالُوْا: وَمَا حَقُّ الطَّرِیْقِ؟ قَالَ: غَضُّ الْبَصَرِ، وَکَفُّ الاَذٰی وَرَدُّ السَّلَامِ، وَاَمْرٌ بِالمعروفِ وَنَهْیٌ عَنِ الْمُنْکَرِ۔

ترجمہ: "راستوں میں بیٹھنے سے بچا کرو، صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! اس کے بغیر تو ہمارے لئے چارۂ کار ہی نہیں ہے، یہ ہماری مجالس ہیں، جہاں ہم (بیٹھ کر) گفتگو کرتے ہیں، (آپ ﷺ نے) فرمایا: تو راستے کو اس کا حق دیا کرو، انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! راستے کا حق کیا ہے؟ آپ ﷺ فرمایا: (غیر محرم

خواتین سامنے آئیں تو) نظر نیچی رکھنا، کسی بھی ایسی چیز کو راستے سے ہٹا دینا جو آنے جانے والوں کے لیئے اذیت کا باعث ہو، کوئی سلام کرے تو اس کا جواب دینا، اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا، (صحیح بخاری، رقم: 6229،2465)"۔

حضرت ابو برزہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا:

(۳) یَانَبِیَّ اللهِ! عَلِّمْنِی شَیْئًا، اَنْتَفِعُ بِهٖ، قال اَعْزِلِ الاَذٰی عَن طریقِ المسلمینَ،

ترجمہ: "اے اللہ کے نبی ﷺ! مجھے ایسی چیز بتائیے جس سے میں نفع حاصل کروں، آپ ﷺ نے فرمایا: مسلمانوں کے راستے سے تکلیف دہ چیز دور کردو"۔ (صحیح مسلم، رقم: 6616)

(۴) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ اَوْبِضْعٌ وَّسِتُّوْنَ شُعْبَةً، فَاَفْضَلُهَا قولُ لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللهُ، وَاَدْنَاهَا اِمَاطَةُ الاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ، والحیاءُ شُعبةٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایمان کے ستر یا ساٹھ سے کچھ زیادہ شعبے ہیں، جن میں سے سب سے افضل کلمۂ طیبہ کا اعتقاد ہے، اور سب سے ادنیٰ شعبہ راستہ میں سے تکلیف دہ چیز کو دور کردینا ہے اور حیا بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 152)"۔

(۵) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ یُمِیْطُ الاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ صَدَقَةٌ

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (کوئی شخص) راستے سے (لوگوں کو) تکلیف پہنچانے والی چیز کو ہٹاتا ہے، (تو یہ بھی) صدقہ ہے، (صحیح بخاری: 2466)"۔

لہٰذا دینی مجالس میں لاؤڈ اسپیکر کی آواز صرف اُن لوگوں تک محدود رکھی جائے جو ارادتاً حصولِ ثواب کے لئے ان مبارک مجلسوں میں شرکت کے لئے آتے ہیں۔ ہمیں ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے، جس سے لوگوں کے ذہنوں میں بلاسبب دین اور اہلِ دین کے بارے میں بدگمانی اور نفرت پیدا ہو۔

بیت اللہ اور روضۂ رسول کی شبیہ بنا کر شاہراہوں اور چوراہوں پر نصب کرنا مباح ہے، نہ منع ہے اور نہ شریعت کا مطلوب ہے۔ لیکن شبیہ کا حکم اصل کا نہیں ہوتا، اگر کوئی اسے اصل کے مرتبے میں سمجھ کر اِسے نصب کرے یا وہاں حاضری کو عبادت سمجھتا ہو تو یہ بدعت ہے اور شریعت میں اپنی طرف سے زیادتی ہے۔

عرس کی تقریبات میں محرمات، مکروہات اور بدعات کا ارتکاب

سوال:161

بزرگانِ دین کے عرسِ مبارک کی تقریب منعقد کرنا اہلسنت و جماعت کا شِعار ہے۔ لیکن بعض مقامات پر بزرگانِ دین کے عرس مبارک کی تقریبات میں بہت سے خلافِ شرع امور، ممنوعات اور مکروہات کا ارتکاب ہوتا ہے۔ علماءِ اہلسنت عرس کی اِن تقریبات میں شریک ہوتے ہیں، تقاریر کرتے ہیں، لیکن مصلحت کے تحت کلمۂ حق بلند نہیں کرتے، مداہنت کرتے ہیں اور اس سے مسلک اہل سنت بدنام ہوتا ہے اور مخالفین، اہلسنت کو ''بدعتی یا قبر پرست'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ازراہِ کرم ان امور کے بارے میں شرعی احکام وضاحت سے بیان کریں تاکہ دعوتِ دین کا حق بھی ادا ہو اور موافقین ومخالفین سب پر حجت بھی قائم ہو، (حافظ سجاد حسین، احمد پور سیال، جھنگ)۔

جواب:

آپ کا یہ کہنا درست ہے کہ بدقسمتی سے بزرگانِ دین کے عرس کی تقریبات میں بعض مقامات پر خلافِ شرع امور کا ارتکاب ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مزارات کے سجادگان میں سے بعض احکامِ شریعت سے قطعی ناواقف ہیں اور شریعت کے معاملات میں خود بھی بے اعتدالی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مریدین ان کے غیر شرعی افعال کو بھی شریعت کا حصہ سمجھ کر اپنا لیتے ہیں۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض مزارات پر ان اَعراسِ مبارکہ میں اس طرح کے امور پائے جاتے ہیں، جیسے: (1) ڈھول تاشوں کا بجایا جانا (2) مردوں اور عورتوں کے مخلوط اجتماعات (3) خواتین کا بے حجاب غیر محرم مردوں کے درمیان چلتے ہوئے

مزارات پر جانا (4) قبروں کو بوسہ دینا اور سجدہ کرنا (5) لنگر کی تقسیم کے موقع پر بدنظمی اور رزق کی بے حرمتی (6) مردوں، نوجوانوں اور بے حجاب عورتوں کا حال یا وَجد کے نام پر رقص (7) سجادگان کا اپنی وضع قطع سے غیر متشرع ہونا (8) طریقت کے بعض سلسلوں میں عورت کا مرشد بننا اور مردوں کا اس کے ہاتھ چومنا (9) اسی طرح سے عورتوں کا مرد پیر کے ہاتھ چومنا (10) بعض عقیدت مند مردوں اور عورتوں کو پاؤں چومتے بھی دیکھا گیا ہے (11) محافلِ سماع یا محافلِ نعت میں پیسوں کا لٹایا جانا وغیرہ۔

شریعت کی رو سے ان ممنوع امور کو مخالفین دانستہ طور پر اہلسنت کی طرف منسوب کر کے مسلکِ حق اہلسنت و جماعت کو بدنام کرتے ہیں، حالانکہ مسلکِ اہلسنت و جماعت میں ان امور کی شدید ممانعت ہے، علماء و مشائخ پر لازم ہے کہ ان بدعات کے سدِ باب کے لئے ایک پرزور اصلاحی مہم چلائیں تاکہ متصوِفین (جعلی صوفیوں) کی نشاندہی ہو اور وہ تصوف و طریقت کی آڑ میں مسلک اور دین کو بدنام نہ کرسکیں اور جاہل عوام ان کے چنگل اور دامِ تزویر میں نہ پھنسیں۔ کسی بھی مکتبۂ فکر کے متعلق کوئی نظریہ قائم کرنے سے قبل اس مکتبۂ فکر کے مستند و مسلّمہ اکابر کی کتب اور فتاویٰ کا مطالعہ ضروری ہے۔ محض کسی عام شخص یا عوام الناس کی خود سے قائم کی ہوئی غیر شرعی رسوم کو ان کے مسلک کا حصہ قرار دینا، نہ صرف زیادتی ہے بلکہ اِتہام، صریح بہتان اور کذب ہے۔ حضرت سید علی ہجویری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تصنیف ''کشف المحجوب'' میں حقیقی صوفی، متصوِف (جو صوفیاء کی وضع اختیار کرے) اور مُستَصوِف (جعلی اور فریب کار صوفی) کے فرق کو واضح کیا ہے۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: ''بزرگانِ دین کے عرس میں شب کو آتشبازی جلانا اور روشنی بکثرت کرنا، بلا حاجت اور جو کھانا بغرضِ ایصالِ ثواب پکایا گیا ہو، اس کو لٹانا، کہ جو لوٹنے والوں کے پیروں میں کئی من خراب ہو کر مٹی میں مل گیا ہو، اس فعل کو بانیانِ عرس مُوجبِ فخر اور باعثِ برکت قیاس کرتے ہیں، شریعتِ عالی میں اس کا کیا حکم ہے؟۔ آپ نے جواب میں لکھا:

آتشبازی اِسراف ہے اور اِسراف حرام، کھانے کا ایسا لٹانا بے ادبی ہے اور بے ادبی محرومی ہے، تضیعِ مال (مال کا ضائع کرنا) ہے اور تضیع حرام۔ روشنی اگر مصالح شرعیہ سے خالی ہو تو وہ بھی اِسراف ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 24، ص:112، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

بازاری عورتوں کے مزارات پر رقص کے متعلق ایک سوال کے جواب میں امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: بازاری عورتوں کا رقص حرام ہے، (یہ ہم نے امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز کی عبارت کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے)، اس میں مردوں اور عورتوں کے مخلوط اور بے حجاب اجتماعات کی تمام صورتیں شامل ہیں، اولیائے کرام کے اَعراس میں بے قید جاہلوں نے یہ معصیت پھیلائی ہے"۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 29، ص:92، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا: اگر عورت نیک خصلت پابندِ شریعت واقفِ طریقت اپنے ہاتھ پر عورتوں اور مردوں کو بیعت کرنا شروع کردے تو از روئے طریقت اور شریعت یہ بیعت درست ہے یا نہیں؟ بحوالہ کتاب مع عبارت تحریر فرمائیں۔ آپ نے جواب میں لکھا:

اولیائے کرام کا اجماع ہے کہ داعی الی اللہ کا مرد ہونا ضرور ہے۔ لہٰذا سلفِ صالحین سے آج تک کوئی عورت پیر بن نہ بیعت کیا، حضور پر نور سید عالم ﷺ فرماتے ہیں:

لَن یَّفلِحَ قومٌ وَلَّوا اَمرَھم اِمراۃً ، رواہ الآئمۃ احمد والبخاری والترمذی والنسائی عن ابی بکرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ،

ترجمہ: "وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جنہوں نے کسی عورت کو والی بنایا، اس حدیث کو ائمہ کرام احمد و بخاری و ترمذی اور نسائی نے ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔

امام عارف باللہ سیدی عبدالوہاب شعرانی قدس سرہ میزان الشریعہ کتاب الاقضیہ میں فرماتے ہیں:

قَد اَجمَعَ اَھلُ الکشفِ علیٰ اِشتراطِ الذُّکورۃِ فِی کُلِّ داعٍ اِلَی اللہِ تعالیٰ ولم یَبلُغنا اَنَّ

احداً مِن نِساءِ السلفِ الصالحِ تَصدَّرَتْ لِتَربِيةِ المُريدينَ ابداً لِنَقصِ النساءِ فی الدَّرجةِ وإنْ وَرَدَ الكمالُ فِي بَعضِهِنَّ كَمريمَ بنتِ عمرانَ وآسيةَ امراةِ فرعونَ فَذلكَ كمالٌ بِالنِسبةِ للتَّقوىٰ والدِّينِ لابِالنسبةِ لِلحكمِ بينَ الناسِ وتسليكِهِم فی مقاماتِ الولايةِ وغايةُ امرِالمراةِ اَن تكونَ عابدةً زاهدةً كرابعةَ العدويةِ

ترجمہ: ''اہل کشف کا اجماع ہے کہ دین کے داعی کے لئے مرد ہونا شرط ہے اور ہم تک سلفِ صالحین سے ایک روایت بھی ایسی نہیں پہنچی کہ مریدین کی تربیت کا کام کسی خاتون نے انجام دیا ہو، کیونکہ خواتین میں (بعض طبعی عوارض) کی وجہ سے نقص ہوتا ہے۔ اگرچہ ان میں سے بعض میں دینی لحاظ سے کمال تھا، جیسے مریم بنت عمران، آسیہ زوجۂ فرعون۔ لیکن یہ کمال ان کے تقوے اور دین داری کے باعث تھا، اس لئے نہیں کہ وہ لوگوں پر حکومت کریں یا مقاماتِ ولایت میں ان کی تربیت کریں، زیادہ سے زیادہ یہی ہے ہوسکتا ہے کہ عورت عابدہ وزاہدہ ہوسکتی ہے، جیسے رابعہ عَدَوِیہ بصریہ، (فتاویٰ رضویہ، جلد 21، ص:494)

قرآن مجید نے ازواجِ رسول اللہ ﷺ کو امہات المومنین (مومنوں کی مائیں) قرار دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ اور اُس (نبی) کی بیویاں ان (مومنوں) کی مائیں ہیں، (الاحزاب:6)۔ اس کے باوجود یہ تاکیدی حکم ارشاد فرمایا:

(۱) وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ

ترجمہ: ''جب تم اُن (اُمہات المومنین) سے کوئی بات پوچھو، تو پردے کے باہر سے پوچھو، (الاحزاب:53)''۔

(۲) یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا

ترجمہ: ''اور اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم تقوے پر کار بند رہو، سو تم اپنے (غیر محرم لوگوں کے ساتھ) پرکشش لہجے میں بات نہ کرو کہ جس کے دل میں (فسق کی) بیماری ہے، (خدانخواستہ) وہ امید قائم کر بیٹھے، اور (ان کے ساتھ) دستور کے موافق

بات کرو، (الاحزاب:32)"۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے متعدد احادیث مروی ہیں، ان کے توسط سے شعبۂ نسواں کے دینی احکام بھی امت کو ملے، لیکن تعلیم و تعلم کا یہ سلسلہ حدودِ شریعت کے اندر رہا۔ مزارات کو بوسہ دینے کے متعلق فقہاءِ امت کی مختلف آراء ہیں، لیکن امام احمد رضا قادری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ عوام کے لئے احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ انہیں قبر کو بوسہ دینے سے منع کیا جائے، کیونکہ بعض جہلاء بوسے سے تجاوز کر کے سجدۂ تعظیمی تک جا پہنچتے ہیں۔ اور شریعت کے مقاصد میں سے ایک "سدِّ ذرائع" بھی ہے، یعنی ایسے اسباب و ذرائع کو روکنا جو آخرِ کار محرمات اور مکروہات تک جا پہنچیں۔

ایامِ عرس میں مزارات کو غسل دینے کے لئے دن مخصوص کرنے کا شرعی حکم

سوال:162

بزرگانِ دین کے مزارات پر عرس کی تقریبات منعقد کی جاتی ہیں اور ان تقاریب کے آغاز یا اختتام کے روز مزار کو غسل دیا جاتا ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ عرس کے آخری دن غسل دینے میں کوئی حرج تو نہیں؟ یا اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے؟ (حاجی عبدالرؤف، کراچی)

جواب:

اعراسِ مبارکہ کی تقریبات تبلیغی اجتماعات، میلاد النبی ﷺ کے اجتماعات، ختمِ قرآن، افتتاحِ درسِ حدیث اور ختمِ بخاری کے اجتماعات، خیر کے ان تمام کاموں کے لئے دن، مقام اور وقت کا تعین سہولت کی غرض سے ہوتا ہے۔ یہ تعیینِ عرفی ہے، تعیینِ شرعی نہیں ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آج کل گھڑیوں کے حساب سے نماز کے اوقات مقرر کئے جاتے ہیں۔ تعیینِ شرعی سے مراد یہ ہے کہ کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ اس خاص وقت، مقام، دن اور تاریخ کو یہ کام کرنا باعثِ اجر و ثواب ہے اور اس سے پہلے یا بعد یا دوسرے وقت اور مقام پر ایسا کرنا باعثِ اجر نہیں ہے۔ یہ تعیینِ شرعی ہے اور ایسی تعیین صرف شارع کا اختیار ہے، جیسے وقوفِ عرفہ کے لئے 9 ذوالحجہ، ایامِ نحر، ایامِ عید یا فرض روزوں کیلئے رمضانِ مبارک

وغیرہ۔ مزارات کو غسل دینے کے لئے دن یا وقت کا تعین بھی عرفی ہے، لوگوں کی اپنی سہولت اور صوابدید پر منحصر ہے، للہٰذا عرس کی تقریبات کے آغاز پر یا آخری دن غسل دینا، دونوں ہی درست ہیں اور اِس میں کوئی شرعی قباحت اور حرج نہیں ہے۔ ویسے مزارات کو غسل دینا کوئی شرعی ضرورت نہیں ہے، تاہم اس کی حکمت یہ ہوسکتی ہے کہ کثیر تعداد میں لوگ بزرگانِ دین کے مزارات پر ایصالِ ثواب اور اظہارِ عقیدت کے لئے آتے ہیں، للہٰذا مزار اور اس سے ملحق جگہ کا صاف ستھرا ہونا اچھی بات ہے اور اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ اور اس کی اصل غسلِ کعبہ ہے، مزار کو عرس کے آغاز پر غسل دیا جائے یا اختتام پر دونوں کی حیثیت یکساں ہے۔

خواتین کا علماء سے مسائل دریافت کرنا

سوال:163

دارالافتاء میں خواتین اپنے مسائل کے حل کے لئے آتی ہیں، اُن میں اکثر برقع میں نہیں ہوتیں اور مفتیانِ کرام اُن سے براہِ راست بات کرتے ہیں، جبکہ یہ خواتین دوپٹہ اوڑھے ہوئے ہوتی ہیں اور ان کا چہرہ کھلا ہوتا ہے۔ مفتی صاحبان ان سے دارالافتاء میں بالمشافہ گفتگو کرتے ہیں، اگرچہ دارالافتاء میں اور بھی افراد ہوتے ہیں، اُن کی موجودگی میں ان کے سامنے ہی گفت وشنید ہوتی ہے۔ بعض حضرات تعلیمی ادارے بھی چلاتے ہیں اور طلباء کی مائیں بہنیں وغیرہ داخلے کے لئے ان اداروں میں آتی ہیں اور ادارے کی خواتین اساتذہ کے ساتھ مہتمم حضرات سے داخلے اور تعلیمی سرگرمیوں کے حوالے سے بات چیت کرتی ہیں۔ میرے دوست کا کہنا ہے کہ اکثر مفتیانِ کرام اور مہتمم حضرات نماز بھی پڑھاتے ہیں، یہ خواتین سے بالمشافہ بات کرتے ہیں، جن میں اکثر خواتین کے چہرے کھلے ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ شریعت کے خلاف ہے، للہٰذا اُن کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ اور ان کی اقتدا میں جو نماز پڑھی جائے گی، اُس کا اعادہ کرنا ضروری ہے۔ آپ سے گذارش ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب سے آگاہ فرمائیں، (محمد عارف، کراچی)

جواب:

آئیڈیل اور معیاری صورت تو یہ ہے کہ خواتین گھروں سے نہ نکلیں، اگر کسی شدید ضرورت یا حاجت کی بنا پر انہیں گھر سے نکلنا پڑے تو باپردہ اور شرعی حجاب کے ساتھ نکلیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم دینی واخلاقی معیارات کے اعتبار سے ایک تنزّل کے دور سے گزر رہے ہیں۔ بعض صورتوں میں مرد دن بھر روزگار اور کاروبار کے لئے گھروں سے باہر رہتے ہیں، خواتین کو سودا سلف خریدنے، چھوٹے بچوں کو اسکول پہنچانے اور واپس لانے یا ڈاکٹر کو دکھانے کے لئے گھر سے باہر جانا پڑتا ہے اور بدقسمتی سے بعض خواتین حجابِ شرعی کا اہتمام بھی نہیں کرتیں۔ اسی طرح بعض خواتین دینی مسائل معلوم کرنے، فتویٰ لینے یا اپنے چھوٹے بچوں کو دینی مدارس میں چھوڑنے اور لینے کے لئے آتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس بھی بعض اوقات خواتین صحابیات شرعی مسائل معلوم کرنے کے لئے آتی تھیں حتیٰ کہ بیعت کرنے بھی آتی تھیں، جس کا ذکر قرآن میں موجود ہے:

يَآ أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى أَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ أَيْدِيْهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

ترجمہ: ''اے نبی مکرم ﷺ! جب آپ کے پاس ایمان والی عورتیں حاضر ہوں اور اس شرط پر آپ سے بیعت کریں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گی اور چوری نہیں کریں گی اور نہ بدکاری کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ اپنے ہاتھوں اور پیروں کے درمیان کوئی بہتان گھڑ کر لائیں گی اور نہ دستور کے مطابق کسی کام میں آپ کی نافرمانی کریں گی، تو آپ ان کو بیعت کرلیا کریں اور ان کے لئے اللہ سے مغفرت طلب کریں، یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، بے حد رحم فرمانے والا ہے، (سورۃ الممتحنہ: 12)''۔

اسی طرح صحابۂ کرام بھی امہات المومنین سے دینی مسائل معلوم کرنے کیلئے آتے تھے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۳۲﴾ (الاحزاب :32)

ترجمہ: ''اے نبی کی (پاک) بیویو! تم عام عورتوں میں سے کسی ایک کی بھی مثل نہیں ہو، اگر تم اللہ سے ڈرتی رہو، سو (پسِ پردہ) کسی مرد سے بات کرتے ہوئے ایسا لچک دار لہجہ اختیار نہ کرو کہ جس کے دل میں بیماری ہے وہ طمع کرنے لگے اور دستور کے مطابق بات کیا کرو''۔

لہٰذا علماء کے لئے یہ تو مناسب اور لازم ہے کہ دینی مسائل اور ضروریات کے لئے آنے والی خواتین کو حجاب اور پردے کی تلقین کریں اور ان سے ضروری گفتگو کرتے وقت نگاہیں نیچی رکھیں، اس کی بابت اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ یَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا یَصْنَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ یَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَ لَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ لْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُیُوْبِهِنَّ (النور:30،31)

ترجمہ: ''(اے رسول!) مومن مردوں سے کہہ دو کہ وہ (غیر محرم عورتوں سے بات کرتے وقت) اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے (حسنِ کردار) کے لئے بہت پاکیزہ (طریقہ) ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ کو اُن کے سب کاموں کی خوب خبر ہے۔ اور ایمان والی عورتوں سے بھی کہیں کہ وہ (بھی) اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور اپنی عفت کی حفاظت کریں اور اپنی زیبائش کو ظاہر نہ کریں، سوائے اُس کے جو ناگزیر ہے، اور اپنے سر پر اوڑھے ہوئے دوپٹے کے آنچل اپنے گریبانوں پر بھی ڈالے رکھیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ ؗ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (الحجرات:12)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو، یقیناً بعض گمان گناہ کا سبب بنتے ہیں''۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: اِیَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِیْثِ

ترجمہ: ''بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے''۔ (صحیح بخاری:5143)

لہٰذا ہمیں کسی عالم، دین دار شخص حتیٰ کہ ہر مسلمان کے بارے میں حسنِ ظن سے کام لینا چاہئے اور کسی کی نیت اور باطنی محرکات کا فیصلہ نہیں کرنا چاہئے تاوقتیکہ کسی کی بدعملی اور بدکرداری کے واضح قرائن وشواہد اور ثبوت سامنے نہ آئیں۔ علماء اور اہلِ دین سے عوام کی یہ توقع بجا ہے کہ وہ مثالی کردار کے حامل ہوں، لیکن وہ بھی اسی معاشرے کی پیداوار ہیں اور اسی معاشرے میں رہ کر انہیں دین کا کام کرنا ہے۔ ان کے لئے بہتر یہ ہے کہ ہر صورت حال میں حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا کام کرتے رہیں۔ جو عالم نگاہیں نیچی رکھے ہوئے خواتین کو مسئلہ بتائے، ضروری بات کرے، حظِّ نفس اور لذّتِ نظر میں مبتلا نہ ہو، اس کے پیچھے نماز پڑھتے رہیں اور بلاوجہ نہ خود بدگمانی میں مبتلا ہوں اور نہ دوسرے لوگوں کو بدگمانیوں میں مبتلا کریں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ

ترجمہ: ''کیا آپ نے انہیں نہ دیکھا جو خود اپنی پاکیزگی کے دعویدار ہیں بلکہ اللہ جسے چاہے (باطنی) پاکیزگی عطا فرماتا ہے، (النساء:49)''۔

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (النجم:32)

ترجمہ: ''اپنی پارسائی کے دعوے نہ کرو، اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ پرہیزگار کون ہے؟''۔

البتہ اہلِ علم پر بھی یہ لازم ہے کہ وہ خلوت میں کسی غیر محرم خاتون سے ملاقات نہ کریں، مجلس میں دینی ضرورت سے متعلق مسائل کے علاوہ دوستانہ اور بے تکلف گپ شپ نہ کریں۔ دینی علم اور علماء کے احترام کے لئے شرعی حدود وقیود کی احتیاط از حد لازم ہے۔ علماء کو چاہئے کہ ایسی عورتوں کو پردے کی تلقین کیا کریں جو کم از کم شرعی حجاب کا بھی اہتمام نہیں کرتیں۔

مکان کے دروازوں اور پیشانی پر قرآنی آیات لکھنا

سوال:164

مکان کی پیشانی پر قرآن کی آیات لکھنا کیسا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں

وضاحت فرمایئے، (محمد احسان، لیاقت آباد، کراچی)۔

جواب:

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا مقدس کلام ہے اور اس سے اصل مقصود اس کے احکام کو سمجھ کر ان پر عمل کرنا ہے، اس کی تلاوت بھی بہت بڑی سعادت ہے اور حصولِ ثواب کا ذریعہ ہے۔ قرآن کا احترام واجب ہے۔ قرآن باعث برکت اور اعتقادی اور عملی اصلاح کا ذریعہ ہے۔ یہ تمام ظاہری و باطنی عوارض کے لیے شفا ہے۔ حصول برکت کے لیے آیات مبارکہ کو دیوار پر لکھنا جائز ہے' بشرطیکہ پاک رنگ' چونے یا مواد کے ساتھ لکھی جائیں، جو بارش وغیرہ سے اکھڑ کر بہہ نہ جائے یا تانبے، لوہے یا پلاسٹک کی شیٹ پر لکھ کر اسکرو سے دیوار پر نائٹ کر دیا جائے۔ اگر کسی رنگ سے دیوار پر لکھی گئی ہوں اور دوبارہ اس جگہ پر رنگ کرنے کے لئے کھرچنا پڑے تو ان ذرّات کو کسی پاک جگہ دفن کر دیا جائے۔ وہ جگہ بلندی پر اور قابل احترام ہو اس پر کوئی ناپاک چیز لگنے کا خدشہ نہ ہو۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ولو کتب القرآن علی الحیطان والجدران بعضھم قالوا یرجی أن یجوز وبعضھم کرھوا ذلك مخافة السقوط تحت أقدام الناس کذا فی فتاویٰ قاضی خان،

ترجمہ: ''اگر قرآن مجید کی آیات دیواروں پر لکھی جائیں تو بعض فقہاء نے اس کے جواز کا قول کیا ہے اور بعض فقہاء نے اس اندیشے کے پیشِ نظر مکروہ قرار دیا ہے کہ اس کے ذرّات (یعنی چونے یا رنگ کے ذرّات) لوگوں کے پاؤں میں گریں گے (اور بے ادبی ہوگی)، فتاویٰ قاضی خان میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد: 5، ص: 323)''۔

پس اگر اس امر کا اہتمام کر لیا جائے کہ اس کے ذرّات نیچے نہ گریں تو کراہت اٹھ جائے گی، نیز اگر کبھی دوبارہ رنگ کرنا ہو تو اسے کھرچ کر کسی محفوظ جگہ دفن کر دیا جائے اور جہاں آیتیں لکھی ہوں، وہاں بے وضو ہاتھ نہ لگائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَّا يَمَسُّهُۥٓ إِلَّا ٱلْمُطَهَّرُونَ ﴿٧٩﴾ ترجمہ: ''اسے نہ چھوا کریں' مگر

پاک لوگ!''(الواقعہ: آیت :79)''۔بعض مکانوں کا رخ گندی گلی کی طرف ہوتا ہے لہٰذا اس طرف آیات کا لکھنا بھی خلافِ ادب ہوگا کہ وہ مقام محترم نہیں سمجھا جاتا۔اسی طرح مساجد کے استنجا خانوں کی طرف بھی نہ لکھی جائیں۔اگر وضو خانہ استنجا خانے سے الگ ہو تو اس کی دیواروں پر مسنون دعائیں لکھی جاسکتی ہیں' تاکہ لوگ متوجہ ہوں اور پڑھ کر اجر پائیں۔یاد رہے کہ حصولِ برکت کے لیے آیات کا لکھنا اگرچہ جائز ہے،لیکن شریعت کا اصل مقصود ومطلوب قرآن مجید کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کرنا ہے اور اس کے احکام پر عمل کی سعادت حاصل کرنا ہے۔مسلمانوں کو چاہیے کہ اسی کو اپنا شِعار بنائیں۔

درآمد کردہ کھاد کے استعمال کا جواز

سوال:165

ہم کاروباری لوگ ہیں اور تجارت کے لئے یورپ سے کھاد درآمد کرتے ہیں، یہ کھاد 100 فیصد مرغیوں کے گوبر سے تیار کی جاتی ہے اور خالصتاً زمین کی زرخیزی کے لئے استعمال ہوتی ہے۔یہ ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔پورٹ سے کلیرنس کے وقت کسٹم حکام نے لیبارٹری تجزیے کے دوران تحقیق کی ،تو معلوم ہوا کہ اس کھاد میں سور کے فضلہ اور گوشت کے ذرات بھی پائے گئے ہیں۔کسٹم حکام نے اِسے اسلامی تعلیمات کے خلاف گردانتے ہوئے مالِ ممنوعہ سمجھ کر ضبط کرلیا ہے۔گورنمنٹ کی امپورٹ پالیسی میں اِس کی ممانعت صرف اس صورت میں ہے، جب ایسی امپورٹ اسلامی اصولوں کے خلاف ہو،لیکن قانون میں یہ واضح نہیں کیا گیا کہ کن صورتوں میں اس کی ممانعت ہوگی اور اس کو منسوخ قرار دینے کا کون مجاز ہوگا اور اِس کا طریقۂ کار کیا ہوگا؟

ہماری رہنمائی فرمائیں کہ کیا ایسی کھاد(جو براہِ راست انسانی استعمال میں نہیں آتی اور) جس میں سور کے فضلے یا گوشت کے ذرات پائے گئے ہوں، کیا اس کی درآمد اور فروخت اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائز ہوگی؟،(سید صادق محمود، بلاک 14 ،گلشن اقبال،کراچی)۔

جواب:

مرغیوں کے گوبر سے تیار کردہ ایسی کھاد، جس کے اجزائے ترکیبی میں سور کا فضلہ یا گوشت کے اجزا شامل ہوں، کا استعمال زمین کی زرخیزی کے لئے جائز ہے۔ زمین کی زرخیزی کے لئے عموماً نجس اشیاء ہی استعمال کی جاتی ہیں، مثلاً گوبر وغیرہ۔ اگر کھاد کی تیاری میں مرغیوں کے گوبر کے ساتھ سور کا فضلہ اور گوشت کے ذرات شامل بھی ہوں تو ایک نیا مرکّب یا پروڈکٹ بننے کے بعد اس کی حقیقت بدل جاتی ہے۔ ایسی کھاد کے استعمال یا درآمد میں بھی کوئی قباحت نہیں۔ ماہیت کے تبدیل ہونے (Substance) کا مطلب یہ ہے کہ وہ شے اپنی سابق ماہیت (Essential Nature) کو چھوڑ کر کسی دوسری ماہیت میں بدل جائے۔ ماہیت کے بدلنے سے اُس کا حکم بھی بدل جائے گا، جیسے شراب جب سرکہ بن جائے یا خون مُشک بن جائے یا نطفہ لوتھڑا بن جائے، تو اِن صورتوں میں جب کہ شراب نے اپنی حقیقتِ خمریہ، خون اپنی حقیقتِ دَمَویہ اور نطفہ اپنی حقیقتِ مَنَویہ چھوڑ کر دوسری حقیقت و ماہیت میں بدل گئے ہوں، تو اِن کا حکم بھی بدل جائے گا۔

علامہ علاؤالدین حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

(و) لا (مِلحٌ کانَ حمارًا) او خنزیراً ولا قذرٌ فی بئرٍ فصارَ حمأۃً لانقلابِ العینِ، بہ یفتی۔

ترجمہ: ''اور وہ نمک ناپاک نہیں ہے، جو (اپنے اصل وجود کے اعتبار سے) گدھا تھا یا خنزیر تھا، (پھر وہ نمک کی کان میں گر کے تحلیل (Dissolve) ہو کر نمک بن گئے اور ان کی سابق ماہیت باقی نہ رہی) اور کنویں میں گری ہوئی وہ گندگی بھی ناپاک نہیں ہے، جو (تحلیل ہو کر) کالی مٹی کی شکل میں کیچڑ بن گئی، کیونکہ اب اس کی سابق حقیقت بدل گئی ہے، اسی پر فتویٰ ہے۔۔۔۔۔۔ اس کے تحت علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

(لانقلابِ العینِ) عِلّۃٌ لِلکُلِّ وھذا قولُ محمدٍ، وذکرَ معہ فی ''الذخیرۃ'' و ''المحیط'' اباحنیفۃ ''حلیۃ'' قال فی ''الفتح'' وکثیر من المشائخ اختارُوہ، وھو المختارُ، لانَّ الشرعَ رتَّبَ وصفَ النجاسۃِ علی تلک الحقیقۃِ وتَنتَفِی الحقیقۃُ

بِانتفاءِ بعضِ اجزاءِ مفهومهَا، فكيف بالكُلِّ؟۔۔۔۔۔۔۔۔ ونظيرهٗ في الشرعِ النُّطفةُ نجسةٌ وتَصيرُ علقةً وهي نجسةٌ وتَصيرُ مُضغةً فتطّهرُ، والعصيرُ طاهرٌ، فيصيرُ خمراً، فينجس ويصيرخِلاً فيطهرُ۔

ترجمہ: ''یہ بات کہ ماہیت کے بدل جانے سے حکم بدل جاتا ہے، یہ علت (Cause) سب چیزوں کیلئے ہے، اور یہ امام محمد کا قول ہے اور اس کے ساتھ ''حلیہ'' میں ''ذخیرہ'' اور ''محیط'' کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ یہ امام ابوحنیفہ کا بھی قول ہے۔ علامہ ابن ھمام نے ''فتح القدیر'' میں لکھا ہے کہ اکثر مشائخ نے اسی کو اختیار کیا ہے اور یہی قول مختار ہے، کیونکہ شریعت نے اسی حقیقت پر وصفِ نجاست کو مرتب کیا ہے اور اپنے مفہوم کے بعض اجزاء کی نفی سے حقیقت کی بھی نفی ہوجاتی ہے، تو جب کسی چیز کے تمام اجزاء (اپنی سابق ہیئت کے ساتھ) معدوم ہوجائیں، (تو اس کی حقیقت معدوم کیوں نہیں ہوگی)؟۔۔۔آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں: اور شرع میں اس کی نظیر یہ ہے کہ نطفہ (منی) نجس ہے اور وہ (ماں کے رحم میں) جب عَلَقہ (منجمد خون Bloodsucker) کی شکل اختیار کرتا ہے، تب بھی وہ نجس ہوتا ہے۔ اور پھر جب وہ مُضغہ (گوشت کا لوتھڑا Embryo) بن جاتا ہے تو پاک ہوجاتا ہے۔ اور پھل وغیرہ سے کشید کیا ہوا رس پاک ہوتا ہے، پھر جب پھلوں کا رس سڑ جانے سے خمر (شراب) بن جاتا ہے تو نجس ہوجاتا ہے (کیونکہ اب اس کی حقیقت بدل گئی ہے)، پھر یہی شراب جو حرام اور نجس ہے جب (نمک اور لیموں ڈالنے سے) سِرکہ بن جاتا ہے تو (اپنی حقیقت کے بدل جانے سے) پاک ہوجاتا ہے''۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:1 ص:463)

لہٰذا ان فقہی دلائل کی روشنی میں اُس کھاد کی درآمد اور زمین کی زرخیزی کے لئے اُس کا استعمال جائز ہے۔

کسی کو کافر کہنے کا حکم

سوال:166

ایک لڑکی کو اغوا کیا گیا، جس پر اس کی برادری والوں نے مشترکہ طور پر پوری برادری

سے حلف لیا کہ اغوا کرنے والے لڑکے کی برادری کا مکمل سماجی بائیکاٹ کیا جائے گا۔اس دوران لڑکی کی برادری میں ایک شخص کے بیٹے کی شادی ہوئی۔انہوں نے اپنی برادری میں جس شخص کی لڑکی اغوا ہوئی تھی ، پرانی ناراضگی کی بنا پر شادی میں دعوت نہیں دی، اس پر برادری دو گروپوں میں تقسیم ہوگئی۔اسی طرح لڑکی کی برادری کے ایک شخص نے لڑکے کی برادری کے ایک فرد سے مکان کی تعمیر کے لئے لکڑی چرائی ،جبکہ اس کی بیٹی کی وفات پر جنازے میں شرکت نہیں کی۔اب یہ دونوں گروپ ایک دوسرے کو محافل اور مساجد میں لفظ کافر اور منافق کہتے ہیں۔کیا کسی مسلمان کے جنازے میں اجتماعی صورت میں شرکت نہ کرنا اور دوسروں کو روکنا درست ہے؟ سوشل بائیکاٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟۔کیا ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو کافر ،منافق کہہ سکتا ہے؟، (محمد سرور، راولاکوٹ، آزاد کشمیر)۔

جواب:

مذکورہ صورت میں جس شخص نے اُس لڑکی کو اغوا کیا تھا، اُس شخص اور اُس کی برادری کے اُن افراد کا معاشرتی مقاطعہ (Sociol Boycott) کیا جانا چاہئے جو لوگ اس غیر شرعی فعل میں اس کے مدد گار ہوں یا اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوں، ان کا بائیکاٹ بھی درست ہے۔البتہ اس کی برادری کے ان لوگوں کا بائیکاٹ صحیح نہیں ہے، جو ایسے حرام فعل اور اس کا ارتکاب کرنے والوں سے نفرت کرتے ہیں۔شریعت کا تقاضا بھی یہی ہے۔

''رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا:

''یَارَسُولَ اللّٰہِ مَاالْعَصَبِیَّۃُ؟،قَالَ اَنْ تُعِیْنَ قَوْمَکَ عَلَی الظُّلْمِ''۔

ترجمہ:''یارسول اللہ ﷺ !عصبیت کیا ہے؟،آپ ﷺ نے فرمایا:عصبیت یہ ہے کہ تو ظلم میں اپنی قوم کا مدد گار رہے ،(سُنن ابوداؤد، رقم الحدیث:5078)''۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق برادری کے لوگ خیر کے کاموں میں آپس میں تعاون کریں اور برائی کے کامون میں تعاون نہ کریں ،نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں۔لیکن پوری برادری یا اس کے کچھ لوگوں کا اپنے کسی رکن کے گناہ کے کاموں

میں مدد کرنا اور اس کی حمایت کرنا حرام ہے، کیونکہ یہ معصیت ہے اور معصیت کے کاموں میں مخلوق کی اطاعت لازم نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الله، ترجمہ: "کسی ایسے امر میں مخلوق کی اطاعت لازم نہیں ہے، جس پر عمل پیرا ہونے سے اللہ تعالیٰ کی معصیت لازم آئے"۔

(مسند امام احمد بن حنبل: 1095)

کسی بھی مسلمان کو دوسرے مسلمان کی نمازِ جنازہ سے روکنا جائز نہیں ہے، بلکہ یہ حرام فعل ہے اور ایسے لوگ فعلِ حرام کے ارتکاب کے سبب فاسق قرار پائیں گے، جہاں تک سماجی مقاطعہ (Social Boycott) کا تعلق ہے تو کسی عذرِ شرعی کے بغیر کسی مسلمان سے ترکِ تعلق جائز نہیں، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"لَايَحِلُّ لِرَجُلٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ"۔

ترجمہ: "کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنے (دینی) بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ قطع تعلق (Boycott) کرے، (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 6077)"۔

کسی سے نفرت یا محبت کا معیار ذاتی پسند یا ناپسند نہیں ہونا چاہئے، ذاتی عداوت کی خاطر کسی مسلمان سے قطع تعلق بھی شریعت کے خلاف ہے۔ احادیثِ مبارک میں تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

(۱) عَنْ مُعَاذٍ أَنَّهُ سَأَلَ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَنْ أَفْضَلِ الْإِيمَانِ قَالَ أَفْضَلُ الْإِيمَانِ أَنْ تُحِبَّ لِلّٰهِ وَتُبْغِضَ فِي اللهِ وَتَعْمَلَ لِسَانَكَ فِي ذِكْرِ اللهِ، قَالَ وَمَاذَا يَا رَسُولَ اللهِ! قَالَ وَأَنْ تُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ وَتَكْرَهَ لَهُمْ مَا تَكْرَهُ لِنَفْسِكَ وَأَنْ تَقُولَ خَيْرًا أَوْ تَصْمُتَ

ترجمہ: "حضرت معاذ بن انس جہنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: "افضل ایمان کیا ہے؟" تو آپ ﷺ نے فرمایا: افضل ایمان یہ ہے کہ تم اللہ (کی رضا) کے لئے (کسی سے) محبت کرو اور اللہ ہی (کی رضا) کے لئے کسی

سے ناراضگی کرو اور تمہاری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر میں مشغول رہے، اُس شخص نے دریافت کیا کہ وہ کس طرح ہوگا؟، آپ ﷺ نے فرمایا: تم لوگوں کے لئے بھی وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو، اور جو اپنے لئے ناپسند کرتے ہو وہ دوسروں کے لئے بھی ناپسند کرو، اور اچھی بات کہو یا خاموش رہو، (مسند امام احمد بن حنبل، جلد 5، ص:248)''۔

(۲) عَنْ عَمرِو بْنِ جَمُوحٍ، اَنَّهُ سَمِعَ النَّبِیَّ ﷺ یَقُوْلُ لَایَحِقُّ الْعَبْدُ حَقَّ صَرِیحِ الایمانِ حتّٰی یُحبَّ لِلّٰہِ تعالیٰ ویُبغِضَ لِلّٰہِ، فاذا أحبَّ للّٰہ تَبَارَکَ وتَعَالیٰ وأبْغَضَ لِلّٰہِ تَبَارَکَ وَتَعَالیٰ، فَقَدِ اِسْتَحَقَّ الوِلاءَ من اللّٰہ،

ترجمہ: ''حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ کوئی بندہ اس وقت تک صریح ایمان کا حق دار نہیں ہوگا، یہاں تک کہ اس کی کسی سے نفرت یا محبت صرف اللہ کی رضا کے لئے ہو۔ پس جب اس کی کسی سے محبت یا نفرت صرف اللہ کی رضا کے لئے ہوجائے تو وہ اللہ کی محبت کا حق دار ہوجائے گا''۔

(مسند امام احمد بن حنبل، رقم الحدیث:15549 جلد 5، ص:293، مطبوعہ: دارالفکر)

مذکورہ بالا احادیث میں ایمان کا کامل درجہ یہی بیان کیا گیا ہے کہ انسان کی دوسرے لوگوں سے محبت کا مدار کسی خوف، طمع یا دنیوی غرض کے لئے نہ ہو بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہو۔ ایمان کا رشتہ سب رشتوں پر فوقیت رکھتا ہے۔

ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کو کافر یا منافق کہنا ناجائز وحرام ہے۔ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(۳) عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ اِذَا کَفَّرَ الرَّجُلُ اَخَاہُ فَقَدْ بَآءَ بِھَا اَحَدُھُمَا۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب کوئی شخص اپنے (دینی) بھائی کو کافر کہتا ہے تو دونوں میں سے کسی ایک شخص کی طرف کفر ضرور لوٹتا ہے، صحیح مسلم، رقم الحدیث:123''۔ یعنی جس کو کافر کہا گیا ہے اگر حقیقت میں وہ کافر ہے تو یہ قول اس پر صادق آئے گا، ورنہ کسی شرعی دلیل وثبوت کے بغیر کسی کو کافر کہنے

والے پر خود یہ قول لوٹ آئے گا۔

(۴) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِيْنَارٍ اَنَّهٗ سَمِعَ ابْنَ عُمَرَ يَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَيُّمَا امْرِءٍ قَالَ لِاَخِيْهِ يَا كَافِرُ فَقَدْ بَاءَ بِهَا اَحَدُهُمَا اِنْ كَانَ كَمَا قَالَ وَاِلَّا رَجَعَتْ عَلَيْهِ۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے اپنے کسی (دینی) بھائی سے کہا، اے کافر!، تو کفر دونوں میں سے ایک کی طرف ضرور لوٹے گا، اگر وہ شخص واقعی ایسا ہی ہے جیسا کہ کہا گیا ہے، تو ٹھیک ہے، ورنہ کفر اسی کی طرف لوٹے گا، (جس نے بلا ثبوت شرعی دوسرے کو کافر کہا ہے)، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 124)''۔ علامہ غلام رسول سعیدی اس حدیث کی شرح میں علامہ یحییٰ بن شرف النووی متوفی 676ھ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''بعض علماء نے اس حدیث کو مشکل احادیث میں سے شمار کیا ہے، کیونکہ اس حدیث کا ظاہری معنی مراد نہیں ہے، اس لئے اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ قتل، زنا اور اسی طرح دوسرے کبیرہ گناہوں کی وجہ سے مسلمان کی تکفیر نہیں کی جاتی، اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کو کافر (''اے کافر!'') کہے، جب کہ اس کا یہ اعتقاد نہ ہو کہ دین اسلام باطل ہے تو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی، اس وجہ سے اس حدیث کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں:

(۱) جو شخص جائز اور حلال سمجھ کر کسی مسلمان کو اے کافر! کہے، وہ کافر ہو جائے گا۔

(۲) جو شخص مسلمانوں کو بکثرت کافر کہے گا اس کی شامت سے وہ خود انجام کار کافر ہو جائے گا۔

(۳) جو شخص کسی مسلمان کو کافر کہہ رہا ہے، وہ درحقیقت خود کو کافر کہہ رہا ہے۔ کیونکہ جس کو وہ کافر کہہ رہا ہے، اُس کے عقائد اسی کی مثل ہیں اور وہ اسی کی طرح مسلمان ہے۔

(۴) اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کو کافر کہے گا (کسی جواز کے بغیر) تو اس کی تکفیر کا گناہ اس کی طرف لوٹے گا۔

(۵) اگر کسی شخص نے مسلمان کو بطور سب و شتم (گالی گلوچ) کافر کہا تو یہ گناہ کبیرہ ہے اور اگر

مسلمان کو اس کے اسلامی عقائد کی وجہ سے کافر کہا تو پھر یہ کفر اس کی طرف لوٹ جائے گا۔
(۲) قاضی عیاض نے امام مالک بن انس سے نقل کیا کہ یہ حدیث خوارج پر محمول ہے جو مسلمانوں کی تکفیر کرتے تھے، لیکن تحقیق یہ ہے کہ باقی اہلِ بدعت کی طرح خوارج کی بھی تکفیر نہیں کی جاتی''۔
(شرح صحیح مسلم للنووی، جلداول، جز ثانی ،ص:50، بحوالہ: شرح صحیح مسلم، جلداوّل:481)

کسی مسلمان کو کافر کہنے کی دو وجوہ ہوسکتی ہیں: (۱) گالی کے طور کہا جائے، اِس سے کہنے والا کافر نہیں ہوتا، اگر چہ شرعاً یہ حرام فعل ہے اور اس پر وہ گنہگار ہوگا (۲) اس معنی میں کافر کہا جائے کہ وہ اسلام سے خارج ہے، اِس صورت میں دلیلِ شرعی کے بغیر مسلمان کو کافر کہنے والا کافر ہوجائے گا، اس پر تجدیدِ ایمان لازم ہے اور اگر وہ شادی شدہ ہے تو تجدیدِ نکاح بھی لازم ہے، جب تک تجدیدِ ایمان نہیں کرے گا، کوئی عبادت قبول نہیں ہوگی۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

والمختارُ للفتویٰ فی جنسِ ھذہ المسائلِ انَّ القائِلَ بمثلِ ھذہ المقالاتِ اِن کانَ أرادَ الشتْمَ ولایَعْتَقدُہٗ کافِراً، لَا یُکَفَّر وَاِنْ کَانَ یَعْتَقِدُہٗ کافِراً، فَخَاطَبَہٗ بھذا بِناءً عَلیٰ اِعتقادِہٖ أنَّہٗ کافرٌ، یُکَفَّرُ، کذا فی الذخیرۃ

ترجمہ: ''اس قسم کے مسائل میں مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو محض گالی کے طور پر کافر کہتا ہے اور اسے حقیقتاً کافر نہیں سمجھتا تو (اگر چہ یہ شرعاً انتہائی ناپسندیدہ بات ہے لیکن) کہنے والا کافر نہیں ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص کسی ایسے شخص کو جو حقیقت میں مسلمان ہے، اسے کافر سمجھتے ہوئے کہتا ہے: اے کافر!، تو ایسا کہنے والا خود کافر ہوجائے گا، ''ذخیرہ'' میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص:278، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

امام احمد رضا قادری قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

جامع الفصولین میں ہے: قال لغیرہٖ یا کافرُ، قال الفقیہ الاعمش البلخی کَفَرَ القائلُ وقال غیرُہ مِن مشائخ بلخ لایکفر فاتفقت ھذہ المسألۃ ببخاریٰ اذا اجاب بعض

آئمة بخاریٰ انه کفر فرجع الجواب الی بلخ فمن افتی بخلاف الفقیه الاعمش رجع الی قوله وینبغی ان لایکفر علی قول ابی اللیث وبعض آئمة بخاریٰ والمختار للفتویٰ فی جنس هذه المسائل ان القائل هذه المقالات لواراد الشتم ولا یعتقد کافرا لایکفر ولو اعتقد کافرا کفر

ترجمہ: ''جامع الفصولین میں ہے: کسی غیر کو کہا: اے کافر!، تو امام اعمش فقیہ بلخی نے فرمایا: وہ کہنے والا خود کافر ہو گیا۔ اور ان کے علاوہ مشائخ نے فرمایا: وہ کافر نہ ہوگا۔ اور یہی مسئلہ بخارا میں پیش آیا، تو بخارا کے بعض آئمہ نے فرمایا: وہ کافر ہو گیا، جب یہ جواب بلخ پہنچا تو جن لوگوں نے فقیہ امام اعمش کے خلاف فتویٰ دیا تھا، اُنہوں نے رجوع کر کے اعمش کے قول سے اتفاق کر لیا۔ اور ابواللیث اور بخارا کے بعض آئمہ کے نزدیک کافر نہ کہنا مناسب ہے، جبکہ اس قسم کے مسائل میں فتویٰ یہ ہے کہ مسلمان کو کافر کہنے والے نے اگر گالی مراد لی ہو اور کفر مراد نہ لیا ہو تو کافر نہیں ہوگا اور اگر اس نے کفر کا اعتقاد کیا تو وہ کافر ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 11 ص: 380379، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

دوسروں کو کافر کہنے والے کا حکم

سوال:167

ایک صاحب جو دوسرے محلے کی مسجد کے پیش امام ہیں، علاقے کی مرکزی جامع مسجد میں نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے بعد سلام پڑھتے ہی لوگوں کے ہجوم میں جب لوگ خطیب صاحب سے مصافحہ کر رہے تھے، آگے بڑھے اور یہ الفاظ کہے: ''ہم سے بھی سلام لے لیں، ہمارے دل میں کفر نہیں، آپ کافر ہیں اور میں یہ بات ثابت کر سکتا ہوں''۔ اس پر لوگ مشتعل ہو گئے کہ انہوں نے ہمارے خطیب کی توہین کی ہے، اُنہیں کافر کہا ہے۔ اس کے بعد وہ شخص ایک حافظِ قرآن بچے کی سند لایا جو اسی مسجد سے فارغ ہوا تھا، مذکورہ شخص نے یہ اعتراض کیا کہ خطیب صاحب نے مُعلم کی جگہ دستخط کیوں کئے، جبکہ مُعلم کوئی اور ہے۔ اس پر مسجد کمیٹی نے لوگوں کی موجودگی میں اس بات کو غلط قرار دیا اور کہا کہ خطیب صاحب سے

دستخط کے لئے ہم نے کہا تھا، وہ اس مسجد کے امام وخطیب اور مدرسے کے منتظم ہیں۔اس پر پورے جمِ غفیر نے اُس (کافر کہنے والے) شخص کو غلط اور جھوٹا کہا، پھر مسجد کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ اس مسئلے پر کسی مفتی صاحب سے فتویٰ لیا جائے، ہمارے سوال درج ذیل ہیں:

۱۔ کیا ایسا شخص امامت کا اہل ہے؟۔

۲۔ ایسے الفاظ ادا کرنے پر شرع کا کیا حکم لاگو ہوتا ہے؟۔

۳۔ کافر کہنے والے شخص کا نکاح قائم ہے یا نہیں؟۔

(سائلین: کمیٹی جامع مسجد واہلیانِ کلووال)

جواب:

مسلمان کو کافر کہنا شرعاً انتہائی ناپسندیدہ ہے اور اس کے قائل کے قول کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں:

(1) بطور گالی کہا جائے، اس سے کہنے والا کافر نہیں ہوتا۔

(2) مسلمان کو مذہبِ اسلام سے خارج جان کر کافر کہا تو اس صورت میں کہنے والا کافر ہو جاتا ہے، اُسے تجدیدِ ایمان کرنا ہوگی اور اگر شادی شدہ ہے تو تجدیدِ نکاح بھی لازم ہے، جب تک تجدیدِ ایمان نہیں کرے گا، اس کی نماز، روزہ وغیرہ قبول نہیں ہوں گے۔

ارشادِ نبوی ﷺ ہے: ''لا الٰہ الا اللّٰہ'' کہنے والوں سے زبان روکو، انہیں کسی گناہ پر کافر نہ کہو''۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

والمختارُ للفتویٰ فی جنسِ ھذہ المسائلِ انَّ القائلَ بمثلِ ھذہ المقالاتِ اِن کانَ أرادَ الشتمَ ولایَعْتَقِدُہٗ کافِراً، لَا یُکفَر وَاِنْ کَانَ یَعْتَقِدُہٗ کافِراً، فَخَاطَبَہٗ بھذا بِناءً علیٰ اِعتقادِہٖ أنَّہٗ کافِرٌ، یُکَفَّرُ، کذا فی الذخیرۃ

ترجمہ: ''اس قسم کے مسائل میں مفتیٰ بہٖ قول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو محض گالی کے طور پر کافر کہتا ہے اسے حقیقتاً کافر نہیں سمجھتا تو (اگرچہ یہ شرعاً انتہائی ناپسندیدہ بات ہے لیکن)

کہنے والا کافر نہیں ہوگا اور اگر کوئی شخص کسی ایسے شخص کو جو حقیقت میں مسلمان ہے، اسے کافر سمجھتے ہوئے کہتا ہے: اے کافر! تو ایسا کہنے والا خود کافر ہو جائے گا، ''ذخیرہ'' میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص: 278، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

صورتِ مسئولہ میں اُس شخص نے خطیب کو یہ کلمات کہے ''ہمارے دل میں کفر نہیں ،آپ کافر ہیں اور میں یہ بات ثابت کرسکتا ہوں''، ایک تو اسے یہ معلوم ہے کہ ایمان و کفر کا تعلق دل اور اعتقاد سے ہے اور پھر اُس کا یہ دعویٰ کہ ''میں یہ بات ثابت کرسکتا ہوں'' یہ اپنی معصیت پر اصرار کے مترادف ہے، لہٰذا اس پر لازم ہے کہ تجدیدِ ایمان اور تجدیدِ نکاح کرے اور خطیب سے کھلم کھلا معافی مانگے، ورنہ وہ امامت کا اہل نہیں رہے گا۔

ڈرائیور کا پٹرول میں خیانت کرنا

سوال:168

گورنمنٹ ایک ڈرائیور کی گاڑی چلانے پر ڈیوٹی لگاتی ہے جو کہ کراچی سے پشاور جاتا ہے اور پشاور سے کراچی واپس آتا ہے، اس سفر کا فاصلہ تقریباً 1600 کلومیٹر ہے اور اس سفر کے لئے گورنمنٹ 800 لیٹر پٹرول دیتی ہے۔ ڈرائیور اُس میں سے تقریباً 120 لیٹر پیٹرول بچا لیتا ہے اور اُسے فروخت کردیتا ہے۔ کیا یہ رقم اُس کے لئے حلال ہے؟،

(صفدر اقبال نعیم، ضلع سدھنوتی تحصیل پلندری، آزاد کشمیر)

جواب:

صورتِ مسئولہ میں ڈرائیور کی حیثیت ملازم (اجیر) کی ہے، ڈرائیونگ کی اُسے اجرت دی جاتی ہے، ملازم کو جو چیزیں کسی کام کے لئے دی جائیں وہ امانت ہوتی ہیں اور جو ڈیزل اُسے دیا جاتا ہے وہ بھی سرکاری امانت ہے، جس کام کے لئے وہ ڈیزل دیا گیا اسے بچا کر اپنے ذاتی تصرف میں لانا یا فروخت کرنا، سب خیانت کے زمرے میں آتا ہے۔ اسلام میں امانت داری کا موضوع بہت وسیع حیثیت کا حامل ہے، زندگی کے ہر شعبے میں امانت داری ضروری ہے۔ قرآن کریم میں جابجا امانت داری کی تاکید اور اہمیت بیان کی گئی

ہے۔قرآنِ کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کا واقعہ بیان فرمایا،حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن کی بکریوں کو کنویں سے پانی نکال کر پلایا۔حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹیوں نے اپنے والد حضرت شعیب علیہ السلام سے اس اجنبی نوجوان کا واقعہ بیان کیا اور پھر اپنے والد سے کہا:

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۫ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ۝

ترجمہ:''ان دونوں خواتین میں سے ایک نے کہا:اے ابا جان! آپ ان کو اجرت پر رکھ لیجئے،کسی کو اجرت پر رکھنے کے لئے بہترین انتخاب ایسے شخص کا ہونا چاہئے جو(دو صفات کا حامل ہو) طاقت ور امانت دار ہو،(سورۃ القصص:26)''۔

اس آیت سے پتا چلتا ہے کہ بہترین اجیر وہ ہے جو قوی ہو اور امانت دار بھی ہو۔جو امانت داری کو چھوڑتا ہے یا حیلے بہانوں سے خیانت کی راہیں تلاش کرتا ہے،وہ گمراہ ہے، حدیث مبارک میں ہے:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ اَبِي بُرَيْدَةَ ،عَنْ اَبِيْهِ ،عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنِ اسْتَعْمَلْنَاهُ عَلٰى عَمَلٍ فَرَزَقْنَاهُ رِزْقًا فَمَا اَخَذَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَهُوَ غُلُوْلٌ۔

ترجمہ:''حضرت عبد اللہ بن ابی بریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:جس کسی کو ہم کسی کام کے لئے مقرر کریں اور اسے اس کی اجرت ادا کردیں تو اپنی اجرت کے علاوہ وہ جو کچھ بھی لے گا،وہ غبن کے زمرے میں آئے گا''۔

(سُنن ابوداؤد،رقم الحدیث:2936)

تاہم اگر حکومت کسی کے ساتھ یہ معاہدہ کرے کہ تمہیں فلاں مقام سے فلاں مقام تک گاڑی لانی اور لے جانی ہے اور اس کا مجموعی معاوضہ یا اجرت (ایندھن اور اجرت کارکنان سمیت) یہ ملے گی تو پھر یہ معاہدہ درست ہے،اور وہ طے شدہ معاوضے کا حق دار ہے،لیکن اگر وہ ڈرائیور ملازم ہے اور اسے اپنے کام کی اجرت ملتی ہے تو پھر ایندھن میں خیانت حرام ہے۔

بجلی کی چوری کا مسئلہ اور اس کا شرعی حکم

سوال:271

آج کل لوگوں میں بجلی چوری کرنے کا رجحان بہت زیادہ ہو گیا ہے، چوری کے مختلف طریقے استعمال کئے جاتے ہیں جیسے میٹر کی رفتار کو کم کرنا، کنڈا لگا لینا، میٹر کو بند کر دینا وغیرہ۔ وہ اس چوری جیسے بڑے گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھتے بلکہ وہ کسی مادی چیز کے بغیر اجازت اٹھا لینے کو گناہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے آنجناب سے معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں بجلی چوری کرنا گناہ ہے یا نہیں؟ برائے کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی مکمل وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں، (مٹھا رمیمن، جی۔ ایم سینٹر کے۔ ای۔ ایس۔ سی کراچی)۔

جواب:

سرقہ کی تعریف کرتے ہوئے علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں: ھِیَ اَخذُ العاقلِ البالغِ عشرۃَ دراھمَ او مقدارھا خُفیۃً عمّن ھو مُتَصَدٍّ للحفظِ مِمّالا یتسارعُ الیہ الفسادُ من المالِ المتموّلِ للغیرِ عن حرزٍ بلا شبھۃٍ

ترجمہ: ''عاقل بالغ کا (کسی محفوظ جگہ سے) کسی کا دس درھم (یا اس کے برابر یا زائد مالیت) کا ایسا مال، جس کی حفاظت کا اہتمام کیا گیا ہو اور اس کا مال غیر ہونے میں کسی شبہے یا تاویل کی گنجائش نہ ہو اور وہ چیز جلد خراب ہونے والی بھی نہ ہو، سرقہ کہلاتا ہے''۔

(فتح القدیر، جلد 5، ص:339، گجرات انڈیا)

علامہ شامی نے سرقہ کی دو قسمیں بیان کی ہیں: (1) سرقہ صغریٰ (2) سرقہ کبریٰ، اگر مال مسروق کے نقصان کا تعلق فقط صاحب مال کے ساتھ ہو تو وہ سرقہ صغریٰ ہے اور اگر وہ نقصان فردِ واحد کے ساتھ خاص نہ ہو بلکہ عام ہو تو وہ سرقہ کبریٰ کہلائے گا۔۔۔۔۔۔علامہ شامی آگے لکھتے ہیں: وقد اشترکا فی التعریف واکثر الشروط اھ ای لان المعتبر فی کل منھما اخذ المال خفیۃ

ترجمہ: ''اور (چھوٹے اور بڑے) سرقہ کی ان دونوں قسموں کی تعریف اور اکثر شرائط ایک

ہی ہیں، کیونکہ ان دونوں اقسام میں جو مفہوم معتبر ہے، وہ یہ کہ (مالک یا محافظ کی غفلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے) خفیہ طور پر کسی کے مال کو چرانا"۔

مذکورہ بالا فقہی حوالوں سے معلوم ہوا کہ شرعی طور پر کسی کا مال لینا چوری ہے اور مالیت تمول الناس (لوگوں کے اس کے حاصل کرنے کی رغبت) سے ثابت ہوتی ہے جیسا کہ علامہ شامی نے تصریح کی ہے، والمالية تثبت بتمول الناس۔ یعنی کسی چیز کا مال ہونا اس امر سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگ اس کے حاصل کرنے اور جمع کرنے میں رغبت رکھتے ہیں۔ بجلی پر تموّل کا تو اطلاق ہوتا ہے کیونکہ اس کی خرید و فروخت مال کے عوض ہوتی ہے، اگرچہ اس کو ذخیرہ نہیں کیا جاسکتا۔ ٹمپرنگ (Tempring) کر کے میٹر کو بند کر دینا یا میٹر کے باہر سے بجلی کے تار کو کنکٹ کر کے استعمال کرنا چوری بھی ہے، خیانت بھی ہے، فعلِ حرام بھی ہے۔ یہ عامۃ الناس کی بھی حق تلفی ہے اور ایک طرح سے سرقۂ کبریٰ ہے۔ حکومت اس کے لئے اپنی حکمت و مصلحت کے مطابق تعزیر مقرر کر سکتی ہے، قانون سازی کر کے اسے عدالت کے دائرے میں لایا جاسکتا ہے، لیکن یہ وہ سرقہ نہیں ہے جس پر قطعِ ید (ہاتھ کاٹنے) کی شرعی سزا مقرر ہے، کیونکہ اس کے لئے باقاعدہ شرائط مقرر ہیں جو یہاں نہیں پائی جاتیں۔ بجلی کے میٹر کی رفتار کو کم کرنا یا میٹر کو بند کر دینا یا کنڈا لگا کر غیر قانونی طریقے سے بجلی استعمال کرنا چوری ہے اور چونکہ بجلی کی چوری کا نقصان صرف فردِ واحد کے ساتھ نہیں بلکہ عوام الناس کیساتھ ہے لہٰذا علامہ شامی کی تصریح کی رو سے یہ سرقہ کبریٰ کہلائے گا، لوگوں کو چاہئے کہ غیر قانونی طریقے سے بجلی کے استعمال سے گریز کریں۔

لیکن جس طرح صارفین کا بجلی کے حصول اور استعمال میں غیر قانونی طریقہ اختیار کرنا ناجائز اور حرام ہے، اسی طرح بجلی سپلائی کرنے والے محکمے یا ادارے کی طرف سے بجلی کے میٹروں کی رفتار کو تیز کرنا یا ان کی غفلت کی وجہ سے میٹر کا چلتے چلتے بند ہو جانا اور بعد میں اپنے من پسند معیار کے مطابق اوسط رقم (Everage) کا بل بھیجنا اور صارف سے زائد قیمت لینا، یہ بھی ناجائز اور حرام ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ

ترجمہ: ''اے مومنو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ، (النساء: 29)''۔

اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ روزانہ کئی کئی گھنٹے لوڈشیڈنگ ہوتی ہے، بجلی کی سپلائی بند رہتی ہے مگر جب بل آتا ہے تو معمول سے زائد ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر صارف کو میٹر کے ناقص ہونے کی شکایت ہو تو اس کے جانچنے کا کوئی غیر جانبدارانہ عادلانہ نظام نہیں ہے، محکمہ یا ادارہ اپنے ظلم کے خلاف خود ہی منصف ہوتا ہے۔ بجلی کی چوری کی اکثر یا بعض صورتوں میں محکمے یا ادارے کے اہلکار اور ذمہ داران شریک ہوتے ہیں اور رشوت لے کر جرم کی ترغیب دیتے ہیں۔ پس جب تک اصلاح کا ایک جامع، غیر جانبدار اور انصاف پر مبنی نظام نہ ہو تو پھر عوام کا استحصال ہوتا رہے گا اور اگر بجلی کی سپلائی کا ادارہ قومی ہے تو قومی نقصان ہوگا۔ غیر جانب دار تجزیوں میں بتایا گیا ہے کہ بجلی کی ترسیل اور سپلائی کے محکمے یا ادارے کی ناقص کارکردگی کی وجہ سے بعض صورتوں میں چالیس فیصد ضیاع ہوتا ہے، جسے فنی اصطلاح میں Line Loss کہتے ہیں۔ اور ان تمام مصارف کو مجموعی مصارف میں شامل کر کے ان حقیقی صارفین کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے جو کوئی خیانت نہیں کرتے، دیانت داری سے بل ادا کرتے ہیں، لہٰذا انکمانہ یا ادارتی سطح پر دانستہ یا نادانستہ غفلت کا بوجھ بے قصور صارفین پر ڈالنا بھی ''اَکْلُ الْاَمْوَالِ بِالْبَاطِل'' (باطل طریقوں سے مال کھانے) کے ذیل میں آتا ہے۔

اگر غیر قانونی استعمال کا سدِّ باب کر دیا جائے اور ہر صارف کو بل ادا کرنا پڑے تو بجلی کی طلب (Demand) اور صرف (Consumption) میں بھی کمی آئے گی، بلکہ بہت ممکن ہے کہ یہ ادارے خسارے سے نکل کر نفع بخش بن جائیں اور حکومت کو زرِ تلافی (Subsidy) سے بھی نجات مل جائے۔ اور اسے نفع بخش کاروبار سمجھ کر مزید ادارے اس شعبے میں سرمایہ کاری کے لئے بخوشی آگے آئیں گے اور صنعتوں کو فروغ ملے گا۔

کراچی جیسے میگا پولیٹن شہر میں اگر شہری خدمات کے ادارے مقامی حکومت کی تحویل میں دیدیئے جائیں تو شہری انتظامیہ بجلی کے غیر قانونی استعمال کو کافی حد تک کنٹرول کر سکتی

ہے۔اگر ہر صارف (Consumer) کو حقیقی بل ادا کرنا پڑے تو کمپنی کے مالی وسائل میں کافی اضافہ ہوسکتا ہے۔شہری حکومت بین الاقوامی اداروں سے شہری خدمات کے اداروں کو جدید بنانے کے معاہدات کر کے خود ادائیگی کر سکتی ہے،جس میں بجلی کی ترسیل کا زیرِ زمین جدید نظام،اوور ہیڈ یا انڈر گراؤنڈ ریل کا جدید ترین نظام وغیرہ شامل ہیں۔